ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No. _____ Acc. No. 169173

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

رجسٹرڈ نمبر ۲۵۱

اُردوی معلّٰی

(63)

جلد ۱ | بابت ماہ جنوری ۱۹۰۶ء | نمبر ۱

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی۔ اے

(فہرست مضامین)

(۱) قلق ۱
(۲) نیشنل کانگرس کا اکیسواں اجلاس ۱۵
(۳) بیاض حسرت ۲۴
(۴) لاسیح کی راماین از بالمکند گپت ۲۵
(۵) محمدن ایجوکیشنل کانفرنس
(۶) تنقید .....
(۷) حصہ نظم { (۱) غزل ... (۲) غزل ...

بمقام اشاعت دفتر اُردوی معلّٰی علی گڈھ

احسن المطابع علی گڈھ میں طبع ہوا

بمسلامہ

(عہ ربع محصول)

ٹرکش مارٹ

حضرات ملک - حال ہی میں ہمنے یورپ سے ایک بہت بڑا
لاٹ کی ٹوپیوں کا منگایا ہے جو ہر رنگ ہر سائز اور ادنیٰ اعلیٰ
قوم کی اپنی اپنی طرز میں ایک دوسرے سے بالکل نرالی اپنی نظیر
آپ ہی ہیں - ان ٹوپیوں کا فیشن بھی ہمنے بڑے غور و فکر
کے بعد تہذیب و ترقی کو مدنظر رکھ کے تجویز کیا ہے
غالباً کوئی اور کمپنی پیش نہیں کر سکتی -
ہمارا قابل توجہ یہ بات ہے کہ ہمارے مشہور
یورپین سیکرز نے حسب فرمائش ان ٹوپیوں
کی نفیس استر پر ہمارا قابل دید بے نظیر اسلامی
ٹرک اور ہمارے مجوزہ پیٹنٹ نام مثلاً
یہ - حبیبیہ - نظامیہ - عثمانیہ - اسلامیہ - علی گڑھ
آباد وغیرہ زرین حروف میں کندہ کر کے اپنا
کمال فن دکھایا ہے -

لہذا معززین قوم و تاجران ملک سے استدعا ہے کہ اپنی
خاص توجہ مبذول کر کے بذریعہ خط کتابت استفسار فرمائیں
یا کچھ مال نمونتاً روانہ کرنیکی اجازت دیں اور ہماری خوش
لگی کو ملاحظہ فرمائیں ہمارے اسٹاک میں ملاحظہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

المشتہر

ٹرکش مارٹ ۱۶۳ ہینسٹی بازار بمبئی

ملہ و فرخ مرزا

اس ناول کا لطف زبان اور حسن بیان دیکھنے کے قابل ہے - واقعات
اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ ہر واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے
درد سوز اق نصیحت - حسن و عشق - ہجر و وصل - غرضکہ جو کچھ عدیم المثل
کے پُر زور قلم سے نکلا ہے وہ لکھنؤ کی ستھری زبان کا ایک دریا ہے کہ بہتا ہے
ساتھ اوسکی اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ قلب پر ایک خاص کیفیت
پیدا ہوتی ہے - یہ ناول نوجوان [illegible] کے لئے ایک خاص دلچسپی کا باعث
ثابت ہوا ہے جسکی تصدیق اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ طبع ثانی کی بھی
چند جلدیں باقی ہیں - قیمت عہ - محصول ڈاک خریدار - نشان فرما
سے دستیاب ہو سکتا ہے -

المشتہر

فطرت - حیدر آباد دکن محلہ افضل گنج - مکان لوی غیاث الدین صاحب

الینچ بانکی پور

کیا آپنے ابتک مولانا الینچ کو نہیں دیکھا ؟ دیکھئے اور ضرور دیکھئے ! اخبار
نہیں چلتا ہوا جادو - ظرافت کا پونمنٹو اپر لطف یہ ہے کہ صرف ہاہا ہی ہی
اور مذاق ہی نہیں - بلکہ پولیٹکل - سوشل - مارل - سائنٹیفک سے مالا مال - ملکی
ترقی اور تمدنی مضامین پر زبردست چٹکیاں لینے میں گرو گھنٹال - زبان
کی صفائی - محاورات کی بندش کا کیا کہنا - پڑھئے اور لوٹ پوٹ ہو جائیے
ہر ہفتہ دلفریب نا بالغانہ نظم و نثر کی بہار - اور تازہ خبروں کے لطف اٹھائیے
ان سب خوبیوں پر قیمت پوچھو تو کچھ بھی نہیں صرف (عہ) چھ شاہی
اور طلبا سے تین - مگر سب دم نقد - مولانا الینچ اپنے یہاں اُدھار کا قاعدہ نہیں
رکھتے - کمرا کیل فرخ آبادی - ایک ہاتھ سو روپے دیجئے دوسرے ہاتھ سو اخبار
لیجئے - رکھئے زوری جو کہا کام - جائی خوبی درخواست پر روشن حال ہو
نمونہ کیلئے دو آنہ کا ٹکٹ آنے تاجروں کو اس اخبار سے بڑھکر کوئی دوسرا اخبار
کثیر الاشاعت نہ ملیگا - اسوقت اس صوبہ میں اُردو کا ایک ہی اکیلا اخبار
[illegible] باوقعت اور کثیر الاشاعت - المشتہر بیجر اخبار الینچ بانکی پور

تنقید

ایک علمی ماہانہ ریویو جو تاریخی تنقیدی سوشل مارل مضامین
نہایت آزادی سے آفتاب کے [illegible] شائع ہوتے ہیں - مذہبی پولیٹکل مضامین
اجتناب کیا جاتا ہے - کاغذ سفید چکنا ولایتی کتابت چھپائی صاف
وعمدہ ہوتی ہے - عہد قدیم و جدید کے مبارکات و خوبیاں اس پرچہ میں
ملتی ہیں - نظم کا حصہ مستقل طور پر آخر میں ہوتا ہے - معہ محصول عہ
درخواست خریداری بنام محمد سعید اللہ خاں - رامپور کیمپ

Number 169173
Date 22.1.96

بسم اللہ

قلق

نام و تخلص خواجہ ارشد علیخاں معروف بہ خواجہ اسد اللہ مخاطب بہ آفتاب الدولہ قلق تخلص زمانہ شاہی کے دور آخر میں لکھنؤ کے دوم درجے کے شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور اپنے ناموں خواجہ وزیر کے اچھے شاگردوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اپنے ایک قصیدے میں اُنھوں نے واجد علیشاہ مرحوم کی بھی شاگردی کا اظہار فخریہ انداز میں یوں کیا ہے ؎

ترا یہ منہ تھا کہ سلطان عالم و عادل	بنائیں دست مبارک سے خود ترے اشعار
خوشا نصیب خوشا قسمت و خوشا طالع	کہ ہو حضور کے شاگردوں میں ترا بھی شمار

لیکن ہمارے خیال میں امرائے دربار کا شاگردی بادشاہ میں داخل ہونا عملی قصیدہ گوئی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا بادشاہ کو رتبہ سے زیادہ قوی قرار دینا خیالی تعریف ہے لیکن اسیر مرحوم کا واجد علیشاہ کی غزل پر مصرعہ لگانا یا قلق کا اپنے تئیں شاگرد اختر بتانا عملی قصیدہ گوئی ہے جس سے بڑھکر کوئی اور صورت خوشامد کی نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ اس قسم کی صریح خوشامد کی مثالیں اس زمانے میں بھی موجود ہیں۔ خیر۔

قلق کی شاعری۔ قلق کی مشاقی اور استادی میں کوئی شبہ نہیں لیکن دیگر اساتذہ لکھنؤ کے مانند انکے کلام سے بھی بجز اسکے کہ بوقت ضرورت بطور سند استعمال کیا جائے دل یا روح کو اور کسی قسم کا سرور حاصل نہیں ہو سکتا عام طور پر انکی غزلوں میں یا تو رعایت لفظی کا خیال ہوتا ہے جو مبتدیوں اور ظاہر بینوں کو بصورت حسن نظر آتا ہے یا مصنوعی عاشقی کا غیر مہذب چوچلا جسکو عیاشوں کے سوا کوئی دوسرا شاعر یا غیر شاعر دل سے پسند نہیں کر سکتا ملاحظہ ہو۔

ازل سے ہوں میں کشتہ آپکے حسن و ملاحت کا	نمک چھڑکا ہے میں نے زخم دل پر شور الفت کا
صدائے آہ ہے مضراب غم کی چھیڑ سے پیدا	دل نالاں نیا پردہ ہے قانون محبت کا
جو وقت قتل اسکے لعل شیریں کا پڑا پرتو	پلایا آب تیغ یار نے شربت شہادت کا
حسن جاتا رہا موقوف ہے ملنا ان کا	خط رخسار ہوا لیسنے مچلکا اُن کا
نام پر دیکھیں گے اغیار جو ہمکو تم کو	دیکھ لینا کہ بدل جائے گا کوٹا اُنکا
گل جو ہم کہا چکے تو جبین کو اک داغ دیا	دیگیا خوب نشانی ہمیں چھلا اُن کا

ان خرابیوں کا الزام قلق سے زیادہ انکے عہد کے مذاق پر ہے جبکہ لوگوں نے عیش و عشرت میں پڑکر حقیقی محبت کے مفہوم کو فراموش کر دیا تھا اور بوالہوسی کو عشق کا قائم مقام سمجھکر قلق و رند کی بیسوا شاعری کو نہ صرف گوارا بلکہ پسند بھی کرتے تھے۔ رند و قلق چونکہ مصنوعی محبت کی تصویر کھینچتے ہیں اسلئے ان کی غزلوں میں عموماً اُس اثر اور درد کا نامہ بھی نہیں ہے جو انکے ہمعصر و ہمپایہ ہلویوں میں مثلاً انیس و شیفتہ کی شاعری میں بمنزلہ جان پایا جاتا ہے۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو صرف اُن موقعوں پر جہاں انکے قلم سے جو کچھ نکلا ہے اُسے اُنکے دل نے بھی محسوس کیا ہو۔ مثلاً واجد علیشاہ عرصہ کی سرگذشت سفر میں یا قیصر باغ کے قافیے کی مندرجہ ذیل غزل میں۔

لُٹ رہی ہے دولت دیدار قیصر باغ میں	مثل گل سب ہو گئے زردار قیصر باغ میں
گاتے ہیں مرغان گلشن پینگ دیتی ہے صبا	جبکہ جھولا جھولتا ہے یار قیصر باغ میں
بیخودی چھائی ہوئی ہے شراب عیش کی	مست دو باہر پڑے ہیں چار قیصر باغ میں
آمد آمد ہے سلامی کو ہمارے شاہ کی	ہیں جوانان چمن ملیسار قیصر باغ میں
محتسب کے ہاتھ سے تنگ اسقدر ہیں اے قلق	آئے ہیں نالش کو سب میخوار قیصر باغ میں

غزلیات قلق کی بے اثری کے باب میں ہمنے "عموماً" کی قید اسلئے لگائی ہے کہ جسطرح کبھی کبھی ہلویوں کے ہاں رعایت لفظی کی بھی مثالیں نظر آجاتی ہیں اسیطرح لکھنویوں کے کلام میں کہیں کہیں بے تکلفی اور درد کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے مثلاً قلق کی مشہور غزل (اداسی دیکھ لو جاتا ہے گلہ دل کا بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا) اپنے خاص رنگ کے لحاظ سے انکے تمام دیوان میں فرد ہے اور یہی وجہ ہے کہ آجتک زبان زد خاص و عام ہے اسی رنگ کی اور بھی چند شعر ملاحظہ طلب ہیں۔

صلح ٹھہری فیصلہ باہمدگر ہونے لگا	عذر ادھر ہونے لگا شکوہ اُدھر ہونے لگا
چپ رہ اے مرغ قفس نالہ و فریاد نکر	موسم گل میں اسیری کے مزے یاد نکر
کچھ گلا اسکا نہیں ہے مے اگر ملتی نہیں	آنکھ بھی اے ساقی رشک قمر ملتی نہیں
یہ دعا دیکے دریار سے ہم رات چلے	خانہ آباد کہ مشتاق ملاقات چلے
کیا کیا نہ امتحاں میں ہم سرخرو رہے	تیغ نگاہ یار تری آبرو رہے
دنیا ہو اور گلشن کوئے حبیب ہو	جنت کی گر ہوس ہو تو دوزخ نصیب ہو

خاتمہ اردو دیہے کی مثنویوں میں قلق کی مثنوی طلسم الفت مشہور پسندیدہ اور مقبول ہے۔ واجد علیشاہ کی طرح میں انکے قصائد بھی بُرے نہیں اور بحیثیت مجموعی متاخرین اساتذہ لکھنؤ میں انکا بھی شمار بیجا نہیں ہے۔ فقط

سفر آشوب

متضمن کیفیت سفر سلطان عالم محمد واجد علی شاہ از قلق لکھنوی

دہوم ہی شہر میں وارفتہ اختر آیا
شاد آیا ہے چلو دیکھیں کہ مضطر آیا
کچھ کریں فکر علاج غم و درد و محن آج
صبح سے شام تلک لوگ چلے آتے ہیں
بھیڑ سی بھیڑ ہے انسان پسے جاتے ہیں
کثرت اہل تمنا ہے بڑا ریلا ہے
پوچھتے ہیں ایدھر آنا ہوا تیرا کیونکر
رنج جاں کاہ جگر سے تیری اُٹھا کیونکر
چھیڑ کچھ ای فلک آوارہ کہانی اپنی
عذر کرتا ہوں کہ اتنا نہ تم اصرار کرو
مجھ ستمکش سے نہ صحبت کوئی زنہار کرو
کیا مصیبت ہو بیاں غم کو گرفتارونکی
میں ہی اُس شمع کا تنہا نہیں پروانہ ہوں
میں ہی اُن گیسوؤنکا کچھ نہیں دیوانہ ہوں
اور بھی شاہ کی دمساز غلام آئے ہیں
سب وہ اس حال سے آگاہ ہیں پوچھو اونسے
حال صدمہ جانکاہ ہیں پوچھو اونسے
چین دردِ دل بیتاب ذرا تو کہوں
کیا کروں حال میں اظہار نہ چھیڑو مجھکو
ہوں مصیبت کا گرفتار نہ چھیڑو مجھکو
میرا افسانہ ہو اظہار کے قابل تو کہوں

خوشحالوں میں یہ چرچا ہے کہ کیونکر آیا
اور کوئی مژدہ جاں بخش ہی لیکر آیا
پوچھیں حال سفر شاہ غریب الوطن آج
خلق اومنڈی ہوئی ہے بارنہیں پاتے ہیں
ایسی مشتاق کب انبوہ سی گھبراتے ہیں
میرے غمخانیکی دروازی پر اک میلا ہے
چین تیرے دل بیتاب نے پایا کیونکر
درد فرقت یہ ہوا تجکو گوارا کیونکر
نقل کر اس سفر غم کی زبانی اپنی
ہر گھڑی مجھسے نہ اس امر کی تکرار کرو
پرسش حال دل زار نہ ہر بار کرو
حیرت آگین ہی کہانی وطن آوارونکی
میں ہی کیا اوس نگہ مست کا مستانہ ہوں
میں ہی الفت میں نہیں اپنونسے بیگانہ ہوں
اور بھی عاشق جانباز غلام آئے ہیں
وہ بھی اس غم میں اسیر آہ ہیں پوچھو اونسے
خاص وہ بندۂ درگاہ ہیں پوچھو اونسے
نفس سرد بھی دم لینے مجھے دے تو کہوں
درد فرقت کا ہوں بیمار نہ چھیڑو مجھکو
پکا پھوڑا ہی دل زار نہ چھیڑو مجھکو
میری قابو میں اگر ہو وہی میرا دل تو کہوں

آہ و زاری سے سر و کار [illegible] کرتا ہے
بحر خون دیدۂ گریاں سے بہا کرتا ہے

رنج بیحد دل غمدیدہ سہتا کرتا ہے
داستاں اپنی مصیبت کی کہا کرتا ہے

یاس اندوہ ہے اور عالم تنہائی ہے
ہم ہیں اور پاس ہمارا دل سودائی ہے

جسکی دم بھر نہ جدائی ہو گوارا مجھکو
جو سوا جان سے بھی اپنی ہو پیارا مجھکو

دم سے جس مہ کی ہو جینے کا سہارا مجھکو
اُس سے چھڑوا دے سپہر ستم آرا مجھکو

قہر بیداد ستم تفرقہ پردازی کی
نئی صورت کی جفا تازہ دراندازی کی

ایسے ملتے ہیں غلاموں کو کہیں یار آقا
ایسے دنیا میں کہاں مونس و غمخوار آقا

ایسے کم ہوتے ہیں عالم میں طرحدار آقا
اس مروت کے تو دیکھے نہیں زنہار آقا

شرق سے غرب تلک ڈھونڈنے گر جاؤنگا
ایسا آقای خوش اخلاق نہ میں پاؤنگا

اب جو چھیڑا ہے تو حال غم غربت سنئے
ماجرائے سفر دشت مصیبت سنئے

الم بیکسی و رنج مشقت سنئے
صدمۂ آفت و ایذای ہلاکت سنئے

خانہ ویران وطن آوارہ و برباد ہوئے
مبتلای الم و مورد بیداد ہوئے

شہر سے جبکہ مقدر نے نکالا ہمکو
سخت آفت عجب اندوہ میں ڈالا ہمکو

کر دیا مثل زمانہ تہ و بالا ہمکو
یہی کہتا تھا ہر اک دیکھنے والا ہمکو

بلبل ہند اب آوارہ وطن ہوتا ہے
حیف صد حیف کہ ویراں یہ چمن ہوتا ہے

تالب گنگ جو وہ خسرو یکتا جائے
تو تو ہمراہ رکاب ایک زمانا جائے

سفر وادی اندوہ جو پیش آجائے
ایک بگھی پہ وہی یکہ و تنہا جائے

گھر سے باہر ہی جو اپنے نہ کبھی نکلا ہو
وہ گل حسن ہو اور منزلوں کا صحرا ہو

رات کو کوچ کیا کرتے تھے تو دنکو مقام
ایک منزل پہ نہ پایا کہیں دم بھر آرام

نہ سر انجام سفر کچھ نہ کسی جا پہ قیام
بسکہ تھا طبع کی ناسازیکا وہ ہی ہنگام

شب وی میں بھی جو تکلیف سو پاتی تھی
سب کا منہ دیکھکے کس یاس سے جاتی تھی

چند دن بعد جو کنیو سے ہوئی شبکو سوار
ہو گیا کاٹنا رستے کا سحر تک دشوار

دن [illegible] پہونچے جو زمینی پہ آکر یکبار
دھوپ کی گرمی سے گلنار ہوئی تھی رخسار

فرط ایذا سے نہ تھا ہلنے کا یارا اُسوقت
تھام کر ہاتھ کو ہمکی سے اتارا اُسوقت

اوترے اوس کوٹھی میں آکر مع ساز و سامان
لے رکھی تھی جو برمن نے کرائے تھا ہاں

حال کچھ اوسکی خرابی کا بھی کرتا ہوں بیاں
جھونپڑا بانسوں کی اور چھپر کے ٹیکے کا نشاں

ڈھیر خاشاک کے تھے چار طرف جلے تھے
دھوپ چھنتی تھی وہ ٹوٹے ہوئے پرنالوں سے

دیکھے کچھ اپنا تصدق اُسے اسوار ہوئے
کوس چھ شہر سے دریا ہے جو ہیں پار ہوئے

پھنس گئی ریت میں بگھی تو یہ ناچار ہوئے
مستعد کھینچنے پر لوگ اُسے ہر بار ہوئے

ریت میں برہنہ پا خود بھی اوتر کر کھینچا
الغرض دور تلک بگھی کو باہر کھینچا

شاہ کرتے تھے جہاں شکوہ ایذائے سفر
جتنے ہمراہی تھے سب رہتے تھے اوس آس پر

یہ نہ معلوم تھا ہے کونسا ان میں افسر
انتظام اسکا ہے موقوف الٰہی کے سپرد

کار پردازوں نے دھیان اتنا بھی اسلائیکا
کھینچنے والا مقرر کوئی اس بار کیا

پہونچے شب بھر کی مشقت میں جو تا گوپی گنج
صبح ہوتے ہی آباد کیسا گوپی گنج

قدم شہ سے منور ہوا کیسا گوپی گنج
غیرت افزا سے چمن بخش بنا گوپی گنج

رات کی جاگنی سے تھی جو حرارت طاری
نیند کب آتی تھی دن بھر ہی غفلت طاری

چند دن بعد بنارس میں تو پائی راحت
وہاں کے رہنے نے بڑھی ختم کی انسانیت

اپنے مالک کی ہر اک طرح ادا کی خدمت
شاہ کے آنے کی تھی دل میں جو اوسکو حسرت

شادی و فرح سے پھولے نہ سماتا تھا وہ
اپنے جامے ہی سے باہر ہوا جاتا تھا وہ

تھالی بھر کر تو روپے آتے ہی صدقہ بھیجا
پیشکش اور نذر نقد بھی شہ کا بھیجا

کیا بیاں کیجیے ایک ایک کو کیا کیا بھیجا
جتنا سامان تھا راحت کا وہ سارا بھیجا

جیسے کرتے ہیں غلام ایسی وفا کی اُسنے
سب نمکخواری سرکار ادا کی اُسنے

آرزومند زیارت جو ہوا بلوایا
بعد مجرے کے وہ اشک آنکھوں میں بھر لایا

نذر دیکر قدم شاہ پہ سر رکھ دیا
شہ نے الطاف کیا بیٹھنے کو فرمایا

بیٹھتے ہی کرم شہ کی ثنا کی اوسنے
بہر افزائش اقبال دعا دی اوسنے

جب قدم دیکھکے مالک کے ہوا وہ رخصت
شرم سے کہنے لگا وہ شہ عالی ہمت

لہ اس موقع پر شاعر نے نہایت سخت الفاظ میں انگریز منتظم سفر اور مالک ہوٹل کی شکایت کی ہے جسنے بوقت رخصت

ہاتھی اور پالکی سے ہم تمہیں دیتے خلعت
پر کریں کیا کہ نہیں آج وہ باقی حشمت

اُسکی قیمت کے موافق زر نقد انکو دو
جسقدر انکے ہی لایق زر نقد انکو دو

پیشکش بھی میری جانب سے اب انکا انہیں دو
کہدو مقبول ہوا دلمیں کچھ آزردہ نہو

جب کہ دکھلائیگا وہ دن مرا آقا در مجکو
میں یہ لے لونگا امانت ہی میری رکھہ چھوڑو

عرض کی میں بھی اُسی روز یہ خلعت لونگا
اور جو کچھ کہ میرے دلمیں ہے حسرت لونگا

واہ ری یاس جو کہتا تھا کوئی اوسکا یار
نکیا ابکی برس آپنے کوئی تہوار

تو وہ کہتا تھا کہ ہوں عیش سے ہمتو سرشار
اور اسطرح سے لٹجائے ہماری سرکار

شاد کیا خاک ہوں کس سے کہیں کس غم میں ہیں
اپنی سرکار کے مٹجانیکی ماتم میں ہیں

آرزو تھی کہ مری گھر مرا آقا آئے
تا نمکخوار بھی ہمچشموں میں عزت پائے

یا فلک دفعتہً اس قہر کی آفت ڈھائے
کہ وہ آئے بھی تو تشریف یہاں یوں لائے

ہائے کیا روؤں میں اس بھولی ہوئی نعمتکو
دیکھ دن آوارہ وطن اپنی ولی نعمت کو

جب چلے وہاں سے تو دریا کا سفر ٹھہرایا
اک جہاز ایسا پرانا سا دخانی پایا

جس سے کشتی فلک کہنگی میں ہم پایا
بادو باران نے بھی اوسدنسے کرم فرمایا

جب ہوا زور کی چلتی تھی تو گھبراتے تھے
کثرت بارش ہر روزہ سی ہوا آتی تھی

خوش فضا ایک نظر آیا مگر سندر بن
فی الحقیقت کہ وہ صحرا ہی برنگ گلشن

حسن میں گلشن شداد پہ ہی چشمک زن
وہ ہوا اوسکی معطر صفت دشت ختن

بیچمیں آب چپ و راست وہ پیاری اشجار
دست قدرت کی ترشے ہوئے ساری اشجار

تیسرے روز ہوا قطع وہ صحرا جسدم
سمجھے اب منزل مقصد کے قریب آئے ہم

صدمۂ آب رواں کا نہ رہا اب کچھ غم
دل میں اپنے ہوا ہر ایک مسافر خرم

نظر اتنے میں سمندر کا مہانا آتا
اوس تلاطم میں تو بس مُنہ کو کلیجا آیا

ہو گیا موج کے صدموں میں گرفتار جہاز
دفعتہً چلنے لگا مست ہی رفتار جہاز

پہونچ تھا ہوگا یہ کسطرح سے اب پار جہاز
بچگیا ڈوبنے سے اوسمیں کئی بار جہاز

ماری دہشت کو نہ تھا دید کا یارا اُسدم
نظر آتا تھا کسیجا نہ کنارا اُسدم

دیکھتا کوئی میری شاہ کا عالم اُس وقت
اُس تلاطم میں نہ تھا چین کوئی دم اُس وقت

گو کہ بہلاتے تھے پر ڈرتے تھے خود ہم اُس وقت
حال ایک ایک کا تھا درہم و برہم اُس وقت

ناخدا لاکھ ہر اک شخص کو سمجھاتا تھا
مگر ایک ایک کا منہ زرد ہوا جاتا تھا

سہ پہر تک تو رہا ایک تلاطم برپا
شام کو قافلہ سب داخل کلکتہ ہوا

اس مصیبت سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے ذرا
کہ چلی گوشۂ غربت میں کس آفت کی ہوا

چین غربت میں بھی لینے نہ دیا قسمت نے
سخت اندھیر غضب قہر کیا قسمت نے

دفعتہً مادر و فرزند و برادر چھوٹے
زیست کا جنسے مزا تھا وہی یکسر چھوٹے

جی نہ انسان کا کسطرح یہ سنکر چھوٹے
سلطنت ساری چھٹی شہر چھٹے گھر چھوٹے

اُسپہ بھی چین نہ لی چرخ یہ آفت ڈالی
ایسی غربت میں مصیبت پہ مصیبت ڈالی

کچھ عجب چرخ ستمگار ہی ہے بدخصلت
طرفہ ڈالی ہی غریب الوطنی میں آفت

ناز پرور دو نپر اندوہ کی اتنی کثرت
آکے پردیس میں کن کن سے ہوئی ہے فرقت

ایک کی نور نظر نور نظر ایک اپنا
زور بازو و دل و روح و جگر ایک اپنا

ماں بھی وہ ماں کہ جو پروانۂ شمع رخسار
نام فرزند پہ جسکی ہو سدا جان نثار

دم بھر آنکھوں سے گر اوجھل ہوں تو آئے نہ قرار
روز منگوایا کریں دنیں خبر سو سو بار

فرط الفت سے جو وسواس بہت آتے تھے
صدقے ہر روز ہزاروں ہی دیئے جاتے تھے

دیکھنا نام سے دریا کی جسے خوف آئے
سو ہی لندن وہی رستے سے تری کی جائے

ملکہ شہزادہ کی جو سدا کہلائے
آسماں اُسپہ ضعیفی میں یہ آفت ڈھائے

یوں جدا بیٹے سے پردیس میں ماں ہو کوئی
ایسا غربت میں نہ خاک نہاں ہو کوئی

منصفی کیجئے جو ماں ہو نثار فرزند
دیکھنے پائی نہ پھر آکے جمال دلبند

ملک بیگانہ میں وہ خاک کا ہو وہی پیوند
حسرتیں دل کی رہیں دل ہی میں اور آنکھ ہو بند

رنج ناکامی مطلب سے جگر پارہ ہو
خانہ ویراں و تباہ و وطن آوارہ ہو

بھائی وہ بھائی کو ہرگز نہ برادر سمجھا
ہر طرح والد ماجد کی برابر سمجھا

بھائی نے بھی اُسے فرزند و پسر بہتر سمجھا
یہ محبت تھی کہ معشوق سے بڑھ کر سمجھا

ایسے ملتے ہیں کہیں تابع فرماں بھائی
ایسے دیکھے ہیں کہیں بھائی پہ قربان بھائی

قہر دیکھو ہی پردیس میں بازو ٹوٹے
نقد جاں ہزن مرگ اُسکا سفر میں لوٹے

آس ملنے کی ہی جسکی نہو ایسا چھوٹے
کیوں نہ اس رنج میں ہر اک سروسینہ کوٹے

پھر کے غربت سے نہ وہ یوسف ثانی آئے
نوجواں بھائیکی افسوس سنانی آئے

اور بیٹا بھی وہ بیٹا کہ سعید ازلی
خوردسالی میں فراست ہی بزرگونکی سی

دیکھکر طبع مبارک کی بہت ناسازی
پیار سے عرض حضور پدر آکر خود کی

آپ تشریف نہ لیجائیں ہماری ہوتے
کیں تکلیف نفرمائیں ہماری ہوتے

ہم ہیں کسدن کے لئے ہمکو روانا کیجے
آپ تشویش نہ کچھ دل میں خدارا کیجے

گو کہ کم عمر ہیں پر دھیان نہ اسکا کیجے
مورد طعن زمانہ ہوں نہ ایسا کیجے

سعی زیبا ہی ہمیں اپنی ریاست کے لئے
آدمی کیا نہیں کرتا ہی حکومت کے لئے

للہ الحمد کہ خالق نے یہ دن دکھلایا
ایک لندن کا مسافر تو سلامت آیا

حق تعالیٰ نے بڑا اپنا کرم فرمایا
یوسف ہند کو یعقوب زماں نے پایا

حق ولیعہد بہادر کو سلامت رکھے
سایۂ شاہ میں تا دور قیامت رکھے

ذی لیاقت بہت افضال الٰہی سی ہے
بامروت بہت افضال الٰہی سی ہے

اہل ہمت بہت افضال الٰہی سی ہے
اور غیرت بہت افضال الٰہی سی ہے

کتنا خوش وضع ہی بانکا میرا مرشدزادہ
فہم وجرات میں ہی یکتا میرا مرشدزادہ

اور اس چرخ ستمگار کے سنئے نیرنگ
شاہ غربت زدہ پر دیکھئے بیداد کے ڈھنگ

ایسا پروردۂ ناز و نعم اور قید فرنگ
بوی گل سی بھی جو ہو جان نزاکت دل تنگ

مثل بلبل وہ گرفتار قفس میں ہو جائے
نود جو حاکم ہو وہ یوں غیر کے بس میں ہو جائے

ہر برس سینکڑوں خنجر لئے ہوں جسکی طیار
ایک ٹٹی کا وہ حکام سے ہو شکر گذار

برف کا جسکے غلاموں کے ہو گھر گھر انبار
آٹھ سیر اوسکو کرے برف عنایت سرکار

کیا کہوں حال میں اسوقت کہ ہی کیا میرا
شق ہوا جاتا ہی اس غم سی کلیجا میرا

کیا کروں نقل میں اس ماہ کی بربادی کو
یوں اُجڑتے نہیں دیکھا کسی آبادی کو

دیکھنا ساری نکوہشوں کی ناشادی کو
گھر لٹا مال لٹا شہر لٹا وای نصیب
ہائے اللہ سوا تیرے کہوں اب کس سے
درد دل آہ سوا تیرے کہوں اب کس سے
وقت بد میں کوئی بے تیرے مددگار نہیں
مجکو آنکھوں سے دکھائی یہ مقدر ساماں
اور میں اُسپہ تصدق نکروں دولت جاں
سخت جاں مجسا زمانہ میں نہ ہوگا کوئی
پیچھلے میرے مسافر کو جو ہیں کرکے اسیر
یہی فریادی کی ہوتی ہی جہانمیں توقیر
ایک نے رحم غریب الوطنی پر نکیا
پھر تو اوسوقت زن و مرد میں تھا اک کہرام
ہوشمیں اپنی نہ تھی خاص سے لیکر تا عام
غل تھا پردیسیں ہم آکے ہوئے صد افسوس
غرض اُسدن سے یہی رہتی تھی باہم تقریر
نکلے آخر کو اس امید میں ہم بے تاخیر
بیخطا سات مہینے تو گرفتار رہے
فضل سے اوسکے جو ہیں ہمنے رہائی پائی
جبکہ خالی نظر آرا مگر شاہ آئی
اُسی وحشت میں دم اُلٹا جو کئی بار اپنا
جب وطن میں ہمیں غربت سے مقدر لایا
شدت درد جدائی نے تو قہر اک ڈھایا
چوک ویران گلی کوچہ میں سناٹا ہے

قید کرتا ہی کوئی بھی کہیں فریادی کو
ماں چھٹی بھائی چھٹا دیس چھٹا وای نصیب
غم جانکاہ سوا تیرے کہوں اب کس سے
تو ہے آگاہ سوا تیرے کہوں اب کس سے
تجسا ہم بیکسونکا کوئی طرفدار نہیں
میرا یوسف مرے آگے ہوا اسیر زنداں
صدمۂ درد جدائی سے رہوں سینہ زناں
زن رہتا نہیں ان صدموں میں اصلا کوئی
خود ہی پوچھا کہ کوئی جرم مرا کچھ تقصیر
واقعی میری اطاعت کی یہی تھی تعزیر
دھیان کچھ اپنی بھی پیمان شکنی پر نکیا
صورت ماہی بے آب تڑپتے تھے غلام
زندہ در گور تھی ارباب محلات تمام
قدم شاہ سی غربت میں چھٹے صد افسوس
اپنے مالک کے رہائی کی کرو کچھ تدبیر
ہوگئے راہ ہی میں خوبی قسمت سی اسیر
اپنے خالق سے رہائیکے طلبگار رہے
اُسی غمخانی میں تقدیر ہمیں پھر لائی
نرہا آپ میں پھر اپنا دل سودائی
پیچھلا گھر کیطرف کو یہ دل زار اپنا
دل یہاں آکے وہاں سے بھی سوا گھبرایا
شہر کا ہمنے عجب رنگ کچھ آکر پایا
شہر سارا دل بیکس کیطرح سونا ہے

نہ وہ چہلیں نہ وہ دھومیں نہ وہ چرچے باہم
ایک جا بیٹھے ہوئے دو کو نہ دیکھا خرّم

شہر کے لٹنے کا کرتا ہے زمانہ ماتم
واسطے ملک کی غربت کا ہے ایک ایک کو غم

بند دروازے کئے بیٹھے ہیں ارباب نشاط
خستہ و برہم و درہم ہیں سب اسباب نشاط

تین حصے سے جو اشہر کہ ہوا پایا تمام
جسطرف دیکھو نظر آتا ہے ایک ہو مقام

مہروش سیکڑوں رہتی تھی جہاں گرم خرام
ٹھوکریں کھا کے بشر چلتے ہیں اُسجا ہر گام

اجنبی ہو گئے ایسے یہ بھٹک جاتے ہیں
ساکن شہر تلک راہ نہیں پاتے ہیں

ہو نہ اسطرح کوئی شہر الٰہی تاراج
لکھنو والے ہوئے جیسے تباہ و محتاج

جنمیں شاہی کوئی کرتا تھا ہمیشہ کوئی راج
اُن مکانوں کے نشاں ڈھونڈو تو ملتے نہیں آج

بستیاں ایسی اُجڑتی نہیں دیکھیں ہمنے
قسمتیں ایسی بگڑتی نہیں دیکھیں ہمنے

برسا کرتا ہو شب و روز جہاں پر کنجن
اُن محلات میں ہوں زاغ و زغن کی مسکن

کوٹھیاں یوں ہوں سجی جیسے کہ اک شبکی دلہن
خس و خاشاک کے ہوں ڈھیر وہاں سیکڑوں من

جو نہ دیکھا تھا ان آنکھوں نے دکھایا ہمکو
نہ سُنا تھا سو وہ کانوں نے سنایا ہمکو

جس جگہہ کل تک ان آنکھوں نے یہ سامان دیکھا
جا پڑی آنکھ جدھر ایک پرستان دیکھا

جسکو دیکھا صفت گل اُسے خنداں دیکھا
آج اُجڑا ہوا ہمنے وہ گلستان دیکھا

سبق دفتر آرام نہ زنہار پڑھو
آیۂ فعتبروا یا اولی الابصار پڑھو

کثرت لالہ و گل سے جو ہو مملو گلزار
عندلیبوں کو قدم رکھنا ہو جن شاخوں پہ بار

زر گل روز لٹاتی ہو جہاں باد بہار
ہر چمن میں ہوں وہاں برگ خزاں کے انبار

جا بجا گل خار ہوں باغی عوض گلچیں ہوں
بدلے سرخی کے لہو سے روشیں رنگیں ہوں

لکھنؤ ایسی تباہی کے سزاوار نہ تھا
اور عشرت کدہ ایسا کوئی زنہار نہ تھا

یوں کبھی جان سے اپنی کوئی بیزار نہ تھا
اسطرح موت کا ہر ایک طلبگار نہ تھا

ان بلاؤں سے تو واقف بھی غمدیدہ نہ تھے
ایسی آفت زدہ ایک یہ ستمدیدہ نہ تھے

یہی سرکار وہ پارس تھی جو چھو جاتا تھا
چار ہی دنمیں اُسے مال یہ ہاتھ آتا تھا

خوبی بخت سے توقیر بھی یہ پاتا تھا
کبر سے ایک کو خاطر میں نہ وہ لاتا تھا

روز سامان نئے سبکو نظر آتے تھے
دم میں بنتے تھے کئی کتنے بگڑ جاتے تھے

اور اقلیموں کے لوگونکی طبیعت یہ کہاں
آدمیت یہ مروت یہ حمیت یہ کہاں

پاسداری و وفاداری و ہمت یہ کہاں
جرات و غیرت و اخلاق و محبت یہ کہاں

کہیں یہ وضع ہی اور طرز لباس ایسا ہی
کہیں انسان کا کوئی قدر شناس ایسا ہی

کہیں جانباز و نمودار جوان ہیں ایسے
ٹھاٹھ امیرونکے سواری کے کہاں ہیں ایسے

کس جگہ اہل زباں سحر بیاں ہیں ایسے
نہ کہیں ایسے کہیں ہیں نہ مکاں ہیں ایسے

اہل ثروت کا تجمل یہ کہیں اور بھی ہی
اہل ہمت کا توغل یہ کہیں اور بھی ہی

یہ لگاوٹ یہ بناوٹ یہ زباں پیاری ہی
یہ تراش اور یہ خراش اور یہ طرحداری ہی

آشنا پروری و دوستی و یاری ہے
یہ یہی شہر ہے جسمیں کہ یہ غمخواری ہے

مارے غیرت کے تو خود فاقہ کیا کرتے ہیں
آشناؤنکے کہلانے پہ مگر مرتے ہیں

یہی وہ گھر تھا غلام اسکا جو کہلاتا تھا
جس جگہ جاتا تھا تو قیر بڑی پاتا تھا

اک جہاں اوسکی زیارت کے لئے آتا تھا
جانکر فخر ہر اک آنکھونپہ بٹھلاتا تھا

ہای کیا قہر یہ ڈھایا ہی سپہر دوں نے
ہاے کیا شہر مٹایا ہی سپہر دوں نے

ایسے ہر فن کی کہیں اہل کمال اور بھی ہیں
امرا کی کہیں یہ ٹھاٹھ ہیں یہ دور بھی ہیں

سارے دنیا میں ملاقات کی یہ طور بھی ہیں
مہ جبینونکی یہ طرز ستم و جور بھی ہیں

ایسی ہر بات میں ایجاد کہیں ہوتے ہیں
ایسے ہر علم کی اوستاد کہیں ہوتے ہیں

ایک اس گھر کے بگڑنے سے زمانہ بگڑا
لکھنؤ شہر اجڑنے سے زمانہ بگڑا

جانعالم کی بچھڑنے سے زمانہ بگڑا
بدمعاشوں کے بھی لڑنے سے زمانہ بگڑا

جو جو عشرتکدہ تھا آج وہ غم خانہ ہی
گنج لٹتے تھی جہاں اب وہیں ویرانہ ہی

جسگھڑی ہوتا ہی اس تازہ خرابی پہ گذر
یہ گماں کرتا ہے ہر ایک ستم دیدہ بشر

نہیں اوڑتا ہی یہ سڑکونپہ غبار آٹھ پہر
فرقت شہ میں زمیں شہر کی ہے خاک بسر

دلپہ صدمے جو گذرتے ہیں وہ سب سہتے ہیں
باغ شاہی میں سڑک دیکھکے یہ کہتے ہیں

چھٹ گیا ہی جو شہ داد گر قیصر باغ
شق ہوا ہی یہ الم سے جگر قیصر باغ

نہر کو کہتے ہیں سب چشم تر قیصر باغ
چشم حیراں کیطرح واہی در قیصر باغ

جای گل خار مغیلاں ہیں عجب ساماں ہے
باغباں آفت تازہ ہے خزاں دربان ہے

خاص بازار کی صورت نہ خدا اب دکھلائے
یا تو اک خلق زیارت کے لیے جسکے آئے

حسن میں مصر کا بازار بھی جس سے شرمائے
راہ چلتے ہوئے یاد انکو وہاں ہیبت چھائے

جلسہ ہر روز جہاں ناچنے والونکا ہو
اس جگہ رات کو ہنگامہ شغالونکا ہو

زرد کوٹھی کے وہ آگے کی گجر دم صحبت
کہ نہ تھی بزم سلیماں سے وہ کچھ کم صحبت

نور کے لوگ وہ جو شاہ کے تھے ہم صحبت
چرخ بیمہر نے یوں کر دی وہ برہم صحبت

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

رس منزل کو وہ جلسے وہ مزے آٹھ پہر
جسکی آراستگی قصر جناں سے بہتر

نشۂ حسن میں سرشار ہر اک رشک قمر
ناچ گانے کے تماشے ہی میں ہوتی تھی بسر

کر دیا تھا مئے عشرت نے یہ مدہوش ہمیں
فکر کونین کی رہتی تھی فراموش ہمیں

وہ ہوادار پہ سلطان ملائک منظر
مثل خورشید درخشندہ جمال انور

جگمگاتے ساتھ وہ خوباں جہانکے اکثر
جیسے گل بلبلوں میں اور ستاروں میں قمر

داخل اسطرح سے ہوتے تھے پریخانوں میں
ہائے اب ذکر ہیں ان جلسونکے افسانوں میں

دو گھڑی دن سے وہ بھی یہ حسیناں جہاں
صورت تخت سلیماں چمنستاں میں رواں

ہائے اللہ یکایک یہ ہوا کیا سامان
نہ وہ گل ہے نہ وہ بلبل نہ چمن نے وہ سماں

یہ گلستاں تو نہ تھا جور خزانکے قابل
نغمہ سنج اسکی نہ تھی شور و فغانکے قابل

شہر کو میرے نظر کھا گئی کس کی یارو
ہائے ہونسا تھا یہ کس اہل حسد نے اسکو

نام کو اسکا نشاں رہگیا باقی اب تو
وصف اس معدن اوصاف کی کیا پوچھتے ہو

ہفت اقلیم میں تو شہر نہیں ایسا تھا
واقعی سچ ہے طلسمات کا یہ خطا تھا

دلخراش ایسی الٰہی کوئی روداد نہ ہو
اسطرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو

مدعی ایسا سپہر ستم ایجاد نہ ہو
کسی بیجرم پہ دنیا میں یہ بیداد نہ ہو

ایسی سرکار کسیکی نہ لٹے دنیا میں
یوں وطن سے کوئی اپنے نہ چھٹے دنیا میں

ای شہ کشور الطاف و عطا میں صدقے
ای مہ برج عنایات و سخا میں صدقے

ای نہالِ چمن صدق و صفا میں صدقے
ای میری جرم بیجرم و خطا میں صدقے

مجھکو پھر آنکھوں دکھلا ای خدا اوج وہی
سلطنت کا وہی سامان ہو پھر فوج وہی

لکھنؤ آپ کا اب بیکس و بیحالی ہے
چرخ نے آہ مصیبت یہ نئی ڈالی ہے

گھر و دولت پہ نہ نوبت ہی نہ گھڑیالی ہے
قصر و گلزار کی بربادی و پامالی ہے

جس جگہ آگے پریزادوں کا مجمع دیکھا
کچھ عجب رنگ کا آکر وہ مرقع دیکھا

شہر میں گاتا ہے جب کوئی بدیسی بالم
ساری عالم کا عجب ہوتا ہی اسدم عالم

روتے روتے کہیں ہو جاتا ہی کوئی بیدم
کوئی کہتا ہی نثار ای میرے جان عالم

دم اب آنکھوں میں ہی دیدار دکھاؤ آکر
اپنا اجڑا ہوا یہ شہر بساؤ آکر

منتیں مانیں گئی ہیں یہ ہوا خواہوں میں
چلے باندھے ہیں پریزادوں نے درگاہوں میں

اثر اللہ عنایت کرے ان آہوں میں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جا جا کے تمہیں راہوں میں

جس گلی کوچے میں گذر وہی جرچاس لو
جسکا دکھ پوچھو یہی اوسکی تمنا سن لو

ایک عالم ہے خریدار مرے یوسف کا
رات دن گرم ہے بازار مرے یوسف کا

لکھنؤ بھر ہے طلبگار مرے یوسف کا
ہی ہر اک طالب دیدار مرے یوسف کا

میں ہی مرتا نہیں کچھ اس بت لاثانی پر
جان عالم کی نکلتی ہی مری جانی پر

جوگنیں آپ کی اک جوگ لئے بیٹھی ہیں
سر پہ کھیلے ہوئے ہیں جان دئے بیٹھی ہیں

سر بصحرا ہوں یہی عزم کئے بیٹھی ہیں
چاک دل سوزن مژگاں سے سئے بیٹھی ہیں

دو کسی روز کسی جا جو بہم ہوتے ہیں
کیسا آپس میں گلے ملتے ہیں اور روتے ہیں

منہ لپیٹے ہوئی دن رات پڑے رہتی ہیں
شدتیں درد جدائی کی بہت سہتی ہیں

ضبط غم کرتے ہیں کچھ منہ سے نہیں کہتی ہیں
دونوں آنکھیں صفت بحر رواں بہتی ہیں

واقعی درد جدائی بھی بلائی بد ہے
اسمیں ایذائی غم و رنج و الم بیحد ہے

ٹھیرا ای دیدۂ گریاں کہ شگون بد ہے
دیکھ چپ رہ دل نالاں کہ شگون بد ہے

کیا کریں چاک گریباں کہ شگون بد ہے
بال کیونکر ہوں پریشاں کہ شگون بد ہے

وہ دم اللہ زمانے میں سلامت رکھے
قائم اس نام کو تا روز قیامت رکھے

جلد اللہ بدیسی کو ہمارے لائے
پھر ہمیں چاندسی صورت وہ کہیں دکھلائے

چین اُسوقت کچھ اپنا دلِ نالاں پائے
یہ مصیبت غم فرقت کی کہیں کٹ جائے

زیب پہلو جو ہماری وہ گلِ رعنا ہو
گرم آغوشِ تمنا ہو جگر ٹھنڈا ہو

یاد آتا ہی وہ اے یار اکڑ کر چلنا
بانکپن سو دمِ رفتار اکڑ کر چلنا

شیر کی طرح وہ ہر بار اکڑ کر چلنا
لیکے وہ ہاتھ میں تلوار اکڑ کر چلنا

بانکی ٹوپی کی ادا یاد جب آجاتی ہی
ایک برچھی سی کلیجے پہ لگا جاتی ہی

اتنے میں پڑ گئی اک دھوم مبارک ہوے
شاد ہوں جو کہ ہیں مغموم مبارک ہوے

یاوری پر ہوئی مقسوم مبارک ہوے
وصل اونہیں جو کہ ہیں محروم مبارک ہوے

یوسفِ مصر اودہ قیدِ محن سے نکلا
آفتابِ فلک ہند گہن سے نکلا

منتیں لوگ بڑھائیں کہ مراد آج آئی
حق نے عشاق کی تاثیر دعا دکھلائی

تازگی کشت تمنائی جہاں نے پائی
غمزدونکو یہ عجب خوب شجر ہی سنوائی

سوئے درگاہ خدا سجدۂ شکرانہ کیا
کس مسرت سے ادا سجدۂ شکرانہ کیا

کہیں صحنک کہیں کونڈی ہوئی مشتاقوں میں
گلگلے جاکے بھری سجدونکے طاقوں میں

عید صلت ہوئی غمخوار ایکی مشتاقوں میں
مجلسیں سیکڑوں محتاجوں نے کیں طاقوں میں

دونے دینی کی ہوئی رسم ہوا خواہوں میں
سیکڑوں حاضریاں چڑھ گئیں درگاہوں میں

کوئی یہ مژدۂ جاں بخش جو ہم تک لایا
اوسنے اعجاز مسیحا کیطرح دکھلایا

دم اوسیدم تن مردہ میں ہمارے آیا
دل بیتاب نے ہمکو یہ قلق سمجھایا

رخ تم اب اپنا سوِ قبلۂ حاجات کرو
یہ دعا دل سے پئے خسرو خوشذات کرو

کہ الٰہی پئے توقیر امام معصوم
پھر پئے آئی شاہ شہدائی مظلوم

اور از بہر جگر سوزئے طفل معصوم
از پئے عصمت و اعزاز جناب مکتوم

تو مرے شاہ کو سلطان اودھ پھر کردے
فقط
دُرِ مقصود سے دامانِ تمنا بھر دے

قند پارسی | فارسی کا فصیح و بلیغ ماہوار رسالہ۔ عمدہ کاغذ پر خوشخط۔ قدیم و جدید نظم و نثر فارسی کا نمونہ اور اخبارات ایران و مصر کا انتخاب صرف اسی رسالہ میں ملسکتا ہی۔ قیمت عہ سالانہ مع محصول۔ حجم ۲۰ صفحے۔
المشتہر دفتر قند پارسی علی گڈھ۔

نیشنل کانگرس کا اکیسواں اجلاس

بمقام بنارس ۲۷-۲۸-۲۹-۳۰ کو بخوبی تمام منعقد ہوا یعنی اس سال کثرت کار کی وجہ سے ۳۰ دسمبر کا نصف دن اور کانگرس کے

کانگرس کی کامیابی | بمبئی کانگرس کی غیر معمولی کامیابی کے بعد اسکے مقابلے میں لوگوں کو بنارس کانگرس کی کم شاندار نظر آنے کا اندیشہ تھا اور بیجا نہ تھا اسلئے کہ اول تو اہل بنارس کے لئے اتنے بڑے جلسے کے سرانجام انتظام کا یہ پہلا ہی موقع تھا دوسرے یوں کہ پولیٹکل معاملات میں اس صوبے کے باشندوں کی کم توجہی سے مالی امداد کے ناکافی ہونیکا بھی خیال تھا لیکن ان سب دقتوں اور خطروں کے باوجود کانگرس کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ تائید ایزدی اس پاک قوم کے شامل حال ہے۔

کانگرس کا انتظام | آنریبل منشی مانہو لال اور استقبالیہ کمیٹی کے بنارسی ممبروں نے ڈیلیگیٹوں کے خورد و نوش و قیام کا اچھا بندوبست کیا تھا۔ اور تمام اشیاء ضروری کا ذخیرہ کافی سے زیادہ موجود تھا۔ اور ایک خاص چیز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی بڑی برات کا انتظام کیا گیا ہے چنانچہ ابتدا میں برات کے دستور کے مطابق بعض لوگوں کو والنٹیروں کی ناتجربہ کاری کے باوجود ہونیکے کچھ تیوری میں بل ضرور پڑی لیکن یہ شکایت بہت جلد رفع ہو گئی۔ البتہ ایک شکایت باقی رہی وہ یہ کہ مختلف صوبوں کے ڈیلیگیٹوں میں ملاقات باہم کی کوئی سبیل نہ نکالی گئی اور کانگرس کے اجلاسوں کی شرکت یا نمائش کی بڑی بڑی سیکڑوں عدد لوگوں کو پرائیویٹ ملاقات ذاتی وقفیت اور تبادلہ خیالات کا بہت کم موقع ملا۔ امید ہے کہ آئندہ اس امر کا خاص لحاظ رکھا جائیگا۔

بنارس کانگرس کے خصوصیات | اس سال لوگوں کی تقریروں اور چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ لارڈ کرزن کی گزشتہ جبری حکومت نے اہل ہند کے دلوں پر قومی اثر ڈالا ہے اور ہر شخص کے دل کو بلند ہمتی اور استقلال سے لبریز کر دینے کے علاوہ بوشیدہ طور پر میدان عمل میں دلیری کی ہمت بھی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ انڈسٹریل کانفرنس کا انعقاد اور نمائش کانگرس میں تقریباً کل سنسنی خیز اشیاء موجودگی اس خیال کی بزبان حال بڑے زور سے تائید کرتی نظر آتی تھی معلوم نہیں کہ کتنے ہی پیر لوگ اس نظارہ روح افزا سے متاثر ہو کر پست خیال سے بلند خیال ہو گئے ہونگے اور کتنے افسردہ دل جوش اور امید کے جذبوں سے مالا مال ہو کر آزادی و خدمت ملک کو اپنا ایمان سمجھنے لگے ہونگے۔

حب وطن اور ولولہ محبت کا ایک عجیب عالم کانگرس پنڈال میں نمایاں ہوتا ہے اور اس عالم سرور کی آب و ہوا میں قلوب احرار کو جو لذت عنقریب میں حاصل ہوتی ہے وہ دوسرے طور پر برسوں بلکہ عمروں میں بھی نہیں فراہم ہو سکتی۔

عہد یک عمر فراغت سے بھی بہتر گذرا	وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہمپر گذرا

دوسری قابل مسرت اور لائق لحاظ خصوصیت مسلمانوں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی معمول سے زیادہ شرکت تھی جسمیں انشاء اللہ تعالیٰ روز افزوں ترقی ہوتی رہیگی کیونکہ ایک بار کانگرس میں شریک ہو کر سبجکٹس کمیٹی کی دلچسپی لائق مضامین تقریروں کو سنکر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کیونکر کوئی شخص کانگرس سے علیحدہ رہنا گوارا کر سکتا ہے۔

کانگرس کی اسپیچیں | مسٹر گوکھلے کا اڈریس تمام ضروری معاملات پر حاوی اور اپنی جامعیت۔ سنجیدگی اور سادگی کے لحاظ سے لاجواب تھا۔ دوسری اسپیچوں میں مسٹر کھاپرڈے کی ظرافت مسٹر بنرجی کی فصاحت لالہ لاجپت رائے کی آزادخیالی و بیباکی۔ مسٹر براینا آئر کی معلومات۔ مسٹر دت کی متانت۔ مسٹر تلک کی صاف گوئی و صداقت مسٹر غزنوی کا جوش۔ مسٹر کرشنا سوامی آئر کی ذہانت، پنڈت مدن موہن مالوی کی روانی بیان اور ملا عبدالقیوم صاحب کے زور تقریر و بلاغت کو حاضرین نے خاص طور پر پسند کیا | کانگرس کا آخری سین نہایت پر اثر اور درد انگیز تھا جبکہ مسٹر گوکھلے کی آخری اسپیچ اور کانگرس کے ختم ہونے کے افسوس کی موجودگی میں مسٹر گھوشال کی صاحبزادی یعنی مسز دت چودھری نے "بندے ماترم"

کا بنگالی ترانہ ہارمونیم پر ایسی پر اثر آواز میں گا کر سنایا کہ کانگرس کے حاضرین میں سے اکثر آبدیدہ نظر آنے لگے اور کلکتے میں دوبارہ ملنے کی امید پر با دیدۂ پرنم کانگرس سے رخصت ہوئے۔

کانگرس کی بے اصول مخالفت افسوس ہے ان بعض مسلمانوں پر جو کانگرس کی بے اصول مخالفت کرتے ہیں۔ بے اصول اسلئے کہ محض افواہی یا اپنی ایجاد کردہ واقعات پر اعتراض کرکے اپنی فرومائگی اور ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں ثابت کرسکتے۔ ایک متعصب اخبار نے سودیشی تحریک کا رزولیوشن پاس کرنیکے لئے کانگرس کو گالیاں دیں اور ایک اس سے بھی زیادہ ناواقف اخبار نے سرحدی صوبہ پنجاب کی علیحدگی پر افسوس کے رزولیوشن پر مضحکہ اڑایا حالانکہ انمیں سے ایک بھی تجویز بنارس کانگرس میں پیش نہیں ہوئی تھی۔ نیز اول الذکر اخبار نے مسلمان شرکاء کانگرس کو محض تماشائی قرار دیا اسکا جواب ہم اسوقت کچھ نہ دینگے۔

خدا نے چاہا تو بہت جلد ان اخبار نویسوں کو اپنی غلط بیانی پر شرمندہ ہونا پڑیگا غیر حاضران کانگرس کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے اور ان تہی مغز خوشامدیوں کی آوارہ بیانی کی پروا نکرکے انہیں تعصب کی آگ میں جلنے دینا چاہئے۔ ان ناقابل اخبار نویسوں سے گزر کر افسوس ہے کہ ہمکو ان چند فہمیدہ اور متین معترضین کانگرس کی منطق بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی جنکا دعوی اس کمزور دلیل پر قائم ہے کہ چونکہ بعض معاملات میں ہنود اور اہل اسلام میں اختلاف ہے اسلئے ان دونوں گروہوں کو ہر معاملے میں اختلاف رکھنا چاہئے۔ ہم ان سادہ دل لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ جب از روئے تجربہ دو شخصوں میں اتحاد خیالات و اغراض بدیہی امر نہیں ہوتا تو دو قوموں میں کیونکر ممکن ہے۔ اور جب یہ حال ہے تو کیا اصول پالٹکس کا اقتضا یہ نہیں ہے کہ جن معاملات میں دونوں گروہوں کے اغراض متحد ہوں کم از کم انکے متعلق دونوں متفق ہوکر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اور کیا یہ غایت درجے کا اخلاقی اور ملکی جرم نہیں ہے کہ چند اختلافی مسائل کو بہانۂ نفاق قرار دیکر ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانے کی اہم اور ضروری تجویز میں رخنہ اندازی کرکے ہندوستانکے دشمنوں کو قوت پہونچائیں درانحالیکہ اس ناگوار عمل سے انہیں من حیث القوم کسی خاص فائدے کی خود بھی امید نہو۔

رفع اختلاف کی ضرورت ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جزوی اختلاف کی بنا پر کلی اختلاف کی صلاح کسیطرح دانشمندانہ نہیں کہی جاسکتی تاہم حتی الامکان غیر ضروری جزوی اختلافات کے مٹانے کی بھی کوشش ضرور کرنا چاہئے۔ یعنی اسطور پر کہ مثلاً لالہ لاجپت رائے صاحب اپنے مذہب آریا اخباروں کو مذہبی جنگ سے روکیں اور نرمی کا سبق دیں اور خلاصتہً بجوبہ حالت مسلمان اخبار نویسوں کو سمجھائیں کہ محض ہنود سے اختلاف کرنیکی غرض سے وہ سودیشی تحریک کی سی مفید اور چلتی ہوئی تحریک میں بعذر ہائے لنگ و نامعقول رکاوٹ پیدا کرنے سے باز آئیں۔ اگر ہندو اخبار کم از کم "ہندوستانی" اخبار کی پالیسی اختیار کریں اور مسلمان اخبار پیسہ اخبار کو نمونہ قرار دے لیں تو وہ اپنی قومی حقوق کی حمایت برقائم رکھ سکیں دوسری قوموں کی دلازاری سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ چند روشن خیال مسلمان جو ابتک کانگرس میں شریک نہیں ہیں مثلاً حاجی موسیٰ خانصاحب سیٹھ تاولی اور شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی مستند پیشوایان کانگرس مثلاً سر فیروزشاہ مہتا سر گوکھلے اور مسٹر ٹلک سے پرائیویٹ طور پر ملیں تو ہم کو قطعی یقین ہے کہ انکے دلوں سے کانگرس کی جانب سے تمام شکوک ان فرشتہ خصال بزرگوں کی صاف دلی اور بے تعصبی کے اثر سے خود بخود محو ہوجائیں اور مسلمان بلا حظر کانگرس میں شریک ہوجائیں۔

ایک اور تجویز اتحادی اگر معترضین کانگرس صادق القول اور راست بیان ہیں تو انکے لئے یہ طریق مناسب ہے کہ اختیار موجودہ سے کہ اختلافی مسائل نیز معاملات مخصوص بہ اسلام کیلئے محمڈن پولٹیکل کانفرنس قائم کریں اور متفق علیہ مسائل میں کانگرس کا ساتھ دیں۔ لیکن اگر یہ بات بھی منظور نہیں تو ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ مخالفین کانگرس انکو نقصان پہونچانیکے علاوہ اپنے ناداں ہمقوموں کے فوائد کو بھی بطور ہیچ پامال کر رہے ہیں۔ خدا انہیں راہ راست پر لائے۔ آمین۔

خاتمہ سالگزشتہ کیلئے بنارس کانگرس کی مفصل رپورٹ بھی آیندہ نمبر ملاحظہ اردو میں ملی ہوگی اسموقع پر ہم تمام رزولیوشنوں کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ مع اسمائے مقررین درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

رزولیوشن ۱
حضور ولیعہد بہادر کا خیر مقدم

یہ کانگرس بہ حیثیت قائمقام تمام اقوام گروہ اور فرقہ ہائے رعایائے ہند کو ویسرائے ہائنس شاہزادہ اور شاہزادی جارج ویلز کے ورود ہند پر اپنا ناچیز اور خیر خواہانہ خیر مقدم عرض کرتی ہے۔ ویسرائے ہائنس نے باشندگان ہند کی نسبت جس لطف آمیز خوش خیالی کا اظہار فرمایا ہے کانگرس نے اسکا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ جو ذاتی معلومات اس سفر میں حاصل ہوئی ہیں انسے اس مربیانہ توجہ میں جو باشندگان ہند کیطرف مبذول ہے اور ترقی ہوگی کانگرس بہت جوش کیساتھ یہ امید رکھتی ہے کہ ویسرائے ہائنس ازراہ مرحمت اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہند کے جناب میں اس کانگرس کی دلی التجا پیش کرینگے کہ جو اصول حکمرانی ملکہ مرحومہ کے اعلان میں قائم کئے گئے ہیں وہ اس ملک کی گورنمنٹ میں داخل کئے جائیں۔

صاحب پریسیڈنٹ اس رزولیوشن کو بذریعہ تار ویسرائے ہائنس کے حضور میں ارسال کریں۔

رزولیوشن ۲
لیجسلیٹو کونسل.....

اس کانگرس کی رائے میں وہ وقت آگیا ہے کہ سپریم اور پراونشل کونسلوں میں اصلاح کیجائے تاکہ وہ ملک کا بہتر نمائندہ ہو سکیں اور غیر سرکاری ممبر ان کو معاملات ملکی میں واقعی اور حقیقی مداخلت حاصل ہو۔ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ غیر سرکاری اور منتخب ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے اور انہیں اختیار دیا جائے کہ ان سوالات پر جو انکے روبرو پیش ہوں کونسل کو اظہار رائے پر مجبور کر سکیں۔ حاکم اعلیٰ مجاز ہو کہ کونسل کے فیصلہ کو مسترد کر دے۔ مجوزہ آنریبل مسٹر جے چودھری (کلکتہ) موید۔ مسٹر کوبندر گھوا آیر (مدراس) مسٹر آر۔ پی۔ کرندکار (ستارہ)

رزولیوشن ۳
آبکاری کی پالیسی...

الف۔ یہ کانگرس گورنمنٹ ہند کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اسنے مختلف صوبوں کے انتظام آبکاری کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ مگر ساتھ ہی کانگرس کو افسوس ہے۔ کہ اس کمیٹی کے کل اراکین سرکاری ہیں، اسلئے عوام کا پورا اعتبار اسپر نہیں ہو سکتا۔

(ب) یہ کانگرس سابق کانگرس سے متفق الرائے ہو کر اپنا پختہ یقین ظاہر کرتی ہے کہ آبکاری کی انتظام میں قابل اطمینان اصلاح کے مقدم شرائط یہ ہیں کہ شخصی انتظام کو کل ہو اور شراب کی موجودہ دکانوں میں کمی کیجائے۔

(ج) یہ کانگرس گورنمنٹ ہند سے باادب درخواست کرتی ہے کہ سالگرہ شدہ جو یادداشت سر فریڈرک لی نے انتظام آبکاری کے متعلق پیش کی تھی اسکے خاص تجاویز پر فوری کارروائی کرنا بہت پسندیدہ ہوگا۔

(د) یہ کانگرس اس امر پر اعتراض کرتی ہے کہ گورنمنٹ ہند نے اپنے عاملانہ اختیار سے بنگال کونسل کے منسوخہ

قانون آبکاری کو جو شرابخواری کو کم کرنیکے لئے مفید اور ترقی پذیر قانون تھا معطل کردیا۔ اور اسطرح اسنے اس کا نسٹیٹیوشنل طریق عمل کو توڑ دیا جو پروونسل کونسل میں پڑتا جاتا ہی۔

مجوزہ۔ سر بہالچندر کرشن (بمبئی) موید۔ مسٹر جی۔ ای۔ نٹیسن (مدراس) مسٹر ایس۔ ایس۔ بہاٹیا (پنجاب)

رزولیوشن ۴ ہاوس آف کامنس اور کونسلوں میں ہندوستانی

اس کانگرس کی رای میں وقت آگیا ہی کہ باشندگان ہند کو ملک کی انتظام اور نگرانی میں زیادہ حصہ دیا جائے۔ اور یہ غرض اسطرح حاصل ہوسکتی ہی کہ

الف۔ ہندوستان کے ہر صوبے کو اختیار دیا جاوے کہ برٹش ہاوس آف کامنس میں کم از کم دو ممبر بھیجیں۔

(ب) کم از کم دو ہندوستانی جنکی لیاقت اور تجربہ مسلم ہو سکرٹری آف اسٹیٹ کی کونسل میں ممبر مقرر کیئے جائیں

(ج) گورنر جنرل کی اکزیکٹو کونسل میں دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوں اور اسیطرح گورنران مدراس اور بمبئی کی کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی مقرر ہو۔ مجوزہ۔ مسٹر جی۔ سبرمنیا ایر (مدراس) موید۔ مسٹر جہانگیر پیٹیٹ (بمبئی) مسٹر ایس۔ آر۔ داس (کلکتہ) مسٹر فضل الحسن (علیگڈھ)

رزولیوشن ۵ پبلک سروس میں ہندوستانی

(الف) اس کانگرس کی رای میں گورنمنٹ کی رزولیوشن مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۴ء میں، جو اصول ہندوستانیوں کو ملازمت گورنمنٹ میں اعلی عہدوں پر جانیکی پالیسی کی نسبت قائم کئے گئے ہیں وہ قانون پارلیمنٹ ۱۸۵۳ء اور اعلان ملکہ مرحومہ ۱۸۵۸ء کے خلاف ہیں یہ کانگرس مؤدب مگر پرزور اعتراض اس کوشش پر کرتی ہی جو بادشاہ اور پارلیمنٹ کے وعدوں کے زائل کردینے کے متعلق کی گئی ہے۔ اور جس سے اس انتظام کے مخالفت ہوتی ہی جو پبلک سروس کمیشن کے غور و فکر کے بعد گورنمنٹ نے قائم کیا تھا۔

(ب) اس کانگرس کی رای میں ملک کا موجودہ مالی اور انتظامی خرابیوں کا صحیح علاج یہ ہی کہ ملک کے اعلی خدمات پر ہندوستانی مقرر کئے جائیں۔ یہ کانگرس پچھلی کانگرسوں سے اتفاق کرتی ہے کہ ہاوس آف کامنس کے رزولیوشن جون ۱۸۹۳ء پر عملدرآمد شروع کیا جاوے جسکے رو سے سول سروس کا امتحان انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں ہونا قرار پایا ہی۔ مگر اس کانگرس کو پختہ یقین ہی کہ اس مسئلے کا قابل اطمینان حل صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہی کہ انڈین سول سروس از سر نو مرتب کیجاوے۔ اور اس اثنا میں جو ڈسکریشنل اختیارات ان لوگوں کو دیئے جائیں جنہوں

نے قانونی تعلیم حاصل کی ہو۔

(ج) یہ کانگرس گزشتہ کانگرس کی رائے سے اتفاق کرتی اور افسوس کرتی ہے کہ پراونشل سروس کے لیے امتحان مقابلہ توڑ دیا گیا۔ گزشتہ تجربات نے بتا دیا ہے کہ نامزدگی کا طریقہ ملک کی خاص حالات کے اعتبار سے سرکاری سرپرستی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ناقابل لوگوں کی ملازمت میں داخل ہو جانے کے سبب سے انتظام کی خوبی غارت ہو جاتی ہے اور اسطرح ہندوستانیوں کی قابلیت عہدہ ہائے جلیلہ پر الزام لگایا جاتا ہے۔ اسلئے کانگرس باادب گورنمنٹ ہند سے درخواست کرتی ہے کہ پراونشل سروس کے لئے امتحان مقابلہ پھر جاری کیا جائے۔ مجوز۔ مسٹر این۔ ایم۔ سمرتھ (بمبئی) موید۔ پنڈت بشن نراین در (لکھنؤ) مسٹر جے۔ سمین (الہ آباد)

رزولیوشن ۶ مالیہ ہند یہ کانگرس گورنمنٹ ہند کی اس کارروائی کی قدر کرتی ہے کہ اس نے گزشتہ مارچ میں بچت کا ایک حصہ ان امور پر صرف کیا جن کی کانگرس نے سفارش کی تھی۔ مگر ساتھ ہی کانگرس کی یہ رائے ہے کہ جو مالی سبکدوشی اداکنندگان ٹیکس کو دیگئی ہے وہ بہت ہی ناکافی ہے اور کانگرس کو افسوس ہے کہ گزشتہ بچت سے فائدہ اٹھا کر فوجی اخراجات بہت بڑھا دئے گئے ہیں بعض محکموں میں یوروپین افسروں کی تنخواہوں میں ترقی کی گئی ہے اور بہت سے نئے عہدے انکے لیے قائم کئے گئے ہیں۔ کانگرس باصرار یہ درخواست کرتی ہے کہ آیندہ جو بچت ہو اول وہ ٹیکسوں کے کم کرنے میں صرف کیجائے اور بعد ازاں ایسے کاموں میں صرف ہو جس سے بلاواسطہ باشندگان ہند کو فائدہ پہونچے مثلاً سائنٹیفک صنعتی اور زرعی تعلیمگاہوں کا قائم کیا جانا طبی امداد میں آسانی پیدا کرنا۔ منوسپل اور لوکل بورڈوں کو مدد دینا کہ اشد ضروری انتظامات حفظان صحت کی اصلاح اور ترقی وسائل آمد و رفت وغیرہ میں صرف کر سکیں۔ مجوز۔ مسٹر جی سبرامنیا آیر (مدراس) موید۔ راؤ بہادر آر۔ ان۔ مہولکر (امراوتی) بابو تھراداس (سندھ)

رزولیوشن ۷ اخراجات فوجی ہندوستان (الف) یہ کانگرس بہت وثوق سے اپنے اعتراض کا اعادہ کرتی ہے کہ فوجی اخراجات کی مسلسل ترقی، غیر ضروری، غیر منصفانہ اور باشندگان ہند کی حد برداشت سے باہر ہے۔

(ب) یہ کانگرس صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ اس ملک کی فوجی اخراجات صرف اسی ملک کے

فوج، ضروریات اور اغراض پر لحاظ کرکے قرار نہیں دیئے جاتے بلکہ مشرق میں برٹش تفوق اور برٹش پالیسی کی خیالات بھی مد نظر ہوتے ہیں، اسلئے انصاف یہ ہے کہ ایک مناسب حصہ اس خرچ کا خزانۂ انگلستان اور کل سلطنت کو برداشت کرنا چاہیے نہ یہ کہ سارا خرچ سلطنت کے ایک ہی حصے پر ڈالدیا جاوے جو سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ اس بوجھ کی برداشت کرنیکے ناقابل ہے۔

(ج) کانگرس یہ ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے کہ بوجہ صلحنامہ جاپان و روس اور عہدنامۂ گلستان و جاپان حالات مشرق کی صورت بدل جانیکے باعث، پندرہ ملین کا زاید خرچ جو فوجی تجدید کیلئے منظور کیا گیا ہے وہ اس غرض میں نہ خرچ کیا جائے۔ کیونکہ شعبہ ہائے تعلیم کی وسعت اور رعایا سے باٹیکس کے کم کرنیکی اشد ضرورت ہے۔ مجوزہ۔ مسٹر ایچ ای۔ واڈیا (بمبئی) موید۔ مسٹر وی۔ ریڈی نمبیر (مدراس) مسٹر بی۔ ان راناڈی (بمبئی) بابو کرشن بلدیو (لکھنؤ)

رزولیوشن ۸۔ (الف) یہ کانگرس اس سوم قانون پر اپنا اطمینان ظاہر کرتی ہے جو بغرض ترمیم قانون تارکان وطن دافع شکایات باشندگان ہند آسٹریلیا کی ہاوس آف کامنس میں پیش ہوا ہے۔ مگر ساتھ ہی کانگرس مکرر افسوس ظاہر کرتی ہے کہ ہز مجسٹی کی نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کو رعایائے انگریزی کے مولی حقوق بھی نہیں ملتے اور ذلت اور تنکیت کی حالت قائم ہے۔ یہ کانگرس خاص کر ٹرانسوال اور آرینج ریور کالونی کے ان قواعد پر جو بوروں کے وقت میں بھی نہ تھے اور اب ہندوستانیوں پر عاید کئے گئے ہیں، اعتراض کرتی ہے۔ باوجودیکہ ہز مجسٹی کے وزرا نے گزشتہ جنگ کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بیان کیا تھا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

(ب) یہ ظاہر ہے کہ نوآبادیوں کے ترقی میں ہندوستانیوں نے کسقدر حصہ لیا ہے۔ انکے ہاتھ سے ہندوستان اور کالونی دونوں کو کسقدر مالی فائدے پہنچے ہیں، انکی وفاداری اور امن و شفقت پسند عادات کسقدر مسلم ہیں، گزشتہ جنگ میں انہوں نے کیسی کارآمد اور جانباز خدمات انجام دیئے اور سب سے بڑھکر حکومت کے اس اصول کے لحاظ سے کہ برٹش سلطنت کے مقام پر تمام رعایا و ملک معظم کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوگا، یہ کانگرس باادب اور پرزور طور پر گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ انگلستان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ نوآبادیوں کی گورنمنٹ سے ہندوستانیوں کو حقوق دیئے جانے پر اصرار کریں اور اگر ضرورت ہو تو وہاں مزدوروں کا بھیجنا بند کردیں اور نیز دوسرے طریقے بدلہ لینے کی اختیار کریں۔ مجوزہ۔ مسٹر۔ وی۔ مدنجیت (اجمیر) موید۔ آنریبل مسٹر بے۔ ان۔ سرما (مدراس) ڈاکٹر بی۔ ایس۔ مونجی (ناگپور)

رزولیوشن ۹
عدالتہائے انصاف کا انتظام

الف - یہ کانگرس اپنی رائے کا اعادہ کرتی ہے کہ کمیٹی اختیارات کو جوڈیشل اختیارات سے پوری طور پر جدا کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

(ب) یہ کانگرس گزشتہ کانگرس سے متفق ہو کر یہ درخواست کرتی ہے کہ تمام ہندوستانی جوڈیشل عہدوں کے قانون پیشہ لوگ منتخب کئے جائیں کیونکہ موجودہ طریقہ یعنی سویلین کو بلا خاص قانونی تعلیم کے اعلیٰ جوڈیشل عہدوں پر مقرر کرنا مقدمات میں غیر قابل اطمینان ثابت ہوتا ہے۔ تجویز مسٹر آر سی دت۔ تائید۔ آنریبل مسٹر چمن لال سیتلواڈ (بمبئی) ڈاکٹر تیج بہادر سپرو (الہ آباد) بابو پرتاپ چندر

رزولیوشن ۱۰
اصلاح پولیس

یہ کانگرس اطمینان کے ساتھ دیکھتی ہے کہ بعض مفید اصلاحوں کی سفارش پولیس کمیشن نے کی ہے مگر پولیس سروس کی لیاقت اور دیانتداری کو حقیقتاً ترقی دینے کے لئے مناسب کارروائی نہیں کی گئی ہے۔ یہ کانگرس یقین رکھتی ہے کہ

(۱) پولیس سروس کے اعلیٰ عہدوں کے امتحانات مقابلہ تمام برٹش رعایا کے لئے یکساں کھولے جائیں اور صرف انگریز تک محدود نہ رکھے جائیں۔ نیز یہ کہ امتحان ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں ہو۔

(۲) پولیس کی حسن کارگزاری بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی بکثرت اعلیٰ عہدوں پر مقرر کئے جائیں۔ (۳) پراونشل سروس کا داخلہ بذریعہ امتحان مقابلہ کے ہو۔

(۴) حاکم ضلع جو پولیس کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے اُس سے جوڈیشل کام نکال لیا جائے اور ضلع کی مجسٹریٹی پر اسکا اختیار ہو۔ تجویز۔ مسٹر ایس۔ سنہا۔ (الہ آباد) تائید۔ مسٹر ونکٹارا او (مدراس) بابو ایشور سرن (گورکھپور) مسٹر نیدو۔ (مدراس)

رزولیوشن ۱۱
تقسیم بنگال

یہ کانگرس اس امر پر اعتراض کرتی ہے کہ تمام صوبہ کے ایسی سخت مخالفت کے باوجود تقسیم بنگالہ عمل میں لائی گئی۔ بدیں خیال کہ تمام بنگالی قوم میں انکے صوبے کے ٹکڑے کئے جانے کے سبب سے سخت ناراضی پھیلی ہوئی ہے اور وہ اس تقسیم کو کالعدم ہونے سے گریز کر رہے ہیں۔ یہ کانگرس گورنمنٹ ہند اور سکرٹری آف اسٹیٹ سے اپیل کرتی ہے کہ وہ موجودہ انتظام کو بدل دیں یا اسمیں کچھ ایسی ترمیم کریں کہ عام رائے کو طمانیت حاصل ہو اور جو اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ کم ہو۔ یہ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے انتظامی خوبی بھی قائم رہے اور تمام بنگالی قوم ایک ہی حکومت کے تحت میں رہے۔

مجوزہ۔ بابو سرندر ناتھ بنرجی (کلکتہ) موید۔ مسٹر ای۔ چودھری۔ رای بہادر سی۔ وی وادیا (بمبئی) مسٹر۔ ایس سنہا (الہ آباد) منشی ہدایت بخش (ڈھاکہ) مسٹر ابوالقاسم (بردوان) راؤ بہادر۔ آر۔ ان مدہولکر (امراوتی)

رزولیوشن ۱۲ بنگال میں جابرانہ کارروائی

یہ کانگرس اپنا سچا اور پُرزور اعتراض حکام کی ان جابرانہ کارروائیوں پر پیش کرتی ہے جو انہوں نے بنگال میں اختیار کی ہے۔ باشندگان بنگال کے پاس جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو انہوں نے غیر ملکی مال کے خلاف ہڑتال کی کیونکہ یہی ایک باضابطہ اور بااثر ذریعہ انکے پاس باقی رہگیا تھا جس سے وہ برٹش پبلک کے خیالات کو گورنمنٹ کی تقسیم بنگالہ کی مستحکم ارادہ کیطرف رجوع کرسکتے تھے جو اسنے باشندوں کی عالمگیر استدعا کے خلاف اختیار کیا تھا۔"

مجوزہ۔ آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد) موید۔ مسٹر واڈیا۔ آنریبل مسٹر واجی اباجی کھرے (بمبئی) مسٹر کرشنا سوامی آیر (مدراس) مسٹر ایم۔ ایچ۔ غزنوی (مین سنگھ)۔ مسٹر جی۔ اس۔ کھاپرڈے۔

رزولیوشن ۱۳ قرنطینہ

اس کانگرس کی رای ہے کہ جو پابندیاں زکاقرنطینہ حاجیوں پر بمبئی میں لگایا جاتا ہے وہ بلاوجہ کی زحمت ہے اور علاوہ وقت کے بے اطمینانی پیدا کرنیکا باعث ہے قانون بین الاقوام کے رو سے دس روز کا قرنطینہ کامران میں ہوتا ہے۔ اسلئے اس کانگرس کی رای ہے کہ جو قرنطینہ بمبئی میں ہے وہ یکقلم موقوف کیا جائے۔ مجوزہ۔ آنریبل مسٹر کاہن داس گوکل داس پارخ (بمبئی) موید۔ مسٹر علی محمد بھیم جی۔ (بمبئی) ملا عبدالقیوم (حیدرآباد دکن) مسٹر اس۔ کھرے (ناسک)

رزولیوشن ۱۴ بعض صوبوں کی شکایات

یہ کانگرس گزشتہ کانگرس سے متفق الرای ہوکر درخواست کرتی ہے کہ (۱) پنجاب ایک صوبہ بنایا جائے۔ (۲) ہندوستانی کونسلوں کے ایکٹ ۱۸۹۲ء کے رو سے پنجاب کے قانونی کونسل کی توسیع اور اصلاح کیجائے۔ (۳) پنجاب میں ہائیکورٹ قائم ہو۔ (۴) برائے قوانین گورنمنٹ ہند کے قانونی کونسل سے پاس ہوا کریں۔ (۵) صوبجات وسطی کے باشندوں کو اختیار دیا جائے کہ اپنا قائمقام کونسل ہند کے لئے منتخب کریں نہ یہ کہ اسے گورنمنٹ یا گورنر مقرر کرے۔ (۶) گورنمنٹ ہند کی محکمہ خارجہ کا رزولیوشن مورخہ ۲۵ جون ۱۸۹۱ء منسوخ کیا جائے جسکے رو سے ان مقامات اخباروں کی دلیلیں

بند کی گئی ہیں جو دیسی ریاستوں میں گورنمنٹ انگریزی کے زیر انتظام ہیں۔ از جانب صدر انجمن۔

رزولیوشن ۱۵ ہندوستان اور جنرل الکشن

یہ کانگرس مسٹر دادا بھائی نوروجی کی نازتہ لمبتہ کیجانے سے امید وار دی پارلیمنٹ کی بدل تائید کرتی ہے۔ مجوز۔ مسٹر کے۔ وکٹار راؤ (بلاری) موید۔ جے۔ ان۔ رای (کلکتہ)

رزولیوشن ۱۶ ہندوستانی وکلاء۔ انگلستان کا شکریہ

یہ کانگرس آنریبل مسٹر جی کے گوکھلے سی۔ آئی۔ ای۔ اور لالہ لاجپت رای کی اس کوشش کی قدر کرتی ہے کہ انہوں نے وکالت ہند کے مشکل کام کو ایسی خوش اسلوبی کیساتھ انگلستان میں انجام دیا۔ مجوز۔ آنریبل مسٹر واجی ابھاجی کھرے (بمبئی) موید۔ مسٹر کے نرائن راؤ (مدراس)

رزولیوشن ۱۷ مسٹر گوکھلے کا تقرر بحیثیت ڈیلیگیٹ

چونکہ ضرورت ہے کہ کانگرس کی اہم مسائل کیطرف موجودہ وقت میں انگلستان کی ذمہ دار عہدہ داروں کی توجہ منعطف کرائی جائے۔ اسلئے یہ کانگرس اپنی پریسیڈنٹ مسٹر گوپال کرشن گوکھلے سی آئی۔ ای کو مقرر کرتی ہے کہ ہندوستانکی وکالت کا کام انجام دیں۔ مجوز۔ مسٹر آر۔ سی۔ دت۔

رزولیوشن ۱۸ کانگرس کی اسٹینڈنگ کمیٹی

کانگرس کی اغراض کو ترقی دینے اور اسکے رزولیوشنوں کی عملی صورتیں نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک اسٹینڈنگ کمیٹی کانگرس کی بنائی جائے۔ مفصلہ ذیل اصحاب ۱۹۰۷ء کے لئے اس کمیٹی کے ممبر مقرر کئے جائیں

(۱) آنریبل سر فیروز شاہ مہتا۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای (بمبئی) (۲) آنریبل مسٹر واجی ابھاجی کھرے (بمبئی) (۳) بی سبرمنیا آیر اسکوئر (مدراس) (۴) آنریبل نواب سید محمد (مدراس) (۵) سر ندرو ناتھ بنرجی اسکوئر (کلکتہ) (۶) اے چودھری اسکوئر (کلکتہ) (۷) مولوی ابو القاسم (بردوان) (۸) لالہ لاجپت رائے (لاہور) (۹) لالہ ہرکشن لال (لاہور) (۱۰) راؤ بہادر آر ان۔ ملکر (امراؤتی) (۱۱) بابو گنگا پرشاد ورما (لکھنؤ) (۱۲) آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد) (۱۳) مسٹر اس سنہا (الہ آباد) (۱۴) ڈی۔ ای واچا اسکوئر (۱۵) آنریبل مسٹر جی کے گوکھلے سی آئی۔ ای } سکرٹری

رزولیوشن ۱۹ سکرٹری کا تقرر

یہ کانگرس مسٹر ادیبوم اسکوئر سی بی کو جنرل سکرٹری اور مسٹر ڈی۔ ای۔ اسکوئر اور آنریبل مسٹر گوکھلے سی۔ آئی۔ ای کو جائنٹ سکرٹری سال آئندہ کے لئے مقرر کرتی ہے۔

رزولیوشن ۲۰ برٹش کمیٹی کا شکریہ

یہ کانگرس سر ولیم ڈیگبی اور دوسرے ممبران برٹش کمیٹی کا ان گرانمایہ خدمات کیلئے جو وہ ہندوستان کے پولیٹکل ترقی کے لئے انجام دے رہے ہیں دلی شکریہ ادا کرتی ہے۔

رزولیوشن ۲۱ آئندہ کانگرس

بائیسواں اجلاس انڈین نیشنل کانگرس کا بوقت ۱۹۰۸ء کے کلکتہ میں ہوگا تعیین تاریخ معہد کو ہوگا۔ مجوز۔ رای جوتندر ناتھ چودھری (کلکتہ)

رزولیوشن ۲۲ شکریہ پریسیڈنٹ

مجوز۔ آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد)

بیاض حسرت

لسانی شیرازی

امروز پریشان تر از آنم کہ تواں گفت
در درد جدائی بچنانم کہ تواں گفت

مصحفی

آنکھوں میں اسکی مینے جو تصویر کھینچ لی
سرمے نے اسکی چشم کی شمشیر کھینچ لی
اس جذب کا بھی ہوں میں دوانا کہ یار نے
نظروں میں میرے اشک کی تاثیر کھینچ لی
ہندوستان میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

نواب مصطفےٰ خاں حسرتی (شیفتہ در ریختہ)

بالباس گل لباس خویش را ہمرنگ ساز
بارہ دیگر قبائے ناز خود را تنگ ساز
من اگر بدنام عشقم غیر بدنام ہوس
گر بر سوائی نمیازی بنام ننگ ساز
حسرتی را شیوۂ صحو و نظیری اہل سکر
روز ہا عاقل و دیوانہ را یکرنگ ساز

مصحفی

دیکھ اسکو اک آہ ہمنے کر لی
حسرت سے نگاہ ہمنے کر لی
اب اسنے چلائی تیغ ہمپر
ہاتھوں کی پناہ ہمنے کر لی
دو ضبط میں جبکہ مصحفی جان
شرم اسکی گواہ ہمنے کر لی

مرزا مہدی بیان

بلبل بیچارہ زاں رو شب نمی خوابیدہ است
در میان غنچہ و گل شبنمے خوابیدہ است

شکر اللہ خاں خاکسار

تلافی ہمہ بے رحمی ہائے شما
بیک نگاہ ادا شد زہے ادائے شما

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ

برائے ولولہ کردن بہانہ ہا ہند
معاشراں سخن عاشقانہ میخواہند
مرید پیر مغانم کہ پادشاہ و ا
مراد خویش ازیں آستانہ میخواہند
بصلح حسرتی و یار ہر دو را میل ست
ز شرم واسطہ در میانہ میخواہند

فقط

مُلا مسیح کی راماین

یہ مضمون جولائی یا اگست کے نمبر کے لئے لکھا تھا مگر وقت پر تیار نہ ہو سکا۔ اسوقت جاڑے میں یہ بے موسم کا ملار سمجھا جائے گا۔ مگر جو محنت کرنی تھی اُسے ضائع کرنے یا اگلے سال تک مضمون کو بیکار رکھنے کی بات اچھی معلوم ہوئی۔ اگر ہو سکا تو اگلی برسات میں ملک محمد کی برساتی نظم اور دوسری ہندی اور اُردو کے شعرا کی موسمی نظموں کا لطف دکھایا جائے گا۔ "ابالمکند گپت"

بالی کے ماری جانیکے بعد سدرون کا راجہ سگریو پمپاپور کا مالک ہوا ہے۔ وہ رام چندر جی سے یہ وعدہ کر کے کہ برسات ختم ہونیکے بعد سیتا کی تلاش کروں گا اپنے دارالخلافت میں چلا گیا ہے۔ ادھر رام چندر جی اور لچھمن جی پہاڑ پر ایک کوہ کے اندر موسم برسات بسر کر رہے ہیں۔ اُسی حالت میں رامچندر جی لچھمن جی کو برسات کی بہار دکھاتے ہیں۔ بالمیک جی نے اپنی سنسکرت کی راماین میں یہ سماں ۶۶ شلوکوں میں دکھایا ہے۔ میں اُنمیں سے ۳۶ شلوکوں کا ترجمہ نیچے دیتا ہوں

ڈھول دب گئی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ گرمی کی شدّت دور ہو گئی۔ راجاؤں نے فوجکشی بند کی اور پردیسی اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ہنس مانسرور میں چلے گئے۔ چکوے اپنی پیاریوں سے جا ملے۔ رات بارش ہونے سے راستے خراب ہو گئے سواریوں کا چلنا مشکل ہو گیا

کہیں روشنی ہے کہیں اندھیرا۔ آسمان پر بادل جمع ہیں کہیں [illegible] سے گھرا ہوا آسمان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا پہاڑوں سے گھرا ہوا سمندر

سال اور کدم کے پھولوں سے بھرا ہوا پہاڑی دھاتوں کے رنگ سے پانی پہاڑی ندیوں میں زور سے بہہ رہا ہے۔ ندیوں کے کنارے [illegible] بول رہے ہیں بھونرے کے مانند کالی اور رسیلی جامنوں کو لوگ مزے سے [illegible] رہے ہیں کئی [illegible]

طرح کے پکے ہوئے آم ہوا کے جھونکوں سے زمین پر ٹپک رہے ہیں۔
بجلی کی جھنڈیاں اڑاتے بگلوں کی قطاروں سے چھائے ہوئے پہاڑ کی چوٹیوں کے مانند اونچے اور کالے بادل جنگ کے متوالے ہاتھیوں کی طرح گرج رہے ہیں۔
بارش کے سبب جنہیں سبزہ لہلہا اُٹھا ہے، مور ناچ رہے ہیں۔ مینہ پڑ چکا ہی ایسے بن شام کے وقت بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔
پانی کی وجہ سے اور بگلوں کی قطاروں سے چھائے ہوئے بادل پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر گویا دم لے لے کر چلتے ہیں۔
بادلوں کی محبت میں اُڑتے ہوئے بگلوں کی قطاریں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ گویا بادلوں کے لئے ہوا نے ایک سفید کنول کے پھولوں کا مالا پہلا دیا ہی۔
چھوٹی چھوٹی بیر بہوٹیوں سے بھری ہوئی سبز نئی گھاس سے زمین ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے گویا کوئی نو عروس لال بوٹے کی سبز ریشمی ساڑی پہنے بیٹھی ہی۔
نیند آہستہ آہستہ بشنو کے پاس جاتی ہے۔ ندیاں دوڑ کر سمندر کے پاس جا رہی ہیں۔ بگلوں کی قطاریں خوشی سے بادلوں کے پاس جا رہی ہیں۔
خوبصورت عورتیں بڑی اُمنگ سے اپنے خاوندوں کے پاس جا رہی ہیں۔ بنوں میں نا ناچنے لگے۔ کدم کی ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں۔ بیل اپنی سستی دور کرنے کو گاہ کے پاس چلے گئے۔ زمین نئی گھاس سے سہاونی بنگئی۔ ندیاں بہتی ہیں بادل برستے ہیں۔ متوالے ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ بن خوبصورت بنگئے ہیں۔ فرقت زدہ لوگ اپنے پیارے کا خیال کر رہے ہیں۔ مور ناچتے ہیں اور بندر چپ ہیں۔
کیتکی کے پھولوں کی خوشبو سے مست ہاتھی بن کے جھرنوں اور موروں کی آواز کے ساتھ خوش ہو چنگھاڑ رہے ہیں۔
پانی کے کنارے گھائل ہو کر کدم کے پھولوں سے لٹکے ہوئے بھونرے پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوئی ہوا آہستہ آہستہ چھوڑ رہے ہیں۔
کوئل کی طرح کالی رات بے شمار پھولوں سے لدی ہوئی جامنوں کی ڈالیاں

ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ گویا وہ بھونروں کے جھنڈ سے چھائی ہوئی ہیں۔
بجلی کی جھنڈیاں اوڑانے والے بڑے زور سے گرجنے والے بادل میدان جنگ میں لڑنے والے بندروں کے مانند معلوم ہوتے ہیں۔
پہاڑی ہنوں میں پھرتا ہوا متوالا ہاتھی بادل کی گرج سنکر اُسے متوالا ہاتھی سمجھ کر لڑنے کو دوڑا مگر پھر بادل کا گرجنا سمجھکر واپس چلا گیا۔
کہیں بھونرے گونجتے ہیں کہیں مورناچتے ہیں کہیں متوالے ہاتھی پھر رہے ہیں اسطرح بن کی خوبصورتی خوب بڑھ رہی ہے۔
کدم سال۔ ارجن اور کیلوں کے پیڑوں سے اور بہت قسم کے پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی بن کی زمین متوالے موروں کے بولنے اور ناچنے سے میخانے کے مانند معلوم ہوتی ہے۔
آسمان سے گرا ہوا موتی سا صاف پانی پتوں پر ٹھہر گیا ہے۔ اُسے بھیگے پروں والے پیاسے پرند خوش ہو کر پی رہے ہیں۔ بھونرے بین سی بجا رہے ہیں۔ مینڈک مردنگ کا لطف دکھا رہے ہیں بندر گا رہے ہیں۔ بن محفل رقص و سرود بن گیا ہے۔
لمبی لمبی دموں والے مور ناچتے ہیں گاتے ہیں اور پیڑوں پر بیٹھتے ہیں۔ اُنکے سبب سے بن سرود منزل بنگیا ہے۔
بادلوں کی گرج سے گہری نیند میں سوتے ہوئے بندر جاگ کر بادلوں کے ساتھ بھیگ کر طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔
جنکے کناروں پر چکوے چکوی پھرتے ہیں ایسی ندیاں پرانے کناروں کو توڑ کر نئے کناروں سے ہم آغوش ہو کر بڑے غرور کے ساتھ عزت کے لائق ہوتیں سمندر کے پاس چلی جا رہی ہیں۔
پانی سے بھرے ہوئے نیلے بادل آپسمیں ایک دوسرے سے ملتے ہوں پھر معلوم ہوتے ہیں جیسے بن کی آگ سے جلے ہوئے دوسرے جلے ہوئے سے ملتے ہوں۔

جمع ہو جاتے ہیں۔ ندیوں کا پانی سمندر میں جا کر ویسا ہی لاجنب ہو جاتا ہے جیسا بندہ خدا کو پا کر۔

زمین پر چار و نطرف سبزہ چھا جانے سے راستہ نہیں نظر آتا ہے۔ جس طرح کج بحثوں کی بحث سے صحیح کتابیں گم ہو جاتی ہیں۔ مینڈک ایسے بولتے ہیں جیسے لڑکے وید پڑھتے ہیں۔ آک اور جواسے کے پتے گر گئے۔ جسطرح اچھی عملداری ہو جانے سے بدچلن لوگوں کا دفعیہ ہو جاتا ہے۔ خاک تلاش کرنے سے بھی کہیں نہیں ملتی ہے جسطرح غصہ سے نیکیوں کا پتہ نہیں لگتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں جگنو کیا چمکتے ہیں گویا گھمنڈی لوگ مجلس کرتے ہیں۔ بارش کی زیادتی سے کیاری پھوٹ چلی ہے جیسے آزاد ہو کر عورت خراب ہو جاتی ہے۔ ہوشیار کسان کھیتی کا ٹلاؤ کرتے ہیں جسطرح لایق لوگ گھمنڈ غرور اور فضول عزت کے خیال کو دور کرتے ہیں چکوے نہیں دکھائی دیتے جیسے کلجگ کے آنے سے دھرم غائب ہو گیا۔ اور سرزمین میں سبزہ اُسیطرح نہیں اُگتا ہے جیسے خدا کے بندوں کے جی میں شہوانی خیال بہت طرح کے جاندار زمین پر بڑھ گئے ہیں جسطرح عمدہ حکومت میں رعیت بڑھ جاتی ہے مسافر جانکو تہاں رہ گئے۔ جیسے علم ہونے سے خواہشات نفسانی نہاں کی تہاں رُک جاتی ہیں۔

کبھی تیز ہوا بادلوں کو اُڑا دیتی ہے جیسے ناخلف لڑکا خاندان کی عزت کو۔ دنیں کبھی اندھیرا ہو جاتا ہے اور کبھی سورج نکل آتا ہے۔ جیسے خراب صحبت سے خوبیاں ہو جاتی ہیں اور اچھی صحبت سے پیدا ہو جاتی ہیں"

تلسی داس جی فقیر تھے اس سے برسات کا نظارہ دکھاتے ہوئے بھی اپنی فقیرانہ نصیحت نہیں لے ہیں۔ وہ برسات کی ایک ایک فطرتی بات کو سامنے لاتے جاتے ہیں کی کی کے لئے اُن میں سے ایک ایک پند ظاہر کرتے جاتے ہیں بھی کا نہ یب کا ہے۔ وہ اکبر اعظم کے وقت میں تھے۔ اس سے دہ بن پہاڑوں وہ اُس زمانہ کی برسات کی کیفیت نہیں کہہ سکتے

تھے جیسے بالمیک جی تھے۔ بن پہاڑ وغیرہ تلسی داس جی نے بھی دیکھے۔ مگر ہاتھیوں کے بن اُن کے زمانہ میں نہ تھے۔ اس سے اُن کی نظم میں ہاتھیوں کا ذکر نہیں ہے۔ وہ بن سے آبادی کی طرف آکر کھیتی اور کسانوں کی بات کہنے لگے ہیں۔ مگر کہا وہی جو آنکھوں سے دیکھا۔

مُلا مسیح جہانگیر کے زمانہ میں تھے۔ اس سے تعجب نہیں کہ اُنہوں نے تلسی داس کو دیکھا یا سُنا ہو۔ کیونکہ جہانگیر کے زمانہ میں تلسی داس جی زندہ تھے۔ جہانگیر کی وفات سے کوئی پانچ چھ سال پہلے اُن کا انتقال ہوا تھا۔ اپنی رامائن میں برسات کی بہار مُلا صاحب نے بھی لکھی ہے۔ کیونکہ برسات ہندوستان کی مشہور ہے۔ قدرت نے یہ نعمت اسی ملک کو عطا کی ہے۔ پھر اصل رامائن میں جس موقعہ پر برسات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بہت ضروری ہے اس سے دوسری زبانوں میں رامائن لکھنے والوں کو بھی اُس کی تقلید کرنا پڑی ہے۔ مُلا مسیح فرماتے ہیں ؎

ہوائے عشق آمد فصل برسات	کہ فردوس بریں سا میکند مات
زبس آب و ہوایش جاں نوازیست	بخوبی بادشاہ ہر ہوا ایست
بہار عاشقاں برسات ہند است	ز دلہا خونفشاں برسات ہند است

ان تین شعروں سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ جناب مُلا صاحب ہند کی برسات کا کچھ اصلی بیان کرنے کی تکلیف گوارا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چھ تھے ہی شعر سے گریز کرتے ہیں اور اپنے عجمی طرز بیان کو قبول کر لیتے ہیں۔

ز رنگ و بوے پر کاریست دروے	سراپا نالہ و زاریست دروے
ہوایش بیدلانرا سینہ کاوو	کہ از ہمر ذرہ عشق نو [illegible]
بوصفش مخزن گوہر کشایم	چو چشم ابر دُر [illegible] موقع پر

رونا دھونا فارس کے شاعروں کو بہت پسند ہے کسی [illegible] دلیل یہی ہے کہ فارس کا عاشق اُسے دیکھ کر رو دے۔ [illegible] ہاں پر بارش کی نئی خوشی کی شے میں بھی اپنا رونے کا دستور [illegible] سے

چو پیشستہ پس از سالے بہ میعاد	سلیماں [illegible] برمہ انگیز
	نمایاں

ازاں باد آتش اوگشت پر تیز | بخار آب دریا یافت انگیز
بگریہ ابر را نو شد اجازہ | کہ سازد سنت عشاق تازہ
فلک عاشق زمیں معشوق زاست | کہ آنرا گریہ و ایں را خندہ کارست
بخندہ ابر ہمچوں زنگی مست | ببازی کردہ تیغ برق در دست

ملا صاحب نے اپنا مضمون بہت زور سے اُٹھایا تھا۔ فلک کا سلیمان سا
بہر کے بعد ہوا کی مسند پر جلوہ فرما ہوا تھا۔ اُس ہوا سے اُسکی آگ تیز ہو گئی اُس
سمندر کے بخارات اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک تو بڑا زور تھا۔ مگر آگے چلکر ابر کو
رونے کا نیا حکم حاصل ہوا کہ وہ رو رو کر عاشقوں کی سُنت کو تازہ کرے۔ آسمان عاشق
ہے زمین معشوقہ ہے۔ اُسکا کام رونا اسکا کام ہنسنا ہے۔ کہاں وہ مسند پر
بیٹھ کر شاہانہ حکم دینا اور کہاں یہ رونا دھونا۔ نیچر کا خیال تو کجا ملا صاحب نے اپنی بات
تک کا خیال نہ رکھا۔ ایک شعر میں جہانگیر کی تعریف نکالی ہے۔

مقلد پیشہ گشتہ ابر آزار | کند تقلید دست شاہ دربار

آگے پھر کچھ مردمی کے ہتھیار باندھے ہیں

بروی آسماں ابر عزیواں | سپہ انگیختہ از تیرہ دیواں
نہ دیوست او کہ نادل شد فرشتہ | برحمت باری از رحمت سرشتہ
بہ سقائی چہ شخصے بے بدیل ست | کہ آب زندگیش آب سبیل ست

نیچے لکھے کئی ایک اشعار خوب ہوئے ہیں

بدشیرہ خوارہ عالم پیر | کہ ابر از شیرۂ جاں میدہد شیر
تلمی داشتہ سبزی ابر و فشاں | کشادہ رنگ زیر چرخ دو کاں
نصیحت شیرۂ اطفال رنگین | کہ ہر یک ابر دارد رنگ چندیں

نبات نشو نما را | نمودہ گلشن رنگین ہوا را
بہ گلشن آرد گل تر | ہم از موج و صدف کافور و گوہر
نہ بن دست زد طرب را | زمیں تو سبزہ کردہ پشت لب را

سبزہ کے بیان میں فرماتے ہیں۔

ز سبزہ شخص گیتی پرنیاں پوش	فگندہ طیلسان خضر بر دوش
ز سبزہ خاک را مینا ست دُر بار	گرفتہ آسماں زو دام زنگار
بہ سرسبزی جہاں چوں بخت شاہان	بشادابی زمیں چو روئے ماہان

اوپر کے کئی ایک اشعار میں فطرتی رنگ بھی ہے۔ نیچے لکھے چند اشعار اس رنگ میں اور بھی زیادہ شرابور ہیں۔

خروش انگیز ہر سو تازہ سیلے	چو دیوانہ بہ صحرا کردہ میلے
دلِ مرغاں ز بند دام آزاد	کہ دانہ سبز شد در دام صیاد
ز اقسام ریاحیں بس گل ہند	شگفت و کوکلا شد بلبل ہند
ز عشق قطرہ چاتک بادم سرد	رقابت با صدف چوں مور میکرد
دلِ طاؤس را از مستی جوش	شدہ معزولئ جنت فراموش
بیک آئینہ نازیدے سکندر	ہزار آئینہ دار دایں بہ ہر پر

اگر یہ چند شعر بھی مُلّا صاحب کی برسات میں نہ ہوتے تو اُن کی برسات کو ذرا بھی ہند سے تعلق نہ رہتا بالکل ایرانی برسات ہو جاتی۔ وہ بھی ہوا بادل سے بنی ہوئی برسات نہیں بلکہ تشبیہ اور استعارات سے بنی ہوئی خیالی۔

۱۲۶۷ھ ہجری میں ایک رامائن اُردو میں منشی جگناتھ صاحب خوشتر نے نظم کی تھی۔ خوشتر ہندو تھے مگر اپنے گھر کی تعلیم اُنہوں نے کچھ نہیں پائی تھی۔

وہ فارسی اُردو کے تعلیم یافتہ تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنی رامائن میں اُسی موقع پر برسات کی بہار لکھی ہے۔ کچھ اشعار اُسکے نیچے لکھے جاتے ہیں۔

عجائب موسم باراں ہے خوشتر	سماں کیا ہے گھٹا کا آسماں پر
عجب کیا فصل باراں کے کرم سے	گل و لالہ کھلیں شاخ قلم سے
جب آیا موسم ابر گہر ریز	ہوا رعد آسماں پہ شور انگیز
گھٹا میں کوندتی تھی برق تاباں	بہار آب میں آتش نمایاں

ہوئی ہر سو رواں باد بہار نئی — شمامِ سبزہ میں کی مشکباری
ملے باہم جو برق و باد و باراں — ہوئے مے ریز مثل بادہ خواراں
ہوا فیض ہوا سے دشت گلزار — زمرد گوں ہوا داماں کہسار
ہوئے منعم تہیدستاں گلشن — ہوا ہر غنچے کا پُر زر سے دامن
کیا ابر سیہ نے چرخ پر شور — ہوئے رقصاں زمیں پر ہر طرف مور
لگا سبزہ ہر اک سو لہلہانے — لگی ہر گل پہ بلبل چہچہانے
ہوا گرم اژدحام گل سو کہسار — کیا شہر یمن کا سرد بازار
ہجوم گل ہوا وہ ہر چمن میں — ہوا چلنے لگی رُک رُک کے بن میں
جھکی ہر گل پہ ہر جا شاخ سنبل — رُخ رنگین پہ ہو جسطرح کاکل
زمیں پر خشک تھی جو چشمہ آب — ہوئے سب فیض ابر تر سے سیراب
ہوا آب رواں سو دشت دریا — ہوا دریا ہجوم گل سے صحرا

یہ بھی ایرانی ڈھنگ کی نظم ہے۔ مگر فطرت کو ایکدم سے اسمیں خیرباد نہیں کہدیا ہے شاعر کو خبر نہیں ہے کہ وہ برسات کی بہار لکھتا ہے یا ایران کے موسم گل کی۔ تاہم چند اشعار برساتی ضرور ہیں۔ اگر خوشتر صاحب ہندوں کا لٹریچر جانتے تو ان کی نظم کچھ اور ہی ڈھنگ کی ہوتی سالک محمد جائسی نے اپنی پدماوت میں ایک بارہ ماسہ لکھا ہے اُس میں برسات کا بیان کرتے ہوئے کمال کیا ہے۔ ہندوستان کی برسات کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے۔ وجہ یہ کہ فقیر تھے۔ سب جگہ پھرتے تھے۔ کتنی ہی برساتیں دیکھی تھیں۔ جو آنکھوں سے دیکھا وہی قلم سے لکھدیا۔ پھر وہ عمدہ کیوں نہ ہو۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے بھی برساتی نظم بہت اعلیٰ درجے کی لکھی ہے۔

فقط بالکند گپت

تنقید

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اُنیسواں اجلاس۔ اس سال علی گڑھ میں ۲۸-۲۹-۳۰-۳۱ دسمبر کو بصدارت آنریبل خلیفہ محمد حسن خاں بہادر شتبہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا یعنی اسلئے کہ

لوگوں کو اس اجلاس کی خاص طور پر کامیاب ہونیکی امید تھی۔ ممبروں، وزیٹروں۔ اور طالب علمان کالج کی مجموعی تعداد ۱۰۰۰ کے قریب تھی۔ ممبروں کی تعداد امید سے کم تھی اور مشاہیر کانفرنس مثلاً مولانا شبلی۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولانا ذکاء اللہ وغیرہم کی عدم موجودگی نیز بعض دیگر ناگفتہ بہ واقعات کی بنا پر اکثر لوگ منغص و مکدر واپس گئے۔ نظر برجملہ حالات کہا جاتا ہے کہ علی گڈھ کانفرنس پھیکی رہی۔

مہمانوں کی دعوت کا خرچ نواب فیاض علیخان صاحب بہادر نے اپنے ذمے لیا۔ [illegible] طالب علموں کے سپرد تھا۔ خان بہادر حاجی مزمل اللہ خانصاحب نے مہمانوں کو [illegible] پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ ان دونوں صاحبوں کے لئے شکریے کے رزولیوشن [illegible] پاس کئے گئے۔

مہمانوں کے کمروں اور مقام اجلاس میں برقی روشنی کا [illegible] نظام محمد احمد صاحب حاجی محمد خانصاحب بیساں خورجہ کی جانب سے ہوا تھا۔ پہلے روز مولوی حبیب الرحمن خان صاحب پریسیڈنٹ ریسپشن کمیٹی نے اپنا ایڈریس پڑھا اسکے بعد صدر انجمن کا انتخاب ہوا آپکے افتتاحی ایڈریس میں بجز دیگر معمولی باتوں کے یہ خیالات قابل غور ہیں کہ "سرسید کے منصوبے اسوقت تک پورے نہیں ہوسکتے۔ جب تک کہ تعلیم خود ہماری ہاتھ میں نہ ہو۔ کالج یونیورسٹی نہ ہو۔ اور کماحقہ ترقی نہیں ہوسکتی جبتک ہم عربی پڑھکر مسلمان اور سائنس پڑھکر محقق نہ بنیں۔ افلاس صنعت و حرفت کی تعلیم سے دور ہوسکتا ہے۔ طلبہ جاپان اور امریکہ وغیرہ بھیجے جائیں یا کم از کم ہندوستان ہی میں انہیں اسکی تعلیم دلائی جائے۔ تعلیم نسواں محفوظ اور محصور مدارس میں ہو۔"

ایڈریس پڑھکر خلیفہ صاحب نے بعذر علالت اپنی جگہ مسٹر علی امام بیرسٹر پٹنہ کو اپنا جانشین بنا دیا۔ چنانچہ کانفرنس کے باقی اجلاسوں میں بھی زیادہ تر آپ ہی صدر انجمن رہے اور حق یہ ہے کہ آپنے فرائض صدارت کو عمدگی کے ساتھ ادا کیا۔ ازاں بعد مسٹر براؤن اسسٹنٹ جائنٹ سکرٹری اسٹینڈنگ کمیٹی نے اپنی کمیٹی کی کارگزاریاں بیان کرکے موجودہ وکلاء کے علاوہ اور بھی چند کلرکوں کی ضرورت ظاہر

ذیل میں کانفرنس کے اجلاسوں کا پروگرام مع رزولیوشنوں کی فہرست کے درج کیا جاتا ہے

۱۔ **رزولیوشن ۱** :۔ "اس کانفرنس کی رائے میں نہایت مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ہز ہائنس حضور عالی نظام مدظلہ العالی کی چہل سالہ جوبلی کی یادگار میں ایک طلائی تمغہ ہر سال ایک ایسے مسلمان طالب علم کو دیا جائے جو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں اعلیٰ درجہ کی ڈگری حاصل کرے اور اس امر کا فیصلہ کہ کس خاص سال میں کس یونیورسٹی کے گریجویٹ کو تمغہ دیا جائے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس کی رائے پر چھوڑا جائے" ۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اسکوئر بیرسٹرایٹ لا نے پیش کیا اور نواب محسن الملک بہادر نے تائید کی۔

۲۔ مولوی حکیم مظفر حسین صاحب سکرٹری نے رپورٹ انجمن اسلامیہ مظفر نگر پیش کی۔

۳۔ **رزولیوشن ۲** :۔ "اس کانفرنس کو نہایت افسوس ہے کہ فی زمانہ مسلمانوں میں تعلیمی کوششوں کو مقامی خصوصیتوں پر محدود کرنیکا خیال دن بدن قوت پکڑتا جاتا ہے اور یہ کانفرنس اس امر کو قومی ترقی کے لئے بہت ضروری سمجھتی ہے کہ تعلیمی قوتوں کا علیگڈھ میں اسطرح اجتماع اور انضباط کیا جائے کہ مقامی ضرورتوں کا بھی کافی لحاظ رہے" ۔ مسٹر محمد علی نے پیش کیا اور مسٹر علی امام و نواب محسن الملک اور منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار نے تائید کی۔

۴۔ **رزولیوشن ۳** :۔ **متعلق اوقاف**۔

۵۔ **بوقت شب (۸ بجے)** ۲۸ دسمبر۔ یونین کلب کی اپنی دوسری (سالانہ جلسہ) تجسیں کالج کے طالب علموں نے ہیلٹ کا ایکٹ کیا۔

۶۔ لکچر مسٹر ارچبولڈ پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڈھ۔ ابتدائی تعلیم انگلستان پر۔

۷۔ **رزولیوشن ۴** :۔ "اس کانفرنس کی رائے ہے کہ مقاصد کانفرنس کی عملی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے کہ تعلیمی مردم شماری کے کام کو از سر نو جاری کیا جائے۔

محرک۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔ موید۔ مسٹر بدرالدین احمد بی۔ اے۔ بیرسٹر

الہ آباد ہائی کورٹ۔

۸۔ **رزولیوشن ۵:** ۔اس کانفرنس کی رائے میں یہ نہایت مناسب ہے کہ بغرض حصول تعلیم صنعت و حرفت ہر سال کم از کم ایک مسلمان طالب علم ممالک غیر کو کانفرنس کے اہتمام سے بھیجا جائے۔ اور جبتک روپیہ ادا نہو وہ ۵ فیصدی اپنی آمدنی سے دے محرک۔ مولوی الف دین صاحب پلیڈر راولپنڈی۔ موید مسٹر غلام محمد منشی ہیڈ سٹرائیٹ لاہور جکو

۹۔ **رزولیوشن ۶:** ۔اس کانفرنس کی رائے میں علی گڈھ کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہنچانے کی تجویز کو کامیاب کرنیکے لئے لازمی ہے کہ اسکے فنڈ اور کل ضروریات کا صحیح اندازہ قرار دینا چاہئے۔ محرک مسٹر قادری۔ موید۔ اڈیٹر صاحب پیسہ اخبار لاہور۔

بوقت شب ۔ ۸ بجے۔ ۲۹ دسمبر۔ (بیک منزل) سکشن میٹنگ تعلیم نسواں۔ میں شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی سکرٹری سکشن نے اپنی رپورٹ پیش کی

۱۰۔ **رزولیوشن ۷:** ۔یہ کانفرنس حضور سر جیمس ڈگس لاٹوش بہادر لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا نہایت تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے کہ انکی گورنمنٹ نے عربی تعلیم کو محمڈن کالج علی گڈھ میں ترقی دینے کے لئے اعلیٰ درجہ کی فیاضی کا اظہار فرمایا محرک۔ نواب محسن الملک بہادر۔ موید۔ خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب

۱۱۔ نظم حکیم مظفر حسین رئیس مظفر نگر مع نقشہ شجرہ اسلام جسکو شاخیں تمام عالم میں پھیلی ہیں مگر تری صرف جڑ میں

۱۲۔ **رزولیوشن ۸:** ۔اس کانفرنس کی رائے میں کانفرنس کے مقاصد کو پبلک کے سامنے مسلسل طور پر رکھنے کے لئے اور اُن میں عملی کامیابی حاصل کرنیکے لئے ضرور ہے کہ مستقل تنخواہ دار ایجنٹ مقرر کئے جائیں۔ محرک۔ مسٹر رزاق بخش قادری موید۔ مسٹر گارڈنر برون۔

۱۳۔ **رزولیوشن ۹:** ۔اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی اصلاح کے لئے قرآن شریف کے ترجمہ کا پڑھانا ضروری ہے۔ محرک مولوی عبدالحکیم صاحب سیشنری افسر پٹیالہ۔

۱۴۔ نظم۔ مرزا اشتیاق حسین صاحب اڈیٹر رسالہ محسن الملک۔ دہلی۔

۱۵- رزولیوشن نمبر ۱۰:- اس کانفرنس کی رائے میں اعلیٰ التعلیم کو مکمل کرنے کے لئے ہندوستان کے کالجوں میں فیلو سسٹم کا جاری کرنا اور وظائف فنڈ قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ محرک۔ علی امام صاحب

۱۶- رزولیوشن نمبر ۱۱:- اس کانفرنس کی رائے میں مختلف مقامات میں جو مسلمانوں کے اوقاف ہیں اُن میں جو اوقاف تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اُن سے تعلیمی مقاصد میں مدد لینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محرک محبوب عالم صاحب۔

۱۷- لکچر خواجہ غلام الثقلین صاحب متعلق اصلاح تمدن۔ یہ لکچر عام طور پسند کیا گیا۔

اجلاس ۱۸ شب وقت ۸ بجے (۳۰ دسمبر ۱۹۰۵ء):- (۱) کنورسیشن لٹریری سکشن۔ (۲) میٹنگ متعلق اصلاح تمدن بمقام بیک منزل جسمیں خواجہ غلام الثقلین صاحب سکرٹری صیغہ نے اپنی رپورٹ پیش کی جس سے معلوم ہوا کہ اس صیغے کا خرچ آمدنی سے زائد ہے۔

۱۹- سید الرحمن صاحب نے صنعت و حرفت کے متعلق اپنا مضمون پڑھا اسکے بعد نواب محسن الملک بہادر نے ایک پُر لطف لکچر دیا جسمیں اسلامی تعلیم و قرآن کو باترجمہ پڑھنے پر زور دیا تھا۔

۲۰- مسٹر ظفر عمر نے ون روپے فنڈ کی رپورٹ پیش کر کے بتایا کہ ابتک صرف ۲۹ ہزار روپیہ جمع ہوا ہے اسی اثنا میں مختلف لوگوں کو تمغے دئے گئے۔

۲۱- رزولیوشن نمبر ۱۲:- شکریہ نواب فیاض علیخاں بہادر متعلق بہ فیاضی و مہمانداری کل ممبران و وزیٹران کانفرنس۔ محرک۔ نواب محسن الملک۔ موید۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔

۲۲- رزولیوشن شکریہ نمبر ۱۳:- خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بابت گارڈن پارٹی محرک۔ مسٹر گارڈنر برون۔ موید۔ مسٹر رزاق بخش قادری۔

۲۳- رزولیوشن شکریہ نمبر ۱۴:- محمد احمد صاحب حاجی محمد خاں صاحب و سائے خوجہ بابت اہتمام روشنی برقی۔ محرک۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔ موید شیخ عبد اللہ صاحب۔

۲۴- رزولیوشن شکریہ نمبر ۱۵:- مسٹر پوپ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ اودھ رہیلکھنڈ ریلوے در باب تخفیف کرایہ ریل۔ محرک۔ مسٹر رزاق بخش قادری۔ موید۔ مولوی بشیر الدین صاحب۔

۲۵- مولوی شبلی صاحب کے مستعفی ہونے پر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے ہم آپ کو توجہ دلاتے ہیں کہ انجمن کو (۱) ایک مکمل اردو کتبخانہ فراہم کرنا چاہئے (۲) مستند قواعد اردو مرتب کرنا چاہئے۔ گذشتہ دو سال میں انجمن نے کچھ کام نہیں کیا۔ اسکی تلافی ضروری ہے۔

۲۶ - گذشتہ کانفرنس کا حساب مسٹر قادری نے پیش کیا۔ مولانا اشہری نے ایک پُرزور نظم پڑھی اور آخر میں حضور ملک معظم کے لئے فرمائے خوشی بلند کئے گئے۔

ان رزولیوشنوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہماری تعلیمی کانفرنس میں سب سے زیادہ ضروری امر غالباً مصلحتاً نظر انداز کر دیا گیا۔ یعنی گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کے متعلق اظہار رائے کی کسی نے ہمت نکی حالانکہ اُس پالیسی سے سب سے زیادہ مسلمانوں ہی کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ پانچویں اور چھٹے رزولیوشن کے سوا باقی اکثر تجویزیں وقت کو پورا کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں اور بس۔ افسوس کہ ان دو تجویزوں کے متعلق بھی کانفرنس کو پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ تعلیم صنعت وحرفت کی غرض سے طالب علموں کو امریکہ وجاپان بھیجنے کی تجویز مسٹر نسیم بی۔ اے وکیل لکھنؤ کے اس اظہار ارادہ تک محدود رہگئی کہ آپ ہر سال کم از کم ایک طالب علم اودھ سے بھیجنے کا بندوبست کرینگے محمڈن یونیورسٹی کے لئے بھی ۱۴ ہزار روپے کا وعدہ ہوا جسمیں سے صرف دو ہزار وصول ہوئے۔ خدا کرے کہ ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہو کہ مسلمانوں نے اظہار فیاضی کو شہزادۂ انگلستان کے ورود مسعود پر اُٹھا رکھا ہے۔

سب سے زیادہ کامیابی صیغہ تعلیم نسواں اور اسکی شاخ یعنی زنانہ صنعت وحرفت کی نمائش کو ہوئی جو اسکے سکرٹری شیخ عبداللہ صاحب کی ذاتی اور عملی کوششوں کا نتیجہ ہے ہم شیخ صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد کہتے ہیں۔ آپ کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ بھوپال۔ بہاولپور مالیر کوٹلہ۔ جنجیرہ اور پٹیالہ کی ریاستوں سے تعلیم نسواں کیلئے پوری امداد کا وعدہ کیا گیا ہے یہانتک کہ بیگم صاحبہ بھوپال نے معتدبہ رقم دی بھی ہے ہز ہائنس آغا خان صاحب نے بھی ایک معقول رقم کا وعدہ کیا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ اتنی ہی مسلمان خود جمع کرلیں گورنمنٹ نے اسکول کا نصف خرچ دینا منظور کیا ہے۔ اسوقت اس صیغے کے فنڈ میں ۶ ہزار ۵ سو ۸۰ روپیہ ہیں شیخ صاحب نے آخر میں یہ بھی امید ظاہر کی کہ ایک سال کے اندر نارمل اسکول قائم ہو جائیگا۔ خدا بھیجیں کشاد۔ آخر میں نمائش کے متعلق بھی بیان کیا کہ ہندوستان کے ہر حصے سے چیزیں آئیں۔ رسالہ خاتون کے متعلق جسکی اشاعت اب چلا رسو ہے، امید ظاہر کی گئی کہ اس سے تعلیم نسواں میں بہت مدد ملیگی۔ افسوس کہ بعض یافتہ جاہلوں اور جذب

غیر مہذب لوگوں نے زنانہ نارمل اسکول اور نمایش صنعت وحرفت کی بھی مخالفت کی اور تہذیب وتعلیم جدید کے نام کو بدنام کیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

انڈسٹریل کانفرنس کا پہلا اجلاس معمولی کامیابی کے ساتھ بمقام بنارس ۳۰ دسمبر ۱۹۰۵ء کو کانگرس پنڈال میں منعقد ہوا۔ مسٹر رمیش چندر دت سی۔ آئی۔ ای صدر نشین تھے جنہوں نے ایک موزوں تقریر کے ساتھ کارروائی شروع کی اور چاہا کہ لوگ مختلف مضامین پر اپنے خیالات ظاہر کریں۔ پہلا مضمون مسٹر ہوپ ٹمسن رجسٹرار کریڈٹ سوسائٹیز کا تھا جنہوں نے کمی وقت کی وجہ سے خلاصہ مضمون زبانی بیان کیا کہ کیونکر زراعتی بنک ان صوبجات میں چل رہے ہیں مسٹر ہالینڈ ڈائرکٹر معدنیات نے ایک دلچسپ مضمون مختلف معدنیات اور پیداوار ہندوستان کے متعلق پڑھکر سنایا۔ اور بھی چند مضامین کے بعد کئی مفید رزولیوشن پاس ہوئے۔ اور آخر میں ایک کمیٹی کانفرنس کے کام چلانے کو قائم ہوئی جسکے سکرٹری مسٹر مدھو لکر مقرر ہوئے اور قریب پانچہزار روپیہ چندہ سال آیندہ کے اخراجات کے لئے جمع ہوگیا مسٹر مدھو لکر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک تنخواہ دار سکرٹری تجویز کریں۔ ہمارے نزدیک اس عہدہ کے لئے مسٹر جنیا منی سابق ایڈیٹر اخبار انڈین پیپل الہ آباد سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔ انڈسٹریل کانفرنس کا خیال سب سے پہلے آپ ہی کو ہوا اور اسکے پہلے اجلاس کی کامیابی کو بھی زیادہ تر آپ ہی کی ذاتی کوشش کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

ہمکو اس کانفرنس کی مفید ملک ثابت ہونیکی بہت کچھ امید ہے اور غالباً وہ زمانہ دور نہیں ہے جبکہ اسکی کوشش سے ہندوستانی تعلیم وصنعت حرفت کے معقول انتظام کے علاوہ ہندوستانی طلبا کو امریکہ وجاپان بھیجنے کا بھی قابل اطمینان انتظام ہوجائیگا۔

سوشل کانفرنس کا بھی اجلاس ۳۱ دسمبر کو کانگرس پنڈال میں بصدارت پنڈت جوالا پرشاد کلکٹر ایٹہ ہوا۔ اس کانفرنس کی تجاویز میں سے رسم پردہ کی سختی کو دور کرنے کے سوا اور بہت کم تجویزیں ایسی تھیں جنکو ہندو اور مسلمان دونوں سے تعلق نہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسمیں جو خال خال مسلمان نظر آتے تھے وہ بطور تماشائی کے شریک تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ پولیٹکل معاملات میں البتہ ہندو مسلمان کے درمیان

اتحاد ممکن اور ضروری ہی۔ سوشل معاملات میں ان دونوں کا ہمخیال ہونا مشکل ہے اور شاید کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔

اس کانفرنس میں ایک خاص بات قابل غور یہ تھی کہ اسٹیج پر پچیس تیس تعلیم یافتہ خاتونوں کی بھی ایک جماعت موجود تھی جنمیں سے بعض نے انگریزی اور ہندی میں تقریریں بھی کیں اسکے مقابلے میں جب ہم مسلمانوں کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو انکی پست خیالی اور قدامت پرستی پر افسوس آتا ہی کہ تعلیم یافتہ عورتوں کا بے پردہ مہذب جلسوں میں شریک ہونا تو درکنار محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی کو بقید پردہ دیکھنے کی بھی سخت مخالفت کی گئی حتی کہ بعض لوگوں نے تو نمائش کی بقید پردہ سیر بھی خواتین کو محروم کرنا چاہا اور مہذب عورتوں کی باہم ملاقات کو بھی ناجائز سمجھکر شیخ عبداللہ صاحب کی مجوزہ لیڈیز کانفرنس کے انتظام میں بھی در پردہ رخنہ اندازی کرنا چاہی۔ لاریب اس قسم کی تاریک خیالیاں مسلمانوں کی ادبار اور رذالت کی نشانیاں ہیں۔

اسپیچ تائیدی مُلا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی

(متعلق بہ رزولیوشن کانگرس بابت قرنطینہ حجاج)

اسوقت جو رزولیوشن کہ آپ حضرات کے سامنے آنریبل گوکل داس پارک نے پیش فرمایا ہی اور جسکی تائید علی محمد بیمجی صاحب نے کی ہی اُسکی مزید تائید کے لیے میں کھڑا ہوں اور اس امر سے میں مطمئن و مسرور ہوں کہ آپ حضرات اکیس سال سے برابر اپنے اوطان عزیز کو چھوڑ کر محض اسوجہ سے زحمت سفر گوارا کرتے اور مختلف اقطاع ہند میں اپنے جلسے قرار دیتے رہتے ہیں کہ رعایا کی تکالیف و مصائب کو دور کریں اور اون کی شکایات کو بطور نائبان قومی سرکار تک پہنچائیں اور اسوقت تک آپ حضرات نے اس بھاری ذمہ داری قومی و ملکی کو نہایت متانت و خلوص و صداقت و استقلال و لیاقت کے ساتھ انجام دیا ہی جسکی وجہ سے ملک کا ہر ایک فرقہ بلا امتیاز مذہب و ملت آپکے مساعی جمیلہ و احسانات

جزیلہ کا دلی شکر گزار ہے۔

تمام ممبران نیشنل کانگریس بلا تفرقہ مذہب و ملت اپنی برادران وطنی کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھتے ہیں اور ہمارے دل و دماغ تعصبات مذہبی سے تیرہ و تار نہیں ہیں بلکہ بالکل اس سے منزہ و مبرا ہیں ہمارا مذہب حب وطن و ہمدردی ملکی و قومی ہے۔

ومن مذہبی حب الدیار لاہلہا	وللناس فیما یعشقون مذاہب
لقد صار قلبی قابلاً کل صورۃ	فمرعی لغزلان ودیر لرہبان
ادین بدین الحب انی توجہت	رکائبہ ارسلت دینی وایمانی

اسکا ثبوت ابھی آپ حضرات کے سامنے پیش ہو چکا ہے کہ حاجیوں کے قرنطینہ کی تنخ تکالیف کی تحریک ہمارے آنریبل ہندو بھائی مسٹر پارک نے کی ہے جو تمام ہندوستانکے دیگر مجالس مدعیان حب وطنی و ہمدردی قومی میں سے کسی نے بھی آجتک نہیں کی تھی بلکہ بزعم خود بعض قومی مجلسوں نے سرے سے حج ہی کو فضول و غیر ضروری ظاہر کیا ہے ہمارے دل و دماغ انسانی موانست سے ایسے منور و روشن ہیں اور ایسے وسیع و بلند وارجمند ہیں کہ ہماری عظیم الشان واجب التعظیم مجلس کے ہر ایک فرد کا یہ خیال و مقال ہے جو بالکل مطابق واقع و حسب حال ہے کہ ؎

مقصود من از کعبہ و بتخانہ توئی	ورنہ من ازیں ہر دو مقام آزادم
چراغ بتکدہ و شمع خانقاہ یکیست	اگرچہ دیدہ دو آمد دلے نگاہ یکیست
عاشقم ملا مرا با کفر جا ایمان چہ کار	رونق ہنگامہ گبر و مسلمانم چو شمع

صاحبو! انسانی طبایع کا مقتضا یہ ہے کہ ہر ایک عاجز و درماندہ شخص و گروہ سے ہمدردی کرے جو اوسکے مشارک جنسی، نوعی، قومی و وطنی ہیں اور جب یہ مشارکین معزز و مقدس بھی ہوں تو اونکی برگزیدگی و اعزاز کیوجہ سے خلوص و ارادت دلی اور بڑھجاتی ہے۔ پس جس درماندہ مقدس گروہ کی ہمدردی کی تائید کرنیکے لئے میں آپکے سامنے کھڑا ہوں وہ حاجیوں کا گروہ ہے جو بمقتضائے اپنے پاک خیالات مذہبی کے اپنی اہل و عیال سے مہاجرت کرکے دور دراز مقامات کا اور اوسکے شدائد و مصائب جھیلنے

اور ایسی تکالیف برداشت کرنے پر جنکا چارہ کار نہیں آمادہ و طیار رہتے ہیں مگر یہ مقدس گروہ قرنطینہ بمبئی کیوجہ سے نہایت تکالیف میں ہر سال مبتلا رہتا ہے اور کوئی اُن کی ہمدردی بجز آپکے سے پاکدل پاک نفس محبان قوم و وطن کے نہیں کرتا اور نہیں کرسکتا اور نہ کسیکو ان کی حالت زار و نزار پر کبھی کچھ رحم آتا ہی بجز ہمارے آنریبل مسٹر پارک ہندو کریم النفس رحیم دل ممبر کے جسکی تحریک آج اُنھوں نے آپکے سامنے پیش فرمائی ہے اور جسکی تائید میں بصد ترقب و امید والتجا وار تجا کر رہا ہوں۔ حضرات تمام مسافرین جو بصرہ، کویت، بغداد، مصر، شام و بنادر خلیج فارس بلکہ تمام عالم میں سفر کرتے ہیں کسی کے لئے قرنطینہ مقرر نہیں ہے بجز حاجیوں کے اور سوائے ایام حج کے اگر دوسرے وقتوں میں جدہ و مکہ کا سفر کیا جاے تو اُنکے لئے بھی قرنطینہ نہیں ہوتا مگر ہوتا ہی تو صرف موسم حج میں اور خاص حاجیوں ہی کے لئے اور وہ بھی اس بے تمیزی کے ساتھ کہ مطلقاً اُنکے آسایش و آرام و حفاظت سرما و گرما کا خیال کچھ نہیں کیا جاتا نہ اون کے لئے کھانے پانی اور اشیاء خورد و نوش کا فراہم کیا جانا کچھ ضروری سمجھا جاتا ہی بلکہ وہ نہایت بیرحمی کے ساتھ لیٹرے دلالوں اور ظالم کوتوالی کے جوانوں کے حوالے ہوتے ہیں اور اون کی عورات اور بچے بھی اون سے علیحدہ و مجبور کردئے جاتے ہیں اور اسطرح ہر سال اُن کی نہایت ذلت و خواری و بیحرمتی ہوا کرتی ہے جس سے مسلمانوں کو نہایت صدمہ اور رنج پہنچ رہا ہی۔ آغاز و ابتدائی حصول اجازت سفر سے لیکر معاودت اوطان تک حاجی کشمکش میں پیس جاتے ہیں اور اُنکو اقسام اقسام کے تکالیف جسمی و روحی اور نقصانات عرضی و مالی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

ایحضرات ہر ایک انتظام کی غرض و غایت آسائش و آرام رعایا و بہبودی بہروزی ملک و دولت و اظہار تہذیب و تکمیل حالت تمدنی و انتظامی ہوا کرتی ہی جو موجب ترقی و زیب و زینت دولت و ملک ہے اور جس انتظام کی یہ حالت ہو کہ اُنمیں سے کوئی ایک غرض بھی اوس سے حاصل نہو بلکہ اونکے برخلاف موجب تکالیف و باعث نقصانات و سبب بدنامی و نارضامندی عمومی ہو تو اُسکا فوراً انسداد کرنا ضروری ہی تا رعایا ہی

مسلم کو دولت برطانیہ کی طرف سے جو عموماً یہ بدگمانی ہو رہی ہے کہ وہ خلاف اپنی مسلمہ اصول حکمرانی و آئین جہانبانی کے مداخلت و مزاحمت بتقدیم فرائض مذہبی کر رہی ہے وہ بالکل مرتفع و مندفع ہو جائے اور رعایا شکر گزار اور اپنی مذہبی مراسم کے انجام دہی میں آزاد رہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ ان مقاصد سے کسیکو انکار یا اسپر ہرگز کسیکو اصرار نہیں ہو سکتا بجز لارڈ کرزن کے سے جابر حاکم کے جنہوں نے رعایای بمبئی کی عرضداشت پر کچھ بھی توجہ و التفات نہیں کی بلکہ ایک نیم سرکاری اخبار کی ذریعے سے مسلمانوں کو یہ دھمکی دیگئی کہ اگر بمبئی کا بندر ہی بند کر دیا جائے تو اسوقت کیا ہوگا اور مسلمان کیا کرینگے۔ ظاہر ہے کہ بجز بدنامی و رسوائی دین و دنیا کے اور نفرین عقبیٰ کے کیا ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہم لارڈ کرزن کے کس کس کام کو روئیں اور کس کس دشمنی کو اپنے آنسوؤں سے دھوئیں ؎

ای کار جہانے شدہ از جور تو مشکل	مشکل کہ رود نقش ستمہای تو از دل

حصہ نظم

غزل جناب طاہر فرخ آبادی

عاشقوں کا کوئی پرسان عہد خوبانیں تھا	پھول بلبل کے ہوئے ماتم گلستاں میں تھا
نقص تھا سب میں مگر پرنور جاناں میں تھا	کون کہتا ہے کہ دھبا ماہ تاباں میں نہ تھا
ای صنم کیوں حضرت زاہد بنے میرے رقیب	کیا سلیقہ دلبری کا حور و غلماں میں تھا
محو مژگاں کسطرح دل کے پھپولے پھوڑتے	ہاں ملکر رہگئے نشتر رگ جاں میں نہ تھا
عمر بھر فریاد کی مینے تو کیا بیجا کیا	کوچہ جاناں میں تھا شہر خموشاں میں تھا
رزق خالق نے دیا بے منت اہل دول	شکر ہے حصہ ہمارا خوان احساں میں نہ تھا
میرے دل سے پوچھنا تھا سنگساری کا مزہ	تھا وہ دیوانہ جو بازیگاہ طفلاں میں نہ تھا
بیخودی میں حال دل کیا عرض کرتا آئینہ	اور ہی عالم میں تھا بزم حسیناں میں تھا
سکہ داغ جنوں سے میں بدلتا کس لئے	واہ سید ہا نام تک سکہ سلیماں میں نہ تھا

ہمکو سب کچھ ملگیا بچھڑا ہوا دل ملگیا
اس سے مطلب کیا ہی تھا یا کوئے جاناں میں تھا

کیوں کیا بدنام طاہر جوش وحشت نے مجھے
آنسوؤں کا تار بھی میرے گریباں میں تھا

غزل جناب رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

دام ہے طول امل اس سے رہا ہو جائے
رفتہ رفتہ یک دلِ بے مدعا ہو جائے

کارواں درد کا ہی کوی جاناں سے گزر
نالۂ پیہم سے آواز درا ہو جائے

نبضِ خس میں کیجئے پیدا حرارت شعلہ کی
یعنی اُس بیگانہ خو سے آشنا ہو جائے

جلوہ سرگرم نمائش ہے کھچا جاتا ہی دل
ہو اگر توفیق تو تجھپر فدا ہو جائے

دردمندان وفا کو بس ہی تیرا التفات
تیرے قربان اسی نگاہِ آشنا ہو جائے

ہم خدا خواہی و ہم دنیا ہی دون وحشت کیا
جستجو میں اُسکی برق ماسوا ہو جائے

غزل جناب شفق عماد پوری

تماشا ہی رہا دل میں مگر دل سے جدا ہو کر
ہوا نا آشنا وہ مجھ سے عالم آشنا ہو کر

ملینگے خاک میں محو خرام فتنہ زا ہو کر
تری رفتار پر مٹجائینگے ہم نقش پا ہو کر

بڑا ہونا توانی کا جو کوسوں ہمسے پیچھے تھے
وہ آگے قافلے سے بڑھگئے بانگِ درا ہو کر

کوئی بچکر کہاں جائے کہاں جاکر اماں پائے
بنی ہی جان کی گاہک ادا اُسکی قضا ہو کر

تلاشِ منزل مقصود میں خود آجتک گم ہیں
کسیکو خضر کیا رستہ بتائیں رہنما ہو کر

لہو پیتا ہوا دل سی جگر کی راہ نکلا ہے
کہاں پہونچا ہی اُسکا تیر ترکش سے جدا ہو کر

بکھیڑی عمر تونکے ہیں نہ جھگڑے آرزوؤں کے
تعلق سی بری ہیں ہم دل بے مدعا ہو کر

پہلا پھولا ہی پامال خرام ناز ہو جانا
مقدر رنگ لایا ہی شفق برگ حنا ہو کر

پہونچیگا خاک گوشۂ دامان یار تک
اُٹھتا نہیں زمیں سے ہمارا غبار تک

مدت سی ہمصفیر اسیر قفس ہیں ہم
کیسی خزاں گزر گئی فصل بہار تک

کیا دن تھی وہ کہ مست مئے بیخودی تھی ہم
کیسا سرور اب نہیں باقی خمار تک

اے چشم کیا ہی جامۂ ہستی کا اعتبار
زینت ترمی ہی پیرہن مستعار تک

زاہد سے بوجہ حسن عمل کا نہ اٹھ سکا
ہلکے یہاں ہیں سر پہ گناہوں کے بار تک

اب کسکی جستجو میں اڑاتی ہی سر پہ خاک
اے بیکسی وہ پھر گئے آکر مزار تک

اتنے گناہ ہیں کہ جو گنئے تو کیوں شفق
فرصت نہو شمار سے روز شمار تک

غزل جناب عبد الکریم نشتر چھپروی سلیم پوری - وارد کلکتہ

ہونٹوں پہ تبسم ہو تو آنکھوں میں حیا ہو
پس جائے ادا آپ وہ مستانہ ادا ہو

مستی ہو کچھ آنکھوں میں تو کچھ لغزش پا ہو
یوں بزم حریفاں میں وہ آئے تو مزا ہو

اپنے دل سوزاں کا تو میں ہوں خس و خاشاک
تم کسکے گلستان تمنا کی فضا ہو

ہشیار ہوا چاہئے گلبانگ نفس سے
دیکھو کہیں یہ شور نہ آواز درا ہو

ہی نور بصر اشک - نہ آنکھوں سے الگ ہو
ہی مونس دل ہاتھ - نہ سینے سے جدا ہو

اے دست جنوں! جیب و گریباں کی خبر لے
اے شعلۂ غم! خاطر محزوں کی دوا ہو

اے دیدۂ تر! قاعدۂ ضبط سے لے کام
اے نالۂ دل! ذوق فغانی پہ فدا ہو

اے تیر نظر! تیرا قدم مجھکو مبارک
اے زخم جگر حق مدارات ادا ہو

میں معتقد شیوۂ ارباب وفا ہوں
تم مجتہد رسم و رہ اہل جفا ہو

دلگیر سا کیوں آج نظر آتا ہی نشتر
تیر مژہ ناز کا گھائل نہ ہوا ہو

غزل حسرت فراق

وہ کس کس شرم سے عذر جفا تقریر کرتے ہیں
مگر پاس وفای عاشق دلگیر کرتے ہیں

بحسرت دیکھتے ہیں غیر پر لطف و کرم انکے
بنا کامی سپاس آہ بے تاثیر کرتے ہیں

گرفتاران غم کو کیا ضرورت قید ظاہر کی
ترے سودائیوں کو لوگ کیوں زنجیر کرتے ہیں

بھلا دیتی ہی مضموں - یاد اس محو تغافل کی
بڑی مشکل سے مکتوب وفا تحریر کرتے ہیں

نہیں یارا ای خاموشی کہانتک ضبط غم حسرت
فراق یار میں ہم نالۂ شبگیر کرتے ہیں

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خاں بہادر مدظلہ

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنی ہی افسانی میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

دُون کی بیٹھا ہوا لیتا ہی زاہد کیا کہوں
متقی ساقی سے بڑھکر کون میخانے میں تھا

ہائے پروانے کا وہ جلنا۔ وہ رونا شمع کا
میں نے روکا ورنہ کیا آنسو نکل آنے میں تھا

دیکھتا تھا جسطرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا دُنیا میں۔ وحشی آئینہ خانے میں تھا

دیر تک میں ٹکٹکی باندھی ہوئے دیکھا کیا
چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا

بُو رہا تھا۔ کچھ شیشے سے تھی۔ یا ٹوٹے سبو
اور کیا اسکے سوا مستوں کی غم خانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے اکثر قصہ خواں
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

خود غرض دُنیا کی حالت قابلِ نفرت تھی شاد
لُطف ملنے کا نہ اپنے میں۔ نہ بیگانے میں تھا

نقاب ایکدن اُلٹ دینا تھا اس دلدل آرا کو
ہم اپنا سا بنا لیتے کبھی تو اہلِ دنیا کو

کرم پیرِ مغاں کا مجھپہ ہی سب سے سوا لیکن
کفِ اغیار میں دیکھا ہی ان آنکھوں نے مینا کو

نگاہِ شوق مجنوں فرش سے تا عرش جاتی ہی
کہاں تک پردۂ محمل چھپائے روئے لیلا کو

لباسِ اہلِ تقویٰ پر نہیں کچھ منحصر واعظ
کہیں کیا ہمنے کس کس بھیس میں دیکھا ہی دنیا کو

بہک جاتے ہیں اکثر سالکانِ راہ اُلفت بھی
خدا نے کیا غضب تاثیر دی ہی روئے زیبا کو

زمانہ چاہتا ہی وزن ہر شے کا برابر ہو
گھٹا دیتا ہی اعلیٰ کو بڑھا دیتا ہے ادنا کو

اُمرا کانوں کے جھک آئے ہیں اُسکے روئے روشن پر
کہاں ہی آسماں صدقہ کرے عقدِ ثریا کو

جئیں یا حسرتِ دیدار میں ہم خاک ہو جائیں
قیامت تک خدا رکھے سلامت نازِ بیجا کو

جو اُن کو بے حجاب ایشاد دیکھا چاہتے ہو تم
جلا دو اور بھی آئینہ قلبِ مصفا کو

ہی عطا تری ہی کرم ترا وہ ستم کہ جسمیں دوام ہو
اگر اسمیں کوئی کلام ہو تو بہشت مجھپہ حرام ہو

جو ہوئے مسافرِ دشتِ غم ہوئی آسماں کو بھی اُنسے ضد
کئی رات خاک پہ رہیں اگر ایک رات قیام ہو

کبھی دشتِ غم میں پھرا کئے کبھی اُنکے در پہ پڑے رہے
رہیں مثل اپنے بنا فلک۔ کہ نہ کوچ ہو نہ قیام ہو

وہ پیام بر ہو کہ خود وہی کوئی شرح کیا کرے جھگڑا ہی
نہ مفصل اوسکا بیان ہو نہ مفصل انکا کلام ہو

یہ دو رنگیاں تو خلاف ہیں نہ بنے گی شاد سے ساقیا
جو خمار ہو تو ہمیشہ ہو۔ جو شراب ہو تو مدام ہو

جب میں کہتا ہوں گوارا مری ذلت نہ کرو | مطلع | سر جھکا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں "محبت نہ کرو"

دیا جو عشق مجھے تو نے سرفراز کیا
ازل میں عشق نے طینت کا امتیاز کیا
نہ خوش ہو کیوں مری مستانہ چال پر ساقی
کٹی تھی عمر صعوبت میں مرنیوالوں کی

ہر اک صفت سے مرے دل کو بے نیاز کیا
نیاز مند مجھے۔ تجھ کو بے نیاز کیا
تو میکدہ سے چلا رخ سوئے حجاز کیا
لحد میں پاؤں غریبوں نے اب دراز کیا

کچھ اس طرح سے چھپائے ہے اپنی مستی شاد
کہ میکدہ میں کسی نے نہ امتیاز کیا

غزل

نہ ہوا تجھ سے بھی چارہ کوئی بے چاروں کا
ذکر تک لب پہ نہیں بچھڑے ہوئے یاروں کا
بیکسی ساتھ دئے جاتی ہے بے چاروں کا
جوش الفت ہی جو ہو فصل بہاری میں شریک
حسن بے پردہ کو بازار میں لے آیا ہے شوق
رخنہ انداز نگاہوں سے نہیں لیتے ہیں کام

ہے غضب ڈھل گیا مکار ترے بیماروں کا
صبر کیوں لیتا ہے صیاد گرفتاروں کا
ترے بیماروں کا
پردہ کہلائے ابھی باغ کی دیواروں کا
چار سو بیٹھ ہے مجمع ہے خریداروں کا
پردہ رکھ لیتے ہیں اس کوچہ کی دیواروں کا

مطمئن ہو کے کہاں کھاتے ہیں روٹی دو دن
شاد کچھ پوچھ نہ احوال زمینداروں کا

زباں پہ مرتے ہوئے انکا نام آ ہی گیا
کہا تھا میں نے کہ واعظ جو نکا ذکر نہ چھیڑ
تمہارا راز مری درد دل نے کھول دیا
کل آ پڑا تھا جو رند و نمیں زاہد نا فہم

وہ اک خلوص جو تھا دل میں کام آ ہی گیا
خدا کے باب میں آخر کلام آ ہی گیا
ہزار ضبط کیا لب پہ نام آ ہی گیا
سنا کہ ذکر حلال و حرام آ ہی گیا

وصال شاد مبارک ہو کھولئے روزہ
کٹا پہاڑ سا دن وقت شام آ ہی گیا

قطعہ

رعایت نصف قیمت رعایت

گنج شایگاں - معروف بہ کمال قدیم شاہان ایران سے لیکر آجتک کے دنیا بھر کے بادشاہوں ریاستوں وغیرہ کے سکے جو ہمارے پاس ملے ہیں کہ سکوں کے دونوں رخوں کی اصلی تصویر۔ سال سوزن ماہیت عجیب چیزیں ہیں۔ ایک مبسوط فہرست تمام سلاطین ہندوستان اور جلال الدین اکبر کے سکوں کی دیگئی ہے (عہ)

تاج و نشان - معروف بہ تاج الملوک۔ قدیم شاہان ایران سے لیکر تمام سلطنتوں ریاستوں وغیرہ کے تاج و نشان۔ فوجی مارک و بیرک وغیرہ کی اصلی تصویر۔ ویت سے رنگتوں کے دکھائی گئی ہے (۱۸)

دستار و کلاہ - تمام دنیا کی مختلف قسم کی پگڑی۔ ٹوپی۔ خود۔ انگریزی عہدوں۔ فوجی تماشہ والوں انگریزی لڑکوں لڑکیوں۔ بیڑیوں کی مختلف اقسام کی ٹوپیاں۔ مختلف قوموں کی پگڑی و ٹوپیاں۔ ان سب کے حالات و تصویریں درج ہیں (۱۸)

جنگ روس و جاپان - ہر سہ حصہ میں فرنگ سے لیکر ہر ایک واقعہ کا تفصیلی بیان ہر ایک موقع کا نقشہ دونوں جانب کے تمام افسروں کی تصاویر تقریباً ۱۰۰ جنگی جہاز کل ۴۵ تو سادہ و نقشے ہیں اور ۷۵ مفصل بیانوں اور باجہ میں اس مشہور جنگ کے حالات لکھے ہیں عہ فی حصہ

احسن الافکار - فی مناقب غوث الابرار۔ غوث پاک کے مفصل سوانح۔ کرامات اور حالات مناقب مجموعہ و خوارق عادات مریدوں اصحابوں وغیرہ کا تذکرہ ۱۲ الاشتہر خبر نشانا نیز عظیم بک ڈپو مراد آباد (روہیلکھنڈ)

دیوان شیفتہ

مع دیباچہ مفید و ضمیمہ مشتمل بر غزلیات فارسی شیفتہ

از تصنیفات نواب مصطفیٰ خان دہلوی شاگرد رشید مومن

شیفتہ کا دیوان کیا گیا تھا جناب شیفتہ کے ہر اربعہ پایا گیا ہے۔ طلب کیجئے

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت حضرت شیخ العالم مخدوم [illegible] اردو ترجمہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

دیوان مجروح | میر مہدی حسین مجروح شاگرد غالب قیمت عہ

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ کئی کمال بھاگلپور کے چند زمیندار و رؤسائے شہر و بالا کام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہر گز نیت نہیں کہ وصف بالذات ہی اس سے مستفید ہو بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر ہمنشا اس کمپنی کا خاص یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے۔ پائدار نفیس ویسی قسم کے کپڑے از قسم لٹھا چادر دھوتی و صافہ و رومال و سوتی و لنگا و ٹوپیاں ہر قسم ہر رنگ کی دستیاب ہر قسم ہر رنگ کا دوپٹہ چھاپ سادہ و چکن ڈوریا و بافتہ وغیرہ لائق تیاری غیر والی و ایکسپن و پاجامہ ٹرسٹ انگریزی اندرون و بیرون و ہندوستان ہر جگہ بآسانی بھیجی جائیں۔ نفاست و پائداری میں یہ خاص بھاگلپوری کپڑے آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔

فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص طبع کی [illegible] رکھی گئی ہے [illegible]

اردوی معلےٰ

یعنی صحیح و فصیح اردو کا ایک ماہوار ... بابل ... ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان بالا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں ... صفحے ... کھائی چھپائی کاغذ بغایت پسندیدہ نمونہ کا پرچہ ۲ر کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے

(۱) رسالہ دواوین - للعہ رسالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ ہمراہ سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) سالانہ (برائے طلبا و غیر مستطیع حضرات) ... ضروری بنجلد دیگر مقاصد لٹریچر و پالیٹکس ... ضرورت خریداری بنام منیجر اردوی معلےٰ علی گڈہ

ے لہ چنانچہ شمارہ ۱۹۰۸ء میں (۱) رپورٹ اردو بمبئی کانگرس (۸ر) دیوان میر سوز (۳ر) اور دیوان قائم چاند پوری شاگرد سودا (۴ر) شائع ہوئے اور ۱۹۰۹ء کی ششماہی آخر میں دیوان حضرت استاد جرأت نذر کیگئے

دیوان غالب

سفید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا بدون خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا - مع شرح دیوان غالب قابل دید از فضیل محسن حضرت سوہانی بی - اے اڈیٹر اردوئے معلےٰ علیگڈہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶ جزو قیمت مع محصول صرف عہ

فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۳ تا صفحہ ۲۲ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں - (درخواست خریداری بنام منیجر اردوئے معلےٰ علیگڈہ)

دیوان مصحفی

حصہ اول - ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اردوئے معلےٰ - غزلوں کا انتخاب اس احتیاط اور خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے - کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا تینوں دیوان دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - کاغذ سفید تقطیع ۲۰×۳۰/۱۸ حجم ۱۶ جزو قیمت صرف (۸ر) مع محصول ڈاک

معلےٰ

درخواست خریداری بنام منیجر اردوی معلےٰ علی گڈہ

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ سرجن اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج پروفیسر نامور ڈاکٹر والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت و تاریکی چشم و ہند جالا - پڑوال غبار - پھولا سیل مرمی ابتدائی موتیا، ناخنہ، پانی جالا، خارش وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی بچہ سے لیکر بوڑھے تک یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ ممیرہ کا سفید اعلیٰ قسم فی تولہ تین روپیہ ہے خاص ممیرہ فی ماشہ پیشیں روپیہ -

مصری سرمہ فی تولہ ۴ر محصول ڈاک ... خریدار درخواست المشتہر

بدو فیر سیا سنگھ اہلو والیہ متعلم بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب

ان سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار سیا سنگھ صاحب نے خود بنایا ہے آپنے داد جتبے مریضوں پر استعمال کرکے دیکھا ہے اور میں اس امر کا بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نادر ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کیواسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنی تجربہ میں آجتک کوئی سرمہ اس سے بہتر فائدہ بخش نہیں دیکھا - میں ان کو جنکی آنکھوں میں ذرا بھی کسی قسم کی شکایت ہے بڑے زور سے استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں - ہر طرح سے مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا - پانی آنے و ہند خارش - سرخی چشم کیواسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا - اور سچ مچ آپنے اسقدر سستے داموں میں یہ سرمہ ایجاد کرکے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہے اسکا شکریہ ادا نہیں ہونا محال ہے - ضرور ہے کہ ملک تمام لوگ آپکے سرمہ سے فیضیاب ہو کر فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں -

رام - پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور نواب صاحب بہادر بہاولپور

رجسٹرڈ نمبر ۲۵۱

اردوئے معلیٰ

جلد (۶)	بابت ماہ فروری ۱۹۰۶ء	نمبر (۲)

مرتبہ پرنسپل احسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

(۱) [illegible] از مولوی سید [illegible] صاحب ۱

از عظیم آبادی ۱۵

(۲) [illegible] از مولانا [illegible]

صاحب شہری ۱۷

(۳) [illegible] از اسلم میرٹھی

(۴) [illegible] ۲۳

(۵) دار السلطنت فرانس کی سیر از [illegible]

(۶) مکتوبات امیر مینائی از مولانا ناقد

(۷) ایک پر لطف تحقیق از حضرت وصل بلگرامی

(۸) حصہ نظم مع غزلیات حضرت شاد

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علیگڈھ

احسن المطابع واقع علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ

(عہ ۱ مع محصول)

ٹرکش مارٹ

حضرات ملک۔ حال ہی میں ہمنے یورپ سے ایک بہت بڑا
لاٹ ٹرکی ٹوپیوں کا منگایا ہے جو ہر رنگ ہر سائز ہر زمانی
و عالمی ہر قسم کی اپنے اپنے طرز میں ایک دوسرے سے بالکل نرالی
اپنی نظیر آپ ہیں ان ٹوپیوں کا فیشن بھی ہمنے بڑے غور و
فکر کے بعد تہذیب و تمدن کو مدنظر رکھ کے تجویز کیا ہے
جسکا نمونہ غالباً کوئی اور کمپنی پیش نہیں کر سکتی مزید
براں قابل توجہ یہ بات ہے کہ ہمارے مشہور ماڈلوں میں
میکرز نے حسب فرمائش ان ٹوپیوں میں برٹش ٹیس
استر پر ہمارا قابل دید بے نظیر اسلامی ٹریڈ مارک
اور ہمارے مجوزہ پیٹنٹ نام مثلاً حمیدیہ حبیبیہ عثمانیہ
عثمانیہ۔ اسلامیہ۔ علی گڈھ حیدر آباد وغیرہ زرین حروف
میں کندہ کرکے اپنا کمال فن دکھایا ہے

لہذا معززین قوم و تاجران ملک سے استدعا ہے
کہ اپنی خاص توجہ مبذول کرکے بذریعہ خط کتابت
استفسار شروع کریں یا کچھ یاں نمونتاً روانہ کرنیکی اجازت
اور ہماری خوش معاملگی کو ملاحظہ فرمائیں ہمارے اسٹاک
میں ولایتی۔ اطالین آسٹریں اور انڈین ساخت کی
ترکی ہیٹ بن بالدار۔ کشتی نما۔ مہاراجہ سائیکل کیپ چھوٹی
بڑی دیوار کی کم و بیش قیمت کی موجود ہیں علاوہ اسکے چھاتی
کے استر کی ترکی ٹوپیاں جنکا ملک کو ایک مدت سے انتظار
تھا موصول ہوئی ہیں عمدہ استنبولی پھندنے اور نفیس ولایتی
کیس کے ساتھ فی عدد ساڑھے چار روپیہ۔

المشتہر

ٹرکش مارٹ ۱۶ بھنڈی بازار بمبئی

ملکہ فرخ مرزا

اس ناول کا لطف زبان اور حسن بیان دیکھنے کے قابل ہے
واقعات کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ ہر واقعہ کی تصویر
آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے در مذاق نصیحت حسن و عشق
ہجر و وصل۔ غرضکہ جو کچھ مدعیم اشتمل مصنف کے ہر نوشتہ قلم
سے نکلا ہے وہ لکھنؤ کی ستھری زبان کا ایک دریا ہے کہ بہا چلا
آرہا ہے ساتھ اوسکی اشک شوخ کر رہا ہے کہ لطف پیدا
خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے یہ ناول نوجوان امرد کے
ایک خاص تجربے کا باعث ثابت ہوا ہے جسکی تصدیق اس
زبان کیا ہوگی کہ طبع ثانی کی بھی اب چند جلدیں باقی ہیں
قیمت در محصول ۱۲ خریدار نشان دیکھ کر شتاب ہر سکتا ہے

المشتہر

حضرت حیدر آباد دکن محلہ افضل گنج مکان مولوی عبد الرحمن
صاحب وکیل

دیوان شیفتہ

طبع دوبارہ مشتمل بر فرمائشات نادر شیفتہ

از تصنیفات نواب مصطفیٰ خان دہلوی شاگرد رشید
مومن

شیفتہ کا دیوان کمیاب ہو گیا تھا اب طبع کرکے اعلیٰ سے چھپوایا گیا ہے
جلد طلب کیجئے

انوار العیون فی اسرار المکنون

ملفوظات و حالات حضرت شیخ العالم مخدوم عبد الحق ردولوی
قدس اللہ سرہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

قیمت ۸ر

دیوان مجروح

میر مہدی حسین مرحوم شاگرد غالب۔ قیمت عہ
درخواست خریداری بنام منیجر اردوی معلی علیگڈھ

شاعری

شاعری رضائے الٰہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ یا معنی کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین فطرت ہیں جنہوں نے مشیت الٰہی کو نفاذ پایا ہے اور جنکے مطالبات عالم درونی و بیرونی نشو و نما پاتے گئے ہیں پس جاننا چاہیے کہ اسی عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ یا معنی کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے شاعری ہے۔

واضح ہو کہ عالم دو نوع پر منقسم ہے ایک عالم خارج ہے اور دوسرا عالم باطن پس جب عالم دو نوع پر منقسم ہے یعنی مادی اور غیر مادی تو مضامین بھی جو اُنسے متعلق ہوں ضرور ہے کہ ہر رنگ سوں چنانچہ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ جو مضامین اشیائے فی الخارج سے تعلق رکھتے ہیں اون کا رنگ جدا ہے۔ اور جو امور ذہنیہ سے متعلق ہیں اُن کی کیفیت کچھ علیحدہ ہے اسی فرق رنگ کے اعتبار سے شاعری دو قسم پر تقسیم پاتی ہے یعنی شاعری متعلق بعالم خارج جسے بزبان انگریزی آبجکٹو (Objective) اور شاعری متعلق بعالم ذہن جسے بزبان انگریزی سبجکٹو (Subjective) کہتے ہیں۔ اول قسم کی شاعری جسکا نام راقم خارجی رکھتا ہے ایسے بیانات پر مشتمل ہوتی ہے جنسے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات رزم بزم جلوس فوج محل احتشام سیاحین باغ تصور چمن گلزار سبزہ زار لالہ زار جبال بحور صحرا دشت بیابان ریگستان خارستان جنگل آبستان چشمے ہوا ابر برق باراں سیل برق شفق صبح شام روز شب قمر سیارے ثوابت قطب بروج و دیگر خارجی اشیا کے متعلق ہوتے ہیں بعض شعرا میں اس قسم کی شاعری کی صلاحیت ایسی دیکھی جاتی ہے کہ اُن کے بیان سے معاملات خارجیہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور جو لطف اعلیٰ درجے کے مصور کی نقاشیوں سے اٹھتا ہے وہی لطف اونکے بیان سے پیدا ہوتا ہے یورپ میں اس رنگ کے شاعر کی مثال (انگریزی شاعروں میں) سر والٹر اسکاٹ

شاعری کی تقسیم اور دو قسموں کا بیان

اور اردو شاعروں میں کسیقدر نظیر اکبرآبادی ہے۔ یورپ اور ایشیا دونوں میں اس رنگ کے کچھ ایسے شعرا گزرے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی معاملہ رزم کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ رزم آنکھوں کے سامنے ظہور میں آرہا ہے اسیطرح اگر انہوں نے جبال و بحور و صحرا وغیرہ کے حالات موزوں کئے ہیں تو یہ سب موجودات فی الخارج پیش نظر معلوم ہوتی ہیں اس طرح کی واقعہ نگاری پر قادر ہونا آسان امر نہیں ہے جبتک کہ شاعر کو معاملات خارجیہ پر غور اور فطرت اللہ کی تبعیت کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل نہوگی اپنے بیانات میں تصویر کا عالم نہیں پیدا کرسکیگا دوسری قسم کی شاعری جسکو راقم داخلی موسوم کرتا ہے تمامتر ایسے مضامین سے متعلق ہوتی ہے کہ جنکو سراسر امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے یہ شاعری انسان کے قوائے داخلیہ اور واردات قلبیہ کی کیفیتوں کی مصوری ہے اس رنگ کے بھی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گزرے ہیں منجملہ اُن کے انگریزی شعرا میں لارڈ بیرن (Lord Byron) ہے اور اردو شاعروں میں میر تقی۔ اس رنگ کے شاعروں نے اگر عشق کو بیان کیا ہے تو عشق کی تصویر سامنے لاکر کھڑی کردی ہے اسی طرح اگر انہوں نے غم حسد رنج ملال افسوس حسد بغض رشک محبت عداوت رغبت نفرت وغیرہ وغیرہ کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسے ایسے امور ذہنیہ کے بیان میں مصور کی قلمکاری کا لطف دکھایا ہے۔ بہرحال ان دونوں رنگوں کے شعرا کے کلام مختلف زبانوں میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسیکو معاملات خارجیہ کے بیان پر قدرت حاصل تھی اور کسیکو امور ذہنیہ کے اظہار کو الیف کی صلاحیت مودعہ تھی۔ علاوہ اسکے کچھ ایسے شعرا بھی اقوام مختلفہ میں دیکھے جاتے ہیں کہ دونوں رنگ کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور اسی دوہری قابلیت کی وجہ سے اُن کی شہرت آجتک برقرار ہے بلکہ ترقی علوم و فنون کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے اس جامعیت کی مثال ہومیر ورجل فردوسی شیکسپیر ملٹن گرٹی میر انیس والمیکی بیاس اور کالیداس ہیں۔

جاننا چاہئے کہ شاعری کے مذاق صحیح و غیر صحیح کا مدار انہیں معاملات خارجیہ

اور امور ذہنیہ کی دانست پر ہے جن شعرا نے عالم درونی و بیرونی کے مضمون کو ملحوظ رکھکر مضمون بندی کی ہے اُن کی شاعری مذاق صحیح سے خالی نہیں ہو سکتی۔ عالم خارج و داخل کے تقاضوں پر لحاظ رکھکر کاربند ہونا تبعیت فطرت ہے پس جب کوئی شاعر تبعیت فطرت کی پابندی کے ساتھ مضمون بندی کریگا تو عام اس سے کہ اوسکی شاعری کا انداز خارجی ہو یا داخلی اوسکی شاعری ضرور فطرتی ہوگی اسی فطرتی شاعری کو مذاق صحیح کا مصداق سمجھنا چاہیے برخلاف اسکے اگر کوئی شاعر معاملات خارجیہ و ذہنیہ کے تقاضوں سے انحراف کرے یعنی تبعیت فطرت نہ کرے تو اوسکی شاعری مذاق غیر صحیح کا نقشہ پیدا کریگی۔

اسی اصول پر سخن فہموں کے مذاق کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور حق یہ ہے کہ سخن فہم کو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور اونکے تقاضوں کی اطلاع خود شاعر کے برابر یا شاعر سے بھی زیادہ درکار ہے اگر زیادہ نہو تو شاعر کے برابر تو ہو کسواسطے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ فطرتی مضامین شاعر کو تبعیت فطرت کے قصد کے بغیر بسبیل الہام تفویض ہوتے ہیں اور خود شاعر اپنے کلام کی خوبیوں سے شعر گوئی کے وقت آگاہ نہیں رہتا ہے بلکہ بہت ایسے مضامین اوسکے قلم سے الہامی طور پر نکل آتے ہیں کہ سخن فہموں کو اوسکی خوبیاں بعد فکر و غور کے درک میں آتی اور شاعر اونکی اطلاع سے ممکن ہے کہ تا دم آخر محروم رہجائے پس ایسی صورت میں ضرور ہے کہ سخن فہم معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی نہایت صحیح اطلاع رکھے ورنہ شعر فہمی میں عاجز رہیگا اسلئے ذی فہموں نے کہا ہے کہ شعر گوئی سے شعر فہمی مشکل ہے۔ یہ قول اگر تمامتر صحیح نہ بھی مانا جائے تاہم اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ شعر فہمی ایک دشوار امر ہے کسواسطے کہ اسکے واسطے بڑے مذاق صحیح کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاق صحیح کسیکو نہیں حاصل ہو سکتا ہے جبتک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور اونکے تقاضوں سے آگہی بدرجہ اتم حاصل نہو جب تک انسان بحد امکان اسکی واقفیت پیدا کرلے زنہار دعوی سخن فہمی نکرے کیا تعجب کی بات ہے کہ بعض اشخاص

اور اُردو شاعروں میں کسیقدر نظیر اکبرآبادی ہی۔ یورپ اور ایشیا دونوں میں اس رنگ کے کچھ ایسے شعرا گزرے گئے ہیں کہ اگر اُنہوں نے کسی معاملہ رزم کو حوالہ قلم کیا ہی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ رزم آنکھوں کے سامنے ظہور میں آرہا ہی اسیطرح اگر اُنہوں نے جبال و بحور و صحرا وغیرہ کے حالات موزوں کئے ہیں تو یہ سب موجودات فی الخارج پیش نظر معلوم ہوتی ہیں اس طرح کی واقعہ نگاری پر قادر ہونا آسان امر نہیں ہی جبتک کہ شاعر کو معاملات خارجیہ پر غور اور فطرت اللہ کی تبعیت کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل نہو گی اپنے بیانات میں تصویر کا عالم نہیں پیدا کر سکیگا دوسری قسم کی شاعری جسکو راقم داخلی موسوم کرتا ہے تمامتر ایسے مضامین سے متعلق ہوتی ہے کہ جنکو سراسر امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے یہ شاعری انسان کے قوای داخلیہ اور واردات قلبیہ کی کیفیتوں کی مصوری ہے اس رنگ کے بھی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گزرے ہیں منجملہ اُن کے انگریزی شعرا میں لارڈ بیرن (Lord Byron) ہی اور اُردو شاعروں میں میر تقی۔ اس رنگ کے شاعروں نے اگر عشق کو بیان کیا ہے تو عشق کی تصویر سامنے لاکر کھڑی کردی ہے اسی طرح اگر انہوں نے غم غصہ رنج ملال افسوس حسد بغض رشک محبت عداوت رغبت نفرت وغیرہ وغیرہ کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسے ایسے امور ذہنیہ کے بیان میں مصور کی قلمکاری کا لطف دکھایا ہے۔ بہرحال ان دونوں رنگوں کے شعرا کے کلام مختلف زبانوں میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسیکو معاملات خارجیہ کے بیان پر قدرت حاصل تھی اور کسیکو امور ذہنیہ کے اظہار کو الف کی صلاحیت مودعہ تھی۔ علاوہ اسکے کچھ ایسے شعرا بھی اقوام مختلفہ میں دیکھے جاتے ہیں کہ دونوں رنگ کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور اسی دوہری قابلیت کی وجہ سے اُن کی شہرت آجتک برقرار ہے بلکہ ترقی علوم و فنون کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے اس جامعیت کی مثال ہومیر ورجل فردوسی شیکسپیر ملٹن گرٹی میرانیس والمیکی بیاس اور کالیداس ہیں۔

جاننا چاہیے کہ شاعری کے مذاق صحیح و غیر صحیح کا مدار انہیں معاملات خارجیہ

اور امور ذہنیہ کی دانست پر ہے جن شعرا نے عالم درونی و بیرونی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھکر مضمون بندی کی ہے اُن کی شاعری مذاق صحیح سے خالی نہیں ہو سکتی۔ عالم خارج و داخل کے تقاضوں پر لحاظ رکھکر کاربند ہونا تبعیت فطرت ہے پس جب کوئی شاعر تبعیت فطرت کی پابندی کے ساتھ مضمون بندی کریگا تو عام اس سے کہ اوسکی شاعری کا انداز خارجی ہو یا داخلی اوسکی شاعری ضرور فطرتی ہوگی اسی فطرتی شاعری کو مذاق صحیح کا مصداق سمجھنا چاہیے برخلاف اسکے اگر کوئی شاعر معاملات خارجیہ و ذہنیہ کے تقاضوں سے انحراف کرے یعنی تبعیت فطرت نہ کرے تو اوسکی شاعری مذاق غیر صحیح کا نقشہ پیدا کریگی۔

اسی اصول پر سخن فہموں کے مذاق کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور حق یہ ہے کہ سخن فہم کو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور اونکے تقاضوں کی اطلاع خود شاعر کے برابر یا شاعر سے بھی زیادہ درکار ہے اگر زیادہ نہو تو شاعر کے برابر تو ہو کسواسطے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ فطرتی مضامین شاعر کو تبعیت فطرت کے قصد کے بغیر بسبیل الہام تفویض ہوتے ہیں اور خود شاعر اپنے کلام کی خوبیوں سے شعر گوئی کے وقت آگاہ نہیں رہتا ہے بلکہ بہت ایسے مضامین اوسکے قلم سے الہامی طور پر نکل آتے ہیں کہ سخن فہموں کو اوسکی خوبیاں بعد فکر و غور کے درک میں آتی اور شاعر اونکی اطلاع سے ممکن ہے کہ تا دم آخر محروم رہجاے پس ایسی صورت میں ضرور ہے کہ سخن فہم معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی نہایت صحیح اطلاع رکھے ورنہ شعر فہمی میں عاجز رہیگا اسلیئے ذی فہموں نے کہا ہے کہ شعر گوئی سے شعر فہمی مشکل ہے۔ یہ قول اگر تمامتر صحیح نہ بھی مانا جاے تاہم اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ شعر فہمی ایک دشوار امر ہے کسواسطے کہ اسکے واسطے بڑے مذاق صحیح کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاق صحیح کسیکو نہیں حاصل ہو سکتا ہے جبتک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور اونکے تقاضوں سے آگہی بدرجہ اتم حاصل نہو جب تک انسان بحد امکان اسکی واقفیت پیدا کرلے زنہار دعوی سخن فہمی نکرے کیا تعجب کی بات ہے کہ بعض اشخاص

جو عالم مادی اور عالم ذہنی کا فرق تک نہیں سمجھتے ہیں شعرا کی نسبت رائے زنی کیلئے مستعدی ہو جاتے ہیں اور بے محابا جو کچھ منہ میں آجاتا ہے فرما جاتے ہیں ایسے حضرات سے جب چاہیے سن لیجیے کہ فلاں شاعر نے خوب غزلیں لکھی ہیں فلاں شاعر نے خوب قصیدے لکھے ہیں فلاں شاعر نے خوب مثنویاں کہی ہیں حالانکہ یہ بھی ان حضرات کو نہیں معلوم کہ غزل کو کس قسم کے مضامین سے تعلق ہے اور قصیدے اور مثنویوں کے لئے کن اقسام کے مضامین درکار ہیں یعنی انہیں اسکی کوئی خبر نہیں کہ غزل قصیدہ و مثنوی کے لئے معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کے متعلق مضامین درکار ہیں یا دونوں کے مضامین کی آمیزش کی حاجت ہے۔ پس جب کسی شخص کو ان باتوں کی تمیز نہ ہوگی تو وہ فطرتی اور غیر فطرتی شاعری کے پہلو کیا سمجھے گا پھر ایسے شخص سے سخن فہمی اور شاعروں کی قدر دانی کی کیا امید کیجا سکتی ہے سخن فہم کو فطرت اللہ سے وفور اطلاع کی بڑی حاجت ہے ایسے شخص کی اطلاع کو بہت وسیع ہونا چاہیے۔ ضرور ہے کہ ایسا شخص معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور واقفیت اسکی محصلانہ طور کی ہو محصلانہ سے مراد حکیمانہ ہے یعنی یہ نہیں کہ عدم ترتیب کے ساتھ ہزاروں امور سے واقفیت رکھتا ہو مگر اس بے ترتیبی کے سبب سے اپنی دانستہ سے کوئی کام نہ لے سکے۔ مرد محصل کے خیالات سلسلہ وار اور منتظم ہوتے ہیں اور فطرت اللہ کے سمجھنے کے لئے اس ترتیب و انتظام کی بڑی ضرورت ہے۔ المختصر شعر فہمی حکیم کا کام ہے اور شعرا کی نسبت رائے زنی آسان امر نہیں ہے پس مناسب نہیں ہے کہ غیر محصل اشخاص رائے زنی کی تکلیف کو اپنے اوپر گوارا کریں۔

جیسا کہ سابق میں عرض ہوا کہ سخن فہم کو فطرت اللہ سے محصلانہ اطلاع درکار ہے اس عدم اطلاع سے حضرات ناواقف عجب عجب طرح کے مغالطے میں پڑتے ہیں بعض اشخاص معاملات فطرت سے ناواقف رہنے کے باعث مجرد شوکت لفظی کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں اور اسی غلط خیالی میں ہمیشہ مبتلا رہ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ مجرد شوکت لفظی کوئی شے نہیں ہے شاعری زنار شوکت لفظی نہیں۔ شاعری کلدار خوش

خیالی پر ہے و شوکت لفظی پر شاعری کی جان خوشخیالی ہے شوکت لفظی شاعری کا کوئی جزو بدن نہیں ہے البتہ شوکت لفظی ملمع شاعرہ کا حکم رکھتی ہے اور تب ہی خوشنما معلوم ہوتی ہے کہ قطع برید سے درست ہو اور جس مضمون کو پہنائیں وہ جامہ زیب بھی ہو ورنہ شعر سعدی صادق آئیگا ؎

اگر بود بر عروس ناز یبا	بدنما بیفتی و دیبا

اسمیں شک نہیں کہ اگر موقع کی شوکت لفظی ہوتی ہے تو اس سے شاعر میں ایک ہیبت پیدا ہوتا ہے لیکن اگر شوکت لفظی بدقرینگی کے ساتھ ہے یعنی فطرت اللہ کی تبعیت کے ساتھ نہیں ہے تو ایسی شوکت لفظی شخص محصل کی آنکھ میں بدنما معلوم ہوگی گو اس سے غیر محصل اور ناقص التعلیم کو چکا چوندہ لگ جاے۔ اکثر شوکت لفظی اس قسم کی ہوتی ہے کہ حکیم اوس سے نافر اور جاہل اوسکی طرف راغب ہوتا ہے۔ کمتر شوکت لفظی ایسی دیکھی جاتی ہے کہ تبعیت فطرت کے ساتھ اُس سے کسی مضمون عالی کی بندش ظہور میں آئی ہو۔ جاننا چاہیے کہ مسائل محققہ اور امور فطرتی کبھی محتاج شوکت لفظی کے نہیں ہیں وہی شعرا اس سے کام لیتے ہیں جو اپنے غیر فطرتی اقوال کو پُر از شان و شکوہ دکھایا چاہتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا سادگی ہے اور جب کلام تبعیت فطرت کے ساتھ ہوگا ضرور اوسمیں سادگی ہوگی

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی	قباے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

المختصر جاننا چاہیے کہ بموقع کی شوکت لفظی نہایت نامطبوع امر ہے اور اسلئے قابل حذر ہے جب بموقع اس کا استعمال ہوگا تو کبھی تقاضاے فطرت کے مطابق نہ ہوگا اور جب تبعیت فطرت کی باقی نہیں رہی تو حکیمانہ دماغ کو ایسے پُرشکوہ غیر فطرتی کلام سے مطلبی حاصل نہیں ہو سکتا۔ شوکت لفظی کی مثال مصوری کی پیرائی میں یہ ہے کہ مثلاً کسی مصور سے کہا جائے کہ ایک عربی گھوڑے کی تصویر کھینچ لاؤ اگر مصور صاحب مذاق صحیح ہے یعنی مرد محصل ہے تو اپنی اطلاع کے مطابق جیسا کہ عربی گھوڑا ہوتا ہے ویسے ہی اوسکی تصویر کھینچ لائیگا لیکن اگر بدمذاق ہے یا جان بوجھکر

فطرت اللہ سے عداوت رکھتا ہی تو ترقی شان و شوکت کی نظر سے تصویر کشی میں [illegible]
اللہ سے اور [illegible] ممکن ہی انکار کریگا مثلاً گھوڑے کے بدن کو دھانی رنگ دیگا سم لعل
کے کان یاقوت کی آنکھیں نیلم کی منہ فیروزہ کا پیشانی پکھراج کی دم مقیش کی بنا دیگا
بلکہ اسپر بھی قناعت نہ کرکے گھوڑے پر بھی جواہر نگار لگا دیگا۔ گھوڑے کی ایسی تصویر
عالم فطرت کو جیسی مکروہ معلوم ہوگی محتاج بیان نہیں ہے مگر غیر محصل شخص تو ایسے بو
قلمونی الوان و مرصع کاری کو دیکھکر جان و دل سے محو سہو ہو جائیگا یہی حال نا تعلیم
یافتہ آدمی کے قسم کے مذاق کا ہی شخص غیر محصل لباس وہی اختیار کرتا ہی جو رنگا رنگ
اور زر آلود ہو گھوڑے ہاتھی لڑکے بالے نوکر چاکر سبکی آراستگی اوسی نامطبوع ترکیب
سی پسند کرتا ہی مکان اسی مذاق کے ساتھ تعمیر کرتا ہے مختصر یہ ہے کہ جو کچھ کرتا ہے
جاہلانہ طنطنہ و شکوہ کے ساتھ کرتا ہی خیر راقم نے جو مصوری کے پیرایہ میں مثال بالا
عرض کی اوسمیں چنداں مبالغہ کو دخل نہیں ہے غیر محصل اشخاص کا مذاق ایسا ہی ناپسندیدہ
انداز کا ہوتا ہی بہرکیف یہ مثال تو مصوری کے پیرایہ میں تھی اگر شعرای ایشیا کے کلاموں
میں ایسی مثالیں ڈھونڈھے تو بیشمار ملتی ہیں واقعی شعرای ایشیائی نے ملوک
امرا کو عجب تماشے کا گھوڑا بنا رکھا ہی اگر گھوڑے کو بلند دکھایا ہی تو اوسکی بلندی
کو آسمان سی بھی زیادہ رفیع دکھلایا ہی چنانچہ ظہیر فاریابی نے اپنی ممدوح کے گھوڑی کو اسقدر
بلند دکھلایا ہی کہ عرش اللہ تعالی بھی اوس سی کچھ نیچا ہی نظر آتا ہی فرماتے ہیں شعر

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا	تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

اس شعر کا بے تکا پن محتاج بیان نہیں ہی مگر سعدی کہ شاعری کا مذاق صحیح رکھتے
تھے نہایت تبعیت فطرت کے ساتھ فرماتے ہیں۔ شعر

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان	نہی زیر پای قزل [illegible]

شوکت لفظی کے علاوہ عوام رعایت لفظی کو بھی جان شاعری قیاس کرتے ہیں
حالانکہ رعایت لفظی بجای خود کوئی شئی نہیں ہی اور شاعری سے اسکو کوئی تعلق ضروری
نہیں ہی اگر بے تکلف کسی شعر میں رعایت لفظی کی صورت پیدا ہو جای تو ایسی رعایت

لفظی خالی از لطف تصور نہیں ہے مگر بہ تکلف رعایت لفظی کا التزام عرفت ناپسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ سبھی شاعری کے بہت منافی ہے بعض شعرا کو رعایت لفظی کا مرض ہوتا ہے اور غیر محصل اشخاص اونکے کلام کو محض رعایت لفظی کے خیال سے پسند کرتے ہیں رعایت لفظی تبھی لطف دیتی ہے کہ باخود الفاظ میں معنوی تعلق موجود ہو ایسی صورت میں رعایت لفظی انتخاب الفاظ مناسب مربوط کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔

منجملہ بدمذاقیوں کے غیر فطرتی مبالغہ پردازی بھی ایک نہایت ناپسندیدہ امر ہے اسکے مرتکب ایشیائی شعرا بہت دیکھے جاتے ہیں ان شعرا کی اس بدمذاقی کا سبب بیشتر بادشاہ اور امرا ہوتے گئے ہیں۔ تقرب سلطانی نے اکثر عالی دماغ اور عالی خیال شعرا کو بھی برباد کر ڈالا ہے عوام مبالغہ پردازی کو عین شاعری سمجھتے ہیں حالانکہ فطرتی شاعری میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

سوای ان لغویات کے غیر محصل اشخاص بہت سے صنایع بدیع کو ضروریات شاعری سے شمار کرتے ہیں لیکن اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے ایسے ڈھکوسلوں کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس مقام پر ایک اور بھی بدمذاقی کا اعادہ ضرور معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعرا کبھی پست خیالی کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں شاعر کے لئے پست خیالی عیب ہے حقیقت حال یہ ہے کہ بعض شاعر فطرت کے رو سے پست خیال ہوتے ہیں اور اون کی طبیعت ہمیشہ پستی کیطرف میلان رکھتی ہے۔ راقم ایسے حضرات کو شاعر کے معزز خطاب کے قابل نہ سمجھکر اور شاعر سے فرق کرنے کی نظر سے شعر گو کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ایسے حضرات بلا تامل زنان بازاری کے مناقب لکھنے کے لئے تلے رہتے ہیں [illegible] غزل سرائی میں انہیں فواحش کو معشوق قرار دیتے ہیں اور کلام کی ترکیب ایسی بری رکھتے ہیں کہ جس سے معشوق بازاری کے سوا معشوق حقیقی مراد لیا جا ہی نہ سکے۔ اسی طرح جوش جوانی وغیرہ کا بیان اس بدمذاقی کے ساتھ کرتے ہیں کہ جس سے دلی تنفر پیدا ہوتا ہے بیشک عہد جوانی بہت جوش انگیز ہوتا ہے اور تقاضائے بشریت سے ناجائز

مبالغہ پردازی

صنایع بدیع

پست خیالی

امور کی طرف طبیعت کو میلان ہی ہوتا ہے مگر ایسے معاملات [illegible]
اس قابل نہیں ہیں کہ شاعر اون کو [illegible] محبت کے ساتھ شعروں میں باندھے
اور وہ شعر زانو پر ہاتھ مار مار کر پڑھے جائیں

مکروہ مضامین

مکروہ مضامین سے حتی الامکان اجتناب واجبات سے ہے مجرد نیچرل ہونے سے
کوئی مضمون شاعر کے اختیار کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے ہزاروں مضمون ایسے
ہیں کہ جو نیچرل یعنی فطرتی ہیں مگر اس سے ضرور نہیں کہ شاعر یا ناولسٹ اُنکو حوالہ
قلم کر ڈالے پستی خیالات سے احتراز پہلا کام شاعر اور ناولسٹ کا ہے۔

بدمذاقی جدید

سابق میں جو بدمذاقیاں حوالہ قلم ہوئیں بیشتر اونمیں قدیم سے چلی آتی ہیں اور
امراض قدیمہ سے شمار کیجا سکتی ہیں مگر اس زمانے میں ایک نئی بیماری پیدا ہوئی ہے
اور وہ یہ ہے کہ اکثر اد ہورے انگریزی خوانوں کے دماغ میں اس خیال خام نے
جگہ کر لی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہو گئی ہیں ایشیا کو خوبی کا کوئی حصہ ملا ہی
نہیں ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس زمانے میں یورپ نے مادیات میں بڑی ترقی کی
ہے یہاں تک کہ اکابر علمای یورپ خدا سے بھی مستغنی نظر آتے ہیں یہ کوئی تعجب
کی بات نہیں ہے علوم مادیات کا یہی تقاضا ہے کہ انسان تدہر اختیار کرے چنانچہ
یہ امر محقق ہے کہ انسان جسقدر مادیات میں ترقی کرتا جاتا ہے روحانیات سے دور پڑتا
جاتا ہے حتی کہ آخر کار خدا اور تمام روحانیات سے منکر ہو بیٹھتا ہے۔ خیر جو کچھ یورپ
تدہر کی حالت میں مبتلا ہو رہا ہے اوسکی مادی ترقیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا
مگر اس سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی ہے کہ اگر یورپ ساری خوبیوں سے معمور ہے تو
ایشیا تمام خوبیوں سے محروم ہے قصور معاف اکثر ہمارے نئی روشنی والے حضرات
کا تو ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے وہ ایشیائی خیالات اوضاع و معاملات کو بالکل
قابل نفرت سمجھتے ہیں یورپ کے ہر امر پر عام اس سے کہ معقول ہو یا غیر معقول جان
دئے دیتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال سے عجب طرح کی نادیدگی ظاہر کرتے ہیں
جا و بیجا ہر قدم پر اہل یورپ کے تتبع پر مستعد رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے

خدا صاف و صاف [illegible] مبارک تک کبھی پہونچا ہی نہیں
ان حضرات کی اولاد اولیاں [illegible] اسدرجے کو پہونچ گئی ہیں
کہ ایشیائی شاعری بھی اُن کی نظر میں ذلیل و محقر معلوم ہوتی ہے حالانکہ خود
اہل یورپ اسکے مقر ہیں کہ ابھی تک اُنمیں ایشیائی خیالات شاعرانہ سے آشنائی
پیدا نہیں ہوئی ہے اور بہت کچھ اونکو معلوم کرنا ہے چنانچہ اسوقت تک جو کچھ اونکو
ایشیائی شاعری سے اطلاع کی شکل پیدا ہوئی ہے وہ پایۂ اعتبار نہیں رکھتی ہے
اسپر بھی جسقدر وہ مطلع ہو چکے ہیں اُس حساب سے ایشیائی شاعری کی وقعت اُنکے
دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ حضرات ناظرین راقم کی اس تحریر سے یہ نہ سمجھیں کہ ایشیائی
شاعری تمام معایب سے پاک ہے اسپر بھی قابل نظر نہیں ہے مگر نئی روشنی والے
حضرات نے اسکو تسلیم کر لیا ہے کہ جو معایب ہیں ایشیائی شاعری میں ہیں یورپین
شاعری تمام معایب سے مبرا ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ فارسی اور اردو کی شاعریاں معایب رکھتی ہیں مگر ان معایب سے
ایشیائی شاعریاں ایسی ذلیل نہیں ہیں کہ کسی حکیم یا مرد معقل کے قابل توجہ نہوں
راقم جب ان نئی روشنی والوں کو یورپ کی شاعری کا ذکر کرتے سنتا ہے تو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ اونکے خیال میں یوروپین شاعری تمام معایب سے پاک متصور ہے
اور ایشیائی شاعری اسکے برخلاف سراسر عیب ہی عیب ہے۔ بدانست راقم اس تنگ
چشمی کا سبب نادیدگی ہے یا یہ کہ یوروپین شاعری بسبب ایک امر جدید ہونیکے
پُرلذت معلوم ہوتی ہے اسمیں شک نہیں کہ یوروپین شاعری کی آگاہی سے ہم
ایشیائیوں کی شاعری کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے نئے مضمون دستیاب
ہو سکتے ہیں مگر یہ فائدہ یوروپین شاعری کو بھی ہماری ایشیائی شاعری سے
پہونچ سکتا ہے۔ اسواسطے کہ بہت سی نازک خیالیاں ایشیائی شاعری میں ایسی
ہیں جنسے شعرائے یورپ کے دماغ کو ابھی آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے اس امر کا
اعتراف خود اہل یورپ اور اہل امریکہ کو ہے بہرحال اہل یورپ کو ایشیائی

خیالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے کہ یا پوری طرح اردو فارسی عربی سیکھیں
یا ان زبانوں کے شعرا کی تصانیف کو نہایت احتیاط کے ساتھ ترجمہ کر ڈالیں اسیطرح ہم لوگوں
کو ترقی فن شاعری کے لئے دو امر درکار ہیں ایک یہ کہ جو معایب ایشیائی شاعری
کے ہیں اُن سے متنفر ہو کر اونکے ازالے کی فکر کریں دوم یہ کہ جو جو خوبیاں یوروپین شاعری
میں ہیں انکو حسب ضرورت اپنی شاعری میں داخل کرنے کی صورتیں نکالیں۔

یہاں ایک بات یوروپین شاعری کی خوبی کی نسبت عرض کر دینا مناسب ہے
یہ ایسی بات ہے کہ جس سے ہمارے ایشیائی شعرا محروم ہوتے ہیں یعنی شعرائے یورپ
اپنی تصانیف میں ہزاروں امور کو جو متعلق جغرافیہ اور تاریخ کے ہیں داخل کرتے
ہیں برخلاف اسکے ایشیائی شاعر، ان امور سے خاصکر امور جغرافیہ سے نہایت
نابلد معلوم ہوتے ہیں چند معمولی شہر و دریا و کوہ کا ذکر بھی جو کرتے ہیں تو آگاہی
علم جغرافیہ سے اونکے ذکر کو تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے بلاشبہ جب ہمارے ملک کے
طبیعت داروں کو اہل یورپ کا یہ مذاق صحیح معلوم ہو جائیگا تو حسب مراد تاریخ و جغرافیہ
کی اطلاع کی صورت پیدا کرینگے اور اس ذریعے سے بہت سے نئے مضامین ایشیائی
شاعری میں داخل ہو جائینگے۔

واضح ہو کہ شاعری ایک امر طبعی ہے اور جبلت و فطرت ہونیکے باعث کسی حال میں انسان
سے منفک نہیں ہو سکتی۔ جب سے کہ تاریخی وسائل سے انسان کے حالات کا پتا لگتا ہے
ہر ملک و ہر قوم و ہر وقت میں شاعری نثر یا نظم کے پیرائے میں جلوہ گر رہی ہے۔ وحشی
قوم پر لحاظ کیجیے تو کچھ نہ کچھ شاعری اوس قوم میں پائی جائیگی گو اُس قوم کی شاعری
ہومیروس ورجل فردوسی ملٹن بالمکی میر انیس کے درجہ کی شائستگی اور بلند خیالی
کے اعتبار سے نہ سہی کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ جسمیں کچھ نہ کچھ گیت نہ گائے
جاتے ہوں۔ یہی گیت قومی شاعری سے خبر دیتے ہیں اگر انہیں وحشی اقوام کو تعلیم یا تمدن
نصیب ہو تو اونکے شعرا میں بھی ہومیروس وغیرہ کی عالی خیالی پیدا ہو سکتی ہے مختصر یہ ہے
کہ چونکہ شاعری داخل فطرت انسانی ہے جہاں انسان کا وجود پایا جاتا ہے وہاں

شاعری بھی موجود رہتی ہے گو وہ شاعری کسی درجہ ابتذال کی ہو اس سے شاعری کا ایک امر فطرتی ہونا ثابت ہوتا ہے اگر شاعری کے ذہنی تعلق پر غور کیجیے تو شاعری سے ایک قلبی کیفیت درک ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری تب ہی انسان سے منفک ہو سکتی ہے جبکہ خود قلب معدوم و مفقود ہو جائے البتہ مختلف انسانوں کو مختلف درجے کی صلاحیت قلبی بخشی گئی ہے اور گو بعض انسان بظاہر شاعری سے بے لگاؤ معلوم ہوتے ہیں مگر کبھی ایسا نہیں ہے کہ جب انسان کو دیا گیا ہو اور قلب واردات قلبیہ سے خالی ہو۔ جاننا چاہیے کہ یہی واردات قلبیہ شاعری کے تخم ہیں عام اس سے کہ اونسے شاعری کا درخت اوگے یا نہ اوگے فقیر کی دانست میں ہر صاحب واردات قلبیہ کچھ نہ کچھ شاعر ہے گو اوسنے کبھی ایک مصرعہ بھی نہ کہا ہو ایسا شخص اپنے لئے تو ضرور شاعر ہے گو اپنی شاعری کا افراد دوسرے تک بسبب موانع کے نہیں پہونچا سکتا ہے غیر شاعر نہیں ہے مگر اپنے واردات قلبیہ پر جو لحاظ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واردات قلبیہ ایک ایسا عالم رکھتی ہیں جسکے گرد کو بھی عالم مادی نہیں پہونچ سکتا ہے درحقیقت واردات قلبیہ کا ایک ایسا عالم معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالموں سے مستغنی ہے اور اگر اوس عالم میں ترقیاں پیدا ہوں تو قلب پورا عالم اکبر کا عالم دکھلا سکتا ہے یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ قلب سے مراد وہ صنوبری شکل مضغہ گوشت نہیں ہے جو انسان کے سینے کے اندر جانب چپ میں واقع ہے۔ قلب سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ ہے کہ جسکو خدا نے اپنی جلوہ گاہ بنایا ہے اور جس سے متعلق روحانیات کو کر دیا ہے پس جاننا چاہیے کہ شاعری اسی لطیفہ ربانیہ کا جوش ہے عام اس سے کہ اوسکا اظہار نطق یا قلم سے ہو یا واردات قلبیہ کی طرح دل ہی دل میں رہجائے جب شاعری کو اتنا بڑا تعلق قلب کے ساتھ ہے تو شاعری کے فطرتی ہونے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

جب شاعری ایک امر فطرتی ہے تو اس سے اغراض انسانی کا کم و بیش طور پر تعلق رکھنا بھی خالی از فطرت نہیں ہے چنانچہ عند التفحص یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاعری

اگلے زمانوں میں اپنا جلوہ دکھاتی رہی ہے اور آج بھی اوسکی وہی رونق باقی ہے اور تا بقائے نوع انسان اوسکی رونق سابق کی طرح رہیگی قدیم اہل مصر و اہل یونان و اہل روم و اہل ہند اور بھی بعثت آنحضرت صلعم سے پہلے کے اہل عرب کے درمیان میں شاعری ایک قومی آلہ تمدن و مذہب بھی جاتی تھی بعد بعثت کے بھی اسکا زور و شور قایم رہا گو انداز شاعری میں بہت فرق آگیا اور اوسکے اغراض کے پہلو بدلتے گئے کتب تواریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بادشاہوں نے شاعری کو بہت عزیز رکھا ہے گو اُن کی توجہ سے نفس شاعری کو ضرر بھی بہت پہونچا گیا ہے۔

شاعری صرف شاہان اسلام میں ممتاز صورت نہیں رہی ہے بلکہ عیسائی شاہان یورپ بھی اسکے قدردان رہے ہیں۔ یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں اسکی یکساں توقیر رہا کی ہے اور جو اسکی قوت سابق میں تھی آج تک باقی ہے۔ فرق اسیقدر ہے کہ اب شاعری کے عنوان بدل گئے ہیں ورنہ نفس شاعری اپنے حال پر ہے اور اس سے برنگ سابق تمدنی اخلاقی اور مذہبی کام لئے جا رہے ہیں۔ عامیانہ خیال کا آدمی پوچھ سکتا ہے کہ اس اُنیسویں صدی میں تو نہ یورپ نہ ایشیا میں شاعری کو کسی قسم کا فروغ نظر آتا ہے پھر شاعری کی سابق قوت سے اعتراف کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر اشخص ناواقف کا اعتراض بہت بجا معلوم ہوتا ہے واقعی اسوقت میں ہومیر وس۔ ورجل شیکسپیر ملٹن گرٹی فردوسی سعدی حافظ کالیداس بالمکی وغیرہ کے مماثل لوگ کہاں ہیں جنسے شاعری کے فروغ کی صورت قیاس کیجا سکتی۔ اس عہد میں ظاہرا شاعری کی رونق تو کہیں بھی دیکھی نہیں جاتی۔ مگر جب نفس شاعری کے فروغ و غیر فروغ پر لحاظ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعری انسان کے داخل فطرت ہونیکے باعث اسیقدر فروغ پر ہے جسقدر سابق امم کیوقت میں تھی البتہ شاعری نے لباس بدل دیا ہے ورنہ شاعری معزول نہیں ہو گئی ہے انسان کا جو کام شاعری پہلے کرتی تھی اس صدی میں بھی کرتی ہے اور زمانہ آیندہ میں بھی کرتی رہیگی گو اوسکے ہیرا پھیر انقلاب پذیر ہوتے چلے جائیں ؎

ہر رنگیکہ خواہی جامہ می پوش	من آں اندازِ قدرا می شناسم

اس عہد میں البتہ ممتاز اقوام دنیا لباس نظم شاعری سے کم کام لیتے ہیں مگر شاعری کو
اتنے رنگوں سے بدلتے ہیں کہ اصل سابقہ سے نہیں ملتا ہے۔ شاعری فی زمانہ زبان و قلم
کے مختلف پیرایوں میں برتی جاتی ہے اور مختلف فنوں کے لباس میں در آکر اپنی
قوت دکھلاتی ہے مختلف پیرایوں کی مثال یہ ہے کہ عہد جدید کے فصحا و بلغا کی اپیل
عام اس سے کہ تمدنی یا اخلاقی یا مذہبی عنوان رکھتی ہوں وہ کامیابی کرتی ہیں کہ قوی
ترین شعرائے عہد سابق بھی نہیں کر سکے۔ برک (Burke) اور پٹرک ہنری (Patrick Henry)
اور (Demosthenes) اور انکے عہد سے آج تک کے فصحا و بلغائے یورپ نے نطق کے
وہ تماشے دکھلائے ہیں کہ عجز و بلند خیال سے عقل دنگ نظر آتی ہے ان فصحا کے
نطق نے سلطنتیں قایم کی ہیں اور سلطنتیں معدوم کی ہیں ملکوں کو خونریزی سے
بچایا ہے اور ملکوں کو خونریزی میں مبتلا کیا ہے ظلم کی بنیادیں ڈالی ہیں اور ظلم کی
بنیادیں کھودی ہیں بادشاہوں کو تخت سے اٹھایا ہے اور تخت پر بٹھایا ہے مختصر یہ ہے
کہ قوموں کو جس راہ پر چلایا ہے قومیں وہ راہ چلی ہیں کیا ان فصحا بلغا کے نطق لطافت
شاعری سے خالی تھے درحقیقت انکے نطق عین شاعری تھے جو ان سے ایسے ایسے حیرت
خیز اثر قومونپر پیدا ہوتے گئے ہیں اسیطرح نطق کے ذریعہ سے فرقہ اہل قانون
عجیب و غریب تماشے دکھلاتا ہے واقعی اس عہد کے بیرسٹران نامی یک رنگ کے
شعرا ہیں اونکے کمال نطق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سامعین پر عالم حیرت طاری ہوتا ہے
بہت بار ایسا ہوا ہے کہ سامعین کو اشکباری کی نوبت پہونچی ہے اور بہت بار
ہنسی کا رکنا دشوار ہوگیا ہے غرض یہ ہے کہ جادوئے نطق سے ہنسانا رولانا
اونکے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی بیگناہ شخص ماخوذ بجرم ہوکر
عدالت کے سامنے لایا گیا ہے اوسکو اپنی بیگناہی کا پورا یقین ہے مگر جب اوسکے خلاف
میں بیرسٹر نے بحث شروع کی اور اوسکی مجرمیت کو دکھلانا شروع کیا تو بیچارہ ماخوذ
باوجود بیجرم ہونیکے اپنے مخالف کی کہنے کے اثر سے اپنے کو مجرم سمجھنے لگا ہے
چنانچہ وارن ہیسٹنگس (Warren Hastings) کہتے ہیں کہ جس وقت

(۱) اُردوی معلا چغتائیوں کے لشکر کو کہتے تھے جس میں بہت بڑے بڑے عالیشان خیمے نصب ہوتے اور عالیشان بارگاہیں لگائی جاتیں۔ اس لشکر کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ چالیس ہزار خیموں پر مشتمل تھا۔ اور خان اعظم کے خیمے و بارگاہ کا تو کچھ کہنا ہی نہیں اور چونکہ وقتی کے اکثر بادشاہ سلسلہ چغتائیہ کی شاخ تھے اسلئے انہوں نے اپنے لشکر کو بھی اُردوی معلا کے نام سے موسوم کیا اور اُس لشکر کی زبان بھی اُردوی معلا کہلائی

(۲) اُردوی معلا جوجی خاں کی اولاد کے لشکر کا خطاب ہو گیا تھا کیونکہ اوسمیں سیکڑوں کلس سونے کے شاہی خیموں اور بارگاہوں پر نصب ہوتے تھے اور ہزاروں چھوٹے چھوٹے کلس امیروں اور سرداروں کے خیموں کو عزت دیتے تھے۔

مغرب کے مشہور سیاح مارکو پولو نے بھی چنگیز کے پوتے قیلائی خان کے جاہ و حشمت کا ذکر اسطور پر کیا ہے کہ اسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوسکو عالم حیرت میں محو ہو کر بطور ایک طلسمی فسانہ کے خیال کر رہا ہے۔

پس جو تختہ اُردوی معلا کا قلی میں نصب ہوا سلاطین چغتائیہ کے اُردوی معلے سے آیا ہوا تختہ ہے جو بجائے خود اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اُردوی معلا اور اُردوی مظفر کا نام اوسوقت کے نہ کہتے ہوئے ہیں جبکہ بغداد اور جنوب بلاد فارس فتح ہوئے۔ اور وہاں کے علما و ادبا اور شعرا نے فاتحین کے لشکروں کو ان ناموں سے یاد کیا۔ یا یہ کہ خود فاتحین نے اُسوقت کے عالیشان مناظر کو دیکھکر اپنے لشکروں کے لئے یہ شاندار الفاظ استعمال کئے اب میں گمنام اُردوی معلا کے نام کو زندہ کرنا چاہتا ہوں جو شاید اُردو کے کسی رسالہ اور اخبار میں اب تک میری نگاہ سے نہیں گزرا اور آج پہلی بار آپ اوسکا حال (اُردوی معلی علی گڈھ) میں ملاحظہ فرمائیں

اُردوی معلا کی شاخ میں چنگیز کے بیٹے جوجی کے بعد جوجی کا بڑا لڑکا (اردو) اسکا جانشین ہوا جسکے معنی ایک بڑے اُردو کے مالک کے ہیں۔

جوجی کے دوسرے لڑکے باتو نے یورپ پر حملہ کر کے اپنی حکومت وسیع کی اور دشت قبچاق کے ترکی قبایل کا امیر ہوا جوجی کے تیسرے لڑکے تقا تیمور کو بلگیر یا اور الکا کا

* نقل دہلی تھا اور چغتائی کا مشہور شہر تھا اور اوسکے خیال میں دادوں پر حکمران تھا جو اب کرغیز اور قزاق کے نام سے مشہور ہیں یا کھان کا ٹھکانہ دریائے اورال ۱۲۱۱ء میں تاتار تھا اور عام طور پر اُردوئے معلا کے سرکردہ اور سپہ سالار کے لئے جاتے تھے۔ اور سپاہ کا ایک خاص حصہ مغل تھا۔ اسلئے اُردوی معلا کے خواتین میں

جغرافیہ اور اہل عرب

صرف لفظ جغرافیہ کا اس بات پر دلالت کرنیکے لئے کافی ہے کہ یہ علم اہل عرب کا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ عربی علم تاریخ کی تمام اقوام عالم کی نگاہوں میں بہت زیادہ وقعت ہے اور علم تاریخ کو جغرافیہ کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہے اسکو اسباب کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم یہ بھی دکھائیں کہ اس فن میں اہل عرب نے کس قدر کوششیں کی اور کہانتک دسترس حاصل کی۔

کوئی علم یا کوئی فن انسان نے اسوقت تک نہیں ایجاد کیا جب تک کہ اوسکے داعی اور اسباب نہیں پیدا ہوئے۔ کیونکہ انسان کو ہمیشہ اپنی ضروریات کے لئے مختلف باتوں کی حاجت پڑتی رہتی ہے۔ اسلئے یہ مقولہ مشہور ہے کہ "ایجاد کی ماں ضرورت ہے" چنانچہ ممالک اور تجارت کی ضرورتیں جب پیش آئیں۔ اور بلاد و امصار کے راستے اور فاصلے دریافت کرنے کی حاجت پڑی تو تاجروں۔ فاتحوں۔ اور سیاحوں کی معلومات جمع کی گئیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے یہ ایک وسیع علم ہوگیا جسکی ترتیب مختلف ابواب اور فصول پر قرار پائی۔

سب سے پہلے جس قوم نے اس کی بنیاد رکھی وہ اہل فنشیا ہیں۔ کیونکہ اوسی قوم نے دنیا میں سب سے پہلے تجارت شروع کی۔ اور انہیں سے سیاحی کی ابتدا ہوئی وہ بحر ابیض کے سواحل تک گئے اور وہاں جاکر آبادی قائم کی۔ شہر صور اوس زمانہ میں تجارتی دنیا کا مرکز تھا۔ وہاں تمام عالم سے تجارتی اور مصنوعی چیزیں آتی تھیں۔ اور تمام اقوام سے یہانتک کہ اہل ہند سے بھی اون کی تجارت تھی۔ ہندو یہاں سے ہاتھی دانت اور خوشبو وغیرہ لیجاتے تھے اور وہاں سے سامان کے (مصالح)

اور دوسری چیزیں خرید کر لاتے تھے۔ اہل فنشیا نے اپنی غیر معمولی تجارت کی وجہ سے دنیا کے ممالک کے متعلق بہت معلومات حاصل کیں۔ اور اکثر ملکوں کے باشندوں اور اونکے باہمی فاصلوں سے خبردار ہو گئے۔

جب اسکندر نے اپنا بڑا لشکر لیکر حملہ کیا۔ اور ایشیا کی سرزمین کو پامال کرتا ہوا بلاد ہند تک پہونچا۔ تو اسکے ہمراہی ایشیا کے حالات سے بہت زیادہ واقف ہو گئے پھر جب وہ واپس گیا تو ان حالات کو عجیب و غریب ہونیکی وجہ سے قلم بند کرا لیا۔ بطالسہ (خاندان بطلیموسی جو مصر کے حاکم) نے سواحل بحر احمر کے حالات لکھوائے۔ اہل روما نے بھی اپنی معلومات کا اسپر بعد میں اضافہ کیا۔ یہ علم اسیطرح پراگندہ حالت میں چلا آتا تھا یہانتک کہ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسکو ترتیب دیں۔ پہلے پہل جس شخص نے یہ کام کیا وہ اراٹیشین یونانی ہے جسکی وفات ۱۹۶ سنہ میں قبل ولادت مسیح ہوئی۔ اس شخص نے بطالسہ کے عہد میں ایک کتاب لکھی جسمیں اہل فنشیا۔ اہل روما اور اسکندر کے ساتھیوں کی تمام معلومات جمع کیں۔ اسکے بعد اسٹربن سیاح نے بھی اسمیں ایک کتاب لکھی۔ پھر بلیناس جغرافی ہوا۔ یہ بطلیموس کے زمانہ میں سنہ ۵۰ عیسوی میں تھا۔ اسنے ایک بہت بڑی کتاب جغرافیہ میں لکھی۔ جسمیں فلکی حساب کے۔ طابق مقامات اور راستے مقرر کئے۔ اوسنے اوس کتاب میں اوس زمانہ کے ۴۳۵۰ شہروں کے نام لکھے ہیں۔ مدینہ کو مدینہ ہی لکھا ہے۔ پہاڑوں کی تعداد دو سو بیان کی ہے۔ معادن۔ اور مختلف ملکوں کے باشندے اور وہاں کی پیداوار کی حالتیں بھی تھوڑی تھوڑی لکھی ہیں جس زمانہ میں اسلامی سلطنت قائم ہوئی اسوقت تک بھی اسی کتاب پر جغرافیہ کا دارمدار تھا اہل عرب نے عصر عباسی میں جہاں اور تمام علوم و فنون کے ترجمے کئے تو اس کتاب کا ترجمہ کر لیا۔ اور اسکا نام الجغرافیہ رکھا۔ بلیناس کی دوسری کتاب کا بھی ترجمہ کر لیا جو فلکیات میں تھی۔ اور اب وہ مجسطی کے نام سے مشہور ہے اور انہیں دونوں کتابوں پر اسکی جغرافیہ دانی

مشہور تھی۔

مگر اس کتاب کے ترجمے کے قبل سے بھی اہل عرب علم جغرافیہ کی ابتدا کر چکے تھے جسکے تین سبب تھے۔ پہلے دو سبب وہی تھے جن کی وجہ سے اہل یونان اور اہل روما نے اس فن کی بنیاد رکھی تھی یعنی فتح ممالک و تجارت۔ کیونکہ اہل اسلام لڑائی اور مفتوح ممالک میں تمام اقوام عام پھیلتے گئے اور دنیا کے ہر چہار سمت پھیل گئے۔ اور نیز وہ لوگ اور خاص اہل حجاز زمانہ جاہلیت سے تجارت پیشہ تھے اسلام کے بعد اُن کی تجارت فتح اور سلطنت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی چلی گئی۔ لیکن تیسرا زبردست سبب جسمیں اہل عرب بہ نسبت دوسری قوموں کے ممتاز ہیں یہ تھا کہ وہ مختلف بلاد اور ممالک سے فریضہ حج ادا کرنیکے لئے کعبہ آتے تھے۔ یہانتک کہ ہند اور چین کے مسلمانوں کے لئے بھی یہ لازمی بات تھی۔ اور اسکے لئے راستے اور مقامات جاننے کی خاص طور پر ضرورت تھی۔ ورنہ وہ کیونکر کعبہ پہونچ سکتے۔ اسکے علاوہ طلب علم میں بھی وہ سفر کرتے تھے۔ اور تمام اسلامی دیار میں علم اور علماء کی تلاش میں پھرتے تھے اسکے لئے بھی مقامات جاننے اور منازل و طرق پہچاننے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ پہلے پہل عربوں نے جغرافیہ میں جو کتاب لکھی وہ راستوں اور منازل کے حالات میں تھی۔ سب سے پہلے اس قسم کی تصنیف ادیبوں نے مثلاً اصمعی اور سکونی نے کی۔ اسکے بعد پھر پورے ملک کے حالات لکھے گئے۔ جیسا کہ ابو الاسحٰق اور ہمدانی نے جزیرہ عرب اور تہامہ کے پہاڑ اور صحارے وغیرہ کے حالات میں کتابیں لکھیں۔ مزید براں فتح ممالک کے بعد اُن کو خراج اور لگان مقرر کرنیکے لئے ممالک کے حالات اور صحابہ کے زمانہ میں جو ملک فتح ہوئے تھے اُن کی کیفیت جاننے کی ضرورت پڑی اور علم جغرافیہ گویا ایک حیثیت سے اونکے مذہب کا حصہ ہو گیا۔

جب جغرافیہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تو اہل عرب نے اسی طرز پر تالیف شروع کی اور اپنی معلومات سے اسپر قابل قدر اضافہ کیا۔ چونکہ اُنکو تحقیق کا شوق تھا اسلئے اُنہوں نے صرف

روایت اور بیان پر بس نہیں کیا بلکہ خود تری اور بحری سفر کرنا شروع کیا۔ اور دنیا کے حالات دیکھکر اونکو کتابوں میں مدوّن کرنے لگے۔ اُن لوگوں نے بلیناس کے جغرافیہ میں بہت سی غلطیوں کی تصحیح کی۔

مسلمانوں میں علم جغرافیہ کی تکمیل چوتھی صدی ہجری میں ہوئی۔ اوس زمانہ میں لوگوں نے اس فن میں بھی اسیطرح تصنیف و تالیف شروع کی جسطرح تواریخ وغیرہ میں۔ سب سے پہلے اہل اسلام میں سے جس شخص نے اس فن میں کتاب لکھی وہ ابوزید بلخی تھا۔ اسنے چوتھی صدی میں اپنی کتاب "صور الاقالیم" یونانیوں کے طرز پر لکھی تھی۔ اوسکے بیس حصے کئے تھے۔ اور پھر ہر ایک حصہ کی الگ الگ تشریح کی تھی۔ لیکن اُنمیں بہت سے بڑے بڑے شہروں کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ اسی کا معاصر ابراسحاق فارسی تھا جو کرخی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بہت بڑا سیاح تھا۔ خود سفر کرکے نہایت تحقیق کے ساتھ کتاب مسالک الممالک لکھی بلخی نے بھی تمام ممالک اسلام کا سفر کیا۔ اور تمام شہروں پہاڑوں۔ شہروں وغیرہ کا مفصل حال لکھا۔ اسنے اپنے سفر کی ابتدا مدینہ سے ۳۳۱ھ میں کی تھی۔ اسکے بعد ابن فقیہ ہمدانی۔ مقدسی اور مسعودی نے کتابیں لکھیں۔ مسعودی نے کئی سفر کئے۔ یہانتک کہ وہ انتہائی ہندوستان تک گیا تھا۔ اوسنے تمام چشم دید حالات لکھے ہیں۔ البیرونی نے بھی اپنی کتاب میں جو ہندوستان کے متعلق لکھی ہے یہاں کے شہروں۔ دریاؤں۔ پہاڑوں کے حالات اونکے نام اور فاصلے مفصل طور پر لکھے ہیں۔ لیکن اب اونمیں سے سوائے چند مشہور شہروں کے ایک بھی نہیں۔ یا اگر ہے تو نام میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ یہ سب کتابیں چھپ گئی ہیں۔

کچھ زمانہ کے بعد جب علم تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی گئی تو لوگوں نے جغرافیہ کی باقاعدہ ترتیب شروع کی۔ اور شہروں اور مقامات کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر لکھے جانے لگے اس قسم کی سب سے مشہور تصنیف یاقوت حموی کی ہے۔ جنکی وفات ۶۲۶ھ میں ہوئی

اسے معجم البلدان لکھی جس میں شہروں پہاڑوں۔ وادیوں۔ سمندروں۔ نہروں۔ بتوں وغیرہ وغیرہ کے مفصل حالات لکھے۔ اور ضمناً بہت سے لوگوں کے تذکرے جو ان شہروں میں پیدا ہوئے بیان کئے۔ یہ کتاب جغرافیہ کی قاموس خیال کی جاتی ہے۔ ابو الفدا نے بھی ایک کتاب تقویم البلدان لکھی ہے۔ انکے علاوہ اہل عرب نے بہت سے سفرنامے لکھے جنکے ذریعے سے ملک۔ قوم۔ تاریخ اور جغرافیہ کی خدمت کی۔

اسلم جراجپوری مدرسۃ العلوم علی گڈھ

ایک مغنیہ سے التجا

گائے جا، سنائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا، ٹیرسٹ، رباب کے ساتھ، ستار کے ساتھ میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ میری التجا وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ اپنے ستار کو چھیڑ میرے دلکو چھیڑ آہ میں التجا کرتا ہوں گائے جا۔

تیری آواز۔۔۔ وہ باریک، وہ بلورین، وہ تیرے دل کی طرح صاف اور شفاف وہ تیرے ننھے دل کی طرح تیری ننھی آواز، مجھے آغوش میں لیلے، مجھے پھسلائے۔ وہ آواز جو تیرے رقیق قلب کے گوشوں سے نکلتی ہے، اور جامۂ ماسوا کو اُتار کر عریاں اور گریاں اوپر کی طرف جاتی ہے، اور پھر ایک پُر اضطراب لرزش کے ساتھ واپس آکر تیرے ہونٹوں میں چھپ جاتی ہے، وہ آواز جو خود ایک شعر ہے، اُس منظوم آواز کے ساتھ آہ گائے جا۔ میری روح کی سی نحیف و ضعیف، میرے دل کی سی کانپنے والی، نازک باریک آواز سے گائے جا ستار کے ساتھ چنگ و رباب کے ساتھ، میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے آہ میں خواہش کرتا ہوں گائے جا۔

گا کہ زندگی کیا ہے؟ سُنا کہ روح کیا ہے؟ محبت کیا ہے؟ تاکہ میں سمجھوں۔ اپنی اُس نازنین روح کے ساتھ گا جو پھولوں کی خوشبو کی طرح عطر پاش ہے۔

اپنی دلگداز آواز کے ساتھ گا۔ جو ظلمات سادی کی طرح دل پر اثر کرتی ہے۔ دنیا سے میرا علاقہ قطع کردے۔ میری خواہشیں، میری حسرتیں جو نہیں جانتیں کہ ختم ہونا کیا چیز ہے انہیں اس طرح۔ بس اس طرح ختم کرنا چاہتا ہوں کہ اس آواز کے نرم آغوش میں، اس آہنگِ دل کی رقت میں، اس نوائے غنغنت کی لطیف موج میں غرق ہو کر مرجاؤں تمہاری باریک، اور شیریں آواز کی تہیں میرا کفن ہوں۔ انہیں لپٹ لپٹ کر مرجاؤں اُسے چوم چوم کے جان دیدوں۔ اُس ہوا سے زیادہ ہلکی، آسمان سے زیادہ صاف آواز میں لپٹ کر اونچا اڑجاؤں، اور میری آنکھیں اور کان عشر تک اس باریک کانپنے والی آواز کو، اس صدا کو جو ایک ننھی چڑیا کے ننھے بازوؤں کی طرح پر پھڑپھڑاتی ہے، بلبلوں کی منقاروں میں، بادلوں کی رنگ آمیز تہوں میں، خاموش رات کو موجوں کی مشاش میں، سُرخ قمر، خندۂ صبح میں ڈھونڈتی پھرا کریں...

آہ! مت ٹھیر گائے جا! اللہ کے واسطے گائے جا ستارے کے ساتھ۔ میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ عرض وہ ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ آہ! میں التجا کرتا ہوں گائے جا... (بلبل رمہ)

انتخاب بیاض

جناب منشی سید انور علی صاحب انور متوسل بھوپال

رباعی عمر خیام نیشاپوری

پیش از من و تو لیل و نہاری بوداست
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی

گردندہ فلک برائے کارے بوداست
کان مردمک چشم نگارے بوداست

"از جملہ رباعیات عمر خیام ایں رباعی انتخاب کردم" "الود"

ملک الشعرا کلیم ہمدانی

نہ ہی می رسد آں نو گل خنداں از من | می کشد خار دریں بادیہ داماں از من

میرزا نعمت خان عالی شیرازی

ہر کہ یکبار بجانانہ رساند خود را | ایں محال است کہ تا خانہ رساند خود را

نواب الٰہی بخش خان معروف دہلوی

کہاں تک راز عشق افشا نہ کرتا | مثل یہ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا

شاہ نصیر دہلوی

دل کا کیا مول بلا زلف چلیپا ٹھہرے | کچھ تری گانٹھ گرہ میں ہو تو سودا ٹھہرے

آذری طوسی

قیمت دولت وصل تو اگر جاں بودے | کار بر عاشق دل سوختہ آساں بودے

ملک الشعرا کلیم ہمدانی

زاں چشم ندیدم کہ نگاہے بمن افتد | بیمار عجب نیست اگر کم سخن افتد

گلشن دہلوی

بدقت میتواں فہمید معنی ہائے نازاد | کہ شرح حکمت العین ست مژگاں دراز او

فغانی شیرازی

بہ بستر افتم و مردن کنم بہانہ خویش | بدیں بہانہ مگر آرمت بخانہ خویش

مصحفی لکھنوی

جتنا کہ ہمیں خوار یہ رکھتا ہے شب و روز | اتنے تو کہنگا زمانے کے نہیں ہم

ناصر علی علی سہرندی

کہ بر شیخ و برہمن دارد احسانے کہ من دارم | چراغ کعبہ و دیر است ایمانے کہ من دارم

نواب عمدۃ الملک امیر خان بہادر انجام

مارا ہوای گلشن و باغی نماندہ است | اے بوئے گل بیرو کہ دماغی نماندہ است

میرزا محمد امین بیرنگ نیشاپوری

رفتم از خویش سوی یار سلامی گفتم | قاصد گریہ رواں بود پیامے گفتم

سکندر جہاں بیگم ضیا گلشن آبادی

گم کردہ رہ غریب ہوں منزل سے دور ہوں | طوفان زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی

تسلیم روے یار کو حسرت کی آنکھ سے | اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

انور

قتل کر کے مجھے یہ کہتے جاتے جاتے | دیکھ مشکل تری آسان کئے جاتے ہیں

انوری خاوری

تا کے بنم رخ تو خون فرو ید دل | آزار جفائے تو بجان جو ید دل
بخشای کز آسمان نمی بارد جاں | رحم آر کہ از زمیں نمی روید دل

شاعرہ آقائی

ز ہشیاران عالم ہر کرا دیدم غمی دارد | دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمی دارد
شکوہ فقر ملک بے نیازی کرد تسلیم | بیدل | با قبالیکہ دل برخاست از دنیا بہ تعظیم

حسن دہلوی

من بودم و کنجے و حریفے و سرودی | غم را کہ نشان دارد بلا را کہ خبر کرد

موسوی خان جرأت

نہ بہر آں کہ منزل دور یا تنگست مؤنالم | دلم را چوں جرس جائے جنبش زنگ سے نالم

مومن دہلوی

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں | یا کہیں عاشق ہوے یا ہو گیا سودا ہمیں

دارالسلطنت فرانس کی سیر (۴) تابع ماقبل

میرے خیال میں فرنچ پولیس کو ہجوم میں عمدہ انتظام قائم رکھنے کا بالکل سلیقہ نہیں اور لندن پولیس سے جب ان کا مقابلہ کرتا ہوں تو میری نظر میں اُن کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ انگلستان کے عظیم الشان دارالسلطنت میں جہاں پیرس سے کہیں زیادہ ہجوم اور لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ایک لمبا زبردست پولیس کا جوان جو ایک طرف سیاہ ہلمٹ لگائے کھڑا رہتا ہے تمام گاڑیوں اور آنے بسوں کے ہجوم کے ہجوم کو صرف اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے آن واحد میں روک دینا بخوبی جانتا ہے اور پیدل چلنے والے ان امن و امان کے محافظوں سے بے انتہا درجے کے خلق کا برتاؤ معلوم کرتے ہوئے بآسانی ادھر سے اُدھر ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی حالت اسکے مقابلے میں بالکل ہی کچھ ہے علاوہ اسکے پولیس کے جوان بھی مجھے کچھ کمزور اور پریشان سے نظر آئے۔ پردیسیوں کے ساتھ انکا اخلاق بھی اچھا نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو نہایت ہی خشک اور بدتہذیب سے معلوم ہوتے ہیں۔

اس برتاؤ کو میرے دوست مسٹر منگا حق بجانب کہتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ پردیسی فرانسیس تہذیب کے ساتھ اونسے سوال نہیں کرتے اور اسلئے ویسا جواب بھی نہیں پا سکتے ہیں۔ مثلاً فرانسیس اگر پولیس کے جوان سے جس سے جان پہچان نہ ہو کوئی بات پوچھیگا تو پہلے (وہاں کی تہذیب کے موافق) ٹوپی اتاریگا اور نہایت ادب سے کہیگا "پارڈن موسیو" اور پھر سوال کرنے کا بخلاف اسکے انگریز اور امریکن جنکی طبیعتیں فرانسیسیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں ان باتوں کی پروا نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ اخیر میں صرف "تینک یو" کہدینا بس کافی ہے۔ فرانسیسیوں میں ظاہری تکلفات اور شائستگی تہذیب کی سخت ضرورت ہے اور ان لوگوں کو اسکا احساس بھی نہیں۔ اس خاص قسم کے بروکھی اور غیر شائستہ برتاؤ میں انگریز تمام یورپ میں مشہور ہیں اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ جزیرہ کے رہنے والے تمام دنیا میں چکر لگا آئیں

لیکن بمشکل دوسرے لوگوں میں خلط ملط کرینگے اور بالکل بھی اون کی صحبت سے متاثر ہونگے
یہ لوگ ہر شے کو کاروباری نظر سے دیکھتے ہیں اور جس چیز کو ہاتھ میں لیتے ہیں کاروبار
کی طرح پر لیتے ہیں۔ اور جب کسی چیز سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو اوسمیں کچھ جوش
ظاہر بھی نہیں کرسکتے اور اُن کی نظر جو ہر شے کو کاروبار کی حیثیت سے دیکھتی ہے اوس
لطف کو معمولات روزانہ کی طرح سمجھنے لگتی ہے اور عیش کی لذت کو زائل کردیتی ہے
یہی عدم جوش وہمدردی اونکے ہر طریقہ عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے
ملک والوں سے میل جول رکھنے میں بھی انہیں یہی انداز طبیعے غالب ہے جسکا اثر یہ ہوا
کہ یورپ والے انہیں مغرور سمجھتے ہیں اور باہمی میل جول کا فائدہ جو تہذیب اخلاق
تمدن وطرز معاشرت کی ترقی کی صورت میں نتیجہ ہوتا ہے۔ اوس سے یہ محروم ہوتے
ہیں۔ مگر مجھے امید ہے کہ میرا یہ خیال قاعدۂ کلیہ نہ تصور کیا جائیگا اور اقرار کرتا ہوں
کہ اسکے مستثنیات بھی ہوتے مگر وہ انگریز جنکا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے انکی عمر کا زیادہ
زمانہ یورپ کے اسی حصے میں گذرتا ہے اور کثرت ربط وضبط سے ان لوگوں کے سے
اخلاق ہوجاتے ہیں۔ قوم اینگلوسیکسن کی طبیعت کی یہ خصوصیت ایسی ہے جسکے نتیجے
اکثر اچھے نہیں ہوتے۔ ترقی زمانہ کی دوڑ میں بھی یہ لوگ پیچھے رہجاتے ہیں اور
اپنی علیحدگی کے سبب سے بہت سی چیزیں نہیں حاصل کرسکتے۔

ٹریموے گاڑیوں کا جو طریقہ لندن میں ہے یہ اوسکی عمدہ مثال ہے اور نیز
اونکی طبیعت کی قدامت پسندی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یورپ میں مدت ہوئی
جبسے تیز ٹریموے گاڑیاں اور بجلی کی ٹرامیں جاری ہیں مگر لندن میں ابھی تک لوگ
اونکے مخالف ہیں (گو کہ اب کسیقدر موٹر آمنی بس گاڑیاں جاری ہوچلی ہیں) اور اپنی
پرانی ہی آمنی بسوں (omnibus) (جو نہایت سست ہوتی ہیں) کو ترجیح دیتے
ہیں۔ فرنچ پولیس کے اس برتاؤ کی ایک اور وجہ ہوسکتی ہے جو کسیقدر معقول معلوم
ہوتی ہے یعنی اون کے ملک کی طرز حکومت بہت کچھ اسکا باعث ہے۔ میرے خیال
میں سلطنت جمہوری صرف ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے زیادہ مناسب

ہوتی ہے جیسے سوئٹزرلینڈ ہے لیکن ایسے بڑے بڑے ملکوں کے لئے جیسے کہ فرانس اور امریکہ ہیں یہ طرز حکومت کسیطرح مناسب نہیں اسمیں فوائد ضرور ہیں مگر میرے خیال میں نقصانات زیادہ ہیں معمولی سے معمولی جاہل آدمی کو بھی جب مساوات کا خبط دامنگیر ہوتا ہے تو بجائے اسکے کہ اوسکے اخلاق اچھے ہوں اور خراب ہوجاتے ہیں اور بڑے بڑے امور ملکی میں اپنی ٹانگ اڑانا جائز کیا بلکہ ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ اسیطرح سے اوسے بہت سے موقعے عامہ خلائق کو برانگیختہ کرنیکے ملتے ہیں۔ وہ کتنا ہی نالائق کیوں نہ ہو مگر اپنی آپ کو بہت کچھ دقیع سمجھکر عالم بالشان بننے کی کوشش کرتا ہے اور خواص کے دوش بدوش رہنے کی خواہش کرتا ہے اوسکی رائے کے خلاف اگر عملدرآمد ہوتا ہے تو علم مخالفت بلند کرتا ہے اسطرح سے ایک متحد جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں اور عمدہ حکومت محال ہوجاتی ہے انگلستان میں بھی دو پولیٹکل فرقے ہیں مگر اُن کی لڑائی صرف پولیٹکل دائرے کے اندر محدود رہتی ہے اور خانگی معاملات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بخلاف اسکے فرانس میں ایک پولیٹکل فرقہ پرائیویٹ معاملات میں بھی دوسرے پولیٹکل فرقے کا مخالف ہوجاتا ہے اور یہ مخالفت اسقدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ اگر ممکن ہو تو ایک دوسرے کی گردن کاٹ ڈالے فتنہ کمیونس (Communes) کا واقعہ اب بھی ہر شخص کی یاد میں تازہ ہوگا جبکہ سیکڑوں بیچارے غریب مزدور سلطنت جمہوری سے بغاوت کرنیکے جرم میں کتوں کی طرح گولی سے مار ڈالے گئے۔ بہت ممکن ہے کہ اب بھی کسیوقت فرانس میں اسطرح کا کوئی نہ کوئی فتنہ پھر اُٹھ کھڑا ہو جس میں اس طرز حکومت کی بینٹ ہزاروں کو چڑھنا پڑے۔

فرانسیسی درحقیقت بمقابلہ انگریزوں کے زیادہ ذکی الحس و پر از جذبات ہوتے ہیں اسی لحاظ سے اون کی طبیعت بہت زیادہ ہم لوگوں سے ملتی جلتی ہے۔

اثنائے قیام میں ایک مرتبہ شام کے وقت مجھے مدمازل لے تہان سے ملنے جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ لڑکی مسٹر فنگا کے دوست ہے اور گو کہ کسی اونچے خاندان

سوا اسکا تعلق نہیں تاہم بہت مہذب اور شائستہ ہو اور فرنچ مڈل کلاس کے اچھے لوگوں میں سے ہو کسیقدر پڑھی لکھی بھی ہے اور میرے دوست کے ساتھ بہت کچھ اتحاد رکھتی ہے۔ نگا صاحب جب پہلے پہل یہاں آئے تو اس لڑکی نے بہت کچھ اُن کی مدد کی اور بہت سی دقتیں جو ایک نووارد اجنبی کے سدراہ ہوا کرتی ہیں اسکی وجہ سے آسان ہوگئیں۔ اوسکا گھر دیکھکر میرا جی بہت خوش ہوا اور ہم سب نے ملکر شانتلی ( ) چلنے کا ارادہ کیا کہ کچھ وقت وہاں تفریح میں گذارا جائے۔

دوسرے دن صبح کو ہماری پارٹی جسمیں وہ لڑکی اور اوسکی ماں بھی شامل تھی گیر ڈیلیاں (Gare de Lyon) سے سوار ہوکر شانتلی (Chantilly) روانہ ہوئے۔ یہ مقام پیرس کے نواح میں صرف ایک گھنٹہ کے فاصلہ پر واقع ہے اور بہت سی ایسی دلچسپ چیزوں کیلئے مشہور ہے جو دوسری جگہ کم نظر آتی ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ نواح پیرس کے کسی قصبہ یا گاؤں میں جانا بمقابلہ لندن کے بہت کچھ غیر دلچسپ اور گراں معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسلئے کہ یہاں لوگوں کی آمد و رفت اتنی نہیں یہاں کے مناظر قدرت میرے خیال میں لندن سے کسی طرح کم دلفریب نہیں مگر جسطرح لندن کے قصبات میں بھیڑ لگی رہتی ہے یہاں کبھی دیکھنے میں نہیں آتی لندن میں اتوار یا ہالیڈی کے دن ضلع ہمسٹڈ ہیتھ (Hampstead Heath) رچمانڈ (Richmond) وغیرہ تمام قرب و جوار کے خوبصورت و دلچسپ قصبات میں لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے مگر پیرس میں گو کہ ورسائی (Versailles) بہت دلچسپ مقام ہے مگر یہاں آنے والوں کا کبھی زیادہ مجمع نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ نہ تو پیرس اتنا بڑا ہے جتنا کہ لندن اور نہ اتنا غیر دلچسپ اور میلا ہے کہ لوگ مجبوراً گرد و نواح کے قصبات میں چھٹیاں گذارنے جایا کریں۔

یہ دن کسیقدر گرم تھا اور ہم خوب شانتلی (Chantilly) کے سڑکوں پر آہستہ آہستہ ٹہلا کئے۔ کچھ دیر بعد درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھانا منگایا۔ دیہات کی ایک جوان اور خوبصورت لڑکی نے ہمارے سامنے کھانا چنا اور طرح طرح کے دیہاتی اشیاء

سے میز کو سجا دیا۔ ہمارے پاس کی ایک فرانسیسی جماعت کے خوش مزاج نوجوان لڑکے چٹیاں منا رہے تھے۔ اور خوب دلگیاں کرتے ہنستے جاتے اچھل کود رہے تھے مجھے یہ فرق بھولے ہوئے سوجے سادے خاموش انگریزوں کے سامنے ایسا بیّن معلوم ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔

تین گھنٹے تک ہم یہاں کے مشہور شاہی محل اور اصطبل کو دیکھتے رہے جسکا جواب یورپ بھر میں نہ ہوگا۔ اس محل میں ایک زمانے میں کئی ایک فرانسیسی بادشاہ رہ چکے ہیں اور اب انہیں قدیم نادر اشیاء اور تصاویر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے یہاں میں نے بہت سے خوبصورت اور عالیشان کمرے دیکھے جنمیں بادشاہ رات کو سویا کرتے اور دربار کیا کرتے تھے۔

اس محل کی ساخت بالکل قدیم فرانسیسی قلعوں کی سی ہے چاروں طرف خندق کھدی ہے اور باہر کی جانب سے ایک بے انتہا دلچسپ جنگل احاطہ کئے ہوئی ہے۔ اس جنگل کو اور اسکی دلفریب مناظر کو دیکھکر بکیچیو (Boccacio) کے قصہ کے سین میری نظر کے سامنے پھر گئے۔ کیونکہ حقیقت میں فرانسیسی بادشاہوں کی تاریخ محض اُن کی عیش و طرب کے افسانے ہیں اور اسی مقام شانتلی (Chantilly) کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان سب کے واجد علی شاہوں کی عیش و عیاشی کا مرکز کہلایا جائے۔

اس مقام کی نظر خیال میں اسطرح تصویر کھینچنا چاہئے کہ (Champs) کی لاتعداد دورویہ صفیں استادہ ہیں۔ ہر طرف موج آسا میدان کے نشیب و فراز سبزے سے ڈھکے ہیں۔ بہت سے عجیب و غریب باغ ہیں جنمیں درختوں کی کثرت نے اندھیرا کر دیا ہے وہاں کہیں تنگ و تاریک کنج ہیں اور کہیں موڑ پر چنار کے درختوں کے سایہ نے ماندے راہگیروں یا عاشقوں اور معشوقوں کے لئے مقامات تنہائی بنا دئے ہیں۔ ایک طرف پانی کے جھلملاتے چشمے پل کھاتے ہوئے بہہ رہے ہیں اور اُن پر خوبصورت خوبصورت نازک پل بندھے ہیں اور ان چشموں کے کنارے سبز سبز جھاڑیوں کی قطار کی قطار چلی گئی ہے۔ دوسری طرف چھوٹی چھوٹی خوبصورت سبزے سے ڈھکے ہوئے

ٹیلے جنہیں نیچر اور انسان دونوں نے ملکر سجانے میں گویا ایک دوسرے کا مقابلہ کیا ہے۔ دلہن کے مانند آراستہ نظر آتے ہیں۔

اس مقام پر فرانس کے کسی عیش پسند بادشاہ کا بنوایا ہوا ایک (Pavilion) ہے جسکی خوبی و دلفریبی نے بہت دیر تک مجھے محو حیرت رکھا۔ اسکا نام پلے سی لامو (Place de l'amour) یا عیش و محبت کا مسکن ہے اور درحقیقت اس مقام کی خوبصورتی اور نزاکت و دلفریبی کے مقابلے میں دیکھا جائے تو یہ نام بالکل صحیح معلوم ہوگا میں نے دیکھا کہ ایک طرف ایک خوش و خرم فرانسیسی جماعت کے نوجوان بادہ سرور میں مست (Pelerin) کے عظیم الشان دورویہ صفوں کے بیچ میں۔ سڑک پر گویا متوالوں کی طرح بہکتے اور آہستہ آہستہ ٹہلتے جا رہے ہیں کہ انہیں سے ایک نے نہایت ہی دلفریب سروں میں نغمہ لامو (محبت) کی ایک ایسی تان نکالی کہ ہوا گونج اٹھی۔ دوسری طرف ایک بڑھیا عورت کے ہمراہ حسین لڑکیوں کی ایک جماعت ہے جو نہایت ہی دلفریب نیچے سروں میں آہستہ آہستہ گاتی جاتی اور ٹہلتی جاتی ہیں۔ کہیں ایک دوسرے سے ہنسی اور چہل کرنے میں کسی کی چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے اور کہیں چنتاری دھوپ کے نیچے کیل کود کا طوفان بپا ہے۔ غرضکہ سب کے سب اس مقام کی دلفریبیوں کے سرور میں ایسے مست ہیں کہ گویا لامو (محبت و عیش) کی دیبی ان کے سروں پہ منڈلا رہی ہے اور اپنے جادو سے اوسنے ہر ایک کو بیخود و بے ہوش کر دیا ہے۔

ہم ٹہلتے رہے یہانتک کہ تھک کر سبزے کی فرش پر لیٹ گئے جسکے اوپر سبز سبز پتیوں کا شامیانہ لگا تھا۔ آہ! یہاں پر اس آدھ گھنٹے کی نیند مجھے ہمیشہ یاد رہیگی میں اب بیخود اور نشہ سرور میں غافل ہو کر سویا کہ مجھے اپنے وطن کی نیندیں یاد آگئیں۔

آفتاب قریب غروب تھا اور ہم بھی سیر و تفریح سے فارغ ہو چکے تھے اسٹیشن پر گاڑی تیار ہی تھی اسلئے فوراً بیٹھکر گیری ڈی لایں (Gare de Lyon) سے اس عالم فریب مقام کو خیرباد کہتے ہوئے روانہ ہوئے ہمارے خوبصورت میزبان نے درحقیقت اس سیر کو زیادہ دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت

نہ کیا اور (Chantilly) شانتلی سے ہم انکا شکریہ ادا کرتے خوش خوش نہایت محظوظ واپس ہوئے
پیرس کے اس دلچسپ نواح کی سیر کے بعد ہمنے ورسائی (Versailles) کے دیکھنے
کا قصد کیا۔ یہ مقام بادشاہان فرانس کا ایک زمانہ میں ونڈسر کیسل (Windsor) تھا
یہ پیرس سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے اور بے شک پیرس کی نواح میں سب مقاموں
سے زیادہ دلچسپ ہے اتوار کے روز چھٹی منانیوالوں کا یہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔

محلات شاہی میں سے ورسائی ( ) میں ایک محل ہے جسمیں لوئی
چہاردہم (Louis XIV) اور نپولین اول کے رہنے کے کمرے ہیں۔ گو کہ اسکے علاوہ
اور بھی محلات بکثرت ہیں مگر یہ محل سب میں ممتاز ہے۔ اس محل اعظم میں ایک تصویر خانہ
ہے۔ جہاں اس کثرت سے عجیب و غریب تصویریں جمع ہیں کہ سوائے لاور (Louvre)
کے میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ یہ تصویریں بالکل تاریخی تصویریں ہیں جسمیں مصور نے
زیادہ تر اپنے ملک کے کارنامے دکھائے ہیں نپولین کے قریب قریب تمام لڑائیاں
اور اوسکی زندگی کے مختلف واقعات اور نیز فرانس اور الجیریا کے محاربات کے
بہت سے موقعے دکھائے گئے ہیں۔ یہ تصویریں اسمیں شک نہیں بے انتہا قابلیت
اور صفائی کے ساتھ بنائی گئیں اور جسامت کے لحاظ سے اسقدر بڑی ہیں کہ میں
سخت متحیر ہوا۔ میرے خیال میں مختصر طور پر اس مقام کی چند تصویروں کا ذکر دلچسپی سے
خالی نہ ہوگا۔

محل کے دوسرے چھت پر جسمیں ۹ کمرے ہیں فرانس کے تمام اور نیز انگلستان کی چند
بادشاہوں کی تصویریں ہیں۔ فرانس کے بادشاہوں کی تصویروں میں میری انٹونائٹ
(Marie antoinette) ملکہ لوئی شانزدہم کی تصویریں جو کیلے (Callet)
کے بنائی ہوئی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس تصویر میں بہت کچھ کام باقی ہے
اور پوری طور سے مکمل نہیں۔

ایک کمرے میں ۱۸۰۹ء کے فتنہ عظیم کے چند واقعات کی تصویریں ہیں جس میں
اوستر۔ آف۔ وی۔ ٹینس کورٹ (Oath of the Tennis Court) کی تصویریں زیادہ

ممتاز ہیں۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ اس محل میں ایک ٹینس کورٹ تھا جہاں لوگوں نے فتنۂ عظیم کے زمانہ میں جمع ہو کر قسم کھائی تھی کہ جب تک حکومت میں کوئی مفید تبدیلی نہ ہوگی اوسوقت تک برابر مخالفت کے لئے جمع ہونا اور بغاوت کرنا چاہیئے۔ یہ تصویریں انہیں مجمعوں اور اونکے سرغناؤں کی تصویریں ہیں۔

محل ورسائی کے جنوبی پہلو کے فرش پر گیلیری آف دی امپائر یعنی تصویر خانہ سلطنت ہے جسمیں ۱۳ کمروں میں جنگ ۱۸۱۰-۱۷۹۶ء کی تصویریں بھری ہوئی ہیں۔ انمیں روگی (Rouget) کی کھینچی ہوئی ایک تصویر ہے جسمیں دکھایا ہے کہ نپولین اعظم کی شادی آسٹریا کی شہزادی میری لوئیسی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہ تصویر بہت زیادہ صاف نہیں اور کسیقدر اندھی معلوم ہوتی ہے مگر اسی شہزادی کی تصویریں دو جگہ اور ہیں جو بے انتہا صاف اور خوبصورت ہیں۔ ایک میں میری لوئیسی تنہا کھڑی ہے اور دوسری میں اپنے لڑکے کو جو نپولین سے پیدا ہوا تھا دیکھ رہی ہے۔ یہ دوسری تصویر فرانس کے مشہور مصنف فرانک (Franque) کی بنائی ہوئی ہے۔

ایک تصویر ہے جسمیں لیوپولڈ اول شاہ بلجیم اور شہزادی لوئیسی دختر لوئی فلپ کے شادی کے شاہانہ جلسے کو دکھایا ہے کہ شادی کا دربار ہے اور پادری کھڑا نکاح پڑھا رہا ہے یہ تصویر ایسی دلچسپ اور خوبصورت ہے کہ اپنے رنگ میں نظیر نہیں رکھتی۔

محل کے شمالی بازو کی پہلی چھت پر اور کمرے ۱۰ کے صدر دیوار پر جسرومی (Gerome) کی کھینچی ہوئی ایک نہایت عظیم الشان تصویر ہے جسمیں لوئی نپولین اور ملکہ دربار فائیٹنی بلو (Fontainebleau) میں سفرای اسلام سے مل رہے ہیں۔

ایک تصویر ہے۔ انتہا درجہ کی دردناک جو انقلاب عظیم فرانس کے خوفناک واقعات میں سے ایک واقعہ کا ایسا دردناک نقشہ ہے کہ موت کا سین آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے موت کا بازار ۱۷۹۳ء میں گرم ہوا۔ ۱۷۹۴ء میں انتہائی کمال پر پہونچا اور خونخواری اور وحشیانہ مظالم کی کوئی انتہا باقی نہ رہی۔ اوسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ کنسرجری (Conciergerie) کے قید خانہ میں بے گناہ بڈھے۔ بچے۔ نوجوان لڑکیاں

مائیں شیر خوار بچوں کو چھاتی سے لگائے بند ہیں اور تمام فرانس میں خون کا سمندر امنڈ رہا ہے۔ باغیوں کی ایک عدالت ہے جو بلا توقف قتل کے احکام جاری کر رہی ہے۔ بے گناہوں کے چھکڑے بھرے ہوئے قید خانے کے پاس کھڑے ہیں کہ انہیں خالی کر کے قید خانے میں ٹھونسیں اور وہاں سے جنہیں قتل کا حکم ہوا ہے بھر کر پلیس ڈی لاریوولیوشن (Plac de la revolution) سولی پر چڑھانے لیجائیں۔ اُف۔ اس سے بھی زیادہ مظالم کہیں سنے گئے ہونگے۔ ان مظالم میں سے ایک مظلمہ کا سین اس تصویر میں دکھایا گیا ہے جس میں شاعر اندری شینیر (andre Chenier) سر پر ہاتھ دھرے موت کے حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ دردناک سین میری نظر سے کہیں نہیں گذرا ایک تصویر ہے۔ ایچ۔ ورنے (H. Vernet) کی بنائی ہوئی۔ اسمیں اس مشہور لڑائی کی سین کھینچنے والے مصور نے سان جوان دی یولوا (San Juan de Ulua) کی گولہ باری کی تصویر بنائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوی فلپ (Louis Philippe) کے زمانہ میں جہازات کیسے ہوتے تھے اور بحری لڑائی کا کیا انداز تھا۔

اس محل کے شمالی بازو کے پہلی چھت کے کمرے ۵ میں یواں (Yvon) کی کھینچی ہوئی حملہ ملاکوف (۸ ستمبر ۱۸۵۵ء) کی تصویر ہے۔ اس سے بڑھکر عمدہ لڑائی کی تصویر شاید ہی دنیا میں کہیں ہوگی صاف معلوم ہوتا ہے کہ خون بہ رہا ہے۔ گولیاں برس رہی ہیں۔ تمنچے۔ بندوقیں۔ کرچیں۔ تلواریں چل رہی ہیں۔ کوئی غرا رہا ہے۔ کوئی کراہ رہا ہے غرض ایک آفت کا عالم ہے۔ جنگ کریمیا میں اس سے بڑھکر سخت کوئی لڑائی نہیں ہوئی جس میں انگلستان فرانس۔ سارڈینیا اور ٹرکی کی افواج متحدہ کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

فرانس کے مشہور مصور بلیس (Blesse) کی بنائی ہوئی جنگ آلما (۲۰ ستمبر ۱۸۵۴ء) کی ایک سین کی تصویر ہے جو ایسی صاف ہے کہ کپڑے پر ہر چیز گویا جاندار معلوم ہوتی ہے خوبی میں حملہ ملاکوف کی تصویر سے یہ کم نہیں اور مصور کی منتہائے کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ فرانس اور الجیریا کی لڑائی کی جو تصویریں ہیں وہ بھی عجیب و غریب فرانسیسی

مشہور مصور بے لانجیر (Bellanger) کی بنائی ہوئی قبضہ درہ موضعہ کی تصویر اور ہوریس ورنے (Horace Vernet) کی بھی بنائی ہوئی قبضہ درہ موضعہ سالا کی تصویریں قابل دید ہیں۔ کہیں یہ ہے کہ فرانسیسی امام عبدالقادر کے خیمہ و خرگاہ پر قبضہ کر رہے ہیں۔ کہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ امام کی عورتیں بے پردہ کی گئی ہیں خاصکر ایک تصویر تو اسقدر بڑی تھی کہ میں چونک پڑا۔ ..... اسمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ فرانسیسی فوج نے عبدالقادر کی فوج پر قبضہ کیا ہے۔ ضخامت میں یہ تصویر ۱۷ فیٹ لمبی اور ۱۷ فیٹ چوڑی ہے اور ۲۰۰۰ کے قریب آدمی ہیں۔ بے پردہ[1] مسلمان عورتیں اور بچے سپاہیوں سے پناہ طلب کر رہے ہیں۔ ایک خاص عورت جو شاید امام عبدالقادر کی بیوی ہیں افسر فوج ڈیوک ڈاملی۔ (Duc d'Aumale) سے رحم طلب کر رہی ہیں۔ ایسا ہیبت ناک سین ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا جیسا برتاؤ فرانسیسیوں نے عبدالقادر کے ساتھ کیا شاید ہی اس سے زیادہ وحشیانہ برتاؤ کسی نے ہزیمت خوردہ غنیم کے ساتھ کیا ہوگا۔ وحشیوں میں بھی کچھ ترس ہوتا ہے اور اونکے بھی ظلم و ستم کی انتہا ہوتی ہے مگر ان مہذب نما وحشی یورپ کی قوموں کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

---

[1] مرزا بیگ بی اپنے سفرنامہ میں اس تصویر کا ذکر کیا ہے اور فرانسیسیوں کی اس تہذیب کا گو کہ بہت نرم الفاظ میں ذکر کیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلیجہ میں خون جوش مار رہا ہے اور آنکھوں سے فرارے نکل رہے ہیں فرماتے ہیں۔
"اس تمام تصویر خانہ میں صرف ایک ہی بات تھی جو فرنچ کی شجاعت اور سویلیزیشن کو بٹہ لگاتی تھی اور مجھکو اوسے دیکھکر نہایت تعجب ہوا کہ ایسی بہادر اور شجاع اور سپاہی قوم نے جو سویلیزیشن کے زیور سے بھی نہایت آراستہ ہے ایسی عجیب بات جو اُن سب خوبیوں کے برخلاف ہے کیونکر کی ہے۔ الجزائر کے محاربات کی تصویروں کی کمرہ میں امام عبدالقادر کی عورتوں کو گرفتار کرنیکے تصویر بنائی ہے اُس کی عورتیں اونٹ پر کجاوہ میں ہیں فرنچ سپاہیوں نے اونٹ کو ہٹا کر کجاوہ گرا دیا ہے اور عورتیں اسمیں سے نکل پڑتی ہیں اور اُن کے بدن سے کپڑا ہٹ گیا ہے۔ اور فرنچ سپاہی سنگین اُٹھائے ہوئے اور اُن کی لڑکیں عورتوں کی طرف کئے ہوئے گویا اب مارنیکو کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا فرنچ کو یہ زیبا تھا کہ عورتوں کی گرفتاری کی تصویر اپنی محل میں لگاتے کیا عورت پر سنگین سیدھی کرنی اور اوسکو کجاوہ میں سے گرا دینا فرنچ سپاہیوں کی بہادری کی یادگاری تھی۔ کیا ایک عورت کا تصویر میں کپڑا بدن پر سے ہٹا ہوا بنا دینا (بالوں نگر ایسا ہی ہوا ہی ہو) فرنچ کی سویلیزیشن کی شان تھا"
(دیکھو مسافران لندن۔) از سر سید احمد خاں۔

اس تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ وحشیانہ مظالم میں یہ فرانسیسی کیسے وحشی ہیں اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو ہاتھ جوڑتے۔ منتیں کرتے اور پناہ مانگتے دیکھکر فخریہ اکڑتے جاتے ہیں کسی قوم کی عظمت و شان کی یہ تصویر ہرگز نہیں بلکہ موجودہ تہذیب و تمدن کے لئے بیکار راہبر اور اگو اقوام دنیا میں فرانسیسی صرف اپنے تئیں سمجھتے ہیں ایک شرم کی تصویر ہے۔ نیرو (Nero) نادر اور ہلاکو کے مظالم کے قصے بیان کئے جاتے ہیں لیکن اگر ان فرانسیسیوں کی اس موجودہ زمانہ کے مظالم سے مقابلہ کیا جائے تو اونکی کوئی حقیقت باقی نہ رہیگی۔ فرانس کے انقلاب عظیم کے زمانہ کو یاد کرو (Commune) کمیونس کے اوس بغاوت کے واقعات بھی ذرا یاد کرو جنہیں ابھی ستر برس بھی نہ ہوئے ہونگے اور اوس ظلم و ستم کو یاد کرو جس سے فرانسیسیوں نے اس غدر کو فرو کرنے میں کام لیا ان سب واقعات سے معلوم ہوگا کہ شاید ہی دنیا میں کوئی قوم اتنے زیادہ فطرۃً ظالم اور وحشی پیدا ہوئی ہو۔ نیرو (Nero) بھی جسنے اپنے باغ کو عیسائیوں کی جسموں میں آگ لگا کر روشن کیا تھا اگر ان وحشیانہ مظالم کو دیکھتا تو شرم سے مارے منہ چھپاتا۔ یوروپین مہذب اقوام ذرا روس کے آجکل کے مظالم اور خاصکر قتل عام سینٹ پیٹرسبرگ کے واقعہ کو دیکھیں اور شرمائیں۔ ذرا کوہ قاف کے مسلمانوں اور تاتاریوں کے قتل کو یاد کریں اور سلطان المعظم پر اسطرح نزغہ کرنیکی وجہ تو بتائیں۔ کیا ہمارے اُن احسانات کا جو ازمنہ وسطی میں ہمنے ان یوروپینوں کے ساتھ کئے تھے یہی بدلہ ہے جو آجکل ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس موجودہ تہذیب کے زمانہ میں جو درحقیقت اخلاق کے لحاظ سے تباہ اور نہایت ہی ذلیل زمانہ ہے کیا ہمارے ساتھ یہی برتاؤ ہوتا رہیگا اور ہم سہے جائینگے۔ اوہ! صلاح الدین کی روح تو ہی آج ہمارے سامنے آ تاکہ تجھے دیکھکر ہمارے دلوں میں عبرت۔ اتفاق و حمیت کے خیال پیدا ہوں۔ آہ۔! اوس عظیم الشان بہادر بادشاہ کا جسد کہیں شام کے میدانوں میں زیر زمین آرام کرتا ہوگا۔ اُسے کیا خبر کہ جو مقامات اوسکے تزک و احتشام کے مرکز تھے، آج ویران پڑے ہیں جن لوگوں کی تلوار سے اوسنے عیسائی دنیا کے دانت کھٹے کر دیئے تھے آج اُن کی اولاد ذلیل و خوار ہے۔ اوسکی روح بیشک اُن کھنڈروں کو دیکھکر روتی ہوگی۔ مگر کیا ہمسے نہیں ہو سکتا

کہ اپنے آباواجداد کے کارنامے یاد کرکے اسیطرح دنیا میں پھر نام پیدا کریں جسطرح انہوں نے کئے تھے مسلمانوں کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو طوفان حوادث کے تھپیڑوں سے نجات دیں اور اُن عیسائیوں کے ہاتھوں سے اپنے تئیں محفوظ رکھ سکیں جو اپنے آپ کو رحم وکرم کے امام اور برے کے مانند حلیم کہتے ہیں اور اسلام کو مذہب شمشیر بتاتے ہیں اس سے بڑھ کر دھوکے بازی اور منافقت دنیا میں کہیں اور بھی ہے خدا کی قسم میرا دل بے انتہا جوش سے بھر جاتا ہے اور ناامیدی اوس پاک خدا کے مکان یعنی کعبہ کی تصویر سامنے کھڑی کر دیتی ہے۔ اور میرے نظر میں اس مرکز وحدانیت کی گرد ہزاروں زائر اطراف واکناف عالم کے جمع طواف کرتے اور اوس پاک ذات کی وحدانیت والوہیت کا اقرار کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی ناامیدی وبیکسی کی حالت میں مدد کے لئے میری زبان سے یہ آواز بیساختہ نکل جاتی ہے کہ اُو خدائے واحد کی مقدس مقام اور اوسکی وحدانیت کے آشکارا کرنے والے اپنے ان زیارت کرنے والوں میں اُن کی اسلاف کی سی روح پھونک دے۔ تیرے سامنے میں اُن اقطاب وابدال وبزرگان دین کی ارواح کو پکارتا ہوں جنہوں نے تیرے دامنوں کو زمانہ سلف میں بوسہ دیا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں حمیت واتفاق اور اصلی اسلامی جوش پیدا ہو جائے۔ تمام اسلامی دنیا سے یہ لوگ تیرے گرد آکر جمع ہوئے ہیں۔ انہیں سچائی۔ انصاف۔ اتفاق۔ مذہب وطن کی محبت کے خیالات پیدا کر دے کہ گھر جاکر ان خیالات کو پھیلائیں اور اپنے ممالک کو ان عیسائی بروں کی چراگاہ بننے نہ دیں۔"

فرانسیسیوں کی اس ظلم وستم کی تصویر نے مجھے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ دمشق کی دلچسپیاں ابھی بہت باقی ہیں اور یہاں کے حالات مجھے کچھ اور بیان کرنے ہیں۔

یہ مقام اپنے فواروں کے لحاظ سے بہت مشہور ہے جنپر خوبصورت اور عجیب عجیب تصویریں پریوں کی شکل کی بکثرت کندہ ہیں ان فواروں نے باغ کو رشک باغ عدن بنا دیا ہے اور ان کا چھوٹنا اور ہوا میں طرح طرح سے چکر کاٹکر گرنا ایسا دلفریب ہے کہ یہ باغ ان کی وجہ سے دنیا کے بہترین باغوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک خوبصورت جھیل ہے

جسپر اکثر کشتیوں میں بیٹھکر تفریح کے لئے لوگ نکلتے ہیں۔ گو کہ یہاں شانتلی (Shantalli) کی مانند درختوں کے دورویہ صفیں کثرت کے ساتھ نہیں تاہم چنداری درختوں کے دلفریب کنج بہت ہیں اور بمقابلہ شانتلی (Shantalli) کی چہل پہل بھی یہاں زیادہ ہے۔ ہر طرف سیر و تفریح کرنیوالوں کی جماعتوں کی جماعتیں نظر آتی ہیں جو صرف ایک دن کے لئے چھٹی منانے آتے ہیں۔

مین ورسائی (Versailles) دریائے سین (Seine) کے راستہ کشتی پر گیا تھا تاکہ وہاں کے دلفریب مناظر قدرت کے دیکھنے کا موقعہ زیادہ ملے مگر لوٹتے وقت نہایت تیز رفتار کی برقی ٹرین پر جسمیں آسائش کا تمام سامان مہیا تھا واپس آیا۔ فقط

"ثانی"

مکتوبات امیر مینائی

استاذ امیر مینائی علیہ الرحمۃ جسطرح نظم اردو کی استاد مسلم الثبوت ہیں اسی طرح جناب مرحوم کی نثر بھی ایک ممتاز مرتبہ رکھتی ہے۔ وہ نہایت متین اور معنی خیز نثر تحریر فرماتے تھے اور میری آرزو ہے کہ کسیطرح استاذ مرحوم کے مکتوبات اور نثر کا مجموعہ مدون ہو جائے چنانچہ رسائل اور اخبارات میں اعلان بھی کیا۔ تلامذہ اور احباب کو خطوط بھی لکھے۔ منشی محمد احمد صاحب خلف اکبر استاذ مرحوم سے زبانی بھی عرض کیا مگر زمانہ ایک حجاب غفلت سے کہ عالم دانش و فن پر پڑا ہوا ہے اور کسیکو اس خواب خوش آیند سے بیدار ہونے کی رخصت نہیں دیتا۔ خیر یہ چند خطوط اردوی معلے میں شائع کرتا ہوں تاکہ اہل فن کو استاذ مغفور کی نثر کا پایہ معلوم ہو جائے اور وہ انکو پڑھکر محظوظ ہوں۔ تلامذہ اور احباب جناب امیر مرحوم سے درخواست ہے کہ جلد متوجہ ہوں اور نقل خطوط حضرت ممدوح خاکسار کو مرحمت فرمائیں تاکہ استاذ کا مجموعہ نثر مکمل ہو جائے۔

خاکسار۔

محمد احسن اللہ خاں ثاقب دفتر قند پارسی علی گڈھ

(۱) حکیم عابد علی صاحب کوثر خیرآبادی کے نام

(رام پور - ۸ مارچ ۱۸۹۶ء)

مجی حکیم صاحب - سلام مسنون دعا مشحون - مہربانی نامہ نے پہنچکر شکر گزار یاد آوری کیا ؎

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

اب تک آپکا فائز مرام نہونا سخت افسوس کا باعث ہے - اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دلخواہ کامیاب فرمائے - یہ داعی خیر دعا سے کسیوقت غافل نہیں ہے -

بھانا پسند آنے کے معنی میں اگلی زبان ہے اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے - مہین "میں ہی" کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں ابتک نظر سے نہیں گزرا - حکم اسکو استعمال کا نہیں دیا جاسکتا حضرت اسیر مرحوم کی نظر سے آپکے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہگیا اور مینے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنی سہو نظر کے اور کیا کہا جائے انکھڑیاں چشم معشوق کیلئے مخصوص ہے اور یہ لفظ مجھے بہت پسند ہے بدنا لفظ ضیح بدنا ہے اور سرایت کرنیکے معنی میں مستعمل ہے

شوق کا ہے وہ ہی عشق جنوں زا دل میں	صبا	بدہ گیا ہے نگیں حسن کا سودا دل میں

ایجاد مذکر ہے - سند کے شعر ذیل میں دیکھئے - آج کل اس لفظ کے تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے - اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں اور جابجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں - سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خانصاحب داغ کا قول ہے کہ دلکی میں مونث ہے مگر کلام میں کہیں سے مونث کا پتا نہیں چلتا - اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں ہے - نسیم دہلوی ؎

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارک باد مرگ		یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

یہ تازہ لگا ہوئے ایجاد گلستاں میں میر رانوں کو لگا رہنے صبا و گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے وہ سند کے لئے [illegible] سے کافی نہیں ہوسکتا مگر دیوان میں اسیطرح چھپا ہے اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے

غافل لکھنوی ؎

اتنی بینائی کہاں کھینچ سیر جزو و کل	عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہے مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر کہا ہے فلہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے ؎

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی	ناسخ	تو گویا پیمبر کو دشنام دی
بارہا میں گیا ہوں نزد امام	ولہ	کبھی مجھکو ندے کوئی دشنام
ہمکو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے	ظفر	خط یہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہمکو		کاہیکو سننے کو دشنام کسو کے آتے

سب بنکے زادے اور جلیل حسن بالتخصیص تسلیم گزار و سپاسگزار ہیں امیر فقیر

(۲) مولوی نورالحسن صاحب خلف اکبر استاذ مولوی محمد محسن صاحب محسن کاکوروی کے نام

دفتر امیر اللغات۔ ریاست رام پور ۸ اگست ۱۸۹۹ء

سراپا رشد و سعادت۔ مجسم علم و لیاقت عزیز از جان مولوی محمد نورالحسن کو امیر فقیر کے جی سے بے اختیار نکلی ہوئی دعائیں۔

آج آزاد آیا۔ آشوب چشم کے سبب میں دیکھ تو نہ سکا مگر تمہارا ریویو امیر اللغات پر پڑھوا کر سنا۔ اس حیثیت سے کہ تمنے اپنی رائے ظاہر کی تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس نظر سے کہ تمنے بہت ہی نازک خیالی کے ساتھ ریویو کیا آفریں و مرحبا کہتا ہوں۔ چشم بددور تمنے تو امیر اللغات کے بعض بعض وہ حسن ملک کو دکھا دئے جن کی نسبت میرا خیال یہ تھا کہ جو اس کام میں مصروف ہیں صرف انہیں کی نگاہ میں ہیں۔ خدا تمہیں بہت بڑی عمر دے۔ تمہاری علم و لیاقت کا ملک میں ڈنکا بجے اور بہت بڑا صاحب اقبال کرے۔ آمین۔

تمہارے سوالوں کا جواب حسب ذیل ہے۔

آرمی۔ میرے نزدیک ہندی ہے اسلئے کہ عاری نیچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلاف اصول ہے

ہندی میں عین کہاں۔

مسالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کا مہند ہے جو عربی میں مصلح کی جمع ہے۔ اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم و ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی عمل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے جیسے عطار کے لیے پنساری وغیرہ۔ تالیف کے لئے وہ کتابیں وغیرہ جنسے اس تالیف میں مدد ملے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لئے گوٹا پٹا بنت کناری۔ کھانے کے لئے لونگ۔ الائچی۔ دھنیا مرچ۔ بال دھونے کا مسالا۔ محرم کا مسالا مسالے کا تیل۔ دلی والے اصل کی طرف جاتے ہیں مگر چونکہ زبانوں پر مصالح نہیں ہے یعنی کوئی یہ نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا۔ گرم مصالح ہوگیا۔ کرتی میں مصالح کم پڑا۔ ایکی محرم کا مصالح ہمکو نہیں دیا اسلئے میری رائے ہے کہ اردو میں جو بولیں وہی لکھیں۔ جسطرح مسالا بولتے ہیں اسیطرح لکھا بھی جائے اور یہی مغرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے۔ جیسا رنگ نے اپنی لغت میں لکھا ہے۔

مسالا۔ میم مفتوح سین مہملہ و لام بالف کشیدہ۔ ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات رونق و لذت آں چیز شود۔ ظاہرا ایں لغت از مصالح باشد۔ اور اسیکی تقلید جلال نے بھی اپنی لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ میر مرحوم نے بھی یہی ضرب اختیار کیا ہے

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحت دل پر	؎	جو دیکھے آپکے موباف کا مسالا سانپ

کالا سانپ اور بالا سانپ زمین ہے۔ ولہ ؎

کسی کے سینۂ سوزاں سے کیا نشہ میں لپٹی ہے		کباب دل کی کچھ کچھ بو ہے کرتی کے مسالے میں

لالے میں پیالے میں زمیں ہے۔ اور جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محلات لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی ؎

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بیچ کر		انگیا کا میرے سارا مسالا مسل گیا

"امیر فقیر"

ایک پُر لطف تحقیق

دہلی اور لکھنؤ کے طفیل میں گو قریب قریب ہندوستان کے تمام شہروں میں کم و بیش فصاحت کا خوشنما جلوہ نظر آنے لگا ہے پھر بھی بہت کسر باقی ہے اور بعض محاورے بالکل ہی ایسے گوش زد ہوا کرتے ہیں عرصہ ہوا کہ میں بانسہ شریف میں حاضر تھا وہاں ایک میرے مکرم شاعر فصیح اللسان جنکا وطن شاہجہانپور ہے اور حضرت داغ دہلوی مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں تشریف رکھتے تھے۔ اُنہوں نے ایک آم کے بڑے درخت کو فرمایا کہ کیا ہی اچھا آم کا بوٹا ہے خاکسار نے عرض کیا کہ اتنے بڑے درخت کو بوٹا کہنا یہ کہاں کا محاورہ ہے اُنہوں نے فرمایا کہ ہر درخت کو خواہ کتنا ہی بڑا ہو اور چاہے جسکا ہو بوٹا کہ سکتے ہیں اور فصحا برابر اسکو استعمال کرتے ہیں۔ کوئی مثال کسی اہل زبان کی نہیں دی۔ میں نے اسکے صحیح ہونے سے بالکل انکار کیا اور بوٹا جن معنوں میں مستعمل ہے وہ ظاہر کئے لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہے۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ فصحاے اہل زبان سے اسکی نسبت استفسار کیا جائے اور جو وہ لکھدیں صحیح مان لیا جائے۔ چنانچہ میں نے یہ مسئلہ پہلے افصح الفصحا استاذی حضرت حمد لکھنوی مدظلہم العالی کی خدمت میں پیش کرکے اُنسے جواب لکھوایا۔ بعدہ حضرت جلال لکھنوی سے لکھوا کر حضرت داغ کی خدمت میں حیدرآباد بھیجا۔ اُنہوں نے بھی اوسکا جواب عنایت فرمایا۔ الحمد للہ کہ خاکسار کا خیال صحیح نکلا۔ اسکی بعد دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بیشک شاہجہانپور میں عام طور سے ہر درخت کو بوٹا کہتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو۔

اب وہ دلچسپ سوال و جواب لفظ بلفظ درج ذیل کرکے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں یقین کہ ناظرین اس مفید تحقیق کے ملاحظے سے بہت محظوظ ہونگے = فقط۔

سوال

شعراے محقق اور فصحاے زبان اردو کی خدمت میں التماس ہے کہ اس بارے میں

اپنی رائے ظاہر کرکے مرہون منت فرمائیں۔ کہ لفظ **بوٹا** بواؤ معروف کے کیا معنی ہیں اور عام اشجار پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مثلاً۔ آم کا بوٹا۔ املی کا بوٹا۔ تاڑ کا بوٹا وغیرہ اور دہلی و لکھنؤ میں اسکے معنی میں کوئی فرق ہے یا نہیں فقط

جواب

(**بوٹا**) اصل میں یہ فارسی زبان کا لفظ بوتہ واؤ معروف اور تائے قرشت کے ساتھ ہے جسکے معنی چھوٹا درخت جو بست بلند نہو۔ اسی کی تے کو تائے ہندی اور آخر کی ہائے مختفیہ کو الف سے تبدیل کرکے بوٹا لفظ ہندی بنا لیا ہے۔ معنوں میں کوئی فرق نہیں۔ اردو میں بھی چھوٹے ہی درخت کو بوٹا کہتے ہیں۔ جیساکہ جناب بحر مرحوم کے اس شعر میں توضیح کے ساتھ موجود ہے ؎

راستی چاہئے خردی و بزرگی کیسی　　بڑھ گیا سرو سے قد یار کا بوٹا ہو کر

اسی وجہ سے اکثر پھول کے درخت پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے جیساکہ امانت مرحوم نے کہا ہے ؎

چمن کی کوئی گل کا بوٹا ہے تو	ستارہ دیا نکے لوٹا ہے تو

اور تصغیر ہی کے لحاظ سے چھوٹے خوشنما قد کو بوٹا سا قد کہتے ہیں جیسے ناسخ مغفور ؎

گڑ گئے گلبن ترے بوٹا سے قد کو دیکھکر　　تھا کف گل میں جو زر گویا دفینا ہو گیا

اور نیز بلحاظ خردی پودے کو بھی کہہ سکتے ہیں جیساکہ بحر مرحوم کے اس شعر سے مترشح ہوتا ہے ؎

سیر کے قابل ہے اب باغ جوانی یار کا　　بیل زلفوں کی چلی قامت کا بوٹا بڑھ گیا

اور گل و برگ کی تصویر کو بھی بوٹا کہتے ہیں جو کسی چیز پر بنی یا چھپی ہو جیسے بحر مرحوم کے اس شعر میں ؎

اپنی بہار خاک دکھائیں غریب لوگ	بوٹی نہ چھینٹ کی ہے نہ بوٹا ہے شال کا

انہیں معنوں میں برعایت معنی مذکورہ بالا یعنی گلبن اس شعر میں فرماتے ہیں ؎

عجب بہار ہے بیلوں کی اور بوٹوں کی	پری دوپٹا ترا غیرت چمن کیا خوب

سحر مرحوم چھوٹے خوشنما قد کو تشبیہاً دوشالے کا بوٹا یوں فرماتے ہیں ؎

گھٹا ہو گئی سیٹے چھوٹے ہوئے	قد نم دوشالوں کے بوٹے ہوئے

آتش مرحوم کہتے ہیں ؎

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی　　گیا ہے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

راقم السطور عرض کرتا ہے ؎

رنگین کفن بھی ہو کہ میں رنگین مزاج تھا　　نیچے کفن کے بوٹے ہوں اوپر کفن کے پھول

اب رہا یہ سوال کہ درخت کو چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بوٹا کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ مثلاً آم کا بوٹا۔ تاڑ کا بوٹا اور املی کا بوٹا وغیرہ ایسا نہ تو اصل لفظ فارسی بوتہ سے معنوی سے مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور نہ محاورۂ اردو میں فصحائے لکھنؤ کی زبان سے سنا نہ اونکے کلام میں نظر سے گزرا اہل کے قدمائے محقق کے کلام میں بھی جہاں تک دیکھنے کا اتفاق ہوا سوا معنی مذکور کے ان معنوں میں ہونیکا خیال نہیں۔ میرے نزدیک تو کسی بہت بڑے درخت کو بوٹا نہ کہنا چاہیے

فقط واللہ اعلم　　خادم الشعرا (محمد محمود احمد) لکھنوی

بوٹا کا اطلاق محض درخت گل یعنی گلبن پر کیا جاتا ہے اور کسی درخت کو نہیں کہہ سکتے۔ جلال بکمال۔

بوٹا چھوٹے سے خوبصورت درخت جو خلقت میں چھوٹا ہو یعنی پودے کو کہتے ہیں اور گلبن کو بھی کہتے ہیں اور ببول پتی کو بھی کہتے ہیں۔ آم کا بوٹا تاڑ کا بوٹا املی کا بوٹا میں نہیں جانتا۔ متوسط درختوں اور خوبصورت قد کو بوٹا سا قد کہتے ہیں۔　　فصیح الملک داغ دہلوی۔

الداعیہ خاکسار وصل بلگرامی عاملہ اللہ تعالیٰ بلطفہ السامی اول تلامذہ حضرت احمد لکھنوی۔

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

وہاں سے میرے اقارب کو کیا مری خبر آئے　　تری گلی سے مری لاش بیوفا گر آئے

پہونچ گئے ہیں کہیں تو صنم کدہ ہو کہ کعبہ　　اب اسکو جانے بھی دو فرط شوق میں جدھر آئے

تجھے کہ عشق و ہوس میں کچھ امتیاز نہیں ہے　　نگاہ حسرت اہل وفا میں کیا نظر آئے

ہمیں مجال کہاں ہے کہ جائیں ہم تری در تک　　تجھے خیال کہاں ہے کہ تو ہمارے گھر آئے

ابھی ذرا بھی قاتل کی کوچے سے نہ اٹھائیں　　بہار زخم تو جب ہے کہ خوں تا کمر آئے

دکھائیں ہم بھی تجھے ایک دن بہار تبسم　　لب جراحت دل میں جو خون ناب بھر آئے

پہونچ سکے نہ ترے لب تک نہ شیشۂ مے گلگوں
تجھے خیالِ دلِ عاشقاں کبھی اگر آئے

ہے اب تو طعنِ اقارب کا ڈر بھی بیم عدو بھی
گئی وہ بات کہ بدعہد تو ہمارے گھر آئے

بطور تحفہ اُسے بھیجئے بخدمت کوکب
زبان خامہ پہ وحشت جو کوئی شعر تر آئے

غزل جناب محمد محمود صاحب حمد لکھنوی ارشد تلامذہ حضرت بحر مرحوم لکھنوی و حضرت قدر مرحوم بلگرامی

یہ بے موقع تمہاری ہر گھڑی کی دل لگی کیسی
طبیعت آدمی کی ہے کبھی کیسی کبھی کیسی

نہیں دل لیکے دیتے یہ تمہاری دہاندلی کیسی
مری ہی چیز کو کہتے ہو۔ میری ہے۔ تری کیسی

دکھا دوں ایکدن اونکو تو پھر ہو دل لگی کیسی
جو کہتے ہیں کہ دیکھیں۔ ہوتی ہے دلکی لگی کیسی

نہیں اک رنگ پر رہتی طبیعت ہے تری کیسی
کبھی ایسی۔ کبھی ویسی۔ کبھی کیسی۔ کبھی کیسی

ترے محفل میں سیکھی ہے نے شوخی تیغ کی کیسی
کنچی کنچکر چلی کیسی چلی چلکر رکی کیسی

جہاں آیا وہاں کہو یا گیا ہمسے الگ چھوٹا
سزا اپنے نکلنے کی دلکو آخر ملگئی کیسی

بیان سوز دل رو رو کے کرتا ہوں تو کہتے ہیں
لگی ہے آگ جب دلمیں تو آنکھونمیں تری کیسی

ستم کرنے سے اونکو کام اور اونکی بلا جانے
یہ تو ہمسے کوئی پوچھے پڑی کیسی سہی کیسی

ہزاروں لخت دل ساتھ آہ کے نکلے ہیں رونے میں
چلا ہے میرا نالہ لیکے پھولونکی چھڑی کیسی

یہ قدرت قاف والونکی کریں جو حسن کا دعویٰ
مقابل اونکے پہلے حور تو ہوئے۔ پری کیسی

مقابل ہوتے ہی مرغ نظر سے مرغ دل ہارا
یہ بازی چھوٹتے ہی جوڑ گھٹ بڑھ ہوگئی کیسی

وہ سن سن کر مرے ہر شعر کو ای حمد کہتے ہیں
طبیعت میں ہے اس کمبخت کی شوخی بھری کیسی

غزل جناب طاہر فرخ آبادی بطرز لکھنو

تاؤ کھا کر رہگیا آہوں سے جل کر رہگیا
رنگ چنبر کیطرح گردوں بدل کر رہگیا

وصف شمع عارض پر نور کا کیا پوچھنا
نور کا مضمون تھا سانچے میں ڈھل کر رہگیا

سخت جاں پایا مجھے غصے کے جوہر کھل گئے
نیچہ جلاد کا تیوری بدل کر رہگیا

دل نے جیتے جی نہ چھوڑا دامن عشق مژہ
واہ رے نادان کانٹوں میں مچلکر رہگیا

تیری چوٹی ایڑیوں تک آئی حسرت بڑھگئی
پاؤں اسنے چھولئے میں ہاتھ مل کر رہگیا

کچھ نہ ٹھہرا دل ہمارا سوز غم کے سامنے
سنگ خارا تھا مگر کنجت جلکر رہگیا

آتے آتے میرے گھر رخصت ہوا وہ مہروش
وصل کا دن صبح ہوتے ہوتے ڈھلکر رہگیا

بزم میں مجھکو فدا ہوتے جو دیکھا یار پر
شمع کو حسرت ہوئی پروانہ جلکر رہگیا

جب حنائی ہاتھ اٹھائے اسنے بہر فاتحہ
قبر میں طاہر کف افسوس ملکر رہگیا

غزل جناب سجاد عظیم آبادی

زباں سے کیا گلہ کاوش عدو سے نکلے
جو دوست دشمن ایمان و ابرو نکلے

تمہاری یاد میں تن سے جدا ہوئی یوں روح
کہ جیسے پھول سے بو۔ دل سے آرزو نکلے

نہ چھوڑنا کبھی دست ہوس سے دامن عشق
جو سو جگہ سے گریبان آبرو نکلے

میں دم بخود ہوں کہ جب ذبح کرکے اوٹھ جائیں
تو جان جسم سے اور زخم سے لہو نکلے

زبان تیغ سے بیجا نہیں ہے پرسش حال
وہ راہ کرتے ہیں دلمیں کہ آرزو نکلے

میں جانتا ہوں کہ آداب میکدہ کیا ہیں
خدا گواہ ہے ساقی جو ہائے و ہو نکلے

شروع راہ حقیقت ہے انتہائے مجاز
صنم کدے سے جو نکلے تو قبلہ رو نکلے

ٹھہر ادب سے ذرا قتل کر مجھے قاتل
غضب ہو۔ گر وہ قریب رگ گلو نکلے

یہ آہ سرد ہے غماز راز عشق بتاں
نہ ہو صبا۔ نہ چمن سے گلوں کی بو نکلے

مریض غم کی اجل آچکے تو وہ آئیں
بدن سے جان نکل لے۔ تو آرزو نکلے

نوید امن ہو سجاد دشمنی ان کی
وہ جسکے دوست ہوئے اسکے عدو نکلے

غزل جناب حاجی شیدہ نور الرحمن صاحب نذر عظیم آبادی

ہزار شکر اسی کا یہ دل نشانہ ہوا
خراب جسکے اشارے سے اک زمانہ ہوا

دکھائیں خوب سی نیرنگیاں دو عالم کی
نگاہ یار کا ممنوں اک زمانہ ہوا

ترے ہی ذکر پہ صد شکر ناتمہ بھی ہوا
ہمیں تو باعثِ آرام یہ فسانہ ہوا

۳

نہ بھول جینے پہ اپنے جہاں اجل آئی
تمام درہم و برہم یہ کارخانہ ہوا

خوشا نصیب کہ تم آج میرے گھر آئے
شرف میں عرش کا ہمسر فقیر خانہ ہوا

بلا سے مجھے ہو کوئی آرزو تو کیونکر ہو
کہ دل کو روئے ہوئے مجھکو اک زمانہ ہوا

وہ مست ہوں کہ اُدھر میں کبھی جو جا نکلا
تو قدسیوں میں بھی اک جشنِ خسروانہ ہوا

نگاہِ یار کا مجھسے نہ پوچھیے عالم
کہ اسکے سامنے جو آگیا نشانہ ہوا

اب اور کیا کہوں صیاد مختصر یہ ہے
سبب قفس میں پہونچنے کا آب و دانہ ہوا

قیام راست نہ تھا مجھکو ای جہاں والو
تمہیں یہ ملک مبارک ہو میں روانہ ہوا

ہمارے حال سے ہوتی ہے تیری شان عیاں
ہمارا ذکر بھی گویا ترا فسانہ ہوا

خوشی کہاں کی۔ تردد کہاں کا۔ غم کیسا
مجھے تو ترکِ علائق کو اک زمانہ ہوا

بہار آئی تو اگلے گلوں کی یاد آئی
بلا نصیبوں کو رونیکا اک بہانہ ہوا

بگڑ کے تیری محبت میں پھر بنا ہی دل
لٹا تو اور بھی انمول یہ خزانہ ہوا

غرض بھلوں سے نہ مطلب برونی ہی انکو
الگ سبھوں سے ہوا جو ترا یگانہ ہوا

انہی کی موت ہے اے نذر قابلِ حسرت
جنہیں شباب ہی خود موت کا بہانہ ہوا

غزل جناب علی اسط صاحب رشک فتحپوری ازباندا

تری یاد ہیں سب ستمگار باتیں
وہ دلدوز طعنے دل آزار باتیں

تری مست آنکھوں نے ہنگام مستی
وہ کیں جیسی کرتے ہیں ہشیار باتیں

قطعہ بند

کسیکو رلایا کسیکو ہنسایا
اشاروں میں کیں وہ طرحدار باتیں

وہ گویائی کو دی ہے طاقت خدا نے
عیاں کرتی ہیں گنج اسرار باتیں

نہیں ضعف سے تاب گفتار باقی
کرے تجھسے کیا تیرا بیمار باتیں

بڑی تیری رحمت بڑی تیری بخشش
یہ کرتے ہیں تیرے گنہگار باتیں

مزہ آگیا رشک تیری بیاں میں
کئے جا تو ای میرے غمخوار باتیں

غزلیات حضرتِ سید الشعرا مولانا شاد خاں بہادر مدظلہ

لقب کیونکر نہو طبع رسا۔ معجز رقم میرا
عصا موسیٰ بنی کا۔ تیغ حیدر کی۔ قلم میرا

تماشہ ہے کہ دم میں کچھ نہیں۔ دم بھر میں سب کچھ ہوں
عجب دھوکے کی ٹٹی ہے وجود کا نعلم میرا

رہے یا جائے دونوں حالتیں یکساں ہیں کیا پروا
نہ روح اپنی۔ نہ صبر اپنا۔ نہ دل میرا۔ نہ غم میرا

ترے رستہ میں ثابت پا کے اک حسرت سی ہوتی ہے
خود اپنے نقشِ پا کو پھر کے تکتا ہے قدم میرا

جہاں روشن ہے جس سے داغ سینہ میں وہ لایا ہوں
بہ حسرت کیوں نہ منہ دیکھا کرے شمعِ حرم میرا

اسی سے لطفِ صحبت دلکو ہے۔ دل ملگیا جس سے
خوشی جانیکو جائے۔ پر نچھوڑے ساتھ غم میرا

گرہ دلکی ہمیشہ کھولتا ہوں پر نہیں کھلتی
الٰہی ہاتھ میں تیرے ہے یہ کارِ اہم میرا

ہوا کمائی ہے ایک مدت یہ میدانِ معانی کی
کہ روکے اب نہیں رکتا ہے کلکِ تیز دم میرا

مجھے الجھا نہ رکھنا روزِ حشر اپنی زیارت میں
کہ اے رحمت بہت مشتاق ہے باغ ارم میرا

ہوس سو کی نہ دو سو کی۔ اسی اک غم کا طالب ہوں
تری سرکار سے ساقی نہ روزینہ ہو کم میرا

لیں اے دشمن دوستی کو چھوڑ دے۔ آ صلح کر مجھ سے
خوشی تیری نہ پائندہ۔ رہے گی اور نہ غم میرا

فقط شکر و شکایت کے لئے اک آڑ رکھ لی ہے
حقیقت میں جو سچ پوچھو کرم میرا ستم میرا

مجھی سے زندگانی فنِ شعر و شاعری کی ہے
غنیمت اس عظیم آباد میں ہے شاد دم میرا

جانے بھی دے محل یہ نہیں کبر و ناز کا
آخر ہے رات وقت ہے راز و نیاز کا

قیدِ مکاں سے مجھ کو چھڑایا عتاب نے
شرمندہ میں نہیں نگہِ دل نواز کا

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نظر
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

اس عیش مستعار پہ ہونے دیا نہ خوش
احسان مانتا ہوں غمِ دل نواز کا

عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں
اسمیں قصور کیا نگہِ فتنہ ساز کا

جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں قیدیوں کی طرح
اللہ ری سلسلہ تری زلفِ دراز کا

اُنکی نگاہِ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
مُنہ دیکھتی رہیگی حقیقت مجاز کا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

اللہ رے بلندیٔ بامِ ثنائے دوست
جھک جھک گیا ہے سر قلمِ سرفراز کا

ترکِ امید بھی مری آنکھوں میں ہے اُمید
اے یاس حوصلہ نہ رہا امتیاز کا

غفلت میں زندگی کا زمانہ بسر کروں
خمیازہ میں اُٹھاؤں ترے خوابِ ناز کا

کسطرح دل کو فتنۂ محشر کا ہو اثر
ہنگامہ یاد ہے تری رفتارِ ناز کا

مطلب نکال لے یہ کہاں آہ کی مجال
اس کا تو کام ہے فقط افشائے راز کا

شاید صفِ نعال میں تھوڑی سی جا ملے
اے شاد ہم بھی رکھتے ہیں دعوا نیاز کا

تجھ میں پوشیدہ ولا نالۂ غماز بھی تھا
کیا سمجھتے تھے کہ اک خانہ برانداز بھی تھا

ٹھوکریں کھانے لگا کاسۂ سر گلیوں میں
اس سے انکار نہیں پہلے سرافراز بھی تھا

جاؤ بیجا شبِ غم میں کئے ناحق نالے
یہ نہ سمجھے کہ کوئی گوشِ برآواز بھی تھا

اب تو ہلنے کی بھی طاقت نہیں باقی صیاد
کبھی اس میں پرِ لائقِ پرواز بھی تھا

سب یہ کہتے ہیں کہ اب صبر بھی ناممکن ہے
اس سے پہلے ترے غمزوں کا اک انداز بھی تھا

سادگی تھی مگر اُس نامے کے ہر فقرے میں
کچھ ادائیں تھیں کچھ انداز تھے کچھ ناز بھی تھا

شاد چپکی سے لگی رہتی ہے برسوں اب تو
وہی میں ہوں کہ کبھی زمزمہ پرداز بھی تھا

کسی طرح سے تو آئے اُنہیں خیال اپنا
ضرور چاہئے اُن سے بیانِ حال اپنا

نگاہِ ناز نے تفصیل تک نہ کرنے دی
ہزار حیف کہ مجمل رہا سوال اپنا

ہزاروں کام معطل ہیں ایک دل کے بغیر
چلا گیا ہے برائے کے بس میں مال اپنا

اُمید وصل نے کس کس کے گھر کئے نہ تباہ
مگر ہمیں بہ خدا کچھ نہیں ملال اپنا

کبھی تو دیر تک اے چشم اشکِ خون روئے
بخار کچھ تو خدا کے لئے نکال اپنا

کوئی تو روئے گا اے شاد اپنی محنت پر
کوئی تو یاد کرے گا کبھی کمال اپنا

اردو کی سلے

بنیاج دلیسج اردو کا ایک [illegible] اور قابل دید رسالہ
[illegible] کے بغیر مطبوعہ دواوین
[illegible] ۲۰ صفحے
کہانی چھپائی کا تذہیب پسندیدہ نمونہ کاپر چہ ۲،
کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔ (۱) رسالہ دواوین
[illegible] مع محصول (۲) صرف رسالہ ہے سالانہ
محصول (۳) صرف رسالہ (محصول سیند کا نذر) ۴
سالانہ (برائے طلبہ و غیر متعلق حضرات) مقاصد ضروری
منجملہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالیٹکس۔ درخواست خریداری
بنام منیجر اردو کی سلے الہ آباد آنا چاہیے۔

علہ چنانچہ [illegible] (۱) رپورٹ اردو [illegible] کانگریس ۸
دیوان [illegible] (۲) اور [illegible] شاگرد
[illegible] (۳) [illegible] کے [illegible]
آخر میں دیوان [illegible]

دیوان غالب

سفید کاغذ پر عمدہ چھپا ہوا ایڈیشن یعنی اس دیوان کی
مطابق جسکا پروفیسر خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا
مع شرح [illegible] غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت
موہانی بی۔ اے۔ اڈیٹر اردو کی سلے علی گڈھ تقطیع
۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۰۰ جزو قیمت مع محصول صرف عہ
فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲)
غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۳
تا صفحہ ۲۴ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰
(۵) ضمیمہ یعنی غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان
میں موجود نہیں ہیں۔
درخواست خریداری بنام منیجر اردو کی سلے علیگڈھ
آنا چاہیے

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی
مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اردو کی سلے غزلوں کا انتخاب
اس احتیاط اور خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اسکو [illegible]
کو دیکھکر [illegible] بالا تعمیم [illegible]
باقی نہیں رہتی۔ کاغذ سفید [illegible] حجم [illegible]
قیمت صرف [illegible] مع محصول ڈاک۔
اور [illegible] اردو کی سلے علیگڈھ

دی [illegible] ٹریڈنگ کمپنی بہاگلپور

حضرات [illegible] دیا جاتا ہے
کہ [illegible] بہاگلپور کے [illegible]
بالالتزام [illegible] ہے [illegible] نہیں کہ
[illegible] اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا
کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ [illegible] کمپنی کا دعویٰ
ہے کہ ہندوستانی و لاثانی طرز کے سستے پارچہ انفیس
دیسی [illegible] از قسم لنگی [illegible] دھوتی و [illegible]
دستی [illegible] و [illegible] از قسم [illegible] رنگ کی [illegible]
و [illegible] رنگ کا [illegible] و [illegible] و [illegible]
لاین [illegible] و [illegible] و [illegible] و [illegible]
[illegible] و ہندوستان [illegible] پہنچا جائیں۔
[illegible] بہاگلپور [illegible] کپڑوں [illegible]
نظیر ہے اور اسقدر مقبول ہزار خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب
زیادہ تشہیر کی ضرورت نہیں رہی۔
[illegible] طرز کے کپڑے [illegible] بہت جلد مناسب
قیمت پر [illegible] کے جاتے ہیں۔
حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت [illegible]
ہوئے ہندوستان و [illegible] صفت کیے جاتے ہیں [illegible]
[illegible] کے [illegible]
ڈاکٹر [illegible] سکرٹری [illegible] ٹریڈنگ کمپنی
بہاگلپور [illegible] تار پور

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگران پنجرہ چوک نمبر ۱۵

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور بیس چیزیں مفت

ہر قسم کے بوٹ جوتے کانپور کے

ہر قسم کے زین کانپور کے

ہر قسم کے سانچے کانپور کے

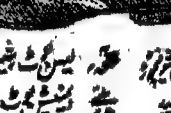

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگران پنجرہ چوک نمبر ۱۵

میرے کا سرمہ

مقصد جناب لفٹننٹ کیپٹن اگر اسر بہادر گورنمنٹ

سرمہ کے فوائد: ہمارے کالج پروفیسر نامور ڈاکٹر ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹر نے بلند تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ امراض چشم کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت و تاریکی چشم دھند جالا پڑنا والی غبار پھولا سیل سرخی ابتدائی موتیا ناخنہ پانی جانا غرض وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی بچے لیکر بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ چھ سال بچے کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ میرہ کا سفید اعلیٰ قسم فی تولہ تین روپیہ خالص میرہ فی تولہ بیس روپیہ

معمولی سرمہ فی تولہ ۴ معمول ٹاک ۱۰ تیز بیمار

الشتہر

پرمود ضلع سیاسنگھ اہلو والیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے میرے کا سرمہ جو کہ سردار سیاسنگھ صاحب نے مجھے دیا ہے آپ خود ویدیت سرمہ پر استعمال کر کے دیکھا ہے اور اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نادر میرے کا سرمہ نہایت ہی سفید اور آنکھوں کی بیماریوں کے واسطے بیحد مفید ہے میں نے اپنے تجربہ میں آنکھ کو [illegible] بغیر کسی تکلیف نہ ہوئی۔ میں ڈاکٹر جنرل انجمن [illegible] کی تعریف ہے جسے روز سے استعمال کرنے کی [illegible] ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ پانی آنے۔ دھند۔ خارش۔ سرخی چشم کے واسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ اور میں اپنے اسقدر سستے داموں میں یہ سرمہ ایجاد کر کے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہے اسکا شکریہ الفاظ میں ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک تمام لوگ آپکے سرمہ سے فیضیاب ہو کر فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔ راقم پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور نواب صاحب بہادر جاوید

رجسٹرڈ نمبر (۲۵۱)

اردوی معلی

جلد (۶) | بابت ماہ مارچ و اپریل ۱۹۰۶ء | نمبر (۳) و (۴)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی اے

(فہرست مضامین)

	صفحہ
۱۔ میں چاہتا ہوں کہ ..... از ایڈیٹر بغداد	(۱)
۲۔ تجارت ہند (سدیشی تحریک بوائکاٹ) از قاضی تلمذ حسین صاحب بی۔ اے ...	(۲)
۳۔ سلطنت عثمانیہ کی مختصر تاریخ۔ از اسلم جیراجپوری	(۱۷)
۴۔ ہاریس روزی شاعر از شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی	(۲۹)
۵۔ بنارس کانگرس اور مسلمانوں کا نفع نقصان از حاجی موسیٰ خانصاحب کیس وتادلی	(۳۴)
(بیاض)	(۴۷)
۶۔ شرر و سرشار از نواب رائے صاحب	(۴۹)
۸۔ دیوان شبلی از عبد السلام صاحب طالب علم دار العلوم ندوہ۔ لکھنؤ ..	(۶۶)
۹۔ مکتوبات امیر مینائی از احسن الزمان صاحب ثاقب مدیر فن پارسی تی گڑھ	(۷۹)
۱۰۔ سانس و کلام از مولوی سید امین احسن صاحب حسرت موہانی از حیدر آباد دکن ..	(۸۱)
۱۱۔ تنقید { ۱۔ سدیشی تحریک و بوائکاٹ ۲۔ بنارس کانگرس اور مسلمانوں کا نفع نقصان	(۸۳)
۱۲۔ حصہ نظم	(۸۷)
۱۳۔ ضمیمہ اردوی معلی دیوان شیفتہ کامل	

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علی گڑھ

احسن المطابع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول ۱ روپیہ سالانہ
دوم عہ سالانہ }

شملہ

اور اس سلسلہ کوہستان کے مفصل حالات
کتاب لطف کسار میں نہایت قابلیت سے بکمال محنت و
تحقیق لکھے گئے ہیں - انگریزی و اردو وغیرہ زبانوں میں
ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی - خط پاکیزہ - کاغذ اعلیٰ - چھپائی
مطبع رفاہ عام سٹیم پریس لاہور -
عبارت دلفریب - طرز بیان طلسم انگیز - انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے

مختصر فہرست مضامین

(۱) مصنف کی پہاڑ پر تعطیلی (۲) پہاڑی حالات اور انکے حالات کا انکشاف
(۳) اس سلسلہ کوہ کی زمانی کیفیت
(۴) کوہستان اور اسکے حقیقی لطف (۷) جنگل اور جانور
(۴) شملہ کا رکا کالٹ روڈ اور ریلوے (۸) بارش اور برف کی نظاری
(۵) پہاڑی جھیل اور سیلے (۹) پہاڑی جانوروں کے حالات
(۱۰) شملہ کی سیر
اور دیگر بیسوں مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ سینریوں کے خاکے
کھینچے گئے ہیں قیمت سہ محصول ڈاک محض ۱۴ سے

اردو بہر گوسنگتا (یعنی مراۃ الغیب) ایک ہزار جلد میں سے
محصول بچاس جلدیں باقی ہیں - قیمت سہ محصول ڈاک عہ
ملنے کا پتہ :- ڈاک خانہ اکال گڈھ ریاست پٹیالہ
منشی رائے بھگونت رائے اڈیشنل نائب ناظم -

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت فتح العالم مخدوم عبد الحق
ردولوی قدس اللہ سرہ
جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی
رحمۃ اللہ علیہ قیمت ۸ر

دیوان مجروح

میر مہدی حسین مرحوم شاگرد غالب قیمت عہ ر

اردوی معلیٰ جلد پنجم مکمل

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع رپورٹ
بمبئی کانگرس بلا قیمت
قیمت عاریہ مع محصول دفتر اردوی معلیٰ علیگڈھ

ملکہ فرخ مرزا

اس ناول کا لطف اور حسن بیان دیکھنے کے قابل ہے
واقعات کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ واقعہ
کی تصویر آنکھوں کے نیچے پھر جاتی ہے درد مذاق لطیف
حسن و عشق ہجر و وصل غرضکہ جو کچھ عدیم المثل مصنف کے
بقدر قلم سے نکلا ہے وہ لکھنؤ کی ستھری زبان کا ایک دریا ہے
کہ موجیں مار رہا ہے ساتھ اوسکی آخر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ
قلب پر ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے یہ ناول
نوجوان امر کے لئے ایک خاص دلچسپی کا باعث
ثابت ہوا ہے جسکی تصدیق اس سے زیادہ کیا ہوگی
کہ طبع ثانی کی بھی اب چند جلدیں باقی ہیں قیمت عہ
محصول ذمہ خریدار نشان ذیل سے دستیاب ہو سکتی ہیں
المشتہر

قطرت حیدرآباد دکن محلہ افضل گنج مکان مولوی
غیاث الدین صاحب وکیل

عصر جدید

یہ ایک ماہانہ رسالہ تین جزو پر سوا تین برس سے
شایع ہوتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ مسلمان
بیکار اور فضول بحثوں میں پڑنے کی
جگہ کام کی باتوں پر متوجہ ہوں - فضول خرچی
کاہلی - بیکاری کو ترک کریں - پیشہ ور گداگری
کو روکیں - محنت اور کام اور جائز ذرائع معاش
کی طرف آمادہ ہوں - تعلیم مغربی سے بجائے
فضول تقلید اہل فرنگ کے اتفاق و محنت کا
سبق لیں - مذہب کا صحیح خیال اور خوف خدا
لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو - شادی و غمی کی
فضولیات اور قرض لینے کا مرض دور ہو -
اسکے آنریری اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین بی - اے ایل ایل
بی - وکیل ہائی کورٹ سکرٹری اصلاح تمدن (سابق چیف
جج ریاست مالیر کوٹلہ) ہیں اور اس رسالے نے مسلمانوں کو ایک نئی
بیدار کیا ہے - قیمت نمونہ ۲ر جواب طلب عہ

میں چاہتا ہوں کہ

چاہتا... آہ چاہتا ہوں کہ تم اسیطرح مجھے نہ پہچانو، نہ جانو اپنا تغافل قائم رکھو اور میں تلخکام زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں۔ ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے تڑپ تڑپ کے مرجاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں۔

اور تمہیں خبر نہو کہ میں نے تمہارے لئے جان دیدی، تمہاری برق نگاہ کے خیال میں جلکر راکھ ہوگیا، خاک ہوگیا، تمہیں خبر نہو کہ ایک پژمردہ دل تمہارا خیال کرکے تمہاری یاد کرکے اپنی تمام جوانی، اپنی تمام عمر کاٹ رہا ہے اسکی تمنائیں امیدیں حسرتیں تمہارے لئے ہیں، وہ تمہاری خاطر غمزدہ زندگی بسر کرنا، اور تمہاری خاطر غمزدہ موت مرنا چاہتا ہے۔ وہ بیچارہ دل بس یہی، صرف یہی چاہتا ہے! جب پروانہ کی طرح، سایہ کی طرح رات دن میں تمہارے پاس تھا، تب تو کبھی ایک نگاہ غلط اندازِ لطف سے شاد کام نہ کیا، پس اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ کبھی شاد کام نہ ہوں۔ آہ! اسیطرح مرجاؤں، اسی طرح مہجور، مقہور اسی طرح وطن سے دور، اسی طرح مشتاق، اسی طرح حسرت کش شوق شہاے نہانی مرجاؤں...

میں چاہتا ہوں کہ جسطرح صبح سویرے نور کے تڑکے، باغ میں چھوٹی چڑیاں ایک شاخ گل سے دوسری شاخ گل تک اڑتی پھرتی ہیں، اور گلاب کی پنکھڑیوں پر سے شبنم کے قطروں کو گرادیتی ہیں، اور نہیں سمجھتیں کہ کیا ظلم کیا، اسی طرح تم بھی کبھی نہ سمجھو۔ نہ میری جینے کی، تمہارے لئے جینے کی، نہ میرے مرنے کی، تمہارے لئے مرنے کی، تمہاری چاہ میں مرنے کی تمہیں خبر ہو تم مجھے نہ دیکھو، شاید... آہ شاید میرے مرنے کے بعد قبر پر... مگر میں اسے بھی نہیں چاہتا، میں اسکا بھی قائل نہیں۔

میں چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مجھے کبھی نہ جانو نہ پہچانو، اپنا تغافل قائم

رکھو اور میں تلخ کام، زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں۔ ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے، تڑپ تڑپ کے مرجاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں۔ (یلدرم) (ترجمہ)

تجارت ہند

(میں ناظرین سے معافی چاہتا ہوں کہ فری ٹریڈ۔ پروٹکشن اور بائیکاٹ۔ یہ تین انگریزی الفاظ جابجا اس مضمون میں استعمال کئے گئے ہیں۔ کیونکہ مرادف الفاظ اردو میں مروج نہیں اور عربی کے الفاظ ان سے زیادہ غیر مانوس ہیں۔ فری ٹریڈ کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے مال درآمد برآمد پر کسی طرح کا محصول نہ لگایا جائے اور پروٹکشن یہ کہ ملک کی ترقی تجارت کے لئے محصول درآمد برآمد حسب ضرورت لگایا جائے۔)

اس وقت ملک کی ترقی تجارت کے لئے سدیشی اور بائیکاٹ وغیرہ کے ذریعے سے کوشش کی جارہی ہے مگر کبھی کبھی بعض تعلیم یافتہ اصحاب بھی مثل ناواقفوں کے کہہ اٹھتے ہیں کہ تجارت آزاد ہونی چاہئے اور اس میں کسی طرح کی عارضی روک اور عارضی ترغیب کو دخل نہ دینا چاہئے اور اپنی اس کلئے کی بنا پر جو انگریزی علم الاقتصاد کے مطالعے کے اثر سے ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا ہے، وہ محبان وطن کی کارروائیوں پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ کیوں مقابلے کی پالیسی کو چھوڑ کر یہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ان اصحاب کو جاننا چاہئے کہ

فری ٹریڈ۔ قدرت کا ناقابل ترمیم قانون نہیں ہے

علم الاقتصاد کے موضوع یعنی دولت کے دو حصے ہیں "تحصیل" اور "تقسیم"۔ تحصیل یعنی کسی چیز کا پیدا کرنا قانون قدرت کے تابع ہے۔ انسان صرف اتنا کرسکتا ہے کہ مختلف اشیا کو خاص طور پر ترکیب دے اور پھر وہ قدرتی اثر سے ایک خاص نتیجہ پیدا کریں۔ برخلاف اس کے "تقسیم" ہے کہ وہ قاعدہ انسانی اختیار میں ہے۔ جب انسان نے ایک چیز حاصل کرلی تو وہ اسے جسطرح چاہے تقسیم کرسکتا ہے۔ یہیں سے اصول تبادلہ کے اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ گورنمنٹ کو تجارت کے کاروبار میں مداخلت نکرنی چاہئے درآمد

اور برآمد پر کوئی ٹیکس قائم کرنا چاہیئے۔ تمام دنیا کو ایسا سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک "قوم" ہے اور "اقوام" کو "افراد" تصور کرنا چاہیئے۔ برخلاف اسکے دوسرا گروہ ہے جو گورنمنٹ کی مداخلت معاملات تجارت میں نہ صرف اختیاری بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔ درآمد اور برآمد کے ٹیکس کو بھی وہ اپنے اپنے موقع سے مناسب خیال کرتا ہے۔

اول الذکر فرقہ فری ٹریڈ کہلاتا ہے اور موخر الذکر پروٹکشنسٹ۔ انگلستان کے علماء اقتصاد المدن فری ٹریڈ کے معین ہیں اور وہ اسے تمدن کی ایک ناقابل ترمیم شرط خیال کرتے ہیں، اور چونکہ انگریزی خیالات کا پرتو ہندوستانی تعلیم یافتہ گروہ پر پڑتا ہے اسلئے انہیں بھی اکثر اس خیال کے حامی ہیں اور ہندوستان کے لئے فری ٹریڈ کو مفید سمجھتے ہیں۔ مگر دیکھنا چاہیئے کہ انگلستان نے کس وقت دنیا کو فری ٹریڈ کا سبق پڑھایا۔ آخر اٹھارہویں صدی تک انگلستان میں قیود تجارت تمام ملکوں سے زیادہ سخت تھی۔ اور اسی زمانے میں اسنے اپنی تجارت کی بنیاد مستحکم کی۔ انگلستان کی اس پالیسی کی نسبت جو الفاظ پرنس بسمارک نے استعمال کئے ہیں ان سے بہتر الفاظ نہیں ملسکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"شہزور اور توانا انگلستان نے جب اپنے بازو مضبوط کر لئے تو میدان میں آیا اور للکارا کہ کون میرے سامنے آویگا میں ہر ایک کے مقابلے کے لئے تیار ہوں"۔

پرنس بسمارک کے اس خیال کی تائید خود انگلستان کے سب سے بڑے حامی فری ٹریڈ یعنی مسٹر کابدن کے قول سے ہوتی ہے۔ فری ٹریڈ کی حمایت کرتے ہوئے وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ "انگلستان ہمیشہ دنیا کے لئے بمنزلہ کارخانہ کے رہا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہیگا"۔

نپولین کی تہ و بالا کرنے والی یورشوں نے تمام یورپ کی تجارت کو درہم و برہم کر دیا تھا، ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو کر اسکی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں انگلستان کے لئے اس سے بہتر کوئی پالیسی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ تمام دنیا کو اپنے اپنے بندرگاہ کھولدینے کی صلاح دے اور خود اسپر عمل کرے۔ مگر اسبارے میں مسٹر جیرنگ کا

مقولہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جو فرماتے ہیں کہ۔

"طبعی امر ہے کہ بھیڑیے اپنے لئے آزادی کی خواہش کرینگے لیکن اگر بھیڑیں بھی یہی خواہش ظاہر کریں تو اسکے سوا کیا ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھیڑیں ہیں۔ یعنی جسطرف کسیکو چلتے دیکھا اسیطرف چلنے لگیں۔ بلا خیال اسکے کہ آگے کنواں ہے یا کھائی۔

اکثر ممالک پر انگلستان کی تحریص اور مغالطہ دہی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور جو اس طلسم میں پھنس گئے تھے انہوں نے بھی بہت جلد نجات حاصل کرلی۔ چنانچہ اڈورڈ ڈالیس کہتا ہے کہ "انگلستان کے ہمسایوں نے اسکی مثال کو بجائے ستارہ رہنمائی سمجھنے کے اپنے حق میں مضر سمجھا" اور اسپر عمل پیرا ہوئے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ فری ٹریڈ قدرت کا ایسا قانون نہیں ہے جو ہر جگہہ اور ہر وقت یکساں مفید ثابت ہو۔ اور اسکے اثرات تغیر حالات سے متغیر نہوں۔ انگلستان میں تو ایک زمانہ تک اصول فری ٹریڈ نیچرل لا کے برابر سمجھا جاتا تھا مگر انیسویں صدی کے اوائل میں جرمنی میں اسکی مخالفت شروع ہوئی۔ اور لسٹ نے فری ٹریڈ کے خلاف کہنا اور لکھنا اختیار کیا انگلستان کی پالیسی کی نسبت لسٹ نے بھی قریب قریب وہی خیال ظاہر کیا ہے جو نصف صدی بعد بسمارک کے زبان اور قلم سے ادا ہوا۔ لسٹ کہتا ہے کہ "انگلستان بجائے خود ایک دنیا ہے اور ایسی دنیا جو باقی تمام دنیا سے دولت اور قوت میں برتر ہے"

اب چند اقوال مسلم الثبوت علما کے اسکی تائید میں نقل کئے جاتے ہیں کہ فری ٹریڈ کو اصول موضوعہ نہ سمجھنا چاہیے۔

(الف) پروفیسر شمولر:۔ "پروٹکشن اور فری ٹریڈ اصول نہیں ہیں بلکہ تمدنی اور سیاسی بیماریوں کے علاج ہیں جو قوم کی حالت کے مطابق تجویز کئے جاتے ہیں"

(ب) پروفیسر بائرنیز "پروٹکشن اور فری ٹریڈ اگر صحیح طور پر سوچا جائے تو اصول سے تعلق نہیں رکھتے"

(ج) اڈورڈ ڈائسی :- "دو اور دو چار ہوتے ہیں" یہ خاتمہ عالم تک صحیح رہیگا مگر فری ٹریڈ ملک کی ایک حالت میں مفید اور دوسری حالت میں مضر ہے ۔۱۲

(د) "فری ٹریڈ خاص زمانے اور خاص حالت میں ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے مگر دوسری زمانے اور دوسری حالت میں وہی فری ٹریڈ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے قطعی مہلک ثابت ہوگی، فری ٹریڈ میں سب سے اول یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ تمام دنیا مثل ایک قوم کے ہے اور مختلف قومیں اسمیں مثل افراد کے ہیں۔ سب ایک ہی غرض اور ایک ہی مقصد کے واسطے کام کرتے ہیں۔ اور جو شخص جس کام کو بہتر کر سکتا ہے وہ اس کام کو انجام دیتا ہے مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔

"جب تک انسان مختلف سلطنتوں میں منقسم ہے اور ہر ایک کے جداگانہ اغراض ہیں کوئی سلطنت خود کو اس میں نہیں ڈالیگی کہ ملکی پیداوار کو غیر ملکی زبردست مقابلے سے تباہ کر دے۔ یہ بلاد صرف تجارتی بلا نہیں ہے بلکہ اسمیں پولیٹیکل اور سوشل خطرات بھی ہیں"۔

فری ٹریڈ کا یہ اصول اسوقت عملاً اختیار کیا جا سکتا ہے کہ تمام پولیٹیکل اختلاف دنیا کے دور ہو جائیں مگر ایسا نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ ان خیالات کو صرف ان فلسفیوں کے دماغی تفریح کے لئے نہ چھوڑ دینا چاہیے جو تمام دنیا کو ایک کرنا چاہتے ہیں۔ ایک عملی منتظم اور قومی عالم اقتصاد ان کو قبول نہیں کر سکتا۔ خود انگلستان میں مختلف اغراض کے لوگ مختلف پالیسی کے حامی ہیں منچسٹر میں زیادہ لوگ فری ٹریڈ کے طرفدار ہیں مگر پرنس بسمارک ان کے نسبت کہتا ہے کہ "منچسٹر کا ایجیٹیشن (فری ٹریڈ کے بارے میں) ایسی بڑی اور دلیرانہ سیاسی اور تمدنی دغابازی ہے کہ ابتک کبھی دنیا میں ایسی دغابازی نہیں دیکھی گئی"۔

انگلستان کے زمیندار اور کوئلے کی کانوں کے مالک ہمیشہ فری ٹریڈ کے خلاف رہے ہیں اور اسوقت بھی مسٹر چیمبرلین کے طرفدار وہیں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن علماء نے

اس پالیسی کو ملک میں رائج کیا تھا اسمیں یا تو ایسے لوگ تھے جنہیں عملی انتظامات ملکی سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا یا ان کے تعلقات ایسے تھے کہ وہ فری ٹریڈ میں اپنا فائدہ دیکھتے تھے۔ چنانچہ آدم سمتھ۔ مالتھس اور مل پادری تھے رکارڈو دلال تھا کابڈن دیوالیہ تھا۔ برائٹ کپڑے کا کارخانہ کرتا تھا اور ولیر قانون پیشہ تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے تھا لرڈ راجرس کے قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ

"بہترین اقتصادی حالت وہ نہیں ہے جسمیں زیادہ سے زیادہ مقدار کم سے کم صرف میں پیدا کیجا سکے اور روپیہ والے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرسکیں بلکہ بہترین حالت وہ ہے جسمیں زیادہ سے زیادہ کام کرنیوالے زیادہ سے زیادہ ممکن آرام اور اطمینان سے رہسکیں"

یہ ہے اصل غایت کسی ملک کی تجارتی پالیسی کی خواہ وہ فری ٹریڈ سے حاصل ہو یا پروٹکشن سے۔ جرمن نے اس امر کو سمجھا اور باوجود انگلستان کی ترغیب اور تحریص کے بسمارک کی کوششوں سے چند برسوں میں اس نے یہ ثابت کردیا کہ کیونکر ایک

زراعتی ملک تجارتی ملک ہوجاتا ہے

نائنٹینتھ سنچری کے پرچہ اگست ۱۹۰۳ء میں مسٹر آٹو از بیکر کا ایک مضمون جرمنی کی تجارتی پالیسی پر شائع ہوا ہے اسکی تفصیلات اور جزوی بحثوں کو چھوڑ کر چند اہم امور کا بیان اقتباس کیا جاتا ہے جو حالت اس وقت ہندوستان کی ہے وہی حالت ساٹھ برس پیشتر جرمن کی تھی۔

لسٹ سب سے پہلا شخص ہے جسنے ۱۸۴۰ء میں جرمن کا خیال اپنی تجارت کو پروٹکشن کے ذریعے سے ترقی دینے کی طرف رجوع کیا۔ چھ برس تک اس نے لگاتار کوششیں کیں مگر اسکی آواز کا کچھ اثر نہوا۔ رعایا میں بیشک اس کی مسائل کا بڑا چرچا ہوا مگر گورنمنٹ نے اسکی صلاح کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ بالآخر ناامید ہوکر اس نے ۱۸۴۶ء میں خودکشی کرلی۔ اس شخص نے دنیا کے اکثر ممالک کا سفر کیا تھا اور وسیع معلومات رکھتا تھا اس کی رائیں عملی بنیاد پر قائم تھیں

نہ کہ محض کتابی بنا پر۔ جسوقت لسٹ نے اپنی کتاب شایع کی تھی انگلستان بہت دولتمند ملک تھا۔ برخلاف اسکے جرمن کی تجارت ابتر حالت میں تھی اسکا انحصار زیادہ تر زراعت پر تھا انگریز جرمن کی پیداوار اپنے ملک کو لیجاتے اور اسکے عوض میں انہیں تیار شدہ مال دیتے تھے (جیسا کہ اسوقت ہندوستان کا معاملہ ہے) خدائی لسٹ کی کوششوں کو ضایع نہیں کیا اور ۱۸۷۰ء کے بعد جرمن میں کسیقدر پروٹکشن قایم ہوگیا۔ اور جنگ فرانس کے بعد بسمارک نے ہمہ تن کوشش کرکے پروٹکشن کو مستحکم کردیا بسمارک کی تحریریں پروٹکشن کی نسبت دلچسپی سے خالی نہیں مگر بخوف طوالت قلم انداز کیجاتی ہیں۔ ازبکر جرمن اور انگلستان کا مقابلہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"نصف صدی کے قریب انگلستان میں مسلسل فری ٹریڈ قایم رہی اور جرمن میں پروٹکشن رہا۔ جرمن اُسوقت ایسا ملک تھا جسے تجارتی۔ مالی اور جہازرانی کے معاملات میں کچھ تجربہ نہ تھا۔ جسکے پاس نہ تو سرمایہ تھا نہ نوآبادیاں تھیں اور نہ عمدہ کوئلے کی کانیں ہی تھیں صرف ایک عمدہ بندرگاہ اسکے پاس تھا۔ وہ جنگی خدمات سے دبا ہوا تھا۔ تین جنگوں اور ایک انقلاب نے اسکا شیرازہ ابتر کردیا تھا۔ باوجود ان تمام دشواریوں کے جرمن اسوقت بہت ہی دولت مند ملک ہوگیا ہے۔ ہر جگہ انگریزوں سے اسکا تجارتی مقابلہ جاری ہے۔ یہانتک کہ انگریزی بازاروں میں بھی جرمنی نے اسے دبا رکھا ہے۔" جرمن کی ترقیوں کو دیکھکر انگریز انگشت بدندان ہیں" حقیقت یہ ہے کہ جرمن نے اس نسبت کو جو پچاس برس پہلے انگلستان اور جرمن میں تھی اُلٹ دیا ہے۔"

پس جو لوگ انگلستان کی ترقی کو فری ٹریڈ سے متعلق کرتے ہیں وہ جرمن کی ترقی پر کیا رائے دینگے اگر انگلستان نے فری ٹریڈ کے زیر سایہ گزشتہ نصف صدی میں ترقی کی ہے تو جرمن نے پروٹکشن کی حمایت میں اس سے بدرجہا زیادہ ترقی کی ہے اسلئے دونوں ملکوں کی نظیر سامنے رکھکر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ۔

ہندوستان کی کیا حالت ہے اور کون سی پالیسی اسکے لئے مفید ہے

ہندوستان کی قریب قریب وہی حالت ہے جو نصف صدی پیشتر جرمن کی تھی۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہوگیا ہے اور ۸۵ فیصدی آبادی کا گزران زراعت پر ہے۔ اس بیسویں صدی میں کوئی ملک جو خالصتاً زراعتی ہو ہرگز آسودہ حال نہیں ہوسکتا۔ وائے برحال ہندوستان کہ اس ایک ذریعہ زندگی میں بھی گورنمنٹ کی پالیسی مالیہ اراضی زمینداران اور کاشتکاروں کو شکم سیر نہیں ہونے دیتی۔ اگر اسمیں انصاف برتا جائے تو بھی یہ ممکن ہے کہ ہم مثل بہائم کے زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوجائیں مگر ہم اس ترحم کے قابل بھی نہیں!! پھر بھی ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں بہت سے ملکوں نے اس سے زیادہ ابتر حالت سے ترقی کی ہے اور بہت سی خودسر گورنمنٹوں نے بالاخر رعایا کے واجبی مطالبات تسلیم کئے ہیں۔

میں یہاں بہ تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ انگریزی گورنمنٹ نے کیونکر ہندوستان کی تجارت کو تباہ کیا۔ اردوی معلے کے پرچہ ماہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں مسٹر کشن پرشاد کول نے اپنے مضمون میں اسپر کافی بحث کی ہے اور ہر شخص جسنے واقعات پر غور کیا ہے یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت کو تباہ کرکے انگریزی تجارت نے ترقی حاصل کی ہے "اگر یہ ترقی شریفانہ اور تاجرانہ طریق پر ہوتی تو بڑے اطمینان کا باعث تھا" (ولیم ڈگبی) مگر افسوس کہ بنگال اور کارناٹک کی لوٹ سے یہ غرض حاصل کی گئی ہے۔

مسٹر برڈک آدم اپنی کتاب "قانون ترقی و تنزل" میں لکھتے ہیں کہ

"جنگ پلاسی کے بعد ہی بنگال کی لوٹ لندن میں آنے لگی اور اسکا اثر فوراً ظاہر ہوا" تمام محققین اس امر پر متفق ہیں کہ انگلستان کا تجارتی انقلاب (جسنے انیسویں صدی کو گزشتہ زمانے سے ممیز کردیا) ۱۷۶۰ء سے شروع ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی ہوئی اور جیسا تیز تغیر اسکے بعد واقع ہوا شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا" یعنی ہندوستان کی دولت انگلستان میں جانے لگی۔

ایک دوسرے اہل الرای کا قول ہے کہ:—

"بہت سے واقعات ہندوستان کی تجارت کے خلاف جمع ہوگئے ہیں اٹھارہویں صدی میں انگلستان نے محصول درآمد کے ذریعے سے نہیں بلکہ قطعی ممانعت کے ذریعے سے کپڑے کی تجارت کو تباہ کیا۔" تمام اٹھارہویں صدی انگلستان نے ہندوستان کو اپنے مثلوں یا بلکس کا آماجگاہ بنالیا تھا۔ اور مسٹر لزل فری ٹریڈ پالیسی کے مہمل اور لایعنی تجربے اسپر کئے جاتے تھے (اڈورڈ ساسون) یہ شہادتیں یہ ظاہر کرنیکو کافی ہیں کہ ہندوستان کی تجارت کو انگریزی مقابلے سے برباد نہیں کیا بلکہ بزور تباہ کیا ہے۔ اب اسوقت ہندوستان کی تجارت کی یہ کیفیت ہے کہ:۔

ہندوستان سے ایک ارب ۴۶ کروڑ کا مال سالانہ باہر جاتا ہے اور ایک ارب ۲ کروڑ کا ملک میں آتا ہے۔ یعنی درآمد سے برآمد بقدر ۴۰ کروڑ زیادہ ہے[1] واضح ہے کہ یہ زیادتی بصورت سرمایہ ہندوستان کے ممالک میں کام نہیں آرہی ہے بلکہ انگلستان کو جو خراج ہوم چارجز کے نام سے جاتا ہے اسمیں یہ رقم دینی پڑتی ہے۔

اس تجارت میں غور طلب امر یہ ہے کہ ہندوستان سے کیا مال جاتا ہے اور دوسرے ممالک سے کیا آتا ہے۔ ہندوستان سے جو کچھ مال جاتا ہے قریب قریب سب خام پیداوار ہوتی ہے اور باہر سے جو کچھ مال آتا ہے وہ اسی نسبت سے تیار شدہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ صورت تجارت کی ایسی ہے کہ کوئی ملک اسحالت میں رہکر خوشحال نہیں ہوسکتا۔ اسکی وجہ سے ملک کا سرمایہ اور محنت بیکار پڑے ہیں، اور جس چیز کو ہم ادنیٰ قیمت پر بیچتے ہیں اُسیکو پھر اعلیٰ قیمت پر خریدتے ہیں۔ اسی خام پیداوار سے ہم خود ضروری چیزیں تیار کریں تو ہمکو دوہرا فائدہ ہو۔ اگر ملک کی ضرورت کی چیزیں خود ملک میں تیار کی جائیں تو اس سے دوہرا فائدہ کیونکر ہوگا اسکو میں ایک مثال سے صاف کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کرو کہ تین جزیرے ہیں (الف) اور (ب) قریب قریب واقع ہیں اور ایک (ج) دور واقع ہے جزیرہ الف میں لوہے کی کان ہے اور ب میں کوئلا بہت عمدہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر جزیرہ الف کو کوئلہ کافی ملجائے تو وہ ایک

[1] چیمبر آف کامرس کی سالانہ رپورٹ شائع ہوئی اس سے واضح ہوتا ہے کہ یکم اپریل ۱۹۲۱ء سے ۳۱ ستمبر ۱۹۲۱ء تک ہندوستان کی تجارت میں

لاکھ من لوہا سالانہ گلا کر کام میں لا سکتا ہے۔ جزیرہ ب سے وہ کوئلہ بقدر ضرورت کے حاصل کرتا ہے اور تیس ہزار من لوہا اسکے عوض میں دیتا ہے۔ اور ستر ہزار من لوہا خود بچاتا ہے مگر جزیرہ ج میں بھی کوئلے کی کانیں ہیں اور وہ بیکار پڑی ہیں اسوجہ سے کہ جزیرہ الف خرچ باربرداری کی زیادتی کے سبب سے اس سے کوئلہ نہیں لیتا۔ اب خیال کیجئے کہ جزیرہ الف اور ج ایک گورنمنٹ کی تحت میں آجائے اور جزیرہ ب دوسری قوم اور گورنمنٹ کا مقبوضہ ہوجائے اور اولی الذکر گورنمنٹ جزیرہ الف کے کارخانہ داروں سے کہے کہ آئندہ تم کوئلا جزیرہ ب سے مت لو بلکہ جزیرہ ج سے لو وہ عذر کریں کہ اس حالت میں ہمیں پچاس ہزار من لوہا سالانہ دینا پڑیگا۔ گورنمنٹ اسکی پروا نہ کرے اور انہیں مجبور کرے۔ اسکا نتیجہ کیا ہوگا؟ لوہے کی کان والوں کو بیس ہزار سالانہ کا نقصان ہوگا مگر انہیں کے دوسرے ہم قوموں کو پچاس ہزار سالانہ ملیگا۔ یعنی مجموعی طور پر اس سلطنت میں تیس ہزار من لوہے سالانہ کی مالیت بڑھ جائیگی۔

اب اس مثال کی ہندوستان سے تطبیق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ ایک کپڑے کا کارخانہ ہے اور وہ ایک لاکھ سالانہ کا سوت دوسرے ممالک سے خریدتا ہے۔ اگر وہ مجبور کیا جائے کہ سوت ہندوستان سے خریدے تو اسے دس ہزار سالانہ کا نقصان ہوتا ہے مگر ملک کو مجموعتاً نوے ہزار کا فائدہ ہوتا ہے۔ اور اسیطرح ہر ایک شئے تجارت کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستانی اپنی ملک کی خوشحالی کے لئے آمادہ ہوجائیں اور ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنیکے لئے تیار ہوجائیں تو انہیں اپنے اس ارادے کے حاصل کرنیمیں

کیا کیا دقتیں پیش آوینگی

سب سے اول دقت کا سامنا انگلستان سے ہوگا مگر میں دوسرے ممالک کے حالات بیان کرنے کے بعد اسی بیان کرونگا ہندوستان کے مال درآمد میں ۸۵ فیصدی انگلستان سے آتا ہے اور باقی دوسرے ممالک سے یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم کل تجارت کو ایک دم سے روک دیں البتہ بتدریج ایسا کرسکتے ہیں مگر جب اسکی کوشش کرینگے تو دوسرے ملک بھی خاموش نہیں رہینگے۔ لیکن اس

معاملے میں پالیسی ہندوستان کے ہاتھ ہے۔ چونکہ اکثر ممالک ہندوستان کی تمام پیداوار اس غرض سے لیتے ہیں کہ اپنے ملک میں ان سے مال تیار کریں، وہ ہر حال میں اسکے لینے پر مجبور ہیں دوسرے خاص شے ہندوستان کی برآمد کی غلہ ہے۔ جو ملک اسوقت ہندوستان سے غلہ خریدتے ہیں وہ ہر حال میں اسکی خریداری پر مجبور ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی ملک اسوقت ہندوستان کے ساتھ کسیطرح کی رعایت نہیں کرتا ان کے مقاصد جہانتک اجازت دیتے ہیں وہ ہندوستان کے مال پر محصول درآمد لگاتے ہیں اور وہ اس سے زیادہ نہیں لگا سکتے۔ فرض کرو کہ تمام دوسرے ممالک ہندوستان کے مال پر محصول بڑھا دیں تو وہ محصول کسکو ادا کرنا پڑے گا؟ کیا ہندوستان پر اسکا کچھ اثر پڑیگا۔ بالکل نہیں۔ خود انہیں ممالک کے کارخانہ داروں کو وہ ٹیکس ادا کرنا پڑیگا۔ بلکہ اسوقت حالت ایسی ہے کہ اگر خود ہندوستان کے بندرگاہوں میں ہندوستان کے مال پر محصول برآمد لگایا جائے تو اسکا کوئی جزو بھی ہندوستان کو نہ دینا ہوگا اور وہ بالکل ممالک غیر پر پڑیگا۔

جنوری ۱۹۰۴ء کے پرچہ اشیاتک کے آرٹرلی ریویو میں ہندوستان کی تجارت کے متعلق ایک مضمون سر راپرلتھ برج کے۔ سی۔ آئی۔ ای کا شائع ہوا تھا۔ اسمیں انہوں نے مدراس میل کے پرچہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے ایک اقتباس درج کیا ہے وہ اقتباس ایسا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ میں اسیکا خلاصہ لکھتا ہوں۔

روس کے اعتبار سے ہندوستان کا پلہ غالب ہے کیونکہ اس ملک میں سالانہ تین کروڑ سے زاید کا تیل روس سے آتا ہے۔ اگر ضرورت ہو تو یہ تیل برما اور امریکہ سے لیا جاسکتا ہے۔ برخلاف اسکے گزشتہ سال یہاں سے صرف ۲۱ لاکھ کا مال روس کو گیا۔ اور اسپر بھی سخت محصول درآمد لگایا گیا۔

ممالک متحدہ امریکہ کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہاں سے صرف ایک کروڑ سالانہ کا مال آتا ہے اور یہاں سے آٹھ کروڑ کا مال وہاں جاتا ہے مگر وہ سب خام پیداوار ہے اور امریکہ کے کارخانہ داروں کو ان کی ضرورت ہے اسلئے انپر کسیطرح کا محصول درآمد بھی نہیں لگایا جاتا۔ اگر امریکہ

ان پر محصول لگاویگا تو آخر میں اسکو نقصان اٹھانا پڑیگا۔

جرمن تین کروڑ سالانہ کا مال ہندوستان میں بیچتا ہے اور دس کروڑ کا یہاں سے مزید تا ہے مگر تفصیل کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرمن تمام تیار شدہ چیزیں ہندوستان میں بیچتا ہے اور ہندوستان سے وہ صرف خام مال لیتا ہے اسلیے وہ اپنی مصلحت کے مطابق مختلف شرح سے محصول درآمد بھی لگاتا ہے۔

فرانس بلجیم آسٹریا۔ اور اٹلی کی کیفیت بھی قریب قریب وہی ہو جو جرمن کی ہے وہ تیار شدہ مال ہندوستان میں بیچتے ہیں اور یہاں سے خام مال لیتے ہیں۔ اور یہاں کے مال پر ٹیکس بھی لگاتے ہیں چنانچہ فرانس میں کافی پر للعشہ فی ہندریڈ ویٹ (یعنی ایک من ۱۵ سیر) ٹیکس لگایا جاتا ہے کیونکہ وہ تیار شدہ بھیجی جاتی ہے اور چرخ پر جو صرف سالی کے کام آتی ہے ۲۲ فی ہندریڈ ویٹ ٹیکس لگایا جاتا ہے۔

ان بیانات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یورپ کے مقابلے میں ہندوستان کا پلا غالب ہے یورپ سے ۱۴ کروڑ سالانہ کا تیار شدہ مال آتا ہے اور اسکے عوض ہندوستان سے صرف خام مال جاتا ہے یہ بھی جہاں تک ممکن ہوتا ہے ٹیکس لگایا جاتا۔ ہندوستان ممالک غیر کے اسباب پر صرف ۵ فیصدی ٹیکس لگاتا ہے۔ اسلئے ہندوستان کو اپنے ٹیکس کے بڑھانے کا بہت موقع ہے اور یورپ والے ہندوستان کے مال پر بہت کم ٹیکس بڑھا سکتے ہیں۔

یورپ کے سوا دوسرے ممالک سے ۵ کروڑ سے کچھ زاید کا مال ہندوستان میں آتا ہے۔ ان ممالک میں جاپان کا معاملہ آجکل خاص توجہ کے قابل ہے کیونکہ ہندوستانی جاپان کو اپنا معلم بنانا چاہتے ہیں۔ اسلئے ابھی تک جاپان کے خلاف بائیکاٹ ہی نہیں کیا گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا روش اختیار کیجائیگی۔

سب سے زیادہ وقت طلب جو مسئلہ ہے وہ انگلستان کا ہے۔ جب تک انگلستان کا مال نہ روکا جائیگا ہندوستان کی صنعت و حرفت ترقی نہیں کر سکتی۔ مگر سوچنا یہ ہے کہ کیا قانوناً

انگلستان کے مال پر اسقدر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی تجارت اسکا مقابلہ کر سکے۔ میں اس قضیہ نامرضیہ کو مسٹر تھارہرن سابق فنانشل کمشنر پنجاب کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

"تیس برس پیشتر ہندوستان کے باشندوں میں اپنی پستی کا کچھ احساس پیدا ہوا اور انہوں نے تجارتی کارخانے اور خاص کر کپڑے کی کلیں قائم کرنی شروع کیں۔ لنکاشایر کو خوف ہوا کہ اسکی تجارت کو نقصان پہونچیگا۔ چونکہ لنکاشایر کے ممبر پارلیمنٹ میں بہت با اثر تھے انہوں نے مسلسل ایسے قانون پاس کرائے جس سے ہندوستان کی ترقی رک جائے۔ اور آخر کار ۱۸۷۹ء میں محصول درآمد یک قلم موقوف کیا گیا۔ حالانکہ اسوقت جنگ، قحط اور روپئے کی قیمت گھٹ جانیکے سبب ہندوستان دیوالیہ ہو رہا تھا۔ چند دنوں بعد ہندوستان کا خزانہ خالی ہو جانیکے سبب سے ایک خفیف محصول درآمد لگانے کی اجازت دیگئی۔ مگر لنکاشایر کو تاب نہ آئی اور ہندوستان کے کارخانوں میں بھی ایک ٹیکس لگایا گیا۔ حالانکہ تمام ہندوستان میں اسکے خلاف سخت جوش پھیلا ہوا تھا کیا سرکاری اور کیا غیر سرکاری اہل الرای کیا ہندوستان اور کیا انگریز سب اسکے مخالف تھے"

اسکی نسبت سر رابرٹ لیتھبرج کہتے ہیں کہ وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل میں بھی کوئی ممبر سوای فنانس ممبر کے محصول درآمد کے موقوف کرنے پر رضامند نہ تھا۔ وائسرائے نے پارلیمنٹ کے دباؤ سے صرف اپنی ذاتی ذمہ داری اور اختیار سے ایسا کیا۔

پس غور کرنا چاہیئے کہ اگر ہندوستان کی گورنمنٹ خود یہ کوشش کرے کہ انگریزی مال پر زیادہ محصول لگائے تو گزشتہ تجربہ یہ بتایا ہے کہ اسے کامیابی نہیں ہوگی۔ لیکن اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ ۱۸۷۹ء میں جو جد و جہد گورنمنٹ نے کی اسکا مقصد ہندوستان کی تجارت کو فروغ دینا نہیں تھا بلکہ خزانے کی ضرورت کا پورا کرنا اصل مقصد تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ہمکو زیادہ امید نہ رکھنی چاہیئے۔ قانونی اختیار سے گورنمنٹ کی مدد سے علیحدہ ہو کر جو کچھ ہم کر سکتے ہیں اسپر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اور وہ کیا ہے یہ کہ خود ہم اپنے پیر پر کھڑے ہوں اور اس امر کا عہد کریں کہ صرف اپنے ملک کی چیز استعمال کرینگے۔ لیکن جب تک

دوسرے ممالک آزادانہ طور پر ہندوستانی مال کا مقابلہ کرتے رہینگے یہ غرض نہیں حاصل ہو گی پس سوا اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ

بوائیکاٹ کیا جائے

سب سے بڑا اعتراض بعض زائد از ضرورت دور اندیش اصحاب کی طرف سے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ناراض ہو گی لیکن ہماری غرض ایسی ہے کہ بغیر گورنمنٹ کو ناراض کئے ہوئے وہ حاصل نہیں ہو سکتی ہے، ہندوستانی صنعت و حرفت کی ترقی انگریزی تجارت کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوستان کی سب سے زیادہ تجارت انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس تجارت کا سب سے بڑا حصہ کپڑا ہے اور یہی ایسی چیز ہے جسکو ہندوستانی بہت جلد اپنے ملک میں مہیا کر سکتے ہیں۔ پس ہندوستانی ترقی کے معنی یہی ہیں کہ انگریزی تجارت کو خسارہ ہو اور انگریزی تجارت کے خسارے کے معنی یہ ہیں کہ انگلستان کے لوگ ہندوستان کو ناراض ہوں اور اہل انگلستان کی ناراضی کا برداشت کرنا بالفاظ دیگر گورنمنٹ کی ناراضی کا برداشت کرنا ہے۔ پس اب ہمیں دو امور کے درمیان فیصلہ کرنا چاہئے کہ

آیا ہم ملک کی ترقی کا خیال چھوڑ دیں یا گورنمنٹ کو خوش رکھیں

ہر شخص کو اسکا فیصلہ خود اپنے دل میں کرنا چاہئے کہ اسکا فرض عین کیا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ کہا جاتا ہے صرف زاید از ضرورت دور اندیش لوگوں کے خیال سے کہا جاتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی گورنمنٹ کو خود یہاں کی تجارتی ترقی کا خیال ہے اور تمام جلیل القدر عہدہ دار بارہا اسکے متعلق اپنی زبان سے کہہ چکے ہیں۔ اسلئے ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال کرنا حماقت ہے کہ گورنمنٹ ہماری کوشش سے ناراض ہو گی۔ چنانچہ ۵ اکتوبر ۱۹۰۵ء کا بنگالی لکھتا ہے کہ

"بوائیکاٹ شدیسی تحریک نہیں ہے بلکہ وہ صرف ہندوستان کی ترقی حاصل کرنیکا ذریعہ ہے اور اگر ہمارے وائسرائے اور گورنروں نے بالقصد ہمکو دھوکا نہیں دینا چاہا ہے تو انہیں اس تحریک کا خیر مقدم اور اسکی تائید کرنی چاہئے۔"

دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ اکثر سہل انکار لوگوں کے طرف سے ہوتا ہے کہ جب ایک عمدہ اور سستی چیز ہمیں ملتی ہے تو بدی اور مہنگی چیز کیوں خریدیں؟ مسٹر چیمبرلین سے مسٹر بھاؤنگری نے دریافت کیا تھا کہ آپ اپنی اسکیم میں ہندوستان کو کیا حصہ دینا چاہتے ہیں اسکے جواب میں جو خط مسٹر چیمبرلین نے لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی خواہش معلوم کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کیجا سکتی ہے" اور ہندوستان کی خواہش جیسا کہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ثابت ہو چکا ہے پروٹکشن ہے۔ پس فرض کیجئے کہ ہندوستان انگلستان کی مرضی کے تابع نہوتا تو ضرور تھا کہ یہاں پروٹکشن کی پالیسی اختیار کی جاتی۔ اسوقت غیر ممالک کے مال پر اسقدر محصول درآمد لگایا جاتا کہ ہندوستانی مال انکا مقابلہ کر سکتا۔ اس محصول کے سبب سے چیزوں کی قیمت جو گراں ہوتی وہ کسے دینی پڑتی؟ ہندوستانیوں کو پس اس قانونی اختیار کی کمی کو حب الوطنی سے پورا کرنا چاہیے اور یہی مقصد ہے بائکاٹ کا اس سے زیادہ کچھ نہیں جب تک لوگ کسیقدر تکلیف برداشت نکرینگے اور ملکی فوائد کو ذاتی فوائد پر مقدم نکرینگے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک اور امر خیال رکھنے کے قابل ہے کہ بائکاٹ اگرچہ بظاہر پروٹکشن معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً وہ فری ٹریڈ کا پیش خیمہ ہے کیونکہ جو ملک جس چیز کو بہتر پیدا کر سکتا ہے وہ اسے پیدا کرے۔ پس فطرتاً ہندوستان اپنے قدرتی فوائد اور سستی محنت کے سبب جن چیزوں کے پیدا کرنیکا مستحق ہے اگر وہ بزور اس سے چھین لی گئی ہیں تو فری ٹریڈ کا اصول یہ چاہتا ہے کہ اسے چند روز بیرونی مقابلے سے پناہ دیجائے تاکہ جس غرض کے لئے اسے قدرت نے بنایا ہے وہ اسے باحسن وجوہ انجام دیسکے اور فری ٹریڈ کے اصول پر دنیا میں پورا پورا عمل ہو۔ اگر اہل انگلستان واقعی فری ٹریڈ کے حامی ہیں جیسا کہ گزشتہ الکشن سے ثابت ہو چکا ہے تو انہیں ہندوستان کے بائکاٹ کو بطیب خاطر منظور کرنا چاہئے کیونکہ وہ دراصل ان کے اصول فری ٹریڈ کا

معاون اور مددگار ہے۔

پس جبکہ ہر طرح پر اہل ملک حق پر ہیں تو ان کو کسیکی عارضی خوشی اور ناخوشی کی پروا نکرکے اپنے کام میں مشغول رہنا چاہئے۔ خدا ان کی مدد کریگا۔

تلمذ حسین مدرس العلوم علی گڈھ۔

بندے ماترم

(بنگال کا قومی گیت مصنفہ بنکم چندر چٹرجی مرحوم شہور ناول)

آہ مایہ جان بخش پانی یہ ہوائے خوشگوار
یہ ترو شاداب شیریں میوہ ہائے خوشگوار

ٹھنڈی ٹھنڈی عطر میں مہکی ہوئی بادِ جنوب
سبز کھیتوں کی فضائیں اور یہ میدانوں کی ڈھب

ظلِ شفقت ہو ترا اے مادرِ شفق دراز
خاک پر کیا کیا تری تیری مکینوں کو ہے ناز

اُف! یہ تیری چاندنی راتوں کا منظر خوش نما
آہ! یہ اشجار یہ پھولوں کا زیور خوش نما

تو تبسم تیرے اندازِ تکلم پر نثار
دل کو کرتی ہیں تری شیریں صدائیں بیقرار

سرزمین عیش ہے اے مادرِ دلسوز تو
آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز تو

لاکھوں آوازیں ہیں تیری گھر میں سرگرم خروش
جان نثاروں میں ہیں لاکھوں تیری دست سرفروش

تو جوانوں کی ہے ہمت تو دلیروں کی سپر
کانپتے ہیں دشمنوں کے تیری ہیبت سے جگر

نورِ دانش تو فروغِ جلوۂ ایماں ہے تو
دل ہے تو۔ سرمایۂ صبر و شکیب جاں ہے تو

قوت بازو ہے میری مادرِ غمخوار تو
سینۂ پرغم میں ہے میرے نفس کلتار تو

تیرا دیوا استھان دیوی! دل کے کاشانے میں ہے
تیری تصویر مقدس ہر صنم خانے میں ہے

لکھمی تو ہے زمانے میں اُجالا ہے ترا
ہر کنول کا پھول پانی میں شگوفا ہے ترا

سرستی کا روپ ہے۔ درگا کا ہے اوتار تو
نطق و دانش کی ہے دیوی مادرِ غمخوار تو

اُف! یہ سندر چھب تری یہ سانولی صورت تری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تری

ادرمان بابادی

دولت عثمانیہ کی مختصر تاریخ

دولت عثمانیہ کی مختصر تاریخ بیان کرنیکے لئے ہم اسکو تین مختلف دوروں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) امارۃ (۲) سلطنت (۳) خلافت۔ پہلے دور سے وہ ابتدائی زمانہ مراد ہے جس میں اس سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اور اسکا بادشاہ ایک امیر کے لقب سے سرفراز ہو سکتا تھا۔ اس زمانہ کے عثمانی امرا صرف تین ہیں عثمان اول جس نے اس سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا اور خان اور مراد اول۔ ان تینوں کی حکومت ۹۹ ہجری سنہ ۷۹۱ تک رہی۔

دور ثانی میں یہ دولت وسیع ہوگئی اور اسکا مالک سلطان کے لقب سے ممتاز کیا گیا پہلا سلطان بایزید اول ہے اور آخری سلطان بایزید ثانی۔ اسکے قیام حکومت کی مدت سنہ ۷۹۱ ہجری سے سنہ ۹۱۸ھ تک ہے۔

تیسرے دور میں عثمانی سلاطین نے اپنے لئے خلافت کا لقب اختیار کیا۔ پہلا سلطان جو اس لقب سے مشہور ہوا سلیم اول ہے جو تخت سلطنت پر سنہ ۹۱۸ھ میں بیٹھا تھا مصر کے فتح ہونیکے بعد اس نے اپنا لقب خلیفہ مقرر کیا جو سنہ ۹۲۳ھ میں اسکے مفتوحات میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ لقب خلافت ابتک اُن میں نسلاً بعد نسلٍ اور کابراً عن کابرٍ چلا آتا ہے اور موجودہ عثمانی سلطان عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ بھی اسی لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ عثمانی سلاطین کی اب تک کل تعداد ۳۴ تک پہونچی ہے جنمیں سے تین امرا۔ پانچ سلاطین اور چھبیس خلفا رہیں۔

عثمانیوں نے اپنی حکومت محض اپنی بہادری سے قائم کی جیسا کہ انکے پہلے سلاجقہ نے دینی حکومت قائم کی تھی۔ بخلاف اور ترکی دول کے کہ وہ زیادہ تر بادشاہوں یا جنرلوں کے رعب داب کی وجہ سے قائم ہوئی تھیں۔ کوئی قومی بہادری اُنمیں نہ تھی

اور نہ عصبیت کا جوش تھا۔ جیسے طولونی حکومت مصر تھی یا افغانستان اور ہند کی غزنوی سلطنت۔ یا اتابکہ کی حکومت جو خلفاء سلجوقی کی کل پر مصر و شام اور دیگر ممالک اسلامیہ کو اپنے تصرف میں لائے تھے۔ دولت عثمانیہ کی بنا ایک معزز اور پُرجوش بہادر قبیلہ غور کی ڈالی ہوئی ہے جنہوں نے خود اپنی ہی ایک ہم قوم سلیمان شاہ کو افسر بنا کر اس کے جھنڈے کے نیچے غیر قوموں کو پامال کیا۔ اور ممالک فتح کر کے خود مختاری کا علم بلند کیا۔

سلیمان شاہ اور اُسکا قبیلہ خراسان کے چٹیل میدانوں میں اپنی سکونت رکھتا تھا جب مغلوں نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں چنگیز خاں کی افسری میں اسلامی ممالک کو روند ڈالا۔ اور دنیا میں بے گناہوں کی خون کی ندیاں بہنے لگیں اُسوقت یہ قبیلہ خراسان کی سرزمین سے نکلکر اس ارادے سے چلا کہ کہیں اپنے لئے امن اور اطمینان کی جگہ تلاش کرے۔ ایسا نہو کہ مغلوں کا بیباک لشکر ان کو پامال کردے چنانچہ اپنے حسبِ منشا جگہ تلاش کرتے ہوئے یہ لوگ آرمینیہ میں آئے۔ یہاں کئی سال تک ان کی سکونت رہی لیکن واپسی میں مغلوں کا لشکر ادھر ہی سے ہو کے گذرا خبر پاتے ہی یہ لوگ وہاں سے بھی بھاگے۔ بلکہ فرات کو عبور کرتے ہوئے انکا سردار سلیمان شاہ گھوڑے سے گرا اور مرگیا۔ وہیں اُن لوگوں نے اوسکو دفن کردیا۔ اور ابتک اوسکی قبر ترکی قبر کے نام سے مشہور ہے اُس قبیلہ میں یہ رسم تھی کہ جب سردار مرجاتا تو تمام قبیلہ اوسکے اولاد میں تقسیم ہوجاتا تھا۔ چنانچہ سلیمان شاہ کے چار بیٹے تھے ہر ایک کے ساتھ ایک ایک چوتھائی قبیلہ ہوگیا۔ اور ہر ایک بیٹے نے معہ اپنے قبیلہ کے اپنے قدیمی وطن یعنی خراسان کی راہ لی مگر ارطغرل جو غالباً سلیمان شاہ مرحوم کا بڑا بیٹا تھا اوسنے کہا کہ میں پھر اُس سرزمین پر پلٹ کے کیا جاؤں جسکو میرے باپ نے چھوڑ دیا اور بالآخر وہ اپنے آدمیوں کو لیکر مغرب کی طرف بڑھا۔ اوسکی خوش تقدیری اوسکو ایشیائے کوچک کی سمت راہنمائی کر کے لے گئی جو کہ اُسوقت

سلاجقہ کی حکومت میں باقی رہگیا تھا۔ سلاجقہ کی سلطنت پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں قائم ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ اسکے پانچ حصے ہوگئے تھے (۱) سلاجقہ اُولے (۲) سلاجقہ کرمان (۳) سلاجقہ شام (۴) سلاجقہ عراق وکردستان (۵) سلاجقہ ایشیائے کوچک۔ خاندان سلجوقیہ میں یہ عام قاعدہ تھا کہ خلفا جنرلوں کو اقطاع ولایات پر حکمرانی کرنیکے لیے بھیجتے تھے۔ اور اُنکو اتابک کہتے تھے۔ اس اصول کی وجہ سے بہت تھوڑے ہی عرصہ میں اتابکوں نے اکثر اپنی قوت بڑھا کر اپنے آپ کو خود مختار کرلیا۔ اور آخری چھٹی صدی ہجری گذرنے بھی نہ پائی تھی کہ سلاجقہ کی عظمت اور سلطنت اکثر اسلامی ممالک سے اُٹھ گئی۔ صرف یہی حصہ ایشیائے کوچک کا اُنکے قبضہ میں تھا۔ اور یہ ساتویں صدی ہجری کے آخر تک رہا لیکن اسمیں بھی سلجوقی خاندان کے آٹھ خود مختار حکمران الگ الگ حکومت کررہے تھے۔

ارطغرل جسوقت ساتویں صدی ہجری کے آخر میں وہاں پہونچا تو اُسوقت ایشیائے کوچک انہیں آٹھ طاقتوں میں بٹا ہوا تھا جیسا ہمنے اوپر بیان کیا۔ جسوقت قونیہ پہاڑ کے اوپر یہ چڑھا تو اسنے دیکھا کہ ایک بہت بڑا غبار اُڑ رہا ہے جو تمام شمالی افق میں پھیلا ہوا ہے فوراً ایک ٹیلے پر چڑھکر غور سے نظر جمائی۔ اور دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دو فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ اسکے دلمیں اسوقت جوش پیدا ہوا۔ اور فوراً میدان کی طرف چلا کہ جو ضعیف ہو اوسکی مدد کرے۔ چنانچہ اسکی مدد سے زبردست فوج کو شکست ہوئی۔ اتفاقاً لڑائی ختم ہونیکے بعد جب یہ اوس امیر لشکر سے ملا جسکی اسنے مدد کی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ امیر علاءالدین سلجوقی ہے جسکے ماتحت اسکے ہم قبیلہ لوگ ہیں۔ اس سے اوسکو اور بھی خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے ہی ابناء جنس کی مدد کی۔ علاءالدین نے اسکی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے اسکے لئے اپنے ملک میں سے ایک قطعہ اراضی کا الگ کردیا جسمیں ارطغرل اور اوسکا قبیلہ سکونت کرسکے۔ ارطغرل نے اپنی تمام زندگی وہیں بسر کی۔ اوسکے مرنیکے بعد اوسکا بیٹا عثمان اُس قطعہ زمین کا وارث ہوا۔ یہ ایسا شجاع اور عالی ہمت نوجوان

تھا کہ اپنے باپ سے بہت بڑھ گیا۔ جسوقت علاؤ الدین نے وفات پائی اور اُسکے کوئی اولاد نہ تھی تو دوسرے سلجوقی امرا نے اوسکی سلطنت تقسیم کرلی۔ عثمان بھی ۶۹۹ھ میں خود مختار ہوگیا۔ یہ پہلا استقلال تھا جو اوسکو حاصل ہوا۔ اسکے بعد وہ اپنی سلطنت کے بڑھانیکے لئے کوشش کرنے میں مصروف ہوا۔ سلجوقی امرا میں علاء الدین کی سلطنت کے تقسیم کے بعد جھگڑے پیدا ہوئے۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور علاء الدین کی تمام سلطنت پر لڑ بھڑ کر خود ہی قبضہ کرلیا۔

عثمان کا باپ ارطغرل اپنی زندگی بہت سادہ بسر کرتا تھا جیسا کہ دیہاتی اور گاؤں کے باشندے بسر کرتے ہیں۔ گرمیوں میں وہ اپنے تمام جانوروں۔ بھیڑ۔ بکری اونٹ گھوڑے وغیرہ اور قبیلہ کے پہاڑوں پر جاکر رہتا۔ اور جاڑے میں میدانوں میں آجاتا اُسکے راستہ میں ایک بہت بڑا قلعہ پڑتا تھا جسپر رومیوں کا قبضہ تھا۔ ارطغرل نے اونکے ساتھ عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمارے جانوروں اور جانوں کی حفاظت کرینگے تو اونکو سال میں ایک معین تعداد اونٹوں کی دیتے رہینگے۔ چنانچہ اوس کے زمانہ میں برابر اسپر عملدرآمد ہوتا رہا۔ کیونکہ ارطغرل کو یہ خوف تھا کہ معاہدہ پورا نہ کیا گیا تو یہ لوگ ہمارے تمام جانور لوٹ لینگے۔ اور ہمکو بھی صدمہ پہونچائینگے۔ اسلئے کہ اُسوقت ترکوں کی دہشت ہر ایک کے دل پر جمی ہوئی تھی۔ اور اونکا رعب بہت غالب تھا۔ عثمان کو اس معاہدہ کے مطابق خراج دینا ناگوار تھا۔ وہ اپنے بہادر ہمراہیوں کو لیکر عورتوں کے بھیس میں اُس قلعہ میں چلا گیا۔ اور بہت آسانی سے اُسپر قبضہ حاصل کرلیا یہ قلعہ گورنمنٹ قسطنطنیہ کے قبضہ میں تھا۔ جسکے مظالم سے لوگ بہت زیادہ پریشان ہوگئے تھے۔ اسلئے اس فتح کے بعد اُس دیار میں عثمان کو ہردلعزیزی حاصل ہوگئی اور وہ لوگ اسکے حامی اور وفادار ہوگئے۔

عثمان کا منچلا دل اب کہاں اسکو نچلا بیٹھنے دیتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے

شہر نیقیہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن چونکہ اسکو معلوم تھا کہ یہ آسانی سے فتح نہیں ہو سکتا اسلئے خود اوسکے محاصرہ میں رہا۔ اور اپنے بہادر بیٹے اورخاں کو کچھ فوج کے ساتھ دوسری طرف روانہ کیا کہ وہ ملک فتح کرے۔ اوسنے مختلف قلعے اور شہر فتح کئے اور بروصہ تک جو اوس زمانہ میں بڑا مشہور شہر تھا پہونچگیا۔ عثمان ابتک نیقیہ کے محاصرہ ہی پر تھا شہنشاہ قسطنطنیہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اسکو اندیشہ ہوا۔ اوسنے ایک دوسرا پہلو اختیار کیا کہ عثمان کے پاس ایک رئیس کو جو اوسکا ماتحت تھا بھیجا اور کہا کہ میں اپنی لڑکی سے تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عثمان نے اسکو نہ مانا اور نہ کچھ پرواہ کی۔

بروصہ کے فتح کی خبر پاکر اسنے اپنے بیٹے اورخاں کو واپس بلا لیا۔ اور بہت خوش ہوا خود اوسوقت مرض الموت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اور جینے کی کچھ امید نہ تھی اسلئے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ میں مرتا ہوں لیکن مجکو اپنے مرنے پر کوئی افسوس نہیں ہے جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرا ایک حقیقی خلف اور قائم مقام موجود ہے۔ اے میرے بیٹے تو عدل کا معاون اور ظلم کا مخالف رہنا۔ اور احکام شریعت کی ادائی میں کوتاہی نہ کرنا اپنا پایہ تخت بروصہ میں بنانا اور وہیں مجکو دفن کرنا" چنانچہ بروصہ میں وہ دفن کیا گیا اور وہی پایہ تخت بنایا گیا۔ یہی پہلا عثمانی کیپٹل ہے جو ایشیائے کوچک کے شمالی غربی جانب بحر اسود کے سواحل پر واقع ہے۔

سلطان عثمان نے ۲۷ سال حکمرانی کرنیکے بعد ۷۲۶ھ میں وفات پائی۔ یہی ارطغرل کا بہادر بیٹا عثمان ہے جسکے نام نامی سے ابتک سلطنت ٹرکی فخر کرتی ہے یہ نہایت خوبصورت آدمی تھا اور اسکے بال معمولی سے زائد سیاہ تھے یہانتک کہ اسکا لقب (قارا) یعنی سیاہ بالوں والا پڑ گیا تھا۔ یہ ایک نہایت افتخار کا لقب ہے۔ کیونکہ اُس قبیلہ کے لوگ سیاہ بالونکو بہت پسند کرتے تھے اسکے دونوں ہاتھ بہت لمبے تھے یہانتک کہ گھٹنوں کے نیچے تک پہونچ جاتے تھے۔ جیسے بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے

تھی۔ اسکا لباس بہت معمولی ہوتا تھا۔ البتہ سر پر ایک تاج رکھتا تھا جو تاج خراسانی کہلاتا تھا۔ اسمیں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک حقیقی فاتح اور سچے بہادر کے لئے ہونی چاہئیں۔ اسلئے تمام اسلامی جنرلوں میں اسکو سب سے اعلیٰ درجہ پر رکھتے ہیں اُسکا بیٹا اورخاں بھی ملک گیری کا بیحد شائق تھا۔ اسنے اپنے نام کا سکہ چلایا۔ اور اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ ترکوں کی طرح اسنے یہ نہیں کیا کہ سلطنت کو تقسیم کر دیتا۔ بلکہ اپنے بھائی علاء الدین کو اپنا وزیر مقرر کر لیا۔ اور نظام حکومت اسکے ہاتھ میں دیدیا۔ اسمیں ملکہ انتظام بدرجہ غایت تھا۔ چنانچہ اُس نے سلطنت کو بالکل شائستہ طور پر منظم کر دیا خاندان سلجوقی کی طرح اوسنے ولایات کی حکومت کے لئے اتابکہ نہیں بھیجے بلکہ پاشا مقرر کئے جو اوسکے ماتحت رہیں۔ پاشا فارسی کے دو لفظوں سے مرکب ہے جسکے معنی بادشاہ کا پاؤں ہیں۔ اہل فارس میں یہ ہمیشہ سے رسم ہے کہ وہ لوگ وزرا اور اپنے دیگر ماتحتوں کو ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ وغیرہ وغیرہ کہا کرتے تھے۔

اسوقت لشکر بھی باقاعدہ نہ تھا۔ ضرورت کے وقت قبائل لڑنیکے لئے اکٹھے کر لئے جاتے۔ علاء الدین نے فوج کو مرتب کیا۔ اور اُنکے الگ الگ فرقے۔ رسالے وغیرہ قائم کئے۔ پہلے اسمیں اوسکو بہت دشواریاں پیش آئی لیکن آخر اوسنے یہ ترکیب کی کہ دوسرے قبائل سے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا اسلئے مجبوراً اوسکے ہم قبیلہ لوگوں کو اُسکا انتظام تسلیم کرنا پڑا۔ اورخاں نے مختلف لڑائیوں میں بہت سے عیسائی گرفتار کئے تھے۔ اُنکے بچوں کو اسلامی تربیت دیکر اوس فوج میں بھرتی کیا۔ جو ابتک دولت عثمانیہ کی تاریخ میں انکشاری مشہور ہیں۔ اورخاں کے بعد مراد اول اُسکا جانشین ہوا۔ اس نے اوسی انکشاری فوج سے تمام ایشیائے کوچک پر قبضہ کر لیا اور اسکو ایک سلطنت بنا لیا۔ دوسری طرف ڈارڈنیلز سے یورپ تک پہونچا اور اڈریانوپل کو فتح کر لیا۔ اب قسطنطنیہ کے بادشاہ کے دل پر اسکا بہت خوف طاری

ہوا۔ بلقان کے پہاڑ اوسکی دہشت سے لرزنے لگے۔ اور تمام ٹرکی ریاستیں تھرا اُٹھیں لیکن وہ اس زبردست فاتح کو روکنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ فتوحات کا سلسلہ بڑھائے چلا جاتا تھا۔ آخر ۱۴۹۲ء میں مرگیا۔ اسکے بعد اسکا بیٹا بایزید اوّل اسکا جانشین ہوا۔ جس سے اس دولت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ بایزید اوّل پہلا شخص ہے جسنے اپنا لقب سلطان رکھا۔

اسکے زمانہ میں تیمور لنگ تھا۔ جس نے کہ تماشہ گاہ عالم کی اسٹیج پر وہی ایکٹ کرکے دکھلا دیا جو اس سے ڈیڑھ صدی پہلے چنگیز خاں نے دکھلایا تھا۔ اسنے ماوراء النہر سے نکلکر بہت سی لڑائیوں کے بعد بلاد فارس کو فتح کیا۔ خراسان۔ جرجان۔ مازندران سجستان۔ افغانستان۔ آذربیجان اور کردستان کو روندتا ہوا عراق میں پہونچا اور بغداد پر قبضہ کرلیا۔ وہاں سے مشرق کی طرف رُخ کیا اور ایک تیز رو گرجتے برستے بادل کی طرح کشمیر۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں خون کی ندیاں بہاتا ہوا۔ ایشیائے کوچک کی طرف چلا۔ اسوقت یہی بایزید اوّل حکمران تھا جسے تیمور نے قید کرلیا۔ اور آخر یہ مظلوم قید ہی میں مرگیا۔ اوسکی وفات کے بعد دولت عثمانیہ میں خرابی واقع ہوگئی۔ اسوقت اورنٹس سے ڈانوب تک اسکی سرحد پھیلی ہوئی تھی۔ بایزید کی مختلف اولادوں نے الگ الگ سلطنتیں قائم کرلیں۔ اور اس عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے لیکن اُسکا منجھلا بیٹا محمد چلبی جو نہایت دانشمند اور بہادر تھا اوسنے بڑی حکمت عملیوں سے پھر ایک ہی سلطنت کرلی اسکے بعد مختلف سلاطین ہوئے جو مغرب اور مشرق دونوں جانب سلطنت کے حدود کو وسیع کرتے رہے۔ اور انگریزی جنرلوں اور اونکے بادشاہوں سے لڑتے رہے یہانتک کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کرلیا جسکے فتح کرتے ہی روم کی باقی حکومت کا فیصلہ انہیں کے ہاتھ پر ہوگیا۔

اسلام کی فتوحات میں قسطنطنیہ کی فتح کا واقعہ تاریخی لحاظ سے ایک عظیم الشان

واقعہ ہے کیونکہ ابتدا اسلام سے مسلمان اسمیں نہیں جاسکے - اور ہمیشہ اُن کو دلوں میں یہ اُمنگیں جوش مارا کیں کہ یہ شہر ہمارے قبضہ میں آئے - آخر محمد فاتح عثمانی کے ہاتھ سے یہ مرادیں پوری ہوئیں - اور وہ ۲۹ رمئی ۱۴۵۳ء کو ۸ بجے صبح کے وقت رعب و جلال کے ساتھ اپنے وزرا امرا اور جنرلوں کے ہمراہ رومانوس دروازہ سے گھوڑے پر سوار قسطنطنیہ میں داخل ہوا - شارع عام سے گذرتا ہوا دونوں رخ کی عمارتیں دیکھتا ہوا جنہیں اوسکے دیکھنے کے لئے ہر کھڑکی اور دروازے سے لوگ جھانک رہے تھے آتمیدان پہونچا جسمیں کنیسہ ایا صوفیا ہے - اوسکی نظر ایک ستون پر پڑی جسمیں تین سانپوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں جو آپسمیں لپٹے ہوئے تھے - سلطان نے سنا تھا کہ لوگ عقیدۃً سانپوں کو اپنا محافظ خیال کرتے ہیں - چنانچہ اپنے صوبجان سے اوس نے ایک سانپ کا پھن توڑ ڈالا - اسکے بعد کنیسہ کی عظیم الشان عمارت دیکھی - اوسکے ایک ساتھی نے اپنی تلوار سے اوسکے نقش و نگار میں سے ایک سنہرا پھول توڑنا چاہا اوس نے منع کیا اور عصائے شاہی سے مارا بھی اور کہا کہ ہرگز اس معبد میں سے کوئی چیز نہ توڑو اسکے بعد حکم دیا - گھنٹیاں اور قرنا و صور نکال کے پھینکدو - اور موذن کو حکم دیا اُس نے اذان کہی اور جمعہ میں نماز پڑھی - اور اُسی روز سے اسکا نام جامع ایا صوفیہ کہا گیا -

دوسرے دن دو انکشاری سپاہی اوسکے سامنے شہنشاہ بالیولوگوس کی نعش لائے جو مقتولوں میں تلاش کرنے سے اُن کو ملی تھی - سلطان نے اوسکو نہایت اکرام اور عزت سے دفن کرایا - فتح قسطنطنیہ میں جو لوگ قید کئے گئے تھے اونمیں گرینڈیوک لوکاس نوکربوس بھی تھا جو وزیر خزانہ تھا - سلطان کے سامنے جب وہ لایا گیا تو اوسکو چھوڑ دیا اور کہا کہ بتلاؤ خزانہ کہاں ہے اوسنے تمام خزانہ معائنہ کرایا - جو بہت ہی زیادہ تھا - سلطان نے کہا کہ تم لوگوں نے اسکو اپنی مدافعت اور ملک کی حمایت میں کیوں نہیں صرف کیا - اوسنے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو تمہارے لئے رکھا تھا" محمد فاتح نے

قسطنطنیہ ہی کو اپنا پایہ تخت بنالیا جو کہ ابتک ہے اور اسکے بعد اُس نے ممالک یورپ میں اپنے فتوحات بڑھانے کی کوشش کی۔ انکشاری فوج اس کام کے لئے بہت موزوں تھی۔ اور بالآخر اسی کے ذریعہ سے وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہانتک کہ اٹلی کے قلعہ اورنٹو پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

اُسکے بعد سلطان سلیم اول نے جو اُسکا جانشین تھا مشرق کی طرف عنان توجہ منعطف کی۔ اور اپنی قلیل مدت حکومت یعنی صرف آٹھ سال کے عرصہ میں اسقدر ممالک فتح کئے جو دوسرا صدیوں میں نہیں کرسکتا۔ فارس پر پورا قبضہ کرلیا۔ کردستان دیاربکر شام مصر۔ بلاد عرب۔ حرمین شریفین وغیرہ سب اُسکے تصرف میں آگئے قاہرہ میں بجائے علم عباسی کے عثمانی پرچم لہرانے لگا۔ اور اُن لوگوں نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ یہاں سے دولت عثمانیہ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اور یہی عظیم الشان دور ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ان کی سلطنت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا سلطان سلیم کے بعد اُسکا بیٹا سلیمان خلیفہ ہوا۔ اسکا اقتدار اور اوسکی سلطنت بہ نسبت تمام سلاطین عثمانیہ کے زیادہ تھی۔ اور اسکے زمانہ میں عثمانی سلطنت اعلیٰ معراج کمال پر پہونچی ہوئی تھی جسطرح کہ دولت عباسیہ ماموں کے زمانہ میں۔ اسنے بھی بہت سے ممالک فتح کئے مثلاً بلگریا وغیرہ۔ اسکے جرار لشکر نے ایسا سخت تہلکہ دنیا میں مچادیا جسکے ذکر سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں، آسٹریا کی سرزمین کو اسکے گھوڑوں کی ٹاپوں نے روند ڈالا ۱۵۲۹ء میں وائنا کا محاصرہ کیا۔ گو اُسکو فتح نہیں کیا۔ لیکن جزیہ لیا اسکے زمانہ میں نہایت شائستہ آئین اور قوانین مرتب ہوئے۔ اور ٹرکی سلطنت ہر لحاظ سے ایک زبردست اور عظیم الشان طاقت ہوگئی یورپ کے حکمرانوں مثلاً شارلکن۔ فرڈننڈ۔ فرانسیس اول ولیم دہم اور کورٹس وغیرہ سے عہدنامے کئے اسوقت عثمانی سلطنت شرقاً وغرباً فرات سے جبل طارق تک۔ اور شمالاً وجنوباً بوداپست

جو ڈانوب کے ساحل پر ہے اخیر تک تھی اُسی کے بعد سے اس سلطنت کا زوال شروع ہوا جسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ عثمانی سلاطین نے خود لڑائی میں جانا چھوڑ دیا۔ اور عیش و آرام میں پڑ گئے۔ اسکا تقہقر اور تنزل اُسوقت سے برابر اٹھارہویں صدی عیسوی کے اور آخر تک چلا آیا۔ لیکن اوائل اُنیسویں صدی میں جب سلطان محمود ثانی تخت نشین ہوا تو اوس نے از سر نو انتظام شروع کیا۔ اور جدید تمدن کے مطابق قوانین اور آئین مرتب کئے۔ انکشاری فوج سلطنت کے خلاف تھی۔ اور وہ در پردہ اپنی الگ طاقت قائم کرنا چاہتی تھی لیکن اسنے اونکو اپنی بہادری اور نیز لطائف الحیل سے اپنے قبضہ میں کیا۔ اور وہی روش اختیار کی جو اسکے مشہور جنرل محمد علی پاشا نے مصر میں اوسکے فتح کرنیکے بعد اختیار کی تھی۔ یہ پہلا عثمانی سلطان ہے جس نے طربوش اور انگریزی لباس پہنا۔ اور فٹن پر سواری کی۔ ورنہ اسکے پہلے عثمانی سلاطین عمامہ اور جُبّہ پہنتے تھے۔ اور گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ اُسیوقت سے اُنمیں کچھ جدید تمدن کا اثر پھیل چلا جو ابتک بڑھتا جاتا ہے لیکن بہت آہستگی کیساتھ۔

دولت عثمانیہ بہ نسبت دیگر دول اسلامی کے کئی خصوصیتوں میں ممتاز ہے۔

(۱) اس نے ایسے عظیم الشان فتوحات حاصل کئے جو دوسری اسلامی سلطنتوں کو نہیں نصیب ہوئے۔ خاصکر فتح قسطنطنیہ۔ کیونکہ بنی امیہ اور نیز بنی عباس ہمیشہ اسکے فتح کرنے کی کوشش میں رہے۔ لیکن اُن کو غلبہ نہ ہوسکا۔ اس عظیم الشان فتح کو جدید اصول تمدن سے بہت کچھ تعلق ہے۔ کیونکہ نئی روشنی کا دُھندلا اُجالا پہلے اسی شہر کی چار دیواریوں میں محصور تھا۔ جو بعد کو دنیا میں نکلکر آفتاب کی طرح نورانی ہوگیا۔ جسوقت یہ پایہ تخت فتح کیا گیا تھا۔ اسوقت اسمیں سے کئی فرقے یوروپ میں جا بسے تھے۔

(۲) اسلامی بادشاہوں میں سب سے پہلے سلاطین عثمانیہ ہی نے یورپ کی طرف

رُخ کیا اور اسکو فتح کیا۔ بنی اُمیہ نے اگرچہ اندلس (اسپین) کو فتح کیا تھا۔ لیکن اسکے بعد وہ قسطنطنیہ ہی کی فتح کی ادھیڑ بن میں لگے رہے۔ اگر اسوقت وہ ذرا بھی کوشش کرتے تو تمام یوروپ اونہیں کا تھا۔ اسلئے کہ یوروپ کی حالت اُسوقت نہایت سقیم تھی۔ اور کوئی طاقت تمام ملک میں ایسی موجود نہ تھی جو بنی اُمیہ کی فتوحات میں برائے نام بھی رکاوٹ پیدا کرسکتی۔ اور عثمانیوں نے خصوصیت کے ساتھ یوروپ کی طرف توجہ کی۔ اور باوجود اسکے کہ صلیبی جنگ نے اہل یوروپ کو بیدار کردیا تھا۔ اور اُن کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن پھر بھی عثمانیوں نے بہت بڑا حصہ یوروپ کا اپنے قبضہ میں کرلیا۔

(۳) سلاطین عثمانیہ باوجود اسکے کہ اہل عرب میں سے نہ تھے۔ ان کی خلافت پر بیعت کی گئی۔ حالانکہ دوسرے اسلامی سلاطین مثلاً محمود غزنوی۔ تیمور لنگ وغیرہ کو اگرچہ اونکے ملک بہت وسیع تھے اور اُن کی خواہش بھی تھی لیکن یہ درجہ خلافت نہ حاصل ہوسکا۔ سلطان سلیم نے جب مصر فتح کیا تھا تو اُسوقت آخری خلفاء عباسیہ میں سے جو کہ ہلاکو کی فتح کے بعد بغداد سے مصر میں چلے آئے تھے۔ متوکل علی اللہ موجود تھا یہ اپنے مسند خلافت سے اُتر آیا۔ اور سلطان سلیم کی خلافت پر اوسکی ہاتھ پر بیعت کی۔ آثار بنو اُمیہ یعنی علم۔ سیف اور چادر اوسکے حوالہ کئے۔ حرمین شریفین کی کنجی سپرد کی اور اُسیدن سے عثمانی سلاطین تمام اسلامی عنصر میں سیاست اور دین دونوں کی حکومت کے مالک تسلیم کئے گئے اور اُن کا لقب "خلیفہ امیر المومنین" ہوا جو اب تک وراثتاً چلا آتا ہے۔ اسکی ایک وجہ اور بھی ہے کہ تمدن اسلامی میں جسقدر دولتیں قائم ہوئیں مثلاً فارس۔ ترک۔ کرد۔ دیلم۔ سلجوقی۔ ایوبی وغیرہ اُن کی سلطنت کا رقبہ اسکا نصف بھی نہیں تھا جتنا عثمانی سلطنت کا تھا علاوہ بریں ایک ہی خاندان میں کوئی اسلامی سلطنت اتنے زمانہ تک باقی بھی نہیں رہ سکی جسقدر کہ دولت عثمانیہ رہی۔ عربی

خلافت میں سب سے طویل مدت خلافت عباسیہ کی ہے۔ حالانکہ وہ تین صدی بھی چل نہ سکی اور اُسکے بعد دینی خلافت رہگئی۔ اس لحاظ سے دولت عثمانیہ نے تمام دیگر اسلامی سلطنتوں سے زیادہ عمر پائی۔ اللہ اور بڑھائے۔

(۴) دولت عثمانی کی چوتھی سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے اسلامی عظمت کی بہت کچھ نگہداشت کی اور اگر یہ سلطنت قائم نہ ہوتی تو اسلامی سلطنت کا چراغ دنیا سے کبھی کا گل ہوگیا ہوتا۔ اس نے نہ صرف دوسری قوموں کے حملے سے اسکو محفوظ رکھا بلکہ اسلام کی توڑنے والی طاقتوں کو توڑا۔ خاص کر مغل اور اہل یورپ کو۔

یہ دولت آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں قائم ہوئی۔ اسوقت اسلامی سلطنتوں کی یہ حالت تھی کہ مصر متعدد سلاطین کے قبضہ میں تھا جنمیں دن رات فساد برپا رہتا تھا۔ شام میں ایوبی خاندان کے سلاطین نے الگ الگ کئی خود مختار سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں۔ عراق اور بلاد فارس ایلخانی مکمرانوں کے قبضہ میں تھا۔ ماوراء النہر اور افغانستان پر مغلوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں دہلی کے بادشاہ راج کر رہے تھے دیگر مشرقی ممالک میں آتابکہ اپنے کو مستقل حکمران تصور کرتے تھے۔ ایشیاء کوچک کے خاندان سلجوقی کے امرا نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی تھی اندلس میں دولت ناصری کا تقریباً خاتمہ ہو رہا تھا اور وہ صرف غرناطہ میں محدود تھی۔ مرینیہ۔ زیانیہ اور حفصیہ اُمرا شمالی افریقہ میں جنگ وجدل کر رہے تھے۔ اُسوقت اگر دولت عثمانیہ ایسی زبردست اور وسیع سلطنت نہ قائم ہوتی جس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو اپنے دامن میں لیکر سنبھال لیا تو یقیناً اسلامی حکومت دنیا سے رخصت ہوجاتی۔ اسلئے یہ سلطنت نہ صرف ملکی بلکہ مسلمانوں کی مذہبی لحاظ سے بھی اس قابل ہے کہ وہ اسکے سلطان کو خلیفہ تسلیم کریں۔

اسلم جیراجپوری

ہارس شاعر رومی

ورجل کے بعد روم کا نامی شاعر ہارس (Horace) ہے یہ شاعر ورجل کیطرح رزمی شاعر نہیں ہے اسکے اشعار غزل وقصیدہ دونو کے رنگ رکھتے ہیں راقم کے خیال میں اس شاعر کا کلام سفو شاعرہ اور پنڈار کے رنگون سے ممزوج معلوم ہوتا ہے۔ ہارس نے بیشتر آوڈ لکھے ہیں جو قصاید کی تشبیب سے مشابہت رکھتے ہیں اوسکے کلام کا کچھ ترجمہ ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

کلام ذیل ایک آوڈ ہے جسمیں ہارس اپنی معشوقہ پیرا کی بیوفائی اور تلون مزاجی کی شکایت کرتا ہے اور یہ عورت جو ایک درباری عورت تھی اُسے سمندر سے تشبیہ دیتا ہے۔ تشبیہ سمندر کے ساتھ اس مشابہت سے دیتا ہے کہ سمندر جب ٹھیرا ہوتا ہے تو مسطح شکل ہوتا ہے اور اُس سے باسباب ظاہر کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا ہے مگر چشم زدن میں متموج ہوجاتا ہے اور ہلاکت کا نقشہ دکھلانے لگتا ہے ویسی ہی پیرا کی کیفیت ہے کہ پہلے نہایت مطبوع انداز دکھلاتی ہے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس کے تلون کا سمندر موجزن ہونے لگتا ہے اور عاشق کی جان پر آبنتی ہے اس تشبیہ کے بعد اپنی معشوقہ کو مخاطب کے کہتا ہے کہ ہم بھی تیرے فریب کے سمندر میں ڈوب چکے تھے مگر کسی طرح بچ نکلے اگر اسکی تصدیق درکار ہو تو کوئی جاکر دیکھ لے میری تصویر اور بھیگی پوشاک خدائے بحور کے مندر میں آویختہ ہیں یہ بیان قصہ طلب ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ اہل روم جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے بڑے بت پرست تھے منجملہ انواع اقسام کے دیوتاؤں کے ایک بہت بڑا دیوتا مانا جاتا تھا کہ جسکا نام نپچون تھا (Neptune) یہ دیوتا سمندروں کا مالک تھا اور تمام معاملات بحری اُس سے متعلق سمجھے جاتے تھے اس دیوتا کے لئے ایک بہت بڑا مندر بھی تعمیر کیا گیا تھا اور اہل حاجت وہاں پرستش اور پرستاری کی نظر سے جایا کرتے تھے منجملہ اور رسومات مذہبی کے رومیوں کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کوئی رومی سفر

بحری اختیار کرتا تھا اور اتفاق وقت سے اُسکا جہاز تباہ ہوجاتا تھا اور وہ خود کسی صورت سے بچکر وطن کو واپس آتا تھا تو ادائے سپاس کی نظر سے وہ نجات یافتہ شخص پنچون کے مندر میں حاضر ہوتا اور ایک تصویر اُسمیں آویزاں کرآتا اس تصویر میں اُس شخص اور اوسکے جہاز کی صورت کھچی رہتی تھی مراد اس تصویر آویزی سے یہ تھی کہ خدای بحور نے تصویر کے آویزاں کرنیوالے پر رحم کیا ہے اور ہلاکت سے نجات دی ہے اسواسطے ادای سپاس کی نظر سے ایسی تصویر کا آویزاں کرنا ضرور ہوا ایسے وہمی مراسم سے رومیوں کی مذہبی عقل کا انداز خوب کھلتا ہے باوجود افراط عقل و دانش کے یہ قوم مذہبی خیالات کی صفائی مطلق نہیں رکھتی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل دنیا اور عقل دین مختلف چیزیں ہیں اس زمانہ میں بھی بہت سی عاقل قومیں دیکھی جاتی ہیں جو باوجود پیدا کرنے ہر طرح کی دنیاوی ترقیوں کے مذہبی معاملات میں عاجز نظر آتی ہیں یہ قومیں ہزاروں علمی طریقے دنیا حاصل کرنیکے جانتی ہیں اور اسوقت علوم و فنون میں درجہ کمال حاصل کرچکی ہیں مگر مسئلہ توحید سے تمامتر بے خبر ہیں خدای واحد کی پرستش کا مضمون اُن کی سمجھ میں آتا ہی نہیں ہے خیر اہل یونان اور اہل روم یا اور بھی بہت سی موجودہ قومیں جو دنیاوی شائستگی کا نمونہ سمجھی جاتی ہیں اگر بت پرستی سے خالی نہیں تو نہوں تعجب ہے اُن اہل اسلام سے جو خواجہ خضر کا بیڑا یا کاغذی کشتی بنانے والے ہیں۔ ہر سال ہزاروں جہال زبانی توحید کے قایل۔ برسات کے دنوں میں گنگا کا کنگی سون پن پن اور اسیطرح ندیاں اور نالوں میں کاغذی کشتیاں دھوم دھام سے حضرت خواجہ خضر کی نذر کیا کرتے ہیں اعوذ باللہ من ذلک بہرحال فارس کے اُوڈ کا مفہوم راقم ذیل میں عرض کرتا ہے۔ اُمور بالا کے عرض کردینے سے یہ غرض تھی کہ قصہ طلب مضامین کے بیان سے کلام سے کلام شاعر آسانی کے ساتھ

ذہن نشین ہو جاسکے کسواسطے کہ ہر ملک کی شاعری کچھ نہ کچھ رسوم ملکی سے متعلق ہوا کرتی ہے اور ناواقفیت کی حالت میں نہ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ سامع کے دل کو لذت یاب سخن کرسکتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص اس رسم سے واقف نہو کہ ایک وقت میں یہ دستور تھا کہ جو کوئی فریادی ہوتا تھا وہ دادخواہی کی غرض سے پیراہن کاغذی پہنتا تھا تو ایسا شخص مرزا نوشہ کی اس مطلع کو یعنی ؎

نقش فریادی ہے کسکی شوخی تحریر کا	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی اُس سے لطف سخن اُٹھا سکتا ہے خیر حضرات ناظرین اب ہارس کے اُوڈ کی طرف توجہ فرمائیں گو ترجمہ سے اوسکے اصلی کلام کا لطف حاصل نہیں ہوسکتا۔

خطاب بہ پیرا

ای پیرا تو کس جوان حسین کو جو عطریات میں ڈوبا ہوا ہے خلوت کدوں میں ہم آغوش کئے رہتی ہے کسکے لئے تو اپنی زلفیں اس سادگی کیساتھ سنوارا کرتی ہے ہزار حیف کہ وہ تیری طرف مطمئن ہو رہا ہے اُسے کیا معلوم کہ اُسے تیری بیوفائی کی بدولت کیا کیا نہ اشک ریزی کرنی ہوگی اُسے اسکی کیا خبر ہے کہ تو ابھی کیا سے کیا ہو جانیوالی ہے وہ بیچارہ کیا جانتا ہے کہ تو وہ سمندر ہے کہ جو ہر تموج ہوا کیساتھ کیفیت گوناگون پیدا کرتا ہے اے پیرا جسنے تجھپر اعتماد کیا ہے کہ تو اوسکی ہو رہی ہے اوسکو ہوا کی غیر استقلالی سے تمامتر بیخبری ہے کمبخت وہ ہیں جن کی آنکھوں میں تو بھلی لگتی ہے مگر اونہیں تیری حقیقت سے اطلاع نہیں ہے میری سرگذشت تو میری اُس تصویر سے ظاہر ہے جو خدائے بحور کے مندر کی دیوار پاک سے آویزاں ہے اور اون ترکیبوں سے جو وہاں لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ چیزیں اسبات کی شہادت دیتی ہیں کہ ہم

غرق ہونے سے بدشواری بچ نکلے ہیں۔"

واضح ہو کہ ہارس اپنے کلام بالا میں اُسی مضمون کو شرح و بسط کیساتھ حوالۂ قلم کرتا ہے جسکو مرزا صائب نے مطلع ذیل میں باندھا ہے۔ ؎

چو می بینم کسے از کوی تو دل شادی آید | فریبے کز تو اول خوردہ بودم یاد می آید

مگر معشوقۂ خود کام سے نجات پانے کے مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ نے نہایت خوبصورتی اور پُر تاثیری کے ساتھ غزل ذیل میں فرمایا ہے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند | وندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند | بادہ از جام تجلّی بصفاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی | آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
چوں من از عشق رخش بیخود و حیراں گشتم | خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوش دل چہ عجب | مستحق بودم و ایں رہ بزکاتم دادند
بعد ازیں روی من و آئینہ حسن نگار | کہ درینجا خبر از طلعۂ ذاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد | کہ ببازار غمت صبر و ثباتم دادند
اینہمہ قند و شکر کز سخنم مے ریزد | اجر صبریست کزاں شاخ نباتم دادند
کیمیایست عجب بندگی پیر مغاں | خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند
بحیاتِ ابداں روز رسانید مرا | خط آزادگی از حسن مماتم دادند
عاشق آندم کہ بدام سرِ زلفِ تو فتاد | گفت کز بند غم و غصہ نجاتم دادند
شکر شکر بشکرانہ بفشاں اے دل | کہ نگار خوش و شیریں حرکاتم دادند

ہمت حافظ و انفاس سحر خیزاں بود
کہ ز بند غم ایام نجاتم دادند

واضح ہو کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمہ کے عہد شباب کی معشوقہ شاخ نبات

تھی جسکا نام غزل بالا میں آیا ہی یہ عورت لولیاں شیراز سے تھی۔ مگر حسن و جمال ایسا رکھتی تھی کہ شاہزادگان و امرازادگان اوسکے اوپر جان دیتے تھے اتفاق وقت سے حافظ علیہ الرحمۃ اوسکے گھر پہونچے وہ عورت انکے انداز عاشقی کو دیکھکر کہنے لگی کہ بغیر نقش مرم کوئی عمل کارگر نہیں ہوسکتا۔ حضرت مالدار نہ تھے مگر کچھ عرصہ میں زر کافی بہم پہونچا کر اوسکے گھر گئے اس بار حسب طریق زنان بازاری وہ نہایت اخلاق سے پیش آئی۔ مختصر یہ ہے کہ اوسکے گھر شب بسر کرنیکی ٹھہری صحبت اغیار سے پاک تھی اور عشق خواجہ زور دل پر تھا اس عورت سے قریب نصف شب کے تک ہمکلام رہے جب اوسنے استراحت کیطرف میل دکھلایا خواجہ کو اسوقت ایک بات یاد پڑی جو اوس شب کو عمل میں لایا کرتے تھے اتفاق سے وہ شب شب آدینہ تھی جیسی خواجہ کا یہ معمول تھا کہ دو شمع موی لیکر مصلای شیراز کو جاتے اور وہاں قبر پر ایک امام زادے کے جو وہاں آسودہ ہیں نہایت خلوص دل سے اُن دو شمعوں کو روشن کرتے یہ خدمت خواجہ سے کبھی ترک نہیں ہوئی تھی الا اوس شب میں کہ شاخ نبات کے زور فریفتگی میں فراموش ہونے کو تھی۔ جسوقت خواجہ حسب درخواست اوس عورت کے مایل استراحت ہونے کو تھے کہ وہ خدمت قدیمہ امام زادے کی یاد آئی یہ سوچکر کہ مصلای شیراز بہت دور نہیں ہے دو گھنٹے کی تو بات ہی فوراً پھر کر چلا آؤنگا۔ شاخ نبات کے نزدیک سے اُٹھنا چاہا شاخ نبات نے آستین پکڑی مگر خواجہ نے نہیں مانا گھر آکر دو شمع موی لیکر مصلای شیراز کی طرف روانہ ہوئے اور قبر حضرت امام زادہ پر اُنہیں روشن کیا اس جوش خلوص کا یہ اثر ہوا کہ شاخ نبات کی آرزو بالکل دل سے جاتی رہی اور مزاج پاک میں کچھ ایسا ولولۂ عشق حقیقی پیدا ہوا کہ دنیا سے دون اور اوسکے کل متعلقات کی

ہوس دل سے جاتی رہی - واقعی یہ اُن کی پاکی خیالات کا اثر ہے کہ اُن کا کلام اسقدر مقبول عالم ہو رہا ہے شاعر ہوس باز و ناپاک خیال میں یہ حسن قبول کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے - خواجہ کا یہ شعر ؎

اینہمہ شہد و شکر کز سخنم مے ریزد	اجر صبر لیست کزاں شاخ نباتم دادند

اُن کی پاکبازی اور اُن کی پاک خیالی کی بخوبی شہادت دیتا ہے - واقعی خدمت امام زادہ بہت کام آئی اور کیوں نہ دوستداری خاندان پیغمبرؐ کا اگر اتنا ہی صلہ ملے تو اوس خاندان کی دوستداری سے کیا فائدہ متصور ہے بہرحال خواجہ کو شاخ نبات کے بکھیڑے سے ویسی ہی نجات ہوئی جیسا کہ ہارس کو پیر اسکے دام فریب سے - مگر دونوں کے کلام کو موازنہ کرنے سے خواجہ کا معاملہ ہارس کے معاملے سے بہت زیادہ روحانی انداز رکھتا ہے - حضرات ناظرین کے آگے اسکے بیان کی حاجت نہیں ہے -

جاننا چاہیے کہ یہ شاعر آٹھ برس قبل ظہور حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اسکے کلام مقبول خاص و عام ہیں اور یورپ میں اسکا نام ابھی تک زندہ ہے - فقط امداد امام

اجلاس نیشنل کانگرس منعقدہ بنارس بابت دسمبر ۱۹۰۵ء کے فیصل شدہ رزولیوشن اور مسلمانان ہند کا نفع نقصان

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں	اور کھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

جبکہ ہم اپنے ایک مضمون میں (جو اردوی معلی کے گزشتہ اگست و ستمبر کے متحدہ پرچے میں شائع ہوا تھا) اس دعوے کے ثبوت میں کافی دلائل بیان کر چکے ہیں کہ کیوں کانگرس کو مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے پھر ہم انکو یہاں دہرانا غیر ضروری سمجھتے ہیں لیکن اسبات کو پھر زور سے کہتے ہیں کہ اگر اندین نیشنل

کانگرس بالاستحقاق یہ دعوے کر سکتی ہے کہ "وہ ہندوستان کے ..... ہر قوم اور ہر فرقے کی بہبودی کا خیال کرتی ہے اور وہ کسی خاص فرقے کی طرفدار نہیں ہے بلکہ تمام ہندی قوموں کی خیر اندیش اور بہی خواہ ہے" تو اوسکو مسلمانوں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھنا ہوگا ورنہ کانگرس کا یہ دعوی باطل سمجھا جائیگا۔ ہم بحیثیت مسلمان ہونے کے مشکور ہیں کہ کانگرس کے پچھلے اجلاس میں خدا جانے کس وجہ سے اس ہماری فروگزاشت کی تلافی کی جانب توجہ کی گئی تھی اور مسلمانوں کے قومی حقوق کا گونہ لحاظ رکھا گیا تھا۔ امسال ایسا کیوں کیا گیا؟ یا تو اسکا باعث مسلمانوں کی ایک عرصے سے چیخ پکار ہو یا اسکا یہ باعث ہو کہ اس دفعہ کانگرس ایسے صوبے میں منعقد ہوئی تھی جو بلحاظ اثر کے مسلمانوں کا سینٹر مان لیا گیا ہے اور خاص ایسے وقت میں جبکہ مسلمان اپنی پولیٹکل خواہشات کے اثبات کے ذریعہ کی تلاش میں تھے کانگرس والوں نے مسلمانوں کے پر چلانے کے واسطے انکے حقوق کی جانب اپنی توجہ دکھائی ہو۔ "ان بعض الظن اثم" اور اگر ہم تعلی کی بات کو ناپسند نہ کریں تو عجب نہیں کہ منتظمین کانگرس پر ہماری اس تحریر کا اثر پڑا ہو جو اردوی معلی کے اگست و ستمبر ۱۹۱۰ء کی مشترک نمبر میں شائع ہوئی تھی، غرض کچھ ہی ہو نتیجہ ضرور مسلمانوں کی توجہ کو کانگرس کی جانب مائل کرنے والا ہے۔

اوپر ہمنے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے قومی حقوق کا گونہ لحاظ رکھا گیا تھا" اس فقرے میں ہمنے "لفظ گونہ" اسوجہ سے استعمال کیا ہے کہ ابھی اصولاً اور فروعاً بہت سی ایسی باتیں ہیں جنکے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہنوز کانگرس میں پورے طور پر مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ اور اُن کی نگہداشت نہیں کیجاتی، مثلاً اصول انتخاب ہی کو لیجیے جو نیشنل کانگرس کی خواہشات کا جزو اعظم ہے بلحاظ فوائد مسلمانان ہند اوسوقت تک مستحسن نہیں سمجھا جائیگا جب تک کہ مسلمانوں کو یقین نہ ہوگا کہ اگر

بلحاظ نسبت آبادی وہ ہر جگہ انتخاب میں ضرور کامیاب ہوجائینگے خواہ اسطور پر کہ مسلمان مسلمان کو منتخب کریں اور ہندو ہندو کو خواہ منتخب کنندہ کوئی بھی بلا تفریق ہوں لیکن قواعد انتخاب ایسے وضع کئے جائیں کہ مسلمان بقدر اپنی نسبتی تعداد کے لازمی طور پر منتخب ہوجایا کریں - اور یا اس سے بھی خوبصورت اور اتحاد بڑھانے والا یہ طریقہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو بلحاظ نسبت آبادی مسلمانوں کو منتخب کیا کریں اسطریقہ سے نہایت عمدہ نتائج برآمد ہونگے اور ضرور ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت میں کمی ہوگی، لیکن جب تک کہ کانگرس کی تجاویز ، اُسکے کاغذات ، اور اوسکی آپیچوں میں مذکورہ طریقوں میں سے کسی طریقے کی پوری تفصیل نہیں ہوگی مسلمان ایسے موہوم انتخابی تجاویز کی جنسے وہ عملاً نقصان اٹھا چکے ہوں ہرگز تائید نہیں کرینگے - مسلمان ایسی تجویز پر راضی نہیں ہونگے خواہ ایسی کسی تجویز کے موید مثل گزشتہ کانگرس کے مسٹر فضل الحسن ہی ہوں جو اس ہماری رائے کو اپنی تنقید مندرجہ اُردوی معلی اگست و ستمبر ۱۹۰۵ء میں پسند کرچکے تھے - یہ اس کی جائز خواہش ہے اور کانگرس اگر مسلمانوں کے ہم خیال بنانے میں اپنا فائدہ سمجھتی ہے اور اونکو اپنا موید بنانا چاہتی ہے تو اسکو ماننا پڑیگا اور ایسی تشریح کرنی پڑیگی جس سے مسلمانوں کو اطمینان ہوجائے کہ اصول انتخاب میں مثل سابق اونکے حقوق پامال نہیں ہونگے - صرف ہمارے ناشناسا بھائی "مسلمان" کے نوٹ مندرجہ اُردوی معلی شہر اکتوبر ۱۹۰۵ء میں یہ لکھدینے سے کہ "ہر ایک چھوٹے بڑے عہدیکے لئے تعلیم کی شرط ہے اور مسلمان اُسمیں پورے نہیں اُتر سکتے" یا یوم اجرائے کونسل ایکٹ سے آجتک چند منتخب شدہ مسلمان ممبران کونسل کے نام گنا دینے سے جو بلحاظ نسبت اُس تعداد کے عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو مسلمانوں کو کونسلوں میں حاصل کرنی چاہئے تھیں جبکہ ہم اُن ممبروں کی تعداد کو دیکھیں جو بذریعہ انتخاب کونسلوں میں نشستیں حاصل کرچکے ہیں اور بڑا لطف یہ ہے کہ اُس نوٹ میں بڑی تجسس

اور ہوشیاری سے جو نام مسلمان ممبران کونسل کے گنائے گئے ہیں مع حاشیہ اڈیٹر
اُن کی کل تعداد پانچ سے نہیں بڑھ سکی، اگر بلحاظ آبادی بقیہ چار حصے دیگر اقوام کے
ممبران کونسل کے اور شامل کردیئے جائیں تو منتخب شدہ ممبران کونسل ہائے ہند کی
کل تعداد پچیس ہوتی ہے۔ کیا ابتک یوم اجرائے ایکٹ کونسل ہائے ہند یعنی ۱۸۹۲ء
سے صرف پچیس ہی ممبر تمام ہندوستان کی کونسلوں میں منتخب ہوئے ہیں؟ اگر ایسا
ہے تو تو ہم مطمئن ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقینی نہیں ہے تو ہم ضرور زور سے کہینگے
کہ موجودہ طریقہ انتخاب بلحاظ فوائد مسلمانان ہند ضرور قابل ترمیم ہے، ہم دعوے
سے ہر صوبے میں ایسے لایق مسلمانوں کی کافی تعداد شمار کرا سکتے ہیں جو کسی طرح دیگر
اقوام کے منتخب شدہ ممبران کونسل سے قابلیت میں کم نہیں ہیں اور ممبری کونسل کی
پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور اُن کی قابلیت ملک اور سلطنت دونوں تسلیم کرتے
ہیں۔ وہ کیوں منتخب نہیں ہوسکے؟ وہی طریقہ انتخاب کے ناقص ہونے کے باعث۔
ہمنے مسلمانوں کی ممبری کونسل سے محروم رہنے کو جابجا نہیں لکھا کہ ہم اوسکو صرف
ذاتی عزت ہی سمجھتے ہیں۔ نہیں بلکہ یہ لوگ اپنی قوم کی اصل رائے حکمران گروہ کے
کانوں تک پہونچانے کے اور اپنی قومی حقوق کی نگرانی کا (جنہیں بوجہ ناواقفیت
حکام وقت خلل آنے کا اندیشہ ہو) مابین رعایا اور سلطنت کے ایک آلہ ہوتے ہیں
اور جس قوم کے ہاتھ میں نے ایسی ضروری آلوں کی کمی ہو ضرور اوسکے قومی حقوق اور
حاجات ہر وقت معرض خطر میں ہیں، اگر ہمارے قائم مقام گروہ کی کافی تعداد وائسرائے
کی کونسل میں ہوتی تو پانچ سات برس تک عازمان حج کیوں قرنطینہ کی ناقابل برداشت
تکالیف اُٹھاتے، کیوں ریل کی واپسی ٹکٹ لینے کو مجبور کئے جاتے جنکے حصول
میں میدان حشر سے زیادہ تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، کیوں فرسٹ سکنڈ اور تھرڈ کی تفریق
نہ ہوتی یا کثرت سے ٹکٹ گھر نہ کھولے جاتے، کیوں گورنمنٹ یہ غلط خیال ذہن

نشیں کر لیتی کہ تمام حج کو جانے والے مسلمان تیسرے درجے ہی کے لوگ ہوتے ہیں اور گستاخی معاف کیوں سردار محمد حیات خاں مرحوم کے ہندی والے سوال کو لارڈ کرزن سرسری طور پر اوڑا دیتے اور کیوں باوجود سخت مخالفت اُن پرنس (یکے از خاندان شاہی اودہ مرحوم جنکا نام مجھکو یاد نہیں رہا) کے جو اُس زمانی میں والسرائے کی کونسل میں ممبر تھے (جب قانون حجاج پاس ہوا ہے) قانون مذکور میں بہت سے نقائص باقی رہجاتے جنکا ادنیٰ اثر موجودہ تکلیف دہ قرنطینہ ہے۔ یہ حالات صرف اسوجہ سے ہوئے کہ ہمارے قائم مقاموں کی کافی تعداد والسرائے اور گورنر بمبئی کی کونسلوں میں نہیں تھی دو ایک کے ہونے سے کچھ کام نہیں چلسکتا سلطنت بیچاری کیا کرے وہ اُسوقت تک ہماری ضروریات سے واقف نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُنکو بتایا نہ جائے ہم اسی بتانے والے گروہ میں آزاد اور سچے قومی بہی خواہ مسلمانوں کی کافی تعداد دیکھنے کے آرزومند ہیں اور نیشنل کانگرس والوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم ہندی قوموں کی بہی خواہی کا دم بھرتی ہو تو انتخابی خواہشیں کرتے ہوئے مسلمانوں کی حقوق محفوظ رکھو یہ غریب بہی ہندوستانی ہی نہیں۔

اب ہم دسمبر ۱۹۰۵ء کے اجلاس کانگرس منعقدہ بنارس کی فیصل شدہ تجاویز پر سرسری نظر ڈالتے ہیں اور اُن کو مسلمانوں کے فوائد کے لحاظ سے مثل سالگذشتہ کے جانچتے ہیں۔

کانگرس کی پہلی پاس شدہ تجویز یہ ہے "یہ کانگرس بحیثیت قائم مقام جملہ اقوام گروہ و فرقہائے رعایا ہند کے ویررائل ہائنس شاہزادہ اور شاہزادی بیگم ویلز کے ورود ہند پر اپنا ناچیز اور خیر خواہانہ خیر مقدم عرض کرتی ہے ویررائل ہائنس باشندگان ہند کی نسبت جس تلطف آمیز خوش خیالی کا اظہار فرمایا ہے کانگرس نے اسکا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اُسے یقین ہے کہ جو ذاتی معلومات اس سفر میں حاصل ہوئی ہیں

ان سے اس مربیانہ توجہ میں جو باشندگان ہند کی طرف مبذول ہے اور ترقی ہوگی کانگرس بہت جوش کے ساتھ یہ امید رکھتی ہے کہ ویسرائل ہائنسٹر ازراہ مرحمت اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہند (دام اقبالہ) کے جناب میں اس کانگرس کی دلی التجا پیش کردینگے کہ جو اصول حکمرانی ملکہ مرحومہ کے اعلان میں قائم کئے گئے ہیں وہ اس ملک کی گورنمنٹ میں داخل کئے جائیں"۔ یہ وفادارانہ رزولیوشن ایسا ہے جس سے تمام مسلمان صدق دل سے نہ صرف کانگرس کے ہمزبان ہوسکتے ہیں بلکہ ہمزبان ہیں ہاں اُسکا پچھلا حصہ "خوش آئند" رزولیوشن میں بے موقع ہے اگر اسکی ضرورت ہی سمجھی گئی تھی کہ حضور صاحب عالم سے التجا کی ہی جائے کہ حضور قیصر ہند دام اقبالہ کی درگاہ میں یہ گزارش پیش کریں تو اسکو جدا گانہ رزولیوشن بناکر پاس کرنا تھا اس حصے کے شامل ہوجانے سے رزولیوشن کا لطف جاتا رہا جس کی بنا محض وفاداری سمجھی جاتی اگر یہ حصہ نہ ہوتا۔

بنارس کانگرس کا دوسرا رزولیوشن یہ ہے "اس کانگرس کی رائے میں وہ وقت آگیا ہے کہ سپریم اور پراونشل کونسلوں میں اصلاح کیجائے، تاکہ وہ ملک کا بہتر قائم مقام ہوسکیں اور غیر سرکاری ممبروں کو معاملات ملکی میں واقعی اور حقیقی مداخلت حاصل ہو۔ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ غیر سرکاری اور منتخب شدہ ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے اور انہیں اختیار دیا جائے کہ ان مسائل پر جو اونکے روبرو پیش ہوں کونسل کو اظہار رائے پر مجبور کرسکیں حاکم اعلیٰ مجاز ہو کہ کونسل کی کسی فیصلہ کو مسترد کردے" یہ رزولیوشن صرف ایسے الفاظ کی ایزادی کا محتاج ہے جس سے مسلمانوں کا نسبتی حق ممبری محفوظ ہوجائے جسکے بعد مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس تجویز کی تائید کریں۔

تیسری تجویز جسکی کانگرس سفارش کرتی ہے متعلق صیغہ آبکاری ہے مسلمان کانگرس کی تائید میں اس سے بھی بڑھکر اگر منظوری کی امید ہو تو یہ خواہش کرسکتے ہیں کہ ان مخرب اخلاق اشیاء کا ہندوستان سے وجود ہی مٹا دیا جائے۔ ورنہ کم از کم کانگرس

کے رزولیوشن کی سفارشیں تو منظور ہی کیجائیں۔

۲ چوتھے رزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں "اس کانگرس کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ باشندگان ہند کو ملک کے انتظام اور نگرانی میں زیادہ حصہ دیا جائے۔ اور یہ غرض اسطرح حاصل ہوسکتی ہے کہ (الف) ہندوستان کے ہر صوبے کو اختیار دیا جائے کہ برٹش ہاؤس اوف کامنس میں کم از کم دو ممبر بھیجیں (ب) کم از کم دو ہندوستانی جن کی لیاقت اور تجربہ مسلم ہو سکرٹری اوف اسٹیٹ کی کونسل میں ممبر مقرر کئے جائیں (ج) گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوں اور اسیطرح گورنران مدراس اور بمبئی کی کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی مقرر ہو" اسمیں بھی ایسی ترمیم کی ضرورت ہے جس سے مسلمانوں کا نسبتی حق محفوظ ہوسکے ورنہ بغیر اس ترمیم کے مسلمان اس تجویز کے عمل میں آنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۳ پانچویں تجویز بعینہ بمبئی کانگرس کی پہلی تجویز ہے جسکے متعلق بلحاظ فوائد مسلمانان ہماری بھی پہلی رائے ہے کہ یہ تجویز ایسی صورت میں مسلمانوں کے مفید مطلب ہوسکتی ہے کہ اسمیں ضمن (ب) کے ان الفاظ کے آگے "اعلیٰ خدمات پر ہندوستانی مقرر کئے جائیں" یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں "بلحاظ نسبت آبادی ہندو مسلمانوں کا خیال کرتے ہوئے" اس اضافہ کے بعد مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس تجویز کی تائید کریں۔ ہم یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو رعایتاً ملازمتیں دیجائیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل آدمیوں کو جگہ ملنی چاہیے اور اگر امتحان مقابلہ کے ذریعے سے کوئی ملازمت ملے تو اسمیں شریک ہونے کا بھی مسلمانوں کو موقع ملنا چاہیے یعنی امیدواروں کا امتحان اسطریقے سے نامزد کئے جائیں جسمیں مسلمان کی نسبتی جگہ محفوظ رہسکے اگر مسلمان اُس تعداد سے کم کامیاب ہوں تو اور مسلمانوں کو شرکت امتحان کا موقع ملنا چاہیے تاکہ مسلمانوں کی جگہیں بھر جائیں یا لائق مسلمان دستیاب نہ ہوں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ

لوکل کانگرس میں طے ہونا چاہئے" مگر ابھی نصف سے زیادہ ایسے صوبے ہیں جنمیں لوکل کانگرسیں ندارد ہیں پھر آل انڈیا کانگرس میں اسکی چارہ جوئی نہ کیجائے تو کیا کیا جاوے ہماری (مسلمانوں کی) حقوق ملازمت تو اب سلب ہو رہے ہیں لوکل کانگرس بننے کا انتظار کریں تو کیسے ایک بدرالدین طیب جی صاحب رہگئے تھے اب ہندوستان کی ہائی کورٹوں میں مسلمانوں کا عنصر رہگیا آخر کیوں کانگرس اس جانب توجہ نہیں کرتی کیا بمبئی کلکتہ الہ آباد میں ایک بھی اس قابل مسلمان نہیں ہے جسکو بنچ پر بیٹھنے کی قابلیت ہو؟ نہیں نہ صرف بار میں بلکہ سرکاری ملازموں میں اب بھی بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو بنچ میں بیٹھنے کی پوری لیاقت رکھتے ہیں لیکن اُن کی کہنے والا کوئی نہیں ہے۔

۹۔ چھٹے رزولیوشن کی تائید مسلمانوں کو کرنی چاہئے وہ ضروری اور مفید ملک تجویز ہے جسکا نسبتاً فائدہ مسلمانوں کو بھی پہونچیگا اور وہ تجویز یہ ہے "یہ کانگرس گورنمنٹ کی اس کارروائی کی قدر کرتی ہے کہ اس نے گزشتہ پارچ میں بجٹ کا ایک حصہ ان امور پر صرف کیا جن کی کانگرس نے سفارش کی تھی۔ مگر ساتھ ہی کانگرس کی یہ رائے ہے کہ جو مالی سبکدوش ادا کنندگان ٹیکس کو دیگئی ہے وہ بہت ہی ناکافی ہے اور کانگرس کو افسوس ہے کہ گزشتہ بجٹ سے فائدہ اُٹھا کر فوجی اخراجات بہت بڑھا دئے گئے ہیں بعض محکموں میں یورپین افسروں کی تنخواہوں میں ترقی کی گئی ہے اور بہت سے نئے عہدے انکے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ کانگرس باصرار یہ درخواست کرتی ہے کہ آئندہ جو بجٹ ہو وہ ٹیکسوں کے کم کرنے میں صرف کیجائے اور بعد ازاں ایسے کاموں میں صرف ہو جس سے بلاواسطہ باشندگان ہند کو فائدہ پہونچے مثلاً سائنٹیفک صنعتی زراعتی تعلیم کا ہونا قائم کیا جانا طبی امداد میں آسانی پیدا کرنا میونسپل اور لوکل بورڈوں کو مدد دینا کہ اشد ضروری انتظامات حفظان صحت کی اصلاح اور ترقی وسائل آمد و رفت وغیرہ میں صرف کر سکیں۔

۱۰ ساتویں تجویز جسکو بنارسی کانگرس نے منظور کیا ہے یہ ہے۔ (الف) یہ کانگرس بہت وثوق سے اپنے اعتراض کا اعادہ کرتی ہے کہ فوجی اخراجات کی مسلسل ترقی غیر ضروری غیر منصفانہ اور باشندگان ہند کے حد برداشت سے باہر ہے (ب) یہ کانگرس صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ اس ملک کے فوجی اخراجات صرف اسی ملک کے فوجی ضروریات اور اغراض پر لحاظ کرکے قرار نہیں دیے جاتے بلکہ مشرق میں برٹش پالیسی کے خیالات بھی مدنظر ہوتے ہیں اسلئے انصاف یہ ہے کہ ایک مناسب حصہ اس خرچ کا خزانہ انگلستان اور کل سلطنت کو برداشت کرنا چاہیے نہ یہ کہ سارا خرچ سلطنت کے ایک ہی حصہ پر ڈالدیا جائے جو سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ اس بوجھ کے برداشت کرنیکے ناقابل ہے ہم اب بھی اس اصول کو نادان کی دوستی کہینگے کہ فوجی ترقی روکنے کی سرکار کو صلاح دیجاے اور فوجی اخراجات کی مسلسل ترقی "غیر ضروری" بتائی جائے جبکہ دیگر ایشیائی طاقتیں جو بزعم خود ہندوستان پر ناحق شفیع سمجھتی ہیں پہلے سے زیادہ طاقتور اور زبردست ہو گئی ہیں جاپانی کو تمام دنیا خطرے کی نظر سے دیکھتی ہے ہاں اسمیں شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان فوجی طیاری کا بار غریب ہندوستان کے خزانے پر ڈالنا ضرور نامناسب ہے خاص کر جبکہ ان اخراجات کی بیشی کی حقیقی غرض ایشیا میں برٹش تفوق ہے تو لازم ہے کہ خزانہ انگلستان بھی اس خرچ کے بڑے حصے کا متحمل ہو۔

۱۱ کانگرس بنارس کا آٹھواں پاس شدہ ریزولیوشن "ہندوستانی تارکان وطن ساکن جنوبی افریقہ کی حفاظت حقوق" کے متعلق ہے۔ مسلمانان ہند کو اسکی پوری طور پر تائید کرنی چاہیے۔

۱۲ جبکہ لارڈ ڈفرن کے سے والسرائے جنہوں نے اپنے دوران حکومت میں کانگرس کی بیخ کنی کو اپنا فرض اعلیٰ سمجھ لیا تھا اس بات کے اعتراف کرنے سے گریز نہ کرسکے کہ جڈیشل اور ایگزیکٹو اختیارات کی علیحدگی کانشنل کانگرس نہایت مناسب مشورہ

دیتی ہے اور جبکہ آئے دن اس گڈمڈ اختیارات کے چکر میں ہندو مسلمان دونوں بعض اوقات نقصان اُٹھاتے رہتے ہیں پھر کیوں مسلمان بنارس کانگرس کی نویں فصل شدہ تجویز کی تائید سے چشم پوشی کرینگے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایگزیکٹو اختیارات کو جڈیشل اختیارات سے پوری پوری طرح پر جدا کرنیکی فوری ضرورت ہے۔

۱۳ اصلاح پولیس کا رزولیوشن بھی جو کہ ۱۹۰۵ء کی کانگرس نے پاس کیا ہے ٹھیک ہے

۱۴ کانگرس کی تجویز متعلق تقسیم بنگال یہ ہے "یہ کانگرس اس امر پر اعتراض کرتی ہے کہ تمام صوبے کے ایسی سخت مخالفت کے باوجود تقسیم بنگال عمل میں لائی گئی بدیں خیال کہ تمام بنگالی قوم میں ان کے صوبے کی تقسیم کے سبب سے سخت ناراضی پھیلی ہوئی ہے اور وہ اس تقسیم کو مکمل بے عدلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کانگرس گورنمنٹ ہند اور سکریٹری آف سٹیٹ سے اپیل کرتی ہے کہ وہ موجودہ انتظام کو بدل دیں یا اسمیں کچھ ایسی ترمیم کریں کہ عام رائے کو طمانیت حاصل ہو اور جو اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ کم ہو۔ یہ کانگرس عرض کرتی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے انتظامی خوبی بھی قائم رہے اور تمام بنگالی قوم ایک حکومت کے تحت میں رہے" جبکہ یہ بات عملاً ثابت ہو گئی کہ تقسیم بنگال سے مسلمانان بنگال کو بلحاظ اُن کے شمول گورنمنٹ سروس یا کسی اور لحاظ سے زیادہ فائدہ نہیں ہوا اور جبکہ مخالفت تقسیم میں مسلمانوں کے نام بھی چائے جاتے ہیں پھر مسلمانوں کو اس تجویز کی تائید میں کوئی بڑا حرج نہیں معلوم ہوتا لیکن دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو مسلمان باشندگان بنگال کی رائے کے تابع ہونا چاہیئے۔

۱۵ کانگرس کا بارہواں رزولیوشن یہ ہے کہ یہ کانگرس اپنا سچا اور پُرزور اعتراض حکام کی اُن جابرانہ کارروائیوں پر پیش کرتی ہے جو اُنہوں نے بنگال میں اختیار کی ہیں۔ باشندگان بنگال کے پاس جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو اُنھوں نے غیر ملکی مال کے خلاف ہڑتال

کی کیونکہ یہی ایک باضابطہ اور بااثر ذریعہ اُنکے پاس باقی رہگیا تھا جس سے وہ برٹش پبلک کے خیالات کو گورنمنٹ کی تقسیم بنگال کے مصمم ارادہ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جو اُس نے اشتدادِ کی عالم گیر استدعا کے خلاف اختیار کیا تھا" افسوس اور تعجب ہوتا ہے کہ نیشنل کانگرس کا سا مجمع جو اعلیٰ درجے کے عقلا تعلیم یافتہ، مہذب۔ متین۔ سمجھدار اور تعلیم یافتہ جوٹی کے ہندوستانیوں کا ایک گروہ ہونیکا مدعی ہے اُس نے یہ تجویز پاس کی! کیا اس تجویز کے الفاظ میں متانت پائی جاتی ہے؟ کیا اس تجویز سے کانگرس کی وقار پر خراب اثر نہیں پڑتا ہے صرف بحیثیت مسلمان ہونیکے بلکہ بحیثیت صرف ایک ہندوستانی ہونیکے کسی ہندوستان کے باشندہ کو اس تجویز کی تائید کا مشورہ ہرگز نہیں دونگا۔ اس تجویز کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ سودیشی کی سی مقدس اور مفید تحریک کی بنا نیک نیتی اور ملکی مفاد پر نہیں ہے بلکہ محض ہٹ دھرمی اور ضد پر ہے جو تقسیم بنگال کے باعث پیدا ہوئی ہے جسکا صاف نتیجہ یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ تقسیم بنگال کی تجویز کو واپس لے لے تو ہماری عارضی الفت دیسی صنعت سے رخصت ہو جائیگی کیا کوئی بھی خواہ ملک اتنا عظیم الشان نقصان گوارا کریگا! مسلمان یہی تو کہتے ہیں کہ کانگرس کو اپنی تجاویز میں اعتدال سے باہر نہیں ہو جانا چاہیے اور متانت اور بردباری کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہیے۔ ایسی تجاویز سے کانگرس کے مجمع کی نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر مہذب ممالک میں خفت اور سبکی پیدا ہونیکا اندیشہ ہے جس سے ہر بہی خواہ ملک کو رنج اور افسوس ہوگا۔ کاش صرف اس تجویز کا ابتدائی جز کانگرس میں پیش ہوتا۔ ہم اہل کانگرس سے چاہتے ہیں کہ وہ آیندہ جلسۂ کانگرس میں اس تجویز کو واپس لیں

۱۶ کانگرس کا تیرھواں رزولیوشن کانگرس کی تاریخ میں جہانتک ہماری یاد کام کرتی ہے اپنی قسم کا پہلا رزولیوشن ہے جسکے الفاظ یہ ہیں "اس کانگرس کی رائے ہے کہ جو پانچ روز کا قرنطینہ حاجیوں پر بمبئی میں لگایا جاتا ہے وہ بلا وجہ کی زحمت ہے

اور علاوہ وقت کے بے اطمینانی پیدا کرنیکا باعث ہے۔ قانون بین الاقوام کے رو سے دس
روز کا قرنطینہ کا مران میں ہوتا ہے اسلئے کانگرس کی رائے ہی کہ جو قرنطینہ بمبئی میں
ہوتا ہے وہ یک قلم موقوف کیا جائے۔ یہی وہ تجویز ہے جسکے باعث مسلمان کانگرس
کی جانب کن انکھیوں سے دیکھنے لگے ہیں اور کانگرس کی توجہ مسلمانوں کی ایسی ضروری
خواہش کی جانب مبذول ہونے کو نظر استحسان سے دیکھ رہے ہیں۔ خواہ البشیر کتنے
ہی غیض و غضب کا اظہار کرے اور ملا عبد القیوم کے سے واجب التعظیم اور قابل ادب
بزرگ کی شان میں کیسے ہی نا ملائم الفاظ کا بیجا طور پر استعمال کرے لیکن درحقیقت
ایسے ضروری مسئلے کی جانب کانگرس کی توجہ منعطف کرانے سے ملا صاحب موصوف نے
نہ صرف مسلمانوں کی گردنوں کو مرہون منت کیا ہے، بلکہ خود کانگرس پر بڑا بھاری احسان
کیا ہی جسکو بتایا ہی کہ اس قسم کی مسلمانوں کی حاجات ہیں جن کی طرف اگر کانگرس اپنی
توجہ منعطف کرتی رہے تو ایک حد تک مسلمانوں کو اپنا بنا سکتی ہے، گو ملا عبد القیوم
صاحب نے حجاز ریلوی کے فنڈ جمع کرنے میں اپنی زندگی وقف کرکے جائز طور پر گروہ
لیڈران قوم مسلمانان میں اپنا نام پیش کیا ہے لیکن حاجیوں کی تکالیف کی طرف
متوجہ ہو کر برخاستگی قرنطینہ کی تجویز کانگرس میں پیش کرکے اپنی عزت و وقار کو نہ صرف
مسلمان پبلک میں بلکہ تمام ہندوستان کی قوموں کی نظر میں دوبالا کر دیا ہے ہمارے
عنایت فرما البشیر اگر بمبئی میں ہوتے اور حجاج کی تکالیف کا حال اپنی آنکھوں سے
دیکھتے تو یقین ہی کہ ملا عبد القیوم صاحب کی اور ہمت بڑھاتے۔ بہر حال ہم ملا صاحب
کے دل سے ممنون ہیں جو ایسی ضروری تجویز کے کانگرس میں پیش ہونے کے باعث
ہوئے اور آنریبل مسٹر پارکھ اور دیگر ممبران کانگرس کی بھی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں
نے مبتلائے مصیبت غریب حجاج کی دردناک حالت کی جانب اپنی عادل گورنمنٹ
کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی اور اوسکو سچے اور اصلی واقعات سے آگاہ

کیا ہم نہ صرف اس تجویز کی تائید کرتے ہیں بلکہ ادب اور عاجزی کے ساتھ گورنمنٹ عالیہ سے استدعا کرتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو مسلمانوں کو ان تکالیف سے نکالے اور نہ صرف بمبئی بلکہ کل ہندوستان سے قرنطینہ موقوف کرکے مفلوک حجاج کو دلال اور شقی القلب لٹیروں کی دست برد سے نجات دے۔

۱۷ بنارس کانگرس کی چودھویں پاس شدہ تجویز صرف ایک الفاظ کی زیادتی کی محتاج ہے جس سے بوقت انتخاب پنجاب مطلوبہ سیع شدہ کونسل میں مسلمانوں کی تعداد اُن کی نسبت سے کم نہ ہو سکے ایسی ترمیم کے بعد مسلمان ضرور اس تجویز کی تائید کرینگے

۱۸ افسوس کہ کانگرس کی پندرھویں تجویز پاس کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ہندوستان اپنے واجب التعظیم گرینڈ اولڈ مین کی پارلیمنٹری خدمات سے محروم رہا۔ ہر ایک ہندوستانی کو دل سے متفق ہونا چاہئے اس تجویز کے الفاظ کلیاں و ہیرا لالا حاصل ہیں۔

۱۹ بیشک مسٹر گوکھلے اور لالہ لاجپت رائے ہندوستان کی اُن خدمات کے باعث جو اُنہوں نے پچھلی مشن میں انگلستان جاکر انجام دیئے ہر ہندوستانی کی جانب سے ہزار شکریہ کے مستحق ہیں خصوصاً مسٹر گوکھلے۔ پس ہم ہر مسلمان کو کانگرس کی سولہویں تجویز کی تائید کرنیکا مشورہ دینگے۔

۲۰ کانگرس کی سترھویں تجویز یہ ہے "چونکہ ضرورت ہے کہ کانگرس کی اہم مسائل کی طرف موجودہ وقت میں انگلستان کی ذمہ دار عہدے داروں کی توجہ منعطف کرائی جائے۔ اسلئے یہ کانگرس اپنے پریزیڈنٹ مسٹر گوکھلے کو مقرر کرتی ہے کہ ہندوستان کی وکالت کا کام انجام دیں۔ مسٹر گوکھلے کی قومی خدمات ضرور اُنکا اعتبار ہندوستانیوں کی دلوں میں بڑھاتی ہیں اور یہ تجویز قابل تسلیم ہے۔

۲۱ اٹھارھویں تجویز میں بلحاظ نسبت آبادی ایک مسلمان ممبر کی کمی ہے۔

۲۲ انیسویں تجویز میں ایک جنٹ سکرٹری نواب سید محمد کو ہونا چاہئے تھا۔

۲۳ بیس اکیس اور بائیسویں تجویز ضابطے کی تجویزیں ہیں اور ٹھیک ہیں۔

۲۴ اگر کانگرس ہمارے مذکورہ ترمیمیں اپنی تجاویز میں کردے اور تھوڑی توجہ اور مسلمانوں کی خاص حقوق کی حفاظت کی جانب مائل کردے اور کسی نئی تجویز کے پیش کرتے وقت مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ رکھا کرے تو یقین ہے کہ بہت جلد باہمی اختلاف مٹ سکتا ہے اور مسلمان کانگرس کے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں ہم تو اپنا فرض پورا کر چکے اب کانگرس کے سرگروہ جانیں۔ اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی کے باعث کانگرس کو بہت نقصان پہونچ رہا ہے کانگرس کو اُن کی شکایات کی جانب اپنی توجہ مائل کرنی چاہیے اور اُنکے رفع کی کوشش کرنی چاہیے فقط

محمد موسیٰ خاں دتاوالی ضلع علی گڈھ

انتخاب بیاض

حضرت انور (مولوی بھوپال)

سعدی شیرازی

ساربان آہستہ رو آرام جاں در محمل است | اشتراں را بار بر پشت است ما را بر دل است

شاپور طہرانی

نہ گل چیدم ازیں بستان نہ نام یاسمن بردم | دلی پر درد از غوغای مرغان چمن بردم

فغانی شیرازی

چہ باشد عاشقی خود را بغمہا مبتلا کردن | بصد خون جگر بیگانہ را آشنا کردن

ملک قمی

اگرچہ مجلس مستان تہی ز غوغا نیست | ولیک صحبت شان خالی از تماشا نیست

گل محمد خاں ناطق مکرانی

بکف تیغ جفا باز آں وفا بیگانہ می آید | شفاعت پیشگان رحمی کہ بیرحمانہ می آید

ملا محمد طاہر غنی کشمیری

عاشقاں را جنبش مژگاں چشم بار گشت | عالمی را اضطراب نبض ایں بیمار گشت

حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی

دل گرفتند و ز دلدار نشانم دادند | آنچہ بردند ز من بہتر از انم دادند

ہنر ور خاں عاقل دہلوی

بسکہ میدارد حیا در پردہ محبوب مرا | دیدہ بیگانہ داند مہر مکتوب مرا

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال

افتاد بخو کہ گذرد آں سرو رواں را | من مردہ خوشم زیست مبارک دگراں را

میرزا قلی میلی ہروی

غایت نالہ ہمیں کہ با ایں رسوائی | اگر از یار بپرسند مرا نشناسد

مستورہ کردستانیہ

ہر کس بدلا رائے دارد سر سودائی | تو شوخ پری پیکر آرام دل مائی

شاعرہ نہانی قائنی

ہمچو من بر رخ خوباں نظر پاک انداز | ہر کجا دیدہ آلودہ بود خاک انداز

نہانی اکبر آبادیہ

روز غم - شب درد بے آرام پیدا کردہ ام | دردمندیہا دریں ایام پیدا کردہ ام

شاعرہ نسائی

بعالم ہر کرا بینی دل درد غمی دارد | ز دست غم مثال ایدل کہ غم ہم عالمی دارد

شرر و سرشار

حکیم برہم صاحب گورکھپوری نے اگست و ستمبر کے اردوی معلی میں حیرت انگیز قابلیت و نکتہ سنجی سے شرر و سرشار کا موازنہ کیا ہے جسمیں آپنے حضرت شرر کو ایسا آسمان پر چڑھایا ہے کہ بیچارے سرشار کا نام تک اُن کے مقابل میں لیا جانا روا نہیں رکھتے۔ اُن کے مضمون کا لُب لباب یہ ہے کہ سرشار کا اُردو لٹریچر کے گردن پر کوئی احسان نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ مضمون لکھنے کے قبل حکیم صاحب نے یہ بھی دیکھ لیا ہوتا کہ اُن سے زیادہ قابل نقادوں نے جن میں شیخ عبد القادر بی۔ اے بھی ہیں زبان اُردو میں سرشار کا کیا درجہ قائم کیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اُردو شعرا یا اُن کی شاعری پر ہر صحیح المذاق اُردو دان رائے زنی کر سکتا ہے۔ مگر اُردو ناول پر کچھ لکھنے کی جو ابدہی وہی شخص لے سکتا ہے جو کم از کم انگریزی زبان کے مشہور ناولسٹوں کی تصانیف سے حظ وافی رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی تنقید حکیم صاحب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وقیع ہے۔ علاوہ بریں مسٹر چکبست نے سرشار کے حالات و تصنیفات پر جو تنقید لکھی تھی اور جس نے برہم صاحب کو ایسا برہم کر دیا۔ اُسمیں شرر کا تذکرہ محض ضمناً آیا تھا اُسکے پڑھنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ لکھنے والا واقعات لکھکر اُن پر رائے زنی کرتا جاتا ہے خواہ کسیکو اچھا لگے یا بُرا۔ اُسکا منشا یہ ہرگز نہیں کہ کسیکا دل دکھائے۔ برعکس اسکے حکیم صاحب کے مضمون اوّل سے آخر تک محض دل دکھانیکے لئے اور ایک خداداد قابلیت کے مصنف کو مٹانیکے لئے لکھا گیا ہے۔

مسٹر چکبست کا مضمون تنقیدی تھا۔ اُسمیں سرشار کے محاسن کے ساتھ ساتھ اُنکی معائب بھی روشنی ڈالی گئی تھی مگر حکیم صاحب نے سرشار کی خامیاں تو سب کی سب دکھادیں گو فرضی ہی سہی۔ مگر شرر کو مرفوع القلم سمجھا۔ حالانکہ عوام پر ظاہر ہے کہ آجتک کوئی شخص ایسا نہیں گذرا

جسمیں خوبیونکے ساتھ برائیاں نہ پائی جائیں۔

ہم حکیم صاحب کے کہنے سے اسبات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شرر عربی کے فاضل علامہ فارسی کے عالم اجل۔ اور ہندانی میں یگانہ روزگار ہیں۔ اُنکو متعدد السنہ یورپ پر بھی عبور حاصل ہی ڈکشنری کی مدد سے ترجمے کرسکتے ہیں اور اردو نثر میں تو ایک نئے رنگ کے موجد اور موجودہ لٹریچر کے بانی ہیں۔ اور کوئی اُنکے گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ برعکس اسکے غریب سرشار فارسی میں کچا اور عربی میں امّی محض ہے۔ تاریخ جغرافیے اُسکو مطلق مس نہیں۔ اور السنہ یورپ کا کیا ذکر۔ اردو میں بھی کافی دستگاہ نہیں رکھتا۔ مگر ہمکو اسوقت ان بزرگواروں کی ذاتی کمالات سے بحث نہیں۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ فسانہ نگاری کے میدان میں کس کا قلم طاقت بہتر ہے۔ اور اس فن سے کون زیادہ ماہر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ناول نویسی اور بات ہے۔ اور فاضل ہونا دوسری بات۔ بعینہ اُسیطرح جیسے شاعری کا حال ہے۔ گولڈ سمتھ شیلی۔ بائرن کے سے نامی گرامی شعرا اپنے کالج کے رانرہ درگاہوں سے تھے۔ اسیطرح ٹیکری اور ڈکنس علمیت وجامعیت کے لحاظ سے اپنے وقت کے اور علما سے کہیں کمتر تھے۔ مگر فسانے کے آسمان پر یہی دونوں نام تارے ہوکر چمکے اور جو روش اُنہوں نے اختیار کی اور جس رنگ کا اُنہوں نے رواج ڈالا اُسکے مقلد بھی آج مشکل سے نظر آتے ہیں۔

الفاظ "فسانہ" "ناول" ہمکو اُس انوکھے امتیاز کی یاد دلاتے ہیں جو حکیم صاحب نے اُن کے مابین رکھا ہی۔ حکیم صاحب کو معلوم ہوگا کہ ناول انگریزی لفظ ہی اور اگر اُسکا اردو ترجمہ ہو سکتا ہی تو فسانہ ہی۔ لفظی حیثیت سے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ مگر مفہوم کے لحاظ سے البتہ نمایاں فرق ہی۔ ناول اُس فسانہ کو کہتے ہیں جو زمانہ کا جسکا وہ تذکرہ کر رہا ہو صاف صاف چہرہ اُتارے۔ اور اُسکی رسم و رواج۔ مراسم آداب۔ طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے۔ اور مافوق العادت واقعات کو دخل نہ دے۔ یا اگر دے تو اُن کی تاویل بھی ایسی خوبی سے کرے کہ عوام اُن کو واقعہ سمجھنے لگیں

اسی کا نام ہی ناول۔ یا فسانہ بہ طرز جدید۔ فسانہ عجائب۔ یا گل بکاولی۔ یا قصہ ممتاز۔ یا داستان امیر حمزہ۔ یا طلسم ہوشربا۔ یا بوستان خیال سب پرانے ڈھنگ کے قصے ہیں جنمیں جدید فسانہ کی خوبیوں کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں میر امن دہلوی کی مقبول عام کتاب باغ و بہار یا داستان الف لیلہ ایک حد غیر محسوس تک مرقومہ بالا خوبیاں رکھتی ہیں یعنی اپنے زمانہ کی تہذیب پر ایک نہایت دُھندلی روشنی ڈالتی ہیں۔

اس معیار کو پیش نظر رکھکر اگر سرشار کے فسانوں کو دیکھئے تو ایسی کون سی خوبی ہے جو اُنمیں بدرجہ اتم موجود نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اُن کی سب کتابیں اپنے زمانہ کی سچی تصاویر ہیں۔ اگر آج سے سو برس بعد کوئی شخص فسانہ آزاد کا مطالعہ کرے تو اُسکو آج سے پچیس برس پہلے کی تہذیب و روش خیالات و مذاق عامہ کی جھلکیاں صاف نظر آئینگی۔ جو تاریخ کے مطالعے سے۔ چاہے وہ کیسا ہی وسیع و دقیق کیوں نہو۔ ہرگز نہیں نظر آسکتیں۔ طرز تمدن کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسپر سرشار کی زبان نے اپنے انداز سے گلفشانی نہ کی ہو حتیٰ کہ مداریوں کے شعبدے۔ بھانڈوں کی نقلیں، ساقن کے غمزے اور ایسی ہی بیشمار باتوں کی تفصیل میں بھی کمال مصوری دکھایا ہی خلاصہ یہ ہی کہ "تصویر زمانہ" جتنے جزئیات پر حاوی ہے اُن سب پر سرشار کے طلسمی قلم نے جادو طرازی کی ہے۔

برعکس اسکے حضرت شرر کے جو ناول مشہور ہیں وہ کوئی تو صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کا ہی کوئی محمود غزنوی کے حملے کے زمانہ کا کوئی روس و روم کی لڑائی کے وقت کا۔ کوئی اوس زمانہ کا جب مسلمانوں کے قدم اسپین سے اکھڑ چکے تھے۔ الغرض سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لیجاتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اسلئے وہ اُسوقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھے۔ اُن کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہی۔ اور تاریخی معلومات چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہوں ذاتی و عینی مشاہدے کا نعم البدل نہیں کہا سکتیں آلفرڈ لائل جو ایک مستند انگریزی نقاد ہے لکھتا ہے کہ آجتک کسی ناول

نویس کو تاریخی ناول لکھنے میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی اور نہ اُسکا حاصل ہونا ممکنات سے ہے۔ ایک ایسے زمانہ کے خیالات و واقعات کا فوٹو اُتارنا جسکو گذرے صدیاں گذر گئیں سراسر قیاسی امر ہے۔ ہم یہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسی حالتوں میں ایسا ہوا ہوگا۔ یقینی طور پر یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ایسا ہوا۔ جارج الیٹ نے اپنی ساری عمر میں ایک ہی تاریخی ناول لکھا جسمیں اٹلی کا ایک تاریخی واقعہ بیان کیا۔ اور گو کئی ماہ تک اُنہوں نے وہاں کی طرز معاشرت کا مطالعہ کیا۔ اور جتنی مستند تاریخیں وہاں کے کتب خانہ میں دستیاب ہو سکیں اُن کو غور سے پڑھا تاہم رومولا کے نسبت انگریزوں کا خیال ہے کہ وہ واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ سر والٹر اسکاٹ جسکی حضرت شرر نے تقلید کی ہے تاریخی ناولسٹوں کا سرتاج خیال کیا جاتا ہے مگر باوجودیکہ اوسکا تخیل بہت روشن تھا اور قوت بیانیہ نہایت پرزور تاہم اوسکے تاریخی ناول انگریزی مبصرون کی نگاہ میں نہیں جچتے اُسکے رچرڈ یا سلطان صلاح الدین بالکل نقلی معلوم ہوتے ہیں۔ لائل نے صاف صاف لکھدیا ہے کہ اسکاٹ کے صلاح الدین میں بجز ایک دستار کے اور کوئی عربی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ چاہے زبان کا رنگ قدیم بنایئے، چاہے اپنے کیرکٹروں کو پُرانے لباس سے سجایئے، چاہے اپنے سپاہی پُرانے وضع کے اسلحہ سے مسلح کیجیے۔ مگر کسی گذشتہ واقعے کی سچی تصویر کھینچنے میں ہرگز کامیابی نہوگی۔ جب اسکاٹ اور جارج الیٹ کے سے جادو نگار بھی تاریخی ناول کامیابی سے نہیں لکھ سکتے تو حضرت شرر غیر مکمل تاریخوں کی مدد سے جس حد تک ایسے ناولوں کے لکھنے میں سرخرو ہو سکتے ہیں اُسکا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ارسلہ ہے کہ خیال کبھی مشاہدے کا ہموزن نہیں ہو سکتا۔ سرشار نے پہلے ہی سے ان دقتوں کا اندازہ کر لیا اور جس ترغیب میں پڑ کر اوروں نے اپنی محنت رائگاں کی اُس سے محترز رہا حضرت شرر اسکاٹ کی تقلید کے جوش میں بالکل بھول گئے اور وہی غلطی کر بیٹھے۔

مگر جب حضرت شرر کے اُن ناولوں کو دیکھیے جسمیں اُنہوں نے موجودہ سوسائٹی کے مرقعے کھینچے کی کوشش کی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ بہتر ہوا اُنہوں نے تاریخی ناول ہی کو ذریعہ شہرت قرار

دیا۔ کیونکہ خدا نے انکو وہ تصویر نگاری کی قابلیتیں عطا نہیں فرمائیں جسکے بغیر شاہدات کی سچی تصویر کھینچنی امر محال ہی اور تاریخی ناولوں نے اُن کی اس خلقی کمزوری پر پردہ ڈال دیا کیونکہ اگر انہیں یہ قابلیت حد کافی تک ودیعت ہوتی تو اُن کے موجودہ زمانہ کے ناول اُنکے تاریخی ناولوں سے زیادہ شہرت پاتے اور زیادہ مقبول ہوتے۔ الیٹ تھیکرے اور اسکاٹ نے تاریخی ناول لکھے اور وہ مقبول ہوئے مگر اُن کی شہرت کے لئے وہی ناول طرّہ دستار ہیں جنمیں اُنہوں نے اپنے زمانہ کے حالات پر قصے لکھے ہیں۔

افسوس ہی کہ باخبر حضرات بعض اوقات تنقیدیں لکھنے میں جادۂ اعتدال سے ایسے متجاوز ہو جاتے ہیں کہ تنقید کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ہمکو حیرت ہوتی ہے کہ حکیم برہم ساشخص یہ لکھنے کی کیونکر جرأت کر سکا کہ سرشار کے فسانہ آزاد یا اور ناولوں میں کوئی پلاٹ یا کوئی نتیجہ نہیں ہے اور نہ اُنکا کوئی مبحث ہیں اور نہ اونمیں کوئی غرض رکھی گئی ہے یہ کہنا تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شرر کے سب ناول لچر اور پوچ ہیں۔ اس قابل ہی نہیں کہ ان پر نگاہ ڈالی جاوے۔ مگر ایسا کہنے والا حکیم صاحب کو عقل سے خالی معلوم ہوگا۔ ہاں جنکو خدا نے انصاف پسند آنکھیں عطا فرمائی ہیں وہ چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ سرشار کا کوئی ناول نتیجہ یا غرض سے خالی نہیں فسانہ آزاد ہی کو لے لیجئے۔ کیا اسمیں کوئی پلاٹ نہیں؟ آزاد کا محققانہ نگاہیں لیکر گلیوں بازاروں کی خاک چھاننا۔ نواب کے دربار میں ملازمت کرنا بٹیر کی تلاش میں جانا۔ اور بی بٹیاری کے ترہی چتونوں کا شکار بننا پھر حسن آرا کے عشق میں گرفتار ہونا۔ انتہا درجہ کی علو ہمتی کو کام میں لاکر روم کو جانا۔ وہاں شجاعت کے جوہر دکھانا۔ پولینڈ کی شہزادی کے دام میں پھنسنا پھر مظفر و منصور ہندوستان کو واپس آنا حسن آرا کو عقد میں لانا۔ یہ پلاٹ نہیں ہی تو کیا ہے۔ معترض کہیگا کہ پلاٹ ہی تو ضرور۔ مگر بالکل معمولی۔ ہاں بہت درست۔ پلاٹ بالکل معمولی ہے اور وہ بھی سراسر ظاہری باطنی پلاٹ سے ذرا بھی کام نہیں لیا گیا مگر واضح رہے کہ ناول نویسی کے فن کی معراج یہی ہے کہ سادہ اور معمولی بندشوں

رنگینی اور جادو نگاری کی بنا ہے۔ جارج الیٹ کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے ناولوں کے پلاٹ کبھی بیان نہیں کیا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر یہ عرض کرنا اور بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ناول کے لئے ہر دو قسم کے پلاٹ کی اشد ضرورت ہے بلا اسکے قصہ چل ہی نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناولوں کے لئے جنمیں سوسائٹی کے مرقعے دکھائے جاویں اکثر اوقات پلاٹ اشخاص قصہ کو اس گھر سے اس گھر اور اس شہر سے اس شہر لیجانے ہی پر ختم ہو جاتا ہے تاکہ مصنف کو سوسائٹی کے ہر ایک پہلو پر قلم زنی کا موقعہ ملے۔ چارلس ڈکنس کی مقبول تصنیف پک وک پڑھئے اور اس کلام کی تصدیق کیجئے ایسے ناولوں کے پلاٹ عموماً ظاہری ہوا کرتے ہیں۔ اسپر سرشار نے یہ کمال کیا ہے کہ آزاد کے قصہ کے ساتھ ساتھ شہزادہ ہمایوں فر اور بی اللہ رکھی کا قصہ بھی لکھا ہے۔ تاکہ ناظر کا دل ایک ہی قصہ پڑھتے پڑھتے گھبرا نہ جاوے۔ اسکے علاوہ وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے عیوب دلکش پیرائے میں دکھاتا گیا ہے۔ جنکا سلسلہ قصہ سے نہیں ملتا اور مصنف کی یہ نیت تھی۔ ناظرین جانتے ہیں کہ فسانۂ آزاد اخبار کی صورت میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اور اس سرخی سے کبھی کبھی ایسے مضامین بھی نکلا کرتے تھے جنکا تعلق قصہ سے نہیں ملتا۔ اور گو اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے مگر پروپرائٹروں نے کبھی اتنی تکلیف گوارا نہ کی کہ ان مضامین کو فسانۂ آزاد سے علیحدہ کرا دیں تاکہ قصہ مسلسل ہو جائے۔ اور اوسکی روانی میں کوئی امر حارج نہو۔ علاوہ فسانۂ آزاد کے سرشار کے تین ناول اور ہیں جو مقبولیت کا زیور پہن چکے ہیں۔ یعنی کامنی۔ سیر کہسار اور جام سرشار ان تینوں کتابوں میں پلاٹ کا وہی رنگ اور طرز ہے جو فسانۂ آزاد کا ہے کسیقدر زیادہ سلجھا ہوا۔ روزمرہ کے واقعات ایسی ظریفانہ لطافت کیساتھ لکھے گئے ہیں کہ ناظر صفحے کے صفحے پڑھتا جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا شخص جسنے وہی دماغ اور وہی دل نہ پایا ہو ایسے خشک معمولی واقعات میں ایسی رنگینی اور دلچسپی نہیں پیدا کر سکتا ایسے پلاٹ کو دلچسپ بنانا جسمیں حیرت انگیز واقعات کی چاشنی ہو مقابلتہً کہیں آسان ہے جسطرح نظم میں سہل ممتنع کہنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اسی طرح فسانہ نگاری میں بھی روکھے

پیکے مضامین میں حلاوت پیدا کرنا بعضوں ہی کا حصہ ہوتا ہے۔

اب ہم حکیم برہم صاحب کے ریمارک کے دوسرے حصہ پر آتے ہیں جسمیں اُنہوں نے فرمایا ہے کہ سرشار کے ناولوں میں نہ کوئی غرض ہے نہ مبحث جتنا ہی اسپر غور کرتے ہیں اُتنا ہی پس وپیش ہوتا ہے کہ ایا اسپر ہنسیں یا سنجیدگی سے جواب دیں۔

سرشار نے اُن معاشرتی امراض کے معالجے کا بیڑا اُٹھایا تھا جنکے پنجے میں پھنسکر سوسائٹی جاں بلب ہو رہی تھی۔ اور دیگر تجربہ کار اطبار کی طرح اُسنے بھی تلخ۔ بدمزہ دوائیں قند وعسل میں گھول کر پلائیں۔ اہل بصیرت پر روشن ہے کہ قبائح کے انسداد کا کوئی آلہ ایسا کارگر اور با اثر نہیں ہے جتنا کہ تضحیک کا تازیانہ۔ اور سرشار نے بڑی بیرحمی سے ایسے تازیانے لگائے ہیں۔ بیخبر پڑھنے والا غلطی سے سمجھتا ہے کہ مصنف ہمکو ہنسا رہا ہے مگر ارباب بینش خوب جانتے ہیں کہ ؎ رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے۔ شلار وینیو کیٹ اور سلاربخش جو تو وہ ظرافت بنائے گئے ہیں۔ اُس سے صرف وکلار کی کثرت اور اُن کی بیوقعتی کا خاکہ اڑانا مقصود ہے اور اُس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کور باطن حضرات بھولی بھالی عورتوں کو کیسی کیسی ظاہرداریوں سے دام فریب میں لایا کرتے ہیں ڈکنس نے بھی سر جنٹ بزفز کے پردہ میں وکلار کی خوب خبر لی ہے۔ مگر سرشار کی بیباک ظرافت ڈکنس کے متین طنز سے زیادہ موثر ہے۔ علیٰ ہذا الی اللہ رکھی کا اپنے کھوسٹ شوہر کے نام خطوط لکھوانا اُن خبر لفس بوالہوس بوڑھوں پر حملہ ہے جو قبر میں پانوں لٹکائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ مگر کم سن عورتوں سے شادی کرنیکے مشتاق۔ بلکہ بوڑھاپے کے زمانے میں اپنی خبر گیری وخانہ داری کے لئے شادی کرنا امر لازمی خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح نواب کے دربار گہربار کا جو خاکہ کھینچا ہے اُس سے وثیقہ خواروں کی سادہ لوحی اور اُن کے مصاحبوں کی عیاری دکھانی مدنظر ہے۔ اور تمام سرشار رتو اول سے آخر تک شرابخواری کے نتائج بد سے عبرت دلانے پر وقف کر دیا گیا ہے۔ کامنی ایک حیا پرور۔ وفادار شوہر پرست بیوی کی اعلیٰ

ترین مثال ہے اور جس آرا کا قومی جوش جو انسانیت پر غالب آگیا ہے سن نا سنگیل کے لئے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سرشار کے جتنے ناول ہیں وہ انسان کے خیالات و حرکات نیک و بد و بدبات اعلیٰ و ادنیٰ کی سچی تصویریں ہیں جنپر ظرافت کا شوخ رنگ نہایت خوشنما و نظر فریب معلوم ہوتا ہے اور ایسا کوئی واقعہ نہیں جسکو سرشار نے اپنی کتابوں میں بلا ضرورت لکھ دیا ہو یہاں پر یہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات کسی واقعے کا بیان کرنا بجائے خود ایک نتیجہ ہوتا ہے۔

مگر غالباً حکیم صاحب اپنے نتیجوں کو نتیجہ نہ خیال فرمائیں گے اُنکے نزدیک اُس ناول کے شیشے میں نتیجہ عرض اور بہت بھرے ہوتے ہیں جسکے لیبل پر اس قسم کی کوئی عبارت نہ ہوتی ہو اس ناول میں پردہ کے نتائج بد دکھائے گئے ہیں یا اُس ناول میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ناپسندیدی کی شادیاں ہمیشہ بُرے انجام کو پہونچتی ہیں یا اس ناول میں مذہبی لڑائیوں کا جوش و خروش اور باہمی تنازع مذہبی کے خوفناک نتیجے بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حضرت شرر اور اون کے مقلدین عاشق حسین صاحب لکھنوی حوم اور مولوی محمد علی صاحب مرتع عالم کے کل ناولوں کے ٹائٹل پیج پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت ضرور ملتی ہے۔ گویا ناول نہ ہوئے۔ کوئی فلسفہ کی کتاب ہوئی جسمیں کسی نہ کسی تیوری کو قائم کرنیکی ضرورت ہو اسطرح نتیجہ نکالنا چاہے ایسے قصوں کے لئے جائز قرار دیا جا سکے مگر اعلیٰ درجے کے ناولوں کے لئے ہرگز شایاں نہیں ہے لطف تو جب ہے کہ نتیجہ سرتاسر آمد ہو اور ایک بیساختہ پن کے ساتھ ناظرین کے دلوں میں کھب جائے کسی قصے کے سرنامے پر اُسکا مقصد لکھا ہوا دیکھکر ہمکو اُسکے پڑھنے کی خواہش نہیں باقی رہجاتی انگریزی میں شاید ہی کوئی ناول ایسا ہوگا جسمیں ایسے مذموم طریقے سے نتیجے دکھائے گئے ہوں بلکہ اسکر براؤننگ نے تو علانیہ کہدیا ہے کہ

"ناولس ہو دا اے نند لسی آر دی ورسٹ کلاس آف ناولس"

ادنیٰ ترین ناول وہ ہیں جنہیں کوئی خاص مبحث رکھا جائے اور اُسنے بہت درست کہا ہے۔ کیفیات وجذبات انسانی ومناظر قدرت ودنیا کے کرشموں کی تصویر کھینچنا بجائے خود ایک نتیجہ سائنس یا فلسفہ کے نکتے حاصل کرنیکے لئے ناول نویس بنایا ہی نہیں گیا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ فلسفی کبھی ناول لکھ ہی نہیں سکتا۔

پلاٹ سے گذر کر جب اُن کیرکٹروں کو لیجئے جو ناول کے اسٹیج پر ایکٹ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے ناولوں میں خاص خاص کیرکٹروں کے عادات اطوار وروش خیال میں ایک نہ ایک خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اور یہی خصوصیات مختلف موقعوں اور مختلف حالتوں میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے ادنےٰ درجے کے ناولوں میں یا تو کیرکٹر معمولی سیدھے سادے انسان ہوتے ہیں۔ یا اُن کی خصوصیات قومیت سکونت۔ پیشہ یا چند فرسودہ اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی ناول اُردو میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ بنگالی جب آئیگا اپنے بودے پن کا ثبوت دیگا مارواڑی ہمیشہ بخل وخست کا پتلا بنایا جاتا ہے۔ لالہ صاحب بیچارے ہمیشہ اپنی خانہ ساز فارسی بولتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں۔ راجپوت ہمیشہ اکھڑ۔ اور تند مزاج ہوتا ہے۔ ہندو اور بھاٹیہ ہمیشہ آٹھوں پہر دانتا کلکل ہوا کرتی ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ اپنی عبر کے فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں۔

مگر یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہیئے کہ مستند ناولسٹ اس قسم کے کیرکٹروں سے کام نہیں لیا کرتے۔ بلکہ واقعی اچھے ناولوں میں ہر دو اقسام کے کیرکٹر موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈکنس کے پک وک کو لے لیجئے۔ اسمیں پک وک وکل۔ سناڈگراس بنب میں۔ وارڈل اور ڈلر میں جو خصوصیات ہیں وہ سراسر امتزاجی ہیں۔ اور پرکر۔ بزفز۔ ڈاڈسن وفاگ پاٹ سنگلس وغیرہ میں جو تفریق کی گئی ہے وہ کسی خاص پیشے کی تضحیک کے لئے علیٰ ہذا اور مثالیں بھی دیجا سکتی ہیں۔

سرشار کے کیرکٹروں کا ذکر کرتے ہوئے حکیم صاحب فرماتے ہیں "صرف تین کیرکٹر ہیں۔ ایک
کا ایک عورت کا ایک مسخرے کا اُن کی عورت چاہے کسی قوم اور کسی ملک کی عورت ہو لکھنؤ
مسلمان عورت ہے علیٰ ہذا القیاس اُنکا مرد چاہے کوئی اور کہیں کا ہو لکھنؤ کا ایک آوارہ
اور بازاری بیفکرا ہے۔ اور مسخرا چاہے کوئی ہو لکھنؤ کا ایک افیونی ہے"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں پر سرشار کے کیرکٹروں کی تقسیم جو تین حصوں میں کی گئی ہے
کس اصول پر کی گئی ہے۔ جنس کے لحاظ سے تو دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مسخرا قسم اول میں
کیا جا سکتا ہے۔ اور سرشار پر کیا موقوف ہے دنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ جب کیرکٹر لائیگا تو
یا مرد ہوگا یا عورت۔ کوئی درمیانی قسم وہ کہاں سے لائیگا اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ان دو
جنسوں کے کیرکٹر سرشار کے ناولوں میں ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں ہوا کرتے ہیں یا نہ
اوچھی نگاہ والوں کو تو وہ بالکل یکساں ہی نظر آتے ہیں۔ مگر جسنے واقعی باریک نگاہ
پائی ہیں وہ دیکھ سکتا ہے کہ جس کمال سے اُنہوں نے اپنے کیرکٹروں میں خصوصیتیں
کی ہیں اوسکی نظیر کم ناولوں میں ملیگی۔ پنڈت بشن نراین صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ
مذاق عامہ ایسا سلیم نہیں ہے کہ سرشار کی باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اور ابھی کچھ دنوں تک
سرشار ایسے ہی حملوں کا شکار ہوا کرے گا۔ مگر جوں جوں مذاق سدھرتا جائیگا۔ سرشار کی
زیادہ ہوتی جائیگی۔

چارلس ڈکنس کی طرح حضرت سرشار نے بھی اعلیٰ اور ادنیٰ ہر دو قسم کے کیرکٹروں
مدد لی۔ یہ بہت صحیح ہے کہ سب کیرکٹر لکھنوی ہیں۔ مگر جب اوس نے سارے قصے لکھنؤ ہی
لکھے تو کیرکٹر کیا لندن سے لاتا۔ ہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ انہیں لکھنؤ کے بیفکروں کی امتیا
خصوصیات کس نفاست سے دکھلائے ہیں۔ مرزا ہمایوں فر بھی لکھنوی ہے اور آزاد
لکھنوی مگر دونوں کے عادات میں بین فرق رکھا گیا ہے۔ اگر آزاد کی جگہ ہمایوں
رکھدیجئے تو قصہ بالکل پلٹ جائے گا۔ نواب صاحب بھی لکھنوی ہیں۔ مگر ہمایوں

سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ مرزا عسکری بی لکھنوی ہیں۔ مگر ہمایوں فر یا آزاد سے اُن کو ملایئے تو مطلق میل نہیں کھاتے۔ اسیطرح حسن آرا۔ جہان آرا۔ سپہر آرا۔ گیتی آرا۔ بہار آرا سب لکھنؤ کی شریف زادیاں ہیں مگر سبھوں کے مزاجوں میں نازک و دقیق خصوصیات موجود ہیں۔ بہار آرا کو بھولکر بھی حسن آرا کا مقام نہیں سمجھ سکتے اور نہ سپہر آرا کو حسن آرا سے ملا سکتے ہیں۔ اسی کو فن ناول کا کمال کہتے ہیں۔

ادنیٰ درجے کے کیرکٹر بھی کثرت سے موجود ہیں۔ مولوی صاحب بے عقلین و بی اللہ رکھی و بی عباسی، حکیم صاحب۔ اور رونیو ایجنٹ وغیرہ وغیرہ ہزاروں اشخاص ہیں جو کسی خاص فرقہ یا خاص پیشے کا مضحکہ اُڑانے کے لئے بلائے گئے ہیں۔

مگر اسکے ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ سرشار جب کبھی اپنے کیرکٹروں کو لکھنؤ سے باہر دور دراز کے مقامات پر لیگیا ہے۔ تو وہاں اُن کو غیر لکھنوی بنانیکا خوب لحاظ رکھا ہے مس میڈا یا مس روزیا پولینڈ کی شہزادی لکھنؤ کی شریف زادیاں نہیں کہی جا سکتیں۔ اسیطرح علیقو پاشا یا قسطنطنیہ کے ہوٹل کا سوداگر لکھنؤ کے آوارہ مشرب اور بازاری بیفکرے نہیں ہیں۔ اب حضرات شرر کے کیرکٹروں کو دیکھئے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ حکیم صاحب نے جو کمزوریاں سرشار میں دکھائی تھیں وہ سب کی سب حضرت موصوف کے کیرکٹروں میں پائی جاتی ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے کیرکٹروں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا۔ کسی کو روم سے بلایا۔ کسی کو عرب سے۔ کسی کو مصر سے۔ کسی کو فارس سے مگر نہ تو اُنکے قومی خصوصیتوں کو اور نہ امتزاجی خصوصیات کو کامیابی سے دکھا سکے۔ اُنکے جتنے ہیرو ہیں وہ سب منچلے غیور۔ خوشرو۔ بلند بالا اور مہذب ہیں بس اگر حسن کے جگہہ ملک العزیز چلا آوے تو وہ بھی اپنا حصہ اُسی خوبی سے ادا کرے گا۔ اسی طرح اُنکے اناث میں بھی یہی نقص موجود ہے عذرا۔ ورجنا۔ اینجلنا۔ فلورنڈا۔ سب کی سب بہ استثنا اسکے کہ غیر قوموں کی عورتیں بتلائی گئی ہیں اور ہر حالت میں بالکل ایک سی ہیں۔ ہم ایک کو دوسری سے تمیز نہیں کر سکتے

اگر عذرا کا حصہ انجلنا کو دیدیا جاوے تو بھی نفس قصہ پر کچھ اثر نہوگا - یہ خامی شرر کے سب ناولوں میں پائی جاتی ہے - اور جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں جس ناول میں ایسی معمولی کیرکٹر پائے جاتے ہیں اُسکا شمار ادنیٰ درجہ کے ناولوں میں ہوتا ہے -

سرشار پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اُسکے سب کیرکٹر لکھنؤ ہی کے مرد و عورت ہیں - پھر اُسمیں ہرج ہی کیا ہے ؟ ایک شہر تو کیا ایک محلے اور ایک کنبے میں مختلف عادات و اطوار کے اشخاص ہو سکتے ہیں - اور ایک واقعی پُرفن فسانہ نگار اُنہیں کے روزمرہ کے حالات میں طلسم کی سی تاثیر پیدا کر سکتا ہے - علاوہ بریں ایک خاص مقام کے مناظر - وطرز تمدن کا تفصیلی مرقعہ دکھانا بجائے اسکے کہ سارے زمانے کے جغرافی نقشے دکھا دئے جاویں کہیں بہتر ہے -

مگر اسکا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ ناول نگاری کا کمال یہی نہیں ہے کہ کیرکٹروں میں صرف خصوصیات پیدا کر دئے جائیں - یہ تو کچھ ایسا مشکل کام نہیں - سچی صناعی تو اسمیں ہے کہ کیرکٹروں میں جان ڈالدی جاوے اُن کی زبان سے جو الفاظ نکلیں وہ خود بخود نکلیں نکالے نہ جاویں جو کام وہ کریں خود کریں - اُنکے ہاتھ پانوں مڑور کر زبردستی اُنسے کوئی کام نکرایا جاوے - اس معیار پر سرشار کے کیرکٹروں کو آزمایئے تو وہ عموماً کھرے نکلیں گے - اُنمیں وہی چلت پھرت ہے جو جیتے جاگتے آدمیوں میں ہوا کرتی ہے - اُنمیں وہی چھیڑ چھاڑ - وہی ہنسی - مذاق - وہی رمز و کنائے وہی غل غپاڑے ہوتے ہیں جو ہم اپنی بے تکلفی کے مجلسوں میں کیا کرتے ہیں - اُن کی ایک ایک بات سے ہمکو ہمدردی ہو جاتی ہے وہ ہمکو ہنساتے ہیں رُلاتے ہیں - چڑھاتے ہیں ستاتے ہیں - اُنکے قہقہے کی آوازیں ہمارے کان میں آتی ہیں - ہمارے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے - اور ہم خود بخود کھلکھلا پڑتے ہیں اُنکے گریہ کی دل ہلا دینے والی صدائیں ہم سُنتے ہیں - اور ہمارے آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آتے ہیں - کون ایسا سنجیدہ شخص ہے جو بُو از عفران - اور خواجہ بدیعا کی لگاوٹ

بازیوں پر ہنس نہ پڑے ایسا کون سنگدل ہوگا جو شہزادہ ہمایوں فر کے قتل کے وقت موثر نہ ہو جائے یا کاسنی کو رنڈاپے کا بلاپ کرتے دیکھکر رونے نہ لگے۔ اور کیرکٹروں کو جانے دیجئے سرشار کا خوجی ہی ایک ایسا غیر فانی مخلوق ہے جو دنیا کی کسی زبان میں اُسکے کمال شہرت کا سکہ بٹھانیکے لئے کافی ہے۔ ماشاءاللہ کیا ہنستا بولتا آدمی ہے۔ صبح ہوئی۔ آپ اُٹھے افیون گھولی۔ حقہ کا دم لگایا۔ ریش پہلکاری۔ اور اپنے ڈنربل کو دیکھتے اکڑتے۔ اپنے زعم میں مست چلے جارہے ہیں۔ جوں ہی راستے میں کسی مہپارہ نازنین کو خراماں خراماں آتے دیکھا وہیں آپ کی باچھیں کھل گئیں۔ ذرا اور اکڑ گئے۔ اُس نے جو کہیں آپ کی وضع و قطع پر ذرا مسکرا دیا تو آپ ریشۂ خطمی ہوگئے۔ گمان ہوا مجھپر عاشق ہوگئیں۔ فوراً مونچھوں پر تاؤ دیا اور مسکرا کر تیکھی۔ بانکی چتونوں سے آس پاس کے آدمیوں کو دیکھنے لگے کہ پانوں میں ٹھوکر لگی اور چاروں شانے چت۔ یاروں نے قہقہہ لگایا مگر کیا مجال کہ حضرت کے چہرہ پر ذرا بھی میل آنے پائے۔ گرد جھاڑی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بس! "او گیدی" کا نعرہ بلند کیا۔ قرولی میان سے نکل پڑی اور چاروں طرف ستھراؤ ہوگیا۔ سر دھڑوں سے الگ نظر آنے لگے اور لاشیں پھڑکنے لگیں۔ شاباش! خوجی تجھکو خدا ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔ تیرے احسانوں سے ایک دنیا کا سر گرانبار ہے۔ تیری قرولی ایسے میٹھے زخم لگاتی ہے کہ کسی کا تیر نیمکش بھی ایسی پیاری خلش نہیں پیدا کرسکتا۔ اور تیرے تیور بدلنے میں وہ تحرا آتا ہے جو کسی معشوق طرحدار کے روٹھنے میں بھی نہیں آسکتا۔ بیشک تو ظرافت کا پتلا اور لطافت کی جان ہے۔

حضرت شرر نے بھی متعدد کیرکٹر ایجاد کئے اور اُنکے ناول مقبول بھی ہوئے مگر اُنکے فرزندان معنوی سے کسی نے بھی ایسی شہرت حاصل کی کہ اُسکا نام ہر شخص کے زبان پر ہو؟ حق تو یہ ہے کہ اُنکی طبیعت میں وہ زور اور جدت جو غیر فانی کیرکٹروں کی خلاقی کیلئے درکار ہے، موجود ہی نہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ جب وہ کسی نئے کیرکٹر کی دعوت کرتے ہیں تو پہلے اُسکا استقبال بڑی گرمجوشی سے کرتے ہیں اور ناظرین سے

اُسکا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ایسے ہیں اور ویسے ہیں آپ کی ذات با برکات صوری و معنوی محاسن کی کان ہے وغیرہ وغیرہ مگر محض اُن کی تمہیدوں سے کیرکٹر میں جان نہیں پڑتی کیونکہ وہ بولتے ہیں تو شرر کی زبان سے اور اُن کی ایک ایک حرکت اُن کی ایک ایک ادا اُن کی ایک ایک بات ثابت کرتی ہے کہ مصنف پردہ کی آڑ میں بیٹھا ہوا کیرکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ہمارے دل میں خود بخود یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ ہم چند بے تکلف دوستوں کی صحبت کا مزہ لے رہے ہیں۔ وہ روئیں ہمکو پروا نہیں۔ وہ ہنسیں ہمکو خبر نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ خیالی ہیں۔

شرر نے عرب۔ عجم۔ فارس۔ ترکستان۔ روس۔ روم۔ علیگڈھ۔ لکھنؤ اور خدا جانے کتنے مقامات کے سین دکھائے۔ مگر اُنکے کسی ناول سے وہاں کی عوام کی طرز معاشرت و طرز خیالات کا پتہ نہیں چلتا۔

سرشار کے جادو کار قلم نے ہمکو لکھنؤ کے گلی کوچوں۔ میلوں ٹھیلوں اور باغ بغیچوں کی سیر ایسی خوبی سے کرادی کہ شاید ہم وہاں خود جاکر اُن کو دیکھتے تو اتنا حظ نہ اُٹھا سکتے ہمکو قدم قدم پر لکھنؤ کے امیر۔ فقیر۔ گنوار۔ عیار۔ بھانڈ۔ ظریف۔ مسخرے۔ ترچھے۔ بانکے شریف۔ وضیع۔ مہذب غیر مہذب بوڑھے جوان۔ غرض ہر رنگ و ہر انداز کے آدمی نظر آتے ہیں وہ ہنستے بولتے ہیں۔ دل لگی مذاق کرتے ہیں ناچتے ہیں گاتے ہیں مگر نہ اسلئے کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ یہ اُنکا روزمرہ کا وطیرہ ہے۔ ہمارا جی چاہے تو ہم بھی دیکھ لیں آسکر براؤننگ نے لکھا ہے کہ ناول نویس میں ان چار دماغی اوصاف کا موجود ہونا ناول کے لئے بمنزلہ اربعہ عناصر ہے (۱) پرروز قوت بیان (۲) ظرافت یا بذلہ سنجی (۳) فلسفہ (۴) ڈراما یا کسی واقعے میں بیساختگی سے تاثیر پیدا کردینا۔ اب سرشار کو دیکھئے تو وہ بجز فلسفہ کے اور تینوں اوصاف سے حصہ وافی و کافی رکھتا ہے۔ اور حضرت شرر اگر ان اوصاف میں سے کوئی رکھتے ہیں تو وہ ایک حد تک فلسفہ ہے مگر وہ فلسفہ نہیں جو انسان کے دل

اور دماغ کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ یا جو نوع انسانی پر وسیع نگاہیں ڈالتا ہے بلکہ وہ فلسفہ جو مذہب اور قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دلوں میں تعصب پیدا کر دینا جس کا خاص الخاص کام ہے۔

یہاں پر ایک ایسے امر کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو بعض اصحاب کو شاید ناگوار گذرے۔ سرشار نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ایک بھی ایسی نہیں کہ جسکو ہندو یا مسلمان یا عیسائی یکساں دلچسپی سے نہ پڑھے۔ وہ سب مذہبی تعصبات سے بری ہیں برعکس اسکے حضرت شرر کے ہیرو تو ہر حالت میں مسلمان ہوتے ہیں مگر ہیروئن کبھی ہندو ہوتی ہے اور کبھی عیسائی حضرت شرر تو فلاسفر ہیں اُنکے ذہن کو کم از کم اتنی رسائی ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ اُس اشتعال کا اندازہ کرلے جو ہندو اور عیسائیوں کے دل میں اُن کی اس بے عنوانی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں میں اتنی حسین و عصمت پرور مستورات نہیں ہیں جنکو ہیروئن بننے کا فخر حاصل ہو سکے۔ غالباً کوئی صاحب فرمائینگے کہ بعض ہندو اصحاب نے بھی ہندو ہیرو سے مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا ہے۔ مگر کیا ضرورت ہے کہ حضرت شرر بھی اُسی غلطی کے مرتکب ہوں۔ ہمنے خود دیکھا ہے کہ اکثر ہندو اصحاب منصور و موہنا کو نفرت و کراہیت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسیطرح جیسے کہ بعض مسلمان اصحاب دُرگیش نندنی کو دیکھتے ہیں عشق و محبت کا یہ رویہ بنایت مذموم ہے۔ کمزور دماغ والے چاہے ان تعصبات کا شکار ہو جائیں۔ مگر ایک مستند شخص کی ذات سے اُن کا ظہور میں آنا نہایت نامناسب ہے ہندوستان میں یہ عام رواج ہے کہ لڑکی کے ہمقوموں یا رشتے داروں اور بھائی بندوں کی وقعت لڑکے والوں کے رشتہ داروں سے کم ہوا کرتی ہے۔ اور عوام میں بھونڈے مذاق والے دوسروں کو اپنا خسر زادہ بنا کر خوش ہوتے ہیں گویا شوہر کا طرفدار ہوا بیوی کے طرفداروں پر غالب ہوتا ہے۔ اکثر اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ لغو بکنے والے شہدے اپنی مست رنگی محبت کا بڑی فخر سے تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت شرر

انہیں ادنیٰ ترین جذبات کا شکار ہو گئے۔ بہت کم ایسے ہندو ہونگے جو اُنکے مدّاح ہوں حالانکہ سرشار کے سامنے سر تعظیم خم کرنے والوں میں اکثر مسلمان اصحاب ہیں یہاں اُن لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو قومی اتحاد کے آڑ میں نفاق کا بیج بوتے ہیں۔ ناول نویس کے لئے رسیلی رنگیلی۔ چلبلی۔ شوقین طبیعت کا ہونا ضروری ہے۔ بجائے اسکے حضرت شرر کو مجتہدوں کا جوش اور ملاؤں کا دل ملا ہے جو اُسکام کے لئے موزوں نہیں۔ کسی آدمی کی قابلیت کی ایک یہ دلیل بھی ہے کہ وہ سمجھ جائے کہ میں کونسا کام بہترین طور پر کرسکتا ہوں۔ سرشار نے اپنی مافی الضمیر کو جانا۔ حضرت شرر نہ جان سکے۔

مگر سب سے بڑا ظلم جو حکیم برہم صاحب نے سرشار پر کیا ہے وہ اُسکے طرز تحریر پر ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس موقع پر بڑی بیرحمی سے انصاف کا گلا گھونٹا گیا ہے۔

اب آج اُس ذی کمال کے اُن حقوق کو جھٹلانا جو زبان اُردو پر قیامت تک رہینگے سراسر تعصب و کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔ کوئی کتنی ہی زباندرازیاں کرے مگر اس امر کو نہیں مٹا سکتا کہ سرشار ہی وہ پہلا طبلاع ہے جسنے انگریزی طرز جدید کے فسانے اُردو میں لکھنا شروع کئے اسکے ساتھ ہی تقلید کے جوش میں یہانتک نہیں بڑھا کہ اُردو زبان اور اُسکے انداز تحریر کو مسخ کردے۔ صرف طرز انگریزی لے لیا۔ یا یوں کہو کہ خاکہ انگریزی لیا اوسپر ہندوستانی رنگ چڑھائے۔ انگریزی ناول کی کوئی خوبی ایسی نہیں جو سرشار کے تصانیف میں نہ پائی جاوے۔ برہم صاحب کہتے ہیں فسانہ آزاد اور فسانہ عجائب کی عبارتوں میں کوئی فرق نہیں ہے ہمکو یقین نہیں آتا کہ حکیم صاحب کے قلم سے یہ ریمارک نکلا۔ جام سرشار سے جو دو اقتباسات کئے گئے ہیں وہ خود اس دعوے کی تردید کرتے ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں پنڈت جی نے سرور کے رنگ میں لکھا ہے مگر یہ اون کا رنگ خاص نہیں ہے۔ بلکہ جہاں کہیں ترچھے بانکے چیلوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں عبارت کی رنگینی و قافیہ بندی پر زیادہ زور دیا ہے اور اسکی اُن کو داد

دینی چاہیئے کہ بیفکروں سے متانت آمیز سنجیدہ گفتگو نہیں کرائی جو بالکل بیگانہ معلوم ہوتی۔ یہ بھی خیال رہے کہ گو ناول نویس کا خاص رنگ ایک ہی ہوتا ہے مگر چونکہ وہ ہر قماش و فیشن کے آدمیوں کو بناتا بگاڑتا رہتا ہے اسلئے اوسکی زبان بھی ہر موقع پر رنگ بدلتی رہتی ہی۔ مثلاً فسانہ آزاد میں جب کبھی حکیم صاحب تشریف لاتے ہیں تو پشتو میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی اُن کی زباں کو سرشار کی زبان بتلایئے تو اُسکا جواب بجز خموشی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے جدت کے معنی سمجھنے میں غلطی کی۔ جدت اس کا نام نہیں ہی کہ انگریزی کے غیر مانوس ترکیبوں۔ بندشوں۔ تشبیہوں اور استعاروں کو بے جوڑ۔ روکھے۔ غیر فصیح ترجمے کر دیئے جاویں۔ جیسا حضرت شرر نے کیا ہے۔ اسی کا نام تو نقالی ہے۔ اسپر طرہ یہ کہ بیچارے سرشار پر نقالی کا الزام اسلئے لگایا ہے کہ وہ اپنے کیرکٹروں سے حسب حال باتیں کرواتا ہی۔ حکیم صاحب پر روشن ہو کہ اُردو فسانہ نگاری میں اسیکو جدت کہتے ہیں۔

حضرت شرر جب کسی ناول کی ابتدا کرتے ہیں تو پہلے سینری کا بیان بڑی طوالت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں ہر باب کے ابتدا میں ایسے ہی بیانات ہوتے ہیں جو قصے کی روانی میں ہارج ہوتے ہیں۔ اور عام پڑھنے والا گھبرا کر اُنکو چھوڑ دیتا ہے۔ حکیم برہم صاحب نے بھی حالی ہی میں ایک ناول لکھا اُسمیں شرر کی تقلید اس حد تک کی کہ نوے صفحے کے ناول میں پچیس صفحوں سے زاید محض سینریوں ہی پر وقف کر دیئے تھے۔ یہ نقص فن ہی۔ یہاں پر اتنا اور عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ہیروئن کی تصویر جو حکیم صاحب نے ہمارے سامنے بڑے فخر سے پیش کی ہے کاٹ چھانٹ کر چند لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔ یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مصنف کسی کیرکٹر کے خط و خال۔ چہرہ مہرہ کا بیان کیسی ہی خوبی سے کیوں نکرے مگر ناظرین کے سامنے جیسی تصویر کھینچنا چاہتا ہے ہرگز نہیں کھینچ سکتا۔ جتنے جدید انگریزی ناول ہیں اُنمیں جسمانی کمالات کا بیان چند لفظوں میں

ختم ہو جاتا ہے۔ اور دماغی اوصاف کا پہلے سے ظاہر کرنا تو اپنے کو ناول نویسی کے اصولوں سے بیگانہ ثابت کرنا ہے۔

یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت سرشار کے رنگ میں لکھنے کی بہتوں نے کوشش کی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ جیسے آزاد کی تقلید محال ہے اسیطرح سرشار کے رنگ میں بھی لکھنا مشکل ہے حالانکہ بعض ناول نگاروں نے شرر سے بالا مار لیا ہے چنانچہ انکے ناولوں کی جتنی قدر ملک نے کی ہے اسکی آدھی بھی شرر کے کسی ناول کی نہیں ہوئی فقط "نواب رائے"

"دیوان شبلی"

تمام دنیا کے لٹریچر کی تحلیل صرف دو اجزاء پر ختم ہوتی ہے "نظم و نثر" عموماً تمام خط و کتابت، تحریر و تقریر، مکالمہ۔ نثر میں کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ذریعہ سے لٹریچر پر من حیث الفن کوئی احسان نہیں ہوتا کیونکہ اسمیں علماء جہلا۔ عوام سب کے سب برابر کے حصہ دار ہیں۔

اسمیں کوئی شبہ نہیں۔ کہ نثر انشا پردازی کے سانچے میں ڈھل کر ایک مستقل فن کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن انشا پردازی بجائے خود ایک تشریح طلب لفظ ہے۔ تمام اہل فن نے بہت سے مرحلے طے کرنیکے بعد انشا پردازی کے جو ضروری اجزاء و ارکان قرار دئے ہیں وہ یہ ہیں۔ تشبیہ۔ استعارہ۔ کنایہ۔ سجع وغیرہ۔ اب خیال کرو کہ اگر کوئی فقرہ اس خیالی سانچے میں ڈھالدیا جائے۔ تو اسمیں اور شعر میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہوگی؟ اس موقع پر موزونیت اگرچہ ذہنی تشخص کا کام دے سکتی ہے۔ لیکن یہ تشخص بھی غالباً اسی زمانہ کے حوادثات میں سے ہے جب کہ منطق نے تمام اہل فن کو جامعیت اور مانعیت کے لفظ سے روشناس کر دیا تھا۔ ورنہ فطرتی طور پر اس جگہ کوئی امر فارق نہیں۔ اثر دلکشی۔ واقعے کی تصویر۔ نشست الفاظ۔ فی الجملہ موزونیت۔ کونسی چیز اس فقرہ میں نہیں۔ اور یہی چیزیں شعر کی علت مادی

اور علت صوری ہیں۔

اس لحاظ سے ہر قوم کا لٹریچر۔ نظم ہی کے دائرہ میں اگر علوم و فنون کا تماشا گاہ ہو سکتا ہے اور آواز کا اثر ہے کہ جو لوگ ادبی معرکوں کے علم بردار رہ چکے ہیں، اُنکے دست کمال میں یہ خوشنما تلوار بھی ضرور تھی۔ فرزدق۔ امرؤ القیس۔ فردوسی۔ نظامی۔ ہومر۔ ملک محمد جائسی۔ شکسپیر اسی اکھاڑے کے نامور پہلوان ہیں۔ مختصر یہ کہ لٹریچر کو اگر علمی نگاہ سے دیکھئے تو اُسکا ریشہ ریشہ، لوازمات شعر کے شکنجہ میں جکڑا ہوا نظر آئے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود ہماری قوم نے لٹریچر کے ساتھ من حیث الفن کیا سلوک کیا۔

آج "حملۃ العلم" کا خطاب نہایت فیاضی کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ اور قدیم طرز تعلیم کے جانداروں کو دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں شمع ادب کو انہیں کی انجمنوں میں ڈھونڈھنا چاہئے۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ علما کے گروہ میں اس شمع کی وقعت چراغ مردہ سے زیادہ نہیں۔ اس بزم میں اُردو۔ فارسی کو نامانوس آواز سمجھ کر چھوڑو۔ لیکن عربی زبان کی حلاوت سے کیوں شکر رنجی ہے۔ لیکن اس سے بھی قطع نظر کر لو۔ صرف مذہبی حیثیت سے کام لو۔ آج اس آواز سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا ہے کہ قرآن پاک معجزہ ہے اور بہت سی تحقیق کے بعد یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اعجاز کی اصلی وجہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہے۔ اس لحاظ سے اس معزز گروہ کا یہ فرض تھا کہ ادبی دنیا کا ذرہ ذرہ چھان ڈالتا۔ اور کلام مجید کے نقطے نقطے کو آفتاب کی طرح چمکا دیتا۔ لیکن ہمارے علماء بذات خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُنہوں نے قرآن مجید کے مقابلے میں شعراء عرب کے کلام پر بجز (الشعراء یتبعہم الغاؤن) کے کوئی معمولی ریویو بھی کیا ہے۔؟

جدید تعلیم یافتہ اگرچہ اس عام افسردگی میں شامل نہیں۔ دائرہ زبان کو وسیع کرنیکے لئے دوسری زبانوں سے الفاظ لئے جاتے ہیں۔ اُن کی تنقیح کیجاتی ہے۔ اور اُن کو ایک

عمدہ نشست کے ساتھ روزمرہ میں لاتے ہیں۔ لیکن خوب غور سے دیکھو کہ اس گروہ نے لٹریچر پر من حیث الفن کیا احسان کیا۔ یہ گروہ چونکہ عربی کیجورونکے ذائقے سے ناواقف ہے۔ اسلئے ہمکو عربی کے متعلق ان سے کوئی شکایت نہیں۔ اُردو زبان چونکہ مادری زبان ہے اسلئے اُسکے ساتھ۔ اعتنا۔ چنداں قابل داد نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس گروہ کو اکبری اور جہانگیری سکے کی رام رنگی کا کسقدر ذوق ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے فرمانروا اور اُس زمانے کے شعراء کو ہندوستان کے ساتھ نسب ونام کے عاذ سے اگرچہ کوئی خصوصیت خاص حاصل نہ تھی۔ تاہم اسلام نے قومی دائرے کو اسقدر وسیع کردیا تھا۔ کہ ایک بیگانہ سے بیگانہ مسلمان حقیقی بھائی کے حکم میں اسانی داخل ہوسکتا ہے۔ انما المومنون اخوۃ۔ اسکے علاوہ ان بزرگوں نے تخم شاعری بونے کے لئے۔ جس زمین کو منتخب کیا۔ اُسکا فخر دہلی یا اُس کے اطراف کی زمین بلند آہنگی کے ساتھ کرسکتی ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اُردو زبان کے اکثر شعراء دہلی ہی کی خاک سے اُٹھے۔ اور خود اُردو بھی دلی ہی میں پہلی پھولی۔ ان وجوہات نے مسلمانوں میں ان بزرگوں کی یہ وقعت پیدا کردی کہ ان کا معمولی سے معمولی کارنامہ بھی نہایت جانسوزی کے ساتھ چمکایا جاتا ہے۔ اس خوش اعتقادی اور صحبتہائے دیرینہ کا سب سے بڑا یہ اثر ہوا کہ آج اُردو کا تمام لٹریچر، فارسی زبان کا دوسرا قالب نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے اس گروہ کا فرض تھا کہ جس دلچسپی کے ساتھ قلعہ اکبر۔ تاج محل۔ سکندرہ جامع مسجد کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ اور عظمت گذشتہ کی یاد دلانے کے لئے اُن کی درازی عمر کی دعائیں کیجاتی ہیں۔ اُسی طرح فیضی۔ ابوالفضل۔ عرفی۔ کی غیر محسوس عمارت کے بقا کی بھی تدبیر کیجاتی۔

لیکن ہمارے نوجوان خود انصاف کریں کہ اُنہوں نے بی۔ اے کورس کے سوا اور وہ بھی مجبوراً فارسی کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔ وہ شعراء کے کلام پر ریویو کرسکتے ہیں؟

عرفی کے کلام کی خامی دکھا سکتے ہیں؟ فارسی زبان میں شعر کہہ سکتے ہیں؟ افسوس کہ نہیں کہہ سکتے اور نہیں کہہ سکتے۔

ان دونوں گروہوں کی یہ افسردگی اور بے اعتنائی اگرچہ ایک عام افسوسناک واقعہ ہے۔ تاہم اس عموم میں ہمارے مسلم لیڈر شمس العلماء مولانا محمد شبلی نعمانی داخل نہیں۔ مولانا چونکہ مارالعنب[1] کو انگریزی گلاس میں پیا کرتے ہیں۔ اسلئے اُن کی تمام خصوصیتیں اُن کو ہمیشہ انگریزی خواں اور عربی خواں دونوں گروہوں سے ممتاز رکھتی ہیں۔ انہیں خصوصیات میں شاعری بھی ہے۔ عربی ادب میں مولانا کو اگرچہ دستگاہ کامل حاصل ہے، اس لحاظ سے ان کے نتائج فکریہ کا ظہور اسے پردہ میں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ وقیفہ سنج بزرگ خوب جانتا تھا کہ آج زمانہ کا فونوگراف اس زبان کو اپنے اصل لہجے میں نہیں ادا کر سکتا۔ اُردو عام مروجہ زبان ہے۔ لیکن آخر کچھ شان علم کا بھی لحاظ چاہئے۔ اسلئے اظہار خیالات کے لئے اُس زبان کو چُنا جو ایران کی نفاست پسندی کا سچا نمونہ اور اُردو شاعری کا اصل الاصول ہے یعنی فارسی۔

ان اشعار کا ایک مختصر سا مجموعہ ہمارے پیش نظر ہے۔ جسکا نام زیب عنوان ہے اس مجموعہ میں اگرچہ تمام اصناف سخن موجود نہیں۔ صرف چند قومی نظمیں، مراثی، ناتمام غزلیں ہیں۔ تاہم ان سے مولانا کی ذکاوت و طباعی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اسلئے اس مضمون میں ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ مولانا کا رنگ کیا ہے۔ کلام میں زور ہے یا نہیں کلام میں فارسیت ہے یا نہیں۔ واقعے کی اصلیت ظاہر کی گئی ہے یا نہیں؟ اس لحاظ سے ہم الگ الگ عنوان قائم کرکے مولانا کے کلام پر مختصر سا ریویو کرتے ہیں۔

رنگ کلام

بہت سے تجربہ اور تحقیق کے بعد طے ہو چکا ہے۔ کہ کلام کی مقبولیت۔ اور عدم مقبولیت

[1] عربیت اور ضروریات زمانہ مراد ہے

کا دار مدار صرف رنگ کلام پر ہے۔ اور رنگ کا انحصار صرف زبان اور مضمون آفرینی میں ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ من حیث الاغلب شیرینی زبان کے لطف اٹھانیوالے اور اُسکے جاندادہ زیادہ تر پائے جاتے ہیں اسلئے مولانا بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اُنکے کلام کو خوب غور سے پڑھو صاف ظاہر ہوگا کہ لفظ لفظ میں مصرع مصرع میں زبان کی چاشنی کا کسقدر لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ ہم چند شعر پیش کرتے ہیں ؎

تا کے[1] زغم نہاں نگویم — گویند۔ مگو۔ چساں نگویم
دارم جگرے و میتوانم — کافسانۂ باستاں نگویم
از عربدۂ فلک ننالم — از نیک و بد جہاں نگویم
از نالۂ دل اثر نخواہم — از داغ جگر نشاں نگویم
رفت آنچہ نمود چرخ بر من — یک حرف ازاں میاں نگویم
ایں جملہ ہمیں توانم اما — نتواں کیں داستاں نگویم
در ماتم خان اعظم الدین — جز قصہ خونچکاں نگویم

آہ از غم ایں چنیں امیرے
شیر افگن و شیر شیر گیرے

ہوش[2] میگفت باں فتنہ گر ہوش ربائے — یکرہ از جلوہ بیارام کہ آیم بر جائے
جائے راحت بود سینۂ پر سوز ایدل — آمی و دور سایۂ مژگاں ترم می آسائے

بہ تحسین[3] صبوری چند بفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
چہ در دل داشتی تا از کہ رنجیدی چرا رفتی — زما بگسستہ ای مولای ما آخر کجا رفتی
کہ یارت بود آنجا با کدامیں ہمنشیں خفتی — ہنر را پایہ بالا بردی و خود در زمیں خفتی

زباں پر قدرت اور عربی ادب کے مذاق کا یہ اثر ہے کہ فارسی اشعار میں عربی زبان کے جملے

[1] از مرثیہ جنرل اعظم الدین خاں [2] از مرثیہ مولوی فیض الحسن صاحب [3] از ترکیب بند ندوہ

اور ضرب المثلوں کو اس خوبی کے ساتھ تضمین کر جاتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرب اپنے اصلی مرکز (یعنی زبان عربی سے ہٹکر) پھر قدرتی طور پر اسیکی طرف رجوع کر جاتا ہی۔

در[1] وزاندازہ گذشت و بلغ السیل زباہ	رفت سر رشتۂ صبر از کف وللدہر فنون
شاہ[2] فلک کوکبہ عبدالحمید	ایدہ اللہ بنصر مزید
طرز[3] اندیشہ نوکنم اکنوں	نشنیدی کہ الحدیث شجوں
حضرت[4] خواجہ امین اوصلنی اللہ بہ	صاحب لطف و کرم صیّرنی اللہ فداہ
باصد اندیشہ غرض دل بنہادم بسفر	بزباں بود کہ لا قوۃ الا باللہ
چوں حدیث من و حیرانی من بازشنید	گفت لاحول و لا قوۃ الا باللہ

رعایت لفظی اگرچہ ایک مستقل چیز ہے۔ لیکن چونکہ زبان کے رنگین بنانے کا ایک ذریعہ ہی۔ اسلئے زبان ہی کے سلسلہ میں داخل ہی۔ آج چونکہ اس صنعت کو اکثر شعرا نے مقصود بالذات بنالیا ہے۔ اس لئے اب یہ طریقہ معیوب خیال کیا جاتا ہی۔ خود مولانا بھی اسکے مخالف ہیں۔ لیکن جہاں کہیں اس صنعت کو کام میں لائے ہیں۔ وہاں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیب کو ہنر کے قالب میں ڈھالدیا ہی۔

فاش[5] گویم کہ سخنگوئی زاں روی نہفت	تیرہ شد دہر کہ نیّر زجہاں روی نہفت
درجہاں نخل ہنر را ثمرے بود نماند	نظم را خامۂ او بال و پرے بود نماند

زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہی۔ کہ شعر کے تمام اجزا ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہوں یعنی پھر وہ نثر میں نہ ادا ہوسکیں۔ اس خوبی کو مولانا کے ان اشعار میں ڈھونڈ ہو۔

زین[6] دو سہ حرف فزوں نیست مقال سخنے	کہ بہار آمد و ابر آمد و باراں آمد
دو[7] جہاں اینہمہ برہم شدہ چوں است وچہ ہست	آسماں حلقۂ ماتم شدہ۔ چوں است وچہ ہست

[1] مثنوی جیس سلطان المعظم کے سواری کا سار، دکھایا گیا ہی [2] مثنوی ناتمام بغرض بلغی فرمت [3] نامہ مبسوی خواجہ امین اللہ [4] [illegible] [5] [illegible] [6] [illegible] [7] [illegible]

مہر داغ دل عالم شدہ چوں است و چہ ہست	اختراں دیدۂ پرنم شدہ چوں است و چہ ہست

شاید روز بمرگ کہ ماتم بنشست
از چہ؟ لیلائے شب آشفتہ و درہم شست

مولانا کے کلام میں زبان کی اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں جو مستقل عنوان میں نہیں بیان کیجا سکتیں۔ اسلئے ہمنے اُن کو نظر انداز کردیا۔ مثلاً اس تقسیم کو دیکھو اور لطف اُٹھاؤ۔

در جلوہ گاہ حسن دل پارہ پارہ را	شبلی نگر کہ تا بچہ عنوان فروختم
نیمے ازاں بہ نرگس مستانہ باختم	نیمے دگر بہ غمزہ پنہاں فروختم

زور کلام

مولانا کا دل چونکہ قومی جوش سے لبریز ہے۔ اسلئے اُنوں نے جو قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اُن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ایک عرب رجز خوانی کر رہا ہے۔ اور زبان کی صفائی نے اس جوہر کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ مولانا حالی زمانے کے نشیب و فراز کی تصویر خوب کھینچتے ہیں۔ لیکن تعریض اور ابعاث میں مولانا کا پلہ اُن سے بھاری ہے۔ ان دونوں بزرگوں میں خطیب اور خیر خواہ کا فرق ہے۔

می نہ بینید کہ سرسید ما آنکہ بفضل	رہبر قافلۂ ماست بہر راہ گذار
چیست آخر کہ بایں پیری و ایں ضعف بدن	از علیگڈھ بہ دکن آید و جوید تیمار
تا چہ حال است کہ آتش زنفس ہا بارد	تا چہ حال است کہ خوں میچکدش از گفتار
ایں ہمہ غلغلہ آخر نہ بود بے چیزے	ایں ہمہ ولولہ بے صرفہ نباشد زنہار
حضرت حالی و شمس العلما را بنگر	واں دگر دیدہ ورائے کہ بودش انصار
تا چہ پیش آمدہ کیں ناموراں را بجہاں	در بدر گشتن و در یوزہ گری گشت شعار
شرح ایں قصۂ جانسوز نگفتن تا کے	سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تا کے

لہ غزل ۲ ترکیب بند قومی برائے حیدرآباد۔

آں وآں گوش بدارید کہ می گویم باز	داستانے کہ غم افزا بود و زہرہ گداز

واقعہ کی اصلی تصویر کھینچنا شعرا اور شعر کی حقیقت میں داخل ہے لیکن کسی شعر میں یہ صفت بکمالہ نہیں پایا جا سکتا۔ جب تک شاعر قادر الکلام نہو۔ مولانا کو اسمیں اسقدر کمال حاصل ہے کہ لفظ لفظ واقعے کی اصل تصویر ہوتا ہے۔

واعظ[1] آراستہ عمامہ و از روی شرف	شملہ را کرد چو سر رشتہ امید دراز
زاہد سادہ ہم از کلبۂ تنہائی خویش	با کہن خرقۂ خود رفت بروں بہر نماز
با ہمہ شوکت و فر با ہمہ تمکین و شکوہ	خلق در عید گہ آمد زرہ صدق و نیاز
نفسے چند نشستند دوزانو دانگہ	راست چوں سرو ستادند پئے ذکر و نماز
مفتی شہر ہم از جا بامامت برخاست	با ہمہ صدق و صفا با ہمہ اخلاص و نیاز
آنچہ بایست ز ترتیل و سکوں و قرأت	ہمہ بر وجہ حسن کرد ادا آں ممتاز
پس دگر خطبہ بلفظ بود آغاز بلند	خطبہ چوں سخن قامت محبوب دراز

تاریخی واقعات۔ مختلف شہروں کے بھدے نام۔ امرا کا طول و طویل لقب۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر شعر میں لائی جائیں۔ تو ترکیب کی چستی۔ زبان کی صفائی بندش الفاظ میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا کے اکثر قصیدی اس قسم کے القاب اور ناموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے زبان اور ترکیب کی چستی میں بال برابر فرق نہیں آتا۔ اور لطف یہ کہ اکثر تخفیف کا قاعدہ بھی نہیں جاری کرتے۔ اور یہ اونکے قادر الکلامی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

داور[2] داد گر خسرو اقلیم دکن	میر محبوب علیخاں کہ بود عرش وقار
آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ	بازوے دولت و دستور شہ ملک آرا
ملتجے حضرت عزناط و بغداد و حزری	قدمے رنجہ کن و در حرم مسجد آئے

[1] قصیدہ عیدیہ [2] ترکیب بند قومی سیر آباد

بپورٹ[1] جائیست کہ تا پشم دنگہ کار کند	زورق وکشتی و دا بور بود سر تا سر

(فارسیت)

آج تمام دنیا میں فارسی زبان کی ہمدردی کا غلغلہ مچا ہوا ہے۔ یہ آواز قومی حیثیت سے گو ایک دلکش آواز ہے۔ لیکن فارسی لٹریچر اس سے کچھ نہیں متاثر ہو سکتا یہ تو عام حالت ہے۔ بعض لوگوں نے اس نقطے سے قدم آگے بڑھا کر فارسی کی مزاج پرسی بھی کی۔ لیکن اوپری دل سے مولانا حالی کی ایک آدھ نظمیں فارسی زبان میں ہم نے دیکھیں۔ اور سنجر تو خود ایرانی شاعر ہے۔ جو مدتوں ہندوستان میں پھر کر اپنی طباعی کی داد لیتا رہا۔ اوسکی بھی ایک نظم ندوہ کی سالانہ روئداد میں شائع ہوئی ہے۔ جو ہمارے پیش نظر ہے۔ اس موقع پر ہم کوئی کلی رائے تو نہیں قائم کر سکتے۔ مگر یہ نظمیں درحقیقت ملایانہ نظموں سے زیادہ قابل قدر نہیں ہو سکتیں اصل یہ ہے کہ فارسی زبان کا اصلی لطف اسیوقت شعر میں قائم رہ سکتا ہے۔ جب امور ذیل کا لحاظ رکھا جائے۔

(۱) خالص فارسی ہو۔

(۲) جو خیالات دل میں آئیں فارسی ہی زبان میں آئیں ورنہ شعر محض ترجمہ ہوگا۔

(۳) جو محاورے ہوں اسی زبان کے ہوں۔

(۴) عربی الفاظ ہوں مگر وہی جو فارسی الفاظ کے مشابہ ہیں۔

(۵) ایرانی رسم و رواج کا بھی لحاظ ہو۔

اب اس معیار پر مولانا کے کلام کو پرکھو تو ایک ذرہ فرق نہ پاؤ گے۔ چنانچہ ہم زیادہ وضاحت کے لئے ہر ایک کی مثال دئے دیتے ہیں۔

خواجہ[2] از خانہ برون آئے کہ دیدن دارد	ایشمہ گرمی ہنگامہ و ایں زینت و ساز
مردماں بسکہ ز ہر گوشہ فراز آمدہ اند	نگہ از تنگی جا بار نے یا بد باز

[1] قصیدہ سفریہ [2] قصیدہ عیدیہ ۱۲

آں یکے جلوہ فروش آمدہ در خانۂ زین	واں دگر بر زدہ بر ہودج زر بالش ناز
ہمت[1] بہ نگاہی کند و حوصلہ بنگر[2]	کان نیز کہے با من دگہ باد گرہ داشت

ان اشعار میں صرف ہمت - جلوہ - زینت عربی الفاظ ہیں لیکن اگر محض فارسی داں سے پوچھو تو شاید بمشکل تفریق کر سکے۔

آی کشتۂ ظلم ہاں خبر گیر	دیں نالۂ ما بگوش در گیر
ایں مہ بخسوف مے نیرزد	از چہرہ نقاب خاک بر گیر
برخیز و ہماں برسم پیشیں	ہم تیغ بدست و ہم سپر گیر
ترکانہ کلہ بفرق بشکن	چار آئینہ و زرہ ببر گیر
مردانہ خرام و ہمرہی را	اقبال و سعادت و ظفر گیر

ردیف کا مختلف پہلوؤں سے نبھنا - زبان کی صفائی، بیساختگی، رقت - حلفی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ اشعار ازدو تصورات کا ترجمہ نہیں - محاورے کا یہ التزام ہے کہ ایک قدم بھی اہل زبان کے مرکز سے نہیں ہٹتے - چنانچہ انہیں اشعار میں دیکھو - نالہ بگوش در گرفتن - بخسوف نمی ارزیدن - از چہرہ نقاب گرفتن - کلہ بفرق شکستن کس زبان کے محاورے ہیں - کیا کوئی فارسی شاعر اس سے بڑھکر محاورے کا التزام کر سکتا ہے؟

عربی الفاظ کی طرف بھی انہیں اشعار میں توجہ کرو - ظلم - خبر - خسوف - نقاب - فرق اقبال - سعادت - ظفر - عربی زبان کے الفاظ ہیں - مگر اسکی ساتھ فارسی خسرا سے کے بھی لعل و گوہر ہیں۔

ایرانی رسم و رواج کا لحاظ بھی انہیں اشعار میں کرو - چار آئینہ و زرہ ببر گرفتن کسکا کام ہے میرے نزدیک تو لکھنؤ کے شریف پسند اسکے مستحق نہیں - اسیطرح در خانۂ زین بجلوہ فروشی آمدن - بر ہودج زر بالش ناز زدن - عجمی ہی جشن و طرب کے لوازمات ہیں۔

---

[1] غزل [2] مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں۔

واقعہ کی اصلیت

یہ وہی جوہر ہے جسکی بنا پر اُردو اور فارسی شاعری کو مجموعۂ توہمات کا لقب دیا گیا ہی۔ اسی جوہر نے آج میر ناسخ۔ آتش۔ غالب۔ عرفی۔ نظامی وغیرہ کو باوجود ادعائے حب وطن شکسپیر کا ناک پانا دیا ہی۔ آج اسی جوہر کے سر پر "نیچرل شاعری" کا خوشنما سہرا نظر آتا ہے لیکن سوال یہ ہی کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں۔

اسکا جواب عموماً تمام انگریزی خوانوں کی طرف یہ دیا جاتا ہے کہ واقعات کی قسم کا تصرف نکیا بلکہ حقیقت حال اسطور پر بیان کیجائے۔ کہ اگر مخاطب خود اُس موقع پر موجود ہوتا تو اُسکو وہی کیفیت حاصل ہوتی جو شعر سننے سے حاصل ہوتی ہی۔ اس بنا پر محض لفظوں کی نشست۔ اور اُنکے الٹ پھیر کا نام شاعری ہے۔ مثلاً تم نے ایک سیاہ آدمی کو دیکھا تو شاعرانہ حیثیت سے تمہارا صرف یہ فرض ہی کہ یوں کہدو ؎ وہ سخت سیاہ آدمی تھا۔

لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ شاعر کا حاشیہ عموماً قوی ہوتا ہے۔ اسلئے محسوسات کا اثر نہایت شدت کے ساتھ اُسکے حواس پر پڑتا ہے۔ اس بنا پر وہ چاہتا ہے کہ اسی شدت کے ساتھ وہ کیفیت سامع کو بھی محسوس ہو۔ لیکن اپنا سا حواس مخاطب میں پیدا کردینا شاعر کا کام نہیں۔ اسلئے وہ فطرۃً اس کیفیت کو تشبیہ سے استعارہ سے نازک الفاظ سے مختلف طرز بیان سے مخاطب کے خیال میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسکی مثال بالکل عید کے چاند کی ہی۔ ایک ہی شخص جوش شادمانی میں کبھی اُسکو دوربین سے۔ کبھی مسجد کی چھت سے کبھی دریا میں غرض مختلف حیثیتوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن ان دیدہ ریزیوں کا حاصل صرف اسقدر ہی کہ چاند کی پوری تصویر آنکھوں میں اُتر آئے۔ تاکہ عید کی خوشی دوبالا ہو جائے۔ اور اسکو کوئی شخص معیوب نہیں سمجھتا۔ اسیطرح نازک استعارہ۔ واقعہ کا نشیب و فراز۔ تشبیہ طرز بیان کا چڑھاؤ اُتار کوئی عیب نہیں۔

اسی اصول کا پیمانہ جب ضرورت سے زیادہ وسیع کردیا جاتا ہی۔ تو اُردو اور فارسی

کی موجودہ سرحد کا راستہ کہلاتا ہی۔ فرض کرو کہ تم نے ایک خوبصورت شخص کو دیکھا۔ اب اگر تم اوسکے حسن کی تصویر کھینچنا چاہتے ہو تو تمہارا صرف یہ فرض ہے کہ پھول سی رنگ لیلو۔ آفتاب سے چمک۔ چیتے سے کمر۔ ہرن سے آنکھ اور اس ذریعہ سے اُسکے حسن کا نقشہ دکھا دو لیکن[1] اسطور پر نہیں کہ یہ تصویر بجائے خود ایک مستقل تصویر بنجائے۔ اور اسکے دیکھنے سے صرف اُس شخص کی خیالی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے بلکہ اس طور پر کہ اوسکی تصویر خود آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیجائے۔ اور یہ چیزیں بطور رنگ آمیزی کے کام لائی جائیں حاصل یہ کہ فرقۂ جدید کی سادگی۔ اور قدیم فرقہ کا تصنع دونوں میں اعتدالی پائی جاتی ہے۔

آج انہیں غلط فہمیوں سے اُردو زبان کے شعراء میں رقابت ہو چلی ہے۔ لیکن مولانا نے اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں اُنہوں نے جو ترکیب بند پڑھا تھا۔ اوسکے تمہیدی بند ہم نقل کئے دیتے ہیں۔ ناظرین خود انصاف کریں کہ علماء کی حالت کی جو تصویر اُنہوں نے کھینچی ہے وہ حقیقت حال سی کسقدر دست و گریبان ہی۔ اور اسکے ساتھ شاعری کے لوازمات کا بھی کسقدر التزام ہے۔ اسکے ساتھ انہیں اشعار میں بعض امور متذکرہ بالا کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔

ایکہ پرسی چہ کسانیم و چہ سامان داریم	آنچہ باریچ نیرزد بجہاں آں داریم
ما نہ آنیم کہ دہیم سکندر طلبیم	ما نہ انیم کہ اورنگ سلیماں داریم
ما نہ آنیم کہ بر شیوۂ ارباب حشم	روی در راہے بدر دولت سلطان داریم
ما نہ آنیم کہ با حاجب دربان باشیم	ما نہ آنیم کہ بام و در و ایوان داریم
ما نہ آنیم کہ با مسند و بالیں ارزیم	ما نہ آنیم کہ سر و آب گلستاں داریم
ما نیرزیم بدان پایہ کہ چوں محتشمان	جامہ از قاقم و استبرق و کتاں داریم

[1] یہی قدیم شاعری ہے اور یہی ہماری نوجوانوں کے لئے باعث اعتراض ہی ورنہ یہ طرز چھوڑ دی جائے۔ تو یہ اعتراض کی کوئی وجہ نہیں

ما نہ آنیم کہ یک شیوہ بآئیں گیریم
ما نہ آنیم کہ یک کار بسامان داریم

خاکساران جہانیم و ز اسباب جہاں
بوریائیست کہ در کلبۂ احزاں داریم

جزئے خامہ و اوراق پریشاں نبود
بیش و کم آنچہ بہ پیدا و بہ پنہاں داریم

گاہ گاہے بسوی کلبۂ ما باز خرام
تا بہ بینی کہ چہ برگ و سر و سامان داریم

تو کباب برہ و شہد و شکر میجوئی
ما ہماں پارۂ نانے بسر خواں داریم

تو غلاماں مگر بستہ بفرماں خواہی
ما غلام خود و خود گوش بفرماں داریم

ہم بیک حال بود بے سر و سامانے ما
کہنہ ہرگز نشود جامۂ عریانے ما

عجز و افتادگی و طبع و رضا خواہی ہست
گر ز ما شیوہ پشینۂ ما خواہی ہست

افسر و تاج و کمر بند و کلہ جوئی نیست
جامۂ کہنہ و پارینہ روا خواہی ہست

قصر و بام و حرم و گنبد اگر خواہی نیست
مسجد و منبر و محراب دعا خواہی ہست

آں می کوز فرنگست نداریم بجام
بادۂ خمکدۂ صدق و صفا خواہی ہست

شرح افسانۂ روم نتواں جست ز ما
ور دلا و یز حدیث خلفا خواہی ہست

ما مداوائے تپ و درد ندانیم ولے
گر ز ما بخوری الحاد شفا خواہی ہست

ما خرافات کہن یاد نداریم ولے
گر ز ما سلسلۂ حدثنا خواہی ہست

گفتۂ بیکن و دیکارٹ نداریم بباد
ور حدیثے ز رسول دگر ما خواہی ہست

بے نوائیم ز ما فرۂ دنیا مطلب
آنچہ در کیسہ نداریم تو از ما مطلب

مولانا کے کلام میں انکے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیاں - اور جدید مضامین ہیں - لیکن ہم بخوف تطویل اُن اشعار کو نظر انداز کرتے ہیں - لیکن اسکے ساتھ ہمنے اور بھی ایک خوبی نکتہ نظر انداز کر دیا ہے - یعنی کلام کا عیب و قبح دکھانا - اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ میں

اسقدر وسیع النظر نہیں کہ ماہرین فن کا کہونا کہرا صحیح طور پر پرکہ سکوں - حالانکہ یہ نکتہ تنقید کا عرض لازم تہا - بہر حال کتاب - منیجر المعین - دار العلوم ندوۃ العلما سے ۸ر قیمت پر مل سکتی ہی - اب ہم اپنے مضمون کو خود مولانا کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں -

روشنم شد ز نوا سنجی شبلی کا مروز	ہند را نیز قمی ہست و صفا ہانی ہست

عبد السلام طالب علم دار العلوم ندوۃ العلما - از لکہنؤ -

مکتوبات امیر مینائی

حسب خواہش جناب اڈیٹر صاحب اردوی معلی ہر نمبر رسالہ اردوی معلی میں دو حصے مکتوبات کے دئے جائینگے - اور یہ سلسلہ اسوقت تک جاری رہیگا کہ احباب تلامذہ استاذ امیر مرحوم ایک معتد بہ ذخیرہ مکتوبات کا بندۂ ثاقب کے پاس بہیجدیں - جب کافی تعداد خطوط کی ہو جائیگی تو علیحدہ کتابی صورت میں انشاء اللہ تعالی شائع کئے جائینگے -

دفتر قند پارسی علی گڈہ - محمد احسن اللہ خاں ثاقب

حکیم عابد علی صاحب کو ثر خیر آبادی کے نام

پیارے کوثر - ملفوف کاغذ میں لکہوا کر بہیجتا ہوں اسکو آپ دیکہہ کر اپنے مراسم کے موافق احمد علیخانصاحب منصور آبادی کو جلد لکہہ کر بہیجدیں اور کوئی دقیقہ کاربراری کا فروگذاشت نکریں مجہے بہی جلیل سے سخت انفعال ہی اور اُن کی کامیابی کا نہایت ہی خیال ہی - افسوس ہی کہ عوارض و مکارہ کی وجہ سے سفر نکر سکا ورنہ ضرور وعدہ اُنسے وفا کرتا اور بسبب اسکے کہ جلیل کو دفتر سے علیحدہ ہونے دینا بہی پسند نہیں اور اُنکے والد درویش صفت و ضعیف دنیا کے تعلقات سے کارہ مکان پر ہیں اُنسے کوئی دنیاوی کارروائی ہو نہیں سکتی بلکہ وہ خود پیرانہ سالی سے ایک دلسوز خدمتگار کے محتاج ہیں ان وجوہ سے جلیل کا دور جانا نہیں چاہتی ورنہ دکن میں انکا نوکر رکہوانا ممکن تہا آدمی یہ ایسے اچہے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پہیلیں - میں اُن کی علحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں مگر مجبوری گوارا کرتا ہوں بشرطیکہ اسی جوار یعنی قرب وطن میں انکی بسر کی صورت نکلے چونکہ مجہے خوب معلوم ہی کہ اس جوار میں عموماً لوگ تمہارے معتقد اور خصوصاً احمد علیخانصاحب کو

بہت ہی تمہارا لحاظ ہو تم تہ دل سی کوشش کروگے تو ضرور جلیل کامیاب ہوجائینگے لہذا بہت ہی اصرار سی لکھتا ہوں کہ سرگرم حاجت روائی ہوجیے۔ زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ آپ خود مجمع اوصاف حمیدہ ہیں۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور اقبال بڑھائے۔ زیادہ کیا لکھوں میرا حال بدستور اور ممتاز احمد کو امید اندمالِ زخم تو قوی ہی مگر ہنوز رنجور و معذور ہی اور عزیز بھی گاہ گاہ بیمار ہوجاتے ہیں۔ آج کل پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔ میں بہت منتظر رہوں گا کہ کب آپ احمد علیخانصاحب کا خط مشعر طلب جلیل بھیجینگے۔ تعجیل و تکمیل کے ساتھ کوشش کیجیے فقط سب اطفال اور اہل ذمہ خصوصاً جلیل و آہ سلمہا اللہ مادحب ساں ہیں۔ دلنوازا۔ اسوقت ڈاک سے ایک تہلی بھی پہنچی جسکے پر فقط ایک دوڑا لپٹا ہوا تھا اور دوڑے پر لاکھ کی مہر بھی نہ تھی شاید دھوکے سی یوں ہی روانہ ہوگئی۔ اب آپکا خط آئی تو طریق استعمال معلوم ہوا طمینان کے واسطے یہ دو سطریں بطور رسید لکھدیں فقط

امیر فقیر۔ ۵ رفروری ۱۸۹۲ء

بنام ثاقب کے نام

آئینہ جمال فتوت۔ جمال آئینہ مروت اعلی اللہ شانکم۔ بعد سلام و شوق کی عرض کرتا ہی سراپا تقصیر امیر فقیر کہ یہ رنجور ڈیڑھ مہینے سی دربار جانے سی معذور تھا اسی سی تعمیل حکم میں قصور ہوا۔ عذر خواہ ہوں والعذر عند کرام الناس مقبول آتش بید و دکا ایک نسخہ مجھے ہدیۃً پہنچا اسکا شکر کس زبان سی ادا کروں۔ میری عاجز کو پیرایہ سپاسگزاری سمجھیے۔ جو نسخہ حضور میں مع عرضداشت گزرا تھا سرکار نے بہت شوق سی اسکو ملاحظہ فرمایا اور ارشاد کیا کہ ہمارے طرف سے بہت تعریف لکھو اور دیوان فارسی تدشیح بھیجو حسب الحکم پارسل دیوان کی روانہ کرتا ہوں۔ اس خط کو لکھتے وقت ایک عنایت نامہ مع حاشیہ اصرار آپ بھیجا اسنی اور زیادہ منت پذیر کیا۔ امیدوار ہوں کہ مجھکو مخلص ممنون تصور فرما کر ہمیشہ کارہائے لائقہ سی سرفراز فرمایا کیجیے اور چونکہ دائم المرض و ضعیف البنیان ہوں تو دیر کو جواب لکھنا اگر کبھی واقع ہو تو عفو فرماؤ فقط معروضہ امیر احمد عفی عنہ۔ ۲۶ شوال ۱۲۹۷ ہجری۔

سائنس و کلام

نئی روشنی کی سائنس نے ایک عرصۂ دراز سے اپنی شفاف غیر مکدّر شان اجلا کی وجہ سے ہندوستان کی چشم کمال بین میں مختلف طور پر اثر کیا ہے ہندوستان نے جو اس سے پہلے بھی مختلف قوموں کے آباد ہونے کی وجہ سے ہر قسم و ہر رنگ کے علوم و فنون کا سرچشمہ رہا ہے بہت خوشی کے ساتھ اس سائنس کا خیر مقدم کیا۔ یہ نئی سائنس اصولاً نئی نہیں ہے۔ اسکے کلیات اسکے طرق استدلال اسکے نتائج اشکال عقلیہ سب وہی ہیں جو قدیم سائنس میں موجود ہیں جسکو خواہ فلسفہ یونانی کہو یا عربی فلسفہ مگر جس چیز نے اسکو جدید سائنس کا خطاب دیا وہ میرے نزدیک اُسکی سلاست اور اُسکا سادہ طرز بیان ہے جسکو معمولی قسم کا آدمی سمجھ سکے۔ نیز اُس سے عملی تجربوں اور اختراعات متنوعہ کیطرف ایسی توجہ کی گئی کہ اُنہوں نے سائنس کو نمایاں طور پر چمکا دیا۔ ہمارے یہاں کی سائنس اور خصوصاً وہ حصہ سائنس کا جو ٹیٹ مسلمانوں کا ہے یعنی علم کلام کچھ ایسا مدوّن ہوا ہے کہ سائنس کی دنیا میں متکلمانہ مذاق والوں کو اُس سے تشفی نہیں ہوتی اور ہر شخص بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔ اسمیں وہ متشیات نفوس نہیں داخل ہیں جو اپنی ممتاز عربیت و قابلیت کی وجہ سے بوجہ اتم مستفید ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر وہ کافی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔ فی زمانا نئی روشنی اور پرانی روشنی والوں کی چند در چند کوتہ علمیوں و غلط فہمیوں کی وجہ سے یہ اصول قرار پایا گیا ہے کہ جدید سائنس علاوہ قدیم سائنس سے مختلف ہونیکے مخرب و خلاف مذہب اسلام و آئین احکام شرعیہ ہے چونکہ اس اصول کے قرار پا جانے سے مختلف طبقوں میں خیالات غیر صحیح پھیلگئے تھے لہذا اکابر قوم نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ درحقیقت اس

غلط فہمی کو دور کرنیکے لئے طبقہ علماء سے بہتر کوئی طبقہ موزوں نہیں ہوسکتا ہے جسکے ذاتی اثر کے علاوہ علمیت کا اثر ہر طبقے پر بقدر استعداد موثر ہوتا ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اس طبقے میں اس خیال کے شیوع کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ صرف تخیلاً بلکہ عملی حیثیت سے بعض علماء نے توجہ کی ہے۔ میں اسوقت یہ تمہید جس مبارک کتاب کی ریویو کے لئے کر رہا ہوں "سائنس و کلام" کے خوش آیند نام کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر مطبع نامی لکھنؤ میں طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولنا حافظ حاجی محمد قیام الدین عبدالباری صاحب عم فیضہ بہت ہی مغتنمات علمائے لکھنؤ سے ہیں فرنگی محل دارالاقامت ہے اور آپ وہیں کے مشاہیر علمائے سلف کے یادگار ہیں۔ علمائے فرنگی محل جس مرتبت کے گذرے ہیں اُن کا تذکرہ و فور شہرت کی وجہ سے تحصیل حاصل کی حکم میں ہے۔ اس کتاب کا ایسے دارالعلم کے عالم کی تصنیف ہونا ہی کتاب کا کافی ریویو ہے۔ میں ذاتی طور پر مصنف ممدوح سے خادمانہ نیاز رکھتا ہوں اور نہایت سچائی سے لکھتا ہوں کہ ایسے روشن خیال متبحر و بے تعصب و جامع عالم اس زمانے میں کم ہونگے۔ مصنف کا یہ خاص احسان مسلمانان ہند پر ہے کہ اُنہوں نے ایسی عمدہ تالیف فرما کے طبقۂ علماء میں عملی اور بہت موثر جوشیلی تحریک پھیلا دی جس سے اُمید ہے کہ اس خاموش طبقے میں نہایت بکار آمد بیداری پیدا ہوگی۔ یہ کتاب اُردو میں ایسی سلیس ہے کہ جیسی اس زمانہ میں مقاصد متذکرہ صدر کیلئے ہونی چاہئے۔ یہ کتاب سائنس و کلام کی سبجکٹ کا جزاوّل ہے امید ہے کہ بہت جلد پورا سلسلہ سبجکٹ کا مطبوع ہوگا۔ اہل ملک کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

سید امین الحسن رضوی موہانی آنریری مجسٹریٹ از حیدرآباد دکن

لہ حقیقت میں کتاب سائنس و اسلام اسی تعریف کے مستحق ہے۔ قیمت ۸ر درخواست خریداری بنام مولوی محمد سلامت اللہ صاحب فرنگی محل لکھنؤ کے نام جانا چاہئے۔ فقط "الحیر"

تنقید

(۱) سدیشی تحریک | ایک ایسی مفید اور مبارک تحریک ہے جسکے خلاف کوئی ہوشمند اور ایماندار آدمی اپنی آواز نہیں بلند کر سکتا یہی وجہ ہے کہ ملک کے بعض وہ دشمن بھی جو تمام ملکی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس تحریک سے علانیہ طور پر اظہار اختلاف کرتے ہوئے جھجکتے ہیں اور بمصداق "جو کہ بد را بہانہ ہا بسیار" اس عذر کے ساتھ مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی سفارش کرتے ہیں کہ "ہم سدیشی تحریک کے حامی ہیں لیکن جسطور پر یہ تحریک آجکل جاری ہے اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ یعنی بوائکاٹ کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ بوائکاٹ وفاداری حکومت کے منافی ہے لیکن ہم کہتے کہ بصورت موجودہ

سدیشی تحریک کی ترقی اور بوائکاٹ لازم و ملزوم چیزیں ہیں

جب تک لوگ منچسٹر کے نرم باریک اور ظاہری بھڑک رکھنے والے کپڑوں سے قطعاً اجتناب نہ اختیار کرینگے تب تک ان کے مقابلے میں ہندوستانی بنے ہوئے کپڑوں کی مانگ نہیں بڑھ سکتی اور جب تک ہندوستانی کپڑوں کی مانگ بڑھنے کی یقینی امید نہ ہوگی اسوقت تک ہندوستان کی وہ سرمایہ دار اور کاریگر جو سالہا سال تک کاروبار تجارت سے مجبوراً علیحدہ رہنے کے سبب سے تجارتی حوصلہ مندی اور دور بینی سے تقریباً محروم ہوگئے ہیں اپنی دولت اور محنت کو اس صنعت پارچہ بافی سے دریغ رکھینگے جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تحریک کی کامیابی ایک امر موہوم سے زیادہ نہ رہ جائیگی حالانکہ بوائکاٹ کی مدد سے ہندوستانی کپڑوں کی مانگ کا بڑھنا قطعی اور اسلئے مختلف کارخانوں اور ملوں کا قائم ہونا بھی یقینی ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ جب دیسی کپڑوں کے مختلف کارخانے قائم ہونگے تو اُن میں مقابلہ بھی ہوگا اور کاریگروں کی واقفیت اور کاریگری میں بھی ترقی ہوگی جسکا لازمی اثر یہ ہوگا کہ چیزوں کی خوبی میں بھی ترقی ہوگی اور کیا عجب ہے کہ کسیوقت میں اس خوبی کا درجہ یہانتک بڑھ جائے کہ پھر ہمکو انگریزی مال سے

مقابلے کا خوف بھی جاتا رہے اور بوائیکاٹ کی حاجت ہی نہ باقی رہے۔ کیونکہ ہندوستان میں محنت کی اُجرت کم ہونیکے علاوہ انگلستان کے مقابلے میں کرایہ آمد و رفت اشیاکی اُجرت بھی بچیگی اور چند دیگر مشکلات کے باوجود بھی

ہم انگلستان سے علانیہ مقابلہ کرنیکے قابل ہو جائینگے

لیکن جبوقت تک ایسی حالت نہ پیدا ہو ہمارے نزدیک ہر محب ملک فرض ہے کہ

"غیر ملکی خصوصاً انگریزی چیزوں کو بوائکاٹ کرے"

انگریزی چیزوں کی خصوصیت اسلئے کی گئی ہے کہ سب سے بڑی تجارت یعنی کپڑے کی تجارت انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک ایسی تجارت ہے جسکو ہم بہت جلد اپنے قبضے میں کرسکتے ہیں کیونکہ انگلستان کی بے انصافانہ پالیسی کے باوجود ہندوستان سی صنعت پارچہ بافی بالکل مٹ نہیں گئی ہے اور بہت تھوڑی سی توجہ میں پھر اپنی اصلی حالت عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ شاید اس موقع پر بعض حیلہ پسند کمزور طبیعتیں یہ اعتراض کریں کہ انگلستان کے خلاف بوائکاٹ انگریزوں کی ناراضی کا باعث اور شان وفاداری کے خلاف ہوگا لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب انگلستان نے ہماری غفلت اور بے بسی کے زمانے میں صریح بے انصافی کے ساتھ ہمارے صنعت پارچہ کو منچسٹر والوں کے فائدے کے لئے دیدہ و دانستہ تباہ کرنا جائز سمجھا تو اب اپنی صنعت کو دوبارہ ترقی دینے کے لئے

انگریزی مال کا بوائکاٹ ہرگز کوئی ملکی یا اخلاقی جرم نہیں ہے

اور اگر کسی کے نزدیک ہو بھی تو اُسے اپنی فرشتہ خصلتی۔ اور حکومت پرستی کا ناز بیشک ہو ہمارے نزدیک تو ایسے شخص کو ملک و ملت کا قطعی دشمن سمجھنا چاہیے بوائکاٹ کے خلاف سب سے زیادہ کمزور دلیل۔ یہ پیش کیجاتی ہے کہ بوائکاٹ چونکہ اہل بنگال نے شروع کیا ہے، اور تقسیم بنگال کے متعلق شروع کیا ہے اسلئے مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنا چاہیے۔

ہم کہتے ہیں کہ تقسیم بنگال مسلمانوں کے حق میں مفید ہو یا مضر لیکن جب یہ ثابت ہو گیا کہ اسموقع پر اہل بنگال کی کوشش سے سودیشی تحریک کو ایسی تقویت پہنچی ہے جسکا اس سے قبل کسیکو گمان بھی نہو سکتا تھا یعنی یہ کہ تمام ملک میں اس تحریک کا غلغلہ مچگیا ہے ایسی حالت میں اس عمدہ موقع سے فائدہ نہ اُٹھانا کسی عقلمند کا کام نہونا چاہیئے۔ ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ بعض ناعاقبت اندیش مسلمان لیڈر اور اخبار نویس صرف بنگالیوں کی ناکامی کا تماشا دیکھنے کی غرض سے سادہ دل مسلمانوں کو دہوکا دینا اور انکو سودیشی تحریک اور بوائکاٹ میں شریک ہونے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس قسم کی لیڈری پرائی بدشگونی کے لئے اپنی ناک کٹوانے کی صلاح دینا پرلے درجے کا ملکی گناہ ہے جسکی جوابدہی ان دشمنان ملک و قوم کو خدا کے روبرو کرنا پڑیگی ہوشمند مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ سدیشی تحریک کا خیال ایسا نہیں ہے کہ اب لوگوں کے دلوں سے محو ہو سکے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے اگر مسلمانوں کے لیڈر مسلمان سرمایہ داروں اور مسلمان کاریگروں کو اس تحریک کی جانب سے بے پروا رکھنے کی قابل نفرت کوشش میں کامیاب رہینگے تو دوسری قومیں اُن کی شرکت کی منتظر نہیں رہینگی بلکہ بہ ضرورت ان صنعتوں کو بھی ہاتھ میں لے لینگی جو اب تک خاص مسلمانوں کا حصہ سمجھی جاتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۱۰-۱۵- برس کے بعد مسلمان پالیٹکس کی طرح میدان صنعت و حرفت میں بھی دیگر اقوام سے پیچھے رہ جائینگے اور اُسوقت ان کو معلوم ہوگا کہ جنکو ہم اپنا پیشوا سمجھتے تھے وہ درحقیقت ہمارے دشمن تھے۔

ہمارے نزدیک تقسیم بنگال کا جھگڑا ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ درانحالیکہ سودیشی تحریک کو جو امداد اس مسئلے سے ملی ہے وہ اب یقیناً قائم اور ترقی قایم رہیگی۔ پس جو لوگ آخر میں ہیں وہ تو تقسیم بنگال کو قطع نظر کرکے سودیشی تحریک اور بوائکاٹ میں شرکت کرینگے اور اسموقع سے ضرور فائدہ اُٹھائینگے لیکن جن لوگوں کی نظریں محدود اور دل تنگ ہیں

وہ صرف ہندو اور مسلمانوں کے عارضی یا مقامی جھگڑوں بکھیڑوں کے چکر میں پڑکر خود بھی محروم رہینگے اور خوب ہے کہ اپنی کم فہمی سے دوسروں کو بھی محروم رکھینگے۔

(۲) بنارس کانگرس اور مسلمانوں کا نفع نقصان | سالگزشتہ کی طرح جناب حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس قاولی ضلع علی گڈھ نے اس سال بھی بنارس کے رزولیوشنوں پر مسلمانوں کے فوائد کے لحاظ سے نظر ڈالی ہے اور عام طور کانگرس کی کارروائی کو مفید مسلمانان تسلیم کیا ہے اختلاف صرف چند موقعوں پر کیا گیا ہے مثلاً آپ چاہتے ہیں کہ انتخاب ممبران کونسل وغیرہ میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد کا لحاظ ضرور ہونا چاہیے۔ اور اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی یہ خواہش بالکل درست ہے۔ البتہ جہاں آپ کانگرس کو اس امر پر پابند کرنا چاہتے ہیں کہ انتخاب میں مسلمانوں کی تعداد کا خاص خیال رکھے وہاں مسلمانوں کی جانب سے بھی کانگرس کو اسبات کا اطمینان حاصل ہونا چاہیے کہ مسلمان ممبر متفق علیہ مسائل پر ملکی فوائد کے برخلاف گورنمنٹ کا بیجا طور پر ساتھ دیکر ملک کے بجائے فائدے کو نقصان نہ پہنچائینگے کیونکہ بصورت دیگر آپ کی تجویز کے یہ معنی ہونگے کہ کانگرس اپنے دشمنوں کو اپنا قائم مقام تسلیم کرے اور یہ کسیطرح جائز نہیں ہو سکتا۔

ہمارے خیال میں جب تک مسلمانوں کے چند قائم مقام کانگرس کے لیڈروں سے ملکر تبادلہ خیالات نکریں اور متفق علیہ مسائل کی نسبت فیصلہ نہو جائے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جبتک مسلمانوں میں وہ اخلاقی ہمت پیدا نہو جائے جسکو سالہا گزشتہ کی مضر پالیسی یعنی پولیٹیکل معاملات سے علیحدگی نے تقریباً مٹا دیا ہے اسوقت تک حاجی صاحب کی بجا اور بالکل بجا خواہش مشکل سے پوری ہوسکیگی اور ہم پہلے بھی دکھا چکے ہیں کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے پولیٹیکل معاملات میں سبھوں کا ساتھ دیا ہے وہاں اہل کانگرس نے بھی انکے انتخاب کو بخوشی منظور کیا ہے۔

دوسرا اعتراض آپکا کانگرس کی اس رزولیوشن پر ہے جسمیں مشرقی بنگال میں سرفلر کی جابرانہ کارروائیوں پر اظہار رنج کیا گیا ہے اور بنگالیوں کی تحریر بائیکاٹ سے ہمدردی ظاہر کی گئی ہے۔

حاجی صاحب کے نزدیک یہ تجویز کانگرس کو شایان شان نہیں ہے۔ لیکن ہماری خیال میں جو جو ظلم بنگالیوں پر ہوئے ہیں انکے لحاظ سے کانگرس رزولیوشن کے الفاظ کو اس سے زیادہ سخت ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً حالمیں بریسال کانفرنس کے موقع پر سٹر سریندرناتھ بنرجی کی گرفتاری اور توہین کے واقعہ کو دیکھکر کوئی ہندوستانی جسکے دلمیں ہندو ملک کی کچھ بھی وقعت ہوگی بنگالیوں کو الزام نہیں دیسکتا

حصہ نظم

(روح)

از جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

روح کیا ہے؟ امر رب ذوالجلال — دخل ہے انسان کیا اسکی مجال
روح کیا ہے؟ آمر حصن بدن — فرد کشور کشائی ملک تن
روح کیا ہے؟ معنی لفظ حیات — روح کیا دو اصل ہے اک اسم ذات
روح سے قائم سب ارکان حیات — روح سے وابستہ ساری کائنات
باعث ایجاد عالم روح ہے — مورث شادی و ماتم روح ہے
ہے اطبا کا یہ قول اے ہوشیار — دل میں پیدا ہو جو پاکیزہ ابخار
روح کہتے ہیں اسیکو لاکلام — ہے اسی سے زندگی کا انتظام
روح وہ جوہر ہے مثل لے ایکحکیم — نفس کے اعراض ہیں جسپر مقیم
عین اشیا فی الحقیقت ہے یہی — آگ میں دیکھو حرارت ہے یہی
آب میں دیکھو برودت ہے یہی — پھول میں دیکھو تو نزہت ہے یہی
طبع میں دیکھو تو جودت ہے یہی — جسم میں دیکھو تو طاقت ہے یہی
بہتریں جملہ صنعت ہے یہی — حاصل معنی فطرت ہے یہی
سب جگہ ہے یہ خلا ہو یا ملا — ذرہ ذرہ میں ثبوت اسکا ملا
اسکا نفس ناطقہ بھی نام ہے — جسم اسکا بندۂ بے دام ہے
یہ وہ ہے قابض رہے اسے بیخبر — سب اثاث البیت تن پر عمر بھر
تھا اجازت سے اسیکی خورد و نوش — ساری اعضا اسکے ہیں حلقہ بگوش
دم اسیکا بھرتی ہیں سب قوتیں — اسکی راحت سے ہیں سبکی راحتیں

تھا اسیکا دور دورہ ہر طرف
کالبد اپنا سمجھتا تھا شرف

دلمیں اسکو دی جگہ بالاتفاق
ضعف ہی ہوتا تھا اسکا سبکو شاق

چونکہ پاتا ہے کمال اکدن زوال
ہر خوشی کے ہے نتیجہ میں ملال

بادشاہ و ملک گیر و شہریار
بینوا ہو جائینگے انجام کار

ایک وقت ایسا مصیبت کا پڑا
موت نے اسپر تسلط کر لیا

قابل عبرت تھی اوسکی بیکسی
اُف رے اُسکا زور اوسکی بوسی

ہای کیسی شرم سے منہ موڑ کے
ملک کو جاتی ہے اپنے چھوڑ کے

کوچہ ہر رگ بیاباں ہو گیا
قلعہ دل سارا ویراں ہو گیا

ہے وہی اب طارم قصر دماغ
ہو گیا سنسان جو مانند راغ

ہو گئی بیکار سب فوج قوا
ملک بھر میں اک تلاطم ہو گیا

سچ ہے اُٹھ جائے جہانکا بادشاہ
ہو گئی اوس اقلیم کی حالت تباہ

ہے چراغ روح گل اور رات ہے
ملک جسم اک وادی ظلمات ہے

دور دورہ روح کا جب تک رہا
راحت تن کی نہ تھی کچھ انتہا

اب وہی تو جسم ہے اے بیخبر
چشم عبرت سے خدارا کر نظر

سیج پر پھولوں کے جو بچھین تھا
آج دیکھو خاک میں سب ملگیا

بیکلی تھی جسکو خسخانہ میں آہ
حال پر اوسکے ذرا کر نا نگاہ

اب ہے اک سنسان جنگل ہولناک
جسطرف دیکھو اُدھر انبار خاک

کھولتا ہے موسم گرما سے آب
کب زمیں پر بانوں رکھنے کی ہے تاب

آندھیونکے زور بجلی کی کڑک
سُنکے جسکا ذکر دل جائے دھڑک

وہ گرج بادل کی وہ پانی کا زور
وہ ہواؤنکا ہر اک جانب کو شور

سناہٹ کا وہ عالم لاماں
جنسے چکر میں زمین و آسماں

ہے یہ ہنگامہ قیامت کا بپا
غاک کے کچھ ڈھیر میں ہے وہ دبا

شام مرقد اور سپہ آندھیاری وہ رات
اف معاذ اللہ ہے کہنے کی بات

کھنگی سے تختہائے قبر سب
گر پڑے ہیں ٹوٹ کے سینہ پہ اب

ہے منوں مٹی کا ڈھیر اُس جسم پر
ایک عالم کا بنا ہے رہگذر

یہ شدائد اب وہ جسم نازنیں
سہ رہا ہے اُف بھی کر سکتا نہیں

کچھ تو کہہ اے سونیوالے اپنا حال
دیر سے کرتا ہوں میں تجھ سے سوال

کل تو تھا تو بلبل نغمہ سرا
آج چپ ہے اسقدر یہ کیا ہوا

تیری مجبوری کے صدقے کچھ تو کہہ
دم گھٹا جاتا ہے اب تو چپ نہ رہ

بات کرنا بھی تجھے دشوار ہے
اللہ اللہ اسقدر انکار ہے

کیوں لب شکر و شکایت بند ہے
آج کیوں باب محبت بند ہے

بس عزیز اکدن یہی درپیش ہے
فکر کر گر عاقبت اندیش ہے

محو لعبت خانۂ دنیا نہو
ہستی موہوم پر شیدا نہو

غزل جناب شمس العلما مولوی سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی

عدو کی آزمائش جب ہمارے امتحان تک ہے
تو لازم ہے کہ دیکھو صبر اسمیں بھی کہاں تک ہے

کسیدن تم لڑاؤ آنکھ صحرا میں غزالوں سے
ہمیں بھی دیکھنا ہے دیدۂ آہو کہاں تک ہے

نقاب اسنے جو اپنے چہرۂ روشن سے اُلٹا ہے
نمایاں نور کا عالم زمین سے آسمان تک ہے

خزانِ زندگی ہے تفرقہ اہل محبت کا
مزا دنیا میں جینے کا بہار دوستان تک ہے

نہیں کم راہ پیمائی میں ہوں اے واعظو تم سے
تمہاری دوڑ مسجد تک مری مے کی دکان تک ہے

قدم رکھا ہے اس صحرا میں میرے یوسف دل نے
کہ جسمیں گرد راہ شوق گرد کارواں تک ہے

غم الفت کے افشا سے ہے رسوائی سی رسوائی
عدو کا دوست بیتابی سے میرا رازداں تک ہے

جہاں اندر جہاں ہی اثر ترکیب عالم کی
کسیکو کچھ نہیں معلوم کب سے ہی کہاں تک ہے

غزل جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

بے خطر شوق ملال عشق پیشانی کرے
جو فرشتے سے نہو وہ طبع انسانی کرے

کچھ نہیں بیماری غم کی ترقی کا ملال
دم نکلنے میں مگر اللہ آسانی کرے

چارہ گر تا حد امکان کام اپنا کر چکے
اب خدا ہی کچھ علاج درد پنہانی کرے

ہو گئی برہم مزاجی بھی شریک ناز دوست
کیا سمجھکر کوئی اظہار پریشانی کرے

یہ جواب نامۂ دلدار آیا ہجر میں
بیٹھکر رو بیٹھے گا غم جو طغیانی کرے

اٹھ گئی قسمت سے تاثیر دوا میرے لئے
کون تکلیف علاج درد پنہانی کرے

تین حرفوں میں ہی شرح ماجرای وصل و ہجر
روبروی یار کیوں تقریر طولانی کرے

محشر شوریدہ سر بھی اٹھ گیا مجنوں کے بعد
کہدو وحشت پند رسم چاک دامانی کرے

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ حضرت ثاقب مرقد پارسی

ہی جستجوی مرگ جواب ہجر یار میں
کیا آگ لگ گئی دل امیدوار میں

میں ہوں تو ساری یاس کی سامان ہیں کہ ہی
دست طلب امید کا دامان یار میں

اترا رہا ہوں میں کہ ہوا خاک کوی دوست
عالم غرور کا ہی مری انکسار میں

ہے بیم پر فشانی پروانہ ہای ہای
اتنا بھی دم نہیں مری شمع مزار میں

مطلب ہی سیر باغ سی افزائش جنوں
ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیم بہار میں

کیا دلکو بہا گئیں تری وعدہ خلافیاں
آنے لگا ہی مجھکو مزا انتظار میں

تنگ آ گئے تغافل صبر آزما سی ہم
چٹکی ہی کاش لین وہ دل بیقرار میں

شرمندہ ہو کے گر گئے اپنی نظر سی آپ
یعنی کہ ہم سما نہ سکے چشم یار میں

آنا ترا بھی روز قیامت سے کم نہیں
ہے انتظارِ مرگ ترے انتظار میں

ہوں گلفروش جلوۂ صبح وطن ہنوز
بے لطف کیوں ہو شام غریبی بہار میں

وحشت نہ پوچھ ہستی جیب و جنونِ دست
وحشت نے گل کھلائے ہیں فصلِ بہار میں

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اعظم اجیگڑہ سنٹرل انڈیا

مر گیا مرنا مجھے منظور تھا
کیا عدو کی طرح میں مجبور تھا

کل کسی کی بزم میں دیکھا یہ رنگ
کوئی روتا تھا کوئی مسرور تھا

دیکھنے کو کس طرح ملتا ہے مجھے
وہ حجابِ شرم میں مستور تھا

جب کہا ترکِ محبت کے لئے
بولے ہمکو بھی یہی منظور تھا

سچ ہے آپ انکو مٹائے کس طرح
مدعی داغِ دلِ مہجور تھا

اب تجھے عاجز نوازی آگئی
اس سے پہلے تو بہت مغرور تھا

بزم میں پہلی تھی کیسی چاندنی
چاند گویا ساغرِ بلور تھا

روز روشن ہو گیا روز سیاہ
یہ بھی احسانِ شبِ دیجور تھا

مر گیا اخگر تو وہ کہنے لگے
مہربانِ آتشِ مغفور تھا

جناب مولانا شفق عماپوری ضلع گیا تلمیذ حضرت امیر مینائی

جگائے جاتے ہیں جادو کسی کی چشمِ فتاں میں
نگاہ سرمہ سا ہے فتنہ پردازی کی مژگاں میں

نگاہِ باغباں ہے تاک میں اور گھات میں گلچیں
یہ دو کانٹے ہیں بلبل کیلئے صحنِ گلستاں میں

ملائیں خاک میں کس طرح طفلِ اشک کو آنکھیں
بڑی ناز و نعم سے پالا ہے اس کو دامنِ مژگاں میں

بچے کیا میری نظروں میں بہارِ خلد اے زاہد
نہ بہلیگا یہ دل نقشِ اوگار طاقِ نسیاں میں

اُڑا کر دھجیاں مجکو بنایا رخت عریانی
بچھوڑا تار باقی دستِ وحشت نے گریباں میں

کہاں ہی آکے مٹی دے غبارِ ناقۂ لیلی
کہ بے گور و کفن ہی لاشۂ مجنوں بیابانمیں

مقدر جانے اسکو وصل کا سامان کب ہوگا
کہ ہم کچھ اور دُلہن میں ہیں فلک کچھ اور سامانمیں

نکوئی شمع تربت ہے نہ کوئی چادرِ گل ہے
اُداسی خاک اُڑاتی پھرتی ہی گورِ غریبانمیں

دکھایا ہی یہ نیرنگ مضامیں طبع رنگیں نے
کہ ہیں ہر رنگ کی غزلیں شفق بھوپالی دیوانمیں

سمندر آنسوؤں کا موجزن ہی چشمِ گریانمیں
کہاں جاتا ہی تو اے دل نکلکر ایسے طوفانمیں

ہمارے کام آیا وقت پر سوزِ دروں آخر
بنا داغِ جگر مشعل شبِ تاریک ہجرانمیں

بتونکے ناوکِ مژگانسے اے زاہد خدا حافظ
مجھے ڈر ہی کہ رخنے پڑ نجائیں تیرے ایمانمیں

زیارت کعبۂ دلکی ہی میرا مشغلہ زاہد
ادب سے سر جھکا رہتا ہی محرابِ گریبانمیں

زہے وحشت وہی سرگشتگی ہی خاک ہونے پر
بگولا بنکے میں چکر لگاتا ہوں بیابانمیں

یہ سودا ہی کہ نالے تک ہمارے دو دو دل ہوکر
پریشاں پھر رہی ہیں الفتِ زلفِ پریشانمیں

لبِ زخمِ جگر پر کیوں ہی غورِ العطش قاتل
بھری تھیں آگ کی چنگاریاں کیا آپکے کانمیں

برائے نام گویا ابروی اہلِ رفعت ہے
نہیں اک بوند پانی چشمۂ مہرِ درخشانمیں

شفق یہ رنگ لائیں زمزمہ پردازیاں میری
کہ سُنکر دنگ ہیں مرغانِ خوش الحاں گلستانمیں

(میرزا لا اُبالی کا انار)

کہتے احباب ہیں کچھ مدحتِ رُماں کہیے
میں جو خاموش ہوں، فرماتی ہیں ماں کہیے

نخلِ سرسبز میں جو سُرخ لگا ہی یہ انار (ق)
چرخِ اخضر پہ اسے مہرِ درخشاں کہیے

اسکو فرمائے رُماں بہشتی، لاریب
قلمِ شاخ میں اک آیتِ قرآں کہیے

لو فرضنا جو اُسے کہیے بھی نخلِ سرِ طور
تو اسے لقۂ نورِ رُخِ یزداں کہیے

سبزہ رنگ اک بُتِ ہندو ہی، جو بالفرض نہال
کیوں نہ پیشانی پہ اُسکے اسی افشاں کہیے

باغ اندر میں کہری یا کہ یہ ہی سبز پری
کان میں اسکے ہی آویزۂ مرجاں کہئے

ٹہنی کو اسکی جو کہئے ہی زمرد کی چھڑی
عوضِ دستہ اسے لعل بدخشاں کہئے

آتش تر کا چلکتا ہوا ساغر کہئے
صاف مینائے مئے بادہ پرستاں کہئے

وجہ کیا باندہئے اسکو جو نہ قندیل فلک
کیا سبب اسکو نہ گوئے سر چوگاں کہئے

قمقمہ نور کا اک، اسکو سمجھئے بے شبہ
اور فانوس سر شمع شبستاں کہئے

بے تکلف اسے اک آگ بھبوکا لکھئے
بے تامل اسے اک گنبد گرداں کہئے

بے پس و پیش اسے حقہ دُر کیجئے فرض
اسکے دانوں کو مگر گوہر خنداں کہئے

مان لیجئے اسے اک شوخ کا ہنستا مکھڑا
ہیں نمایاں جو یہ دانے انہیں دنداں کہئے

یا یہ ہی شعلۂ ناراس سی یہ پیدا ہیں شرر
پنجشاخہ اسے یا مشعل سوزاں کہئے

اور بھی کہئے جو کچھ آئے پسند خاطر
لا اُبالی کو مگر اسکا ثنا خواں کہئے

غزل جناب قاضی شمس الضحیٰ صاحب آتشگر دلی۔ اے قاضی پوری

بارا جگر کو زندگانی ہے
ناتوانی سی ناتوانی ہے

آکے مجھ تک پلٹ گیا ساقی
دور مے دور آسمانی ہے

دشت ہے اک نگار خانۂ چیں
پای مجروح دستِ مانی ہے

دل ہی اک داستانِ عبرت خیز
عشق پُر درد اک کہانی ہے

عشق خوباں خلاصۂ صد عمر
زندگی مرگ ناگہانی ہے

عیش دنیا حباب ہے آخر
ایک غم ہے کہ جاودانی ہے

غزل جناب محمد منور خاں صاحب گوہر مدراسی

کھولدی باب قفس چھوڑ دی صیاد مجھے
فصل گل آئی ہی آتا ہی چمن یاد مجھے

جذبۂ عشق میں ہوتی ہی بلا کی تاثیر
کیا یہ ممکن ہی کریں وہ نہ کبھی یاد مجھے

تو نے اے پیر مغاں ایسی پلائی ہی شراب
کر دیا ہی غم کونین سے آزاد مجھے

داغ سا سحر بیاں اب ہی کہاں اے گوہر
نظر آتا نہیں ایسا کوئی اُستاد مجھے

غزل جناب مسعود رضا صاحب جدّت مدہ پور بہاگلپور

یہ ڈھٹائی نہیں تو پھر کیا ہے
کج ادائی نہیں تو پھر کیا ہے

ہم سے نفرت ہے غیر سی اُلفت
میرزائی نہیں تو پھر کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور تم بیزار
یہ رُکھائی نہیں تو پھر کیا ہے

میں کشیدہ ہوں تم کشیدہ ہو
یہ لڑائی نہیں تو پھر کیا ہے

اُنکے در تک نہ پہونچو گے جدّت
جب رسائی نہیں۔ تو پھر کیا ہے

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر عظیم آبادی

وہ شوقِ وصل بڑھاتے ہیں ورنہ فرقت کیا
انہیں کا فیض ہی میں کیا مری صحبت کیا

بسی ہوئی ہے اُمیدوں کی اک نئی دنیا
اُسی کی شان ہی اتنے سو دلکی وسعت کیا

تو کیا میں ہی نہیں ان عاشقوں میں اس قابل
مجھی کو سہو کرے گی تری عنایت کیا

مریضِ غم کو عبث پوچھتے ہیں مجھ سے آپ
گذر چکا ہو جو حالت سے اسکی حالت کیا

کسی سے کیا غرض اپنی سی آپ مطلب ہے
مرے زمانے کی اے شاد آدمیت کیا

نکلجائے گا اگر ان حوصلہ اُمیدوار ونکا
دُعائیں کہو لدین گی مدعا پرہیزگار ونکا

بیابانِ جنوں میں رہگئی مُنہ دیکھ کر آخر
نہ پیچھا کر سکی اے گرد تو چابک سوار ونکا

خیالِ یار کہتا ہی کہ دل لے جان از خودی
کسی پہلو قصور اسمیں نہیں ہم غمگسار ونکا

زرِ گل مفت لٹتا ہی خزاں کی مہمانی میں
الٰہی خیر ہو وارا نیارا ہے بہار ونکا

نہ چھیڑو داستانِ ہجر کو دیوانِ محشر میں
خدا کے واسطے پردہ نہ کھولو شرمسارونکا

تری زلفِ مسلسل کو نہ سلجھائیں کہ سلجھائیں
اسی سودے میں ناحق وقت گذرا ہیچ کارونکا

تجھے بھی اے فلک تلووں کا میرے آبلہ سمجھے
تری جانب ہمیشہ منہ پھرا رہتا ہے خارونکا

بہت توڑا ہے دل اے شاد تب شہرت ہوئی حاصل
کیا نقصان خود اپنا۔ کیا بگاڑا میں نے یارونکا

جو اپنے آپ میں میرا دلِ حزیں ہوتا
تو کچھ مقامِ تردد نہ تھا کہیں ہوتا

محال تھا ترے کوچہ کی خاک کا ملنا
الٹ کے لاکھ اگر آسمان زمیں ہوتا

نواز تا کسی عاشق کو تو اگر اے حسن
تو پھر ضرور یہ چرچا کہیں کہیں ہوتا

بہت سے شک ترے دیدار میں بتا دیتے
کہیں کا میں نہ رہا تھا اگر یقیں ہوتا

کیا زباں نے مری بے خودی میں شکوہ یار
بڑا غضب تھا اگر کوئی نکتہ چیں ہوتا

جو شوقِ وصل ملتا تا دلِ فراق نصیب
تو مستحق صدا حسنت و آفریں ہوتا

ہمیشہ غنچۂ خاطر مرا کھلا رہتا
جو شاد بزم میں حافظ کا ہمنشیں ہوتا

غزل حسرت موہانی

میں ہوں مجبورِ دلِ ہے سودائی
رخصت اے صبر اے شکیبائی

حسن کو ہے سرِ خود آرائی
مژدہ اے آرزوئے شیدائی

نظر افروزِ اہلِ بینش ہے
تیری پنہانیوں سے پیدائی

متحقق ہے جلوۂ رخِ یار
متحیر ہے شخصِ بینائی

ہے وہ رنگین اداؔ بشان وفا
جانِ محبوبی و دلارائی

مذہبِ عاشقی میں ہے اے عقل
بیخودی انتہائے دانائی

اثرِ حسنِ یار سے آخر
آگئی عشق میں بھی رعنائی

عشق کامل کے دونوں ہیں مرغوب
سحرِ وصل و شامِ تنہائی

بندۂ بندگانِ حضرتِ عشق
حسرت سرفرازِ رسوائی

رسید کتب

(۱) لطائف کوہستان | یعنی سلسلہ کوہستان نمک (ریاست پٹیالہ) کے باشندوں اور مقامات کے دلچسپ حالات کا مجموعہ (۱۸×۲۲/۱۶) کی تقطیع حجم ۱۰۰ صفحے) مطبوعہ رفاہ عام آئیم پریس لاہور مع محصولڈاک ۱۴ سے میں مصنف یعنی منشی رای بھگونت رائے صاحب اکال گڈھ ریاست پٹیالہ سے ملسکتی ہے۔

(۲) لطائف وظرائف | یعنی دو ہزار تاریخی لطیفوں کا مجموعہ جنکی تلاش اور ترتیب میں مولف کتاب منشی فاضل مولوی محمد عباس صاحب ایم۔ اے پروفیسر سینٹ زیویر کالج بمبئی نے بڑی محنت اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ مہذب اور متین ظرافت کا مستند اور تاریخی نمونہ اس سے بہتر مشکل سے ملیگا۔ تقطیع ۱۸-۱۲ حجم ۱۵۶ صفحے کسائی چھپائی قابل اطمینان عہ میں مصنف سے (مسافر خانہ کمو۔ فورٹ بمبئی) دستیاب ہوسکتی ہے۔

(۳) تاریخ مصر | تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۰۸ صفحے قیمت ۸ رکار آمد اور ضروری کتاب ہے۔

(۴) حیات شمع | میں شمع کی لو اور اسکی روشنی۔ وزن و ماہیت وغیرہ کے متعلق مفصل اور باتصویر علمی حالات درج ہیں تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۴ صفحے قیمت ۶ ر

(۵) سرگزشت | رابن سن کروزو یعنی ڈیفو کی مشہور عالم کتاب رابن سن کروزو کا اردو ترجمہ نہایت دلچسپ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ لڑکوں کو پڑھایا جائے۔

مندرجہ بالا تین کتابیں پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی۔ انارکلی لاہور سے ملسکتی ہیں

بخت رانا زم کہ یوسف رابہ بازار آورد

صاحبو! میں وہ بدقسمت لڑکا ہوں جسکا باپ ایک جلیل القدر انسپکٹر پولیس تھا۔ جنہوں نے مجھے سات برس کا چھوڑ کر انتقال فرمایا۔ اور اب میں بارہ برس کی عمر میں ہوں میرے مرحوم باپ کو علم جفر سے نہایت شوق تھا اور اس علم کی بیشمار اور جس قیمت پر کتابیں اُن کو ملسکیں انہوں نے جمع کر کے اپنی کل آمدنی کو اسمیں صرف کردیا انوبت بایں جا رسید کہ اُنکے ذوق میں گھر تک بھی نہ بنایا جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اب میں بے خان و مان ہوں بہت سی کتابیں قلمی ہیں جو نایاب گنی جاتی ہیں چونکہ مجھے انگریزی تعلیم کے لئے خرچ کی ضرورت ہے اور سوائے ان کتابوں کے اور کوئی اثاثہ میرے پاس نہیں ہے لہذا میں ان سب کتابوں کو فروخت کرنا چاہتا ہوں اگر کوئی شوقین خریدار ہوں تو مجھسے بتہ ذیل سے خط کتابت کریں زیادہ ادب خاکسار

تجمل حسین۔ معرفت قاضی محمد فاروق انصاری علیگڈھ

اُردوی معلّٰے

یعنی صحیح و فصیح اُردو کا ایک ماہوار ... اور قابل دید رسالہ جسکے ساتھ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کسی دیوان بلا قیمت مفت ناظرین ہوتے ہیں۔ حجم ۲۰ صفحے کپڑی چھپائی کاغذ بنایت پسندیدہ نمونہ کا پرچہ ۲ر کے ٹکٹ کے بدلے بعوض لیا جاتا ہے۔ (۱) رسالہ دواوین مع رسالہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ معمولی سفید کاغذ پر) بکے سالانہ (برائے طلبہ و غیر مستطیع حضرات) مقاصد ضروری سیکھنے دیگر مقاصد مطبع و بالفیکس درخواست خریداری بنام منیجر اُردوی معلّٰے علی گڑھ آنا چاہئے

لہ چنانچہ شمارہ ۹ میں (۱) رپورٹ اُردو بمبئی کانگرس (۸ر) دیوان میر سوز (۲ر) اور دیوان قائم چاند پوری شاگرد سودا (۴ر) شائع ہوئے اور نمبر ۱۰ کی ششماہی آخر میں دیوان حسرت استاد حرات مفت دیا گیا۔

دیوان غالب طبع ثانی لہ

سفید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گزر اتھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اُردوی معلّٰے علی گڈھ تقطیع ۲۶×۱۸/۸ حجم تقریباً ۱۶ جزو قیمت مع محصول و شرح دیلو صرف عہ ر

درخواست خریداری بنام۔ منیجر اُردوی معلّٰے علی گڈھ آنا چاہئے فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۳ تا صفحہ ۱۲ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ جس میں غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

لہ طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کر دی گئی ہے اور اشعار کے مطالب میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ جابجا ترمیم بھی کر دی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے۔

... رئیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بہاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بہاگلپور کے چند زمیندار روسائے متدرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہرگز نیت نہیں کہ وہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ مشار الیہا کمپنی کا خاص یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس دیسی لٹھے کپڑے از قسم لنگی چادر و صوفی و صافہ و رومال دستی و سوتی لنگا و سارسان ہر قسم ہر رنگ کی و تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دھوپ چھاں و سکوہ و چھک و دوٹہ و بافتہ وغیرہ لائق تیاری شبروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون و ہندوستان ہر جگہ بآسانی پہونچائے جاتے ہیں۔

نفاست و پائداری میں ہر خاص بہاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ زنانہ طرز کے کپڑے بھی نمونہ دیکھنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں فرمائشیں ذیل کے پتے سے آنی چاہئیں۔ المشتہر

ڈاکٹر اشرافت حسین سکرٹری رئیس ٹریڈنگ کمپنی بہاگلپور محلہ ...

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اُردوی معلّٰے۔ غزلوں کا انتخاب اس احتیاط اور غزلوں کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا تینوں دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع ۲۶×۱۸/۱۲ حجم ۷ جزو قیمت صرف (۸ر) مع محصول ڈاک المشتہر منیجر اُردوی معلّٰے علی گڑھ

سرخ و سبز اشتہار اُردوی معلّٰے

	صفحہ کا قطع	نصف صفحہ کا قطع	ربع صفحہ کا قطع
سالانہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ششماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک نمبر ۱۵

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور پینتیس چیزیں مفت

ناظرین کو خوب خیال ہوگا کہ یہی ریلوی فیشن کی جیبی گھڑی کسی وقت میں دوسرے سوداگر سات روپیہ کو بیچا کرتے تھے لیکن جب ہمنے وسادے سے چالان خود لگایا اور قیمت ہم نے گھٹا دی تب اور سوداگر حسد سے بھوکر لینے لگے مگر کریں کیا ہمنے اب اسکے ہمراہ پینتیس چیزیں مفت دینا شروع کر دیں یہ گھڑی ۴ گھنٹے کی کوک کی اصل ڈائل مع سکنڈ ٹاک خانہ ریلوی اور تار گھر کے لئے موزوں ہے۔

ہم اسکو پانچ روپے کی پائمار سے تیار کرتے ہیں اور ہم اسکو چار روپے میں فروخت کرتے ہیں اور ہم اسکو چار روپے میں فروخت کرتے ہیں

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ جوتے

کی پائمار سے

کانپور کے ہر قسم کے زین

کانپور کے ہر قسم کے ساز

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ

تعریف

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسر نامور ڈاکٹر والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹر نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت وتار کی چشم دہند جالا۔ پڑوال۔ غبار۔ پھولا۔ سیل۔ سرخی۔ ابتدائی موتیا۔ ناخنہ۔ پانی جانا۔ خارش وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی بچے سے لیکر بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ ممیرہ کا سفید اعلیٰ قسم فی تولہ تین روپیہ خالص ممیرہ فی ماشہ بیس روپیہ عمدہ سرمہ فی تولہ ۴ محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر

پروفیسر سیا سنگھ اہلو والیہ مقام بٹالہ ضلع گرداسپور پنجاب

ان سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ کہ سردار سیا سنگھ صاحب نے خود بنایا ہے آپ خود اور بہت سے مریضوں پر استعمال کرکے دیکھا ہے اور میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نادر ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کے واسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنی تجربہ میں آجتک کوئی سرمہ اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں دیکھا۔ میں اُن کو جنکی آنکھوں میں ذرا بھی کسی قسم کی شکایت ہے بڑے زور سے استعمال کرنیکی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ پانی آنا۔ دہند۔ خارش۔ سرخی چشم کے واسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ اور سچ مچ آپ نے اسقدر سستے داموں میں یہ سرمہ ایجاد کرکے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہمارا شکریہ الفاظ میں ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ آپکے سرمہ سے فیضیاب ہو کر فائدہ اُٹھائیں اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔ راقم پنڈت گنگا رام بیدی

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اردوی معلی

جلد (۶) | بابت مئی ۱۹۰۶ء | نمبر (۵)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

(۱) عود لکھنوی - از حضرت وصل بلگرامی ..... صفحہ ۱

(۲) دار السلطنت فرانس کی سیر "ڈائری" ۱۲

(۳) بیاض الازہر ۲۵

(۴) مسلمان اور کانگریس از حق پسند ۲۶

(۵) بنگ روس و جاپان از حضرت ضامن کنتوری ۳۵

(۶) مکتوبات امیر جنائی از حضرت ثاقب ۴۷

(۷) قطعہ مولوی برکت اللہ صاحب لندن یونیورسٹی ۴۹

(۸) ظریفات تفرق ۵۰

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علی گڈھ

"احسن المطابع" علی گڈھ میں مطبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول ..... عہ سالانہ
قسم دوم ..... چار سالانہ }

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس

سلسلہ

اور اس سلسلہ کوہستانی کے مفصل حالات

کتاب لطف کہسار | میں نہایت قابلیت سے بکمال محنت و تحقیق لکھے گئے ہیں۔ انگریزی و اردو وغیرہ چند باتوں میں ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی۔ خط پاکیزہ۔ کاغذ اعلیٰ۔ چھپائی مطبع رضا وہ حاصل ہے۔ عبارت دلفریب طرز بیان طلسم خیز۔ انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے

مختصر فہرست مضامین

(۱) مصنف کی پہاڑ پر تعمیر
(۲) اس سلسلہ کوہ کی اجمالی کیفیت
(۳) کوہستان اور اسکی حقیقی لطف
(۴) علمہ کالکا کا کاٹ روڈ اور راوی
(۵) پہاڑی جھد اور سیلے
(۶) پہاڑی عورتوں کے ذاتی حالات
(۷) جنگل اور جانور
(۸) بارش اور برف کے نظارے
(۹) پہاڑی چاہوں کے حالات
(۱۰) شملہ کی سیر

اور دیگر بیش بہا مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ سینریوں کے نقشے کھینچے گئے ہیں قیمت مع محصول ڈاک محض ۱۴ر

اردو بہر گوسنگتا | (یعنی مراۃ الغیب) ایک ہزار جلد میں سے پچاس جلدیں باقی ہیں قیمت مع محصول ڈاک ۲ر

ملنے کا پتہ۔ ڈاکخانہ اکال گڈھ ریاست پٹیالہ۔ منشی رائے بگونت رائے اڈیشنل نائب ناظم

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت شیخ العالم مخدوم عبدالحق ردولوی قدس اللہ سرہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمت اللہ

قیمت (۸ر)

دیوان مجروح

[illegible] حسین صاحب مرحوم شاگرد غالب قیمت عہ

اردوی معلی جلد پنجم مکمل

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع رپورٹ بمبئی کانگرس

بلا قیمت

قیمت عا مع محصول دفتر اردوی معلی علیگڈھ سے طلب کریں

المشتہر

منیجر اردوی معلی علیگڈھ

شیخ محمد عبد

ملکہ فرخ مرزا

اس ناول کا لطف اور حسن بیان دیکھنے کے قابل ہے واقعات کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ ہر واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور مذاق لطیف حسن و [illegible] جو کچھ عدیم المثل مصنف کے ہر زور قلم سے نکلا ہے وہ [illegible] زبان کا ایک دریا ہے کہ موجیں مار رہا ہے ساتھ اوسکے اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ قلب پر ایک [illegible] پیدا ہوتی ہے۔ یہ ناول نوجوان امرد کے لئے ایک خاص دلچسپی کا باعث ثابت ہوا ہے جسکی تصدیق اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ مع ثانی کی بھی اب چند جلدیں باقی ہیں قیمت عہ محصول ۱۰ر عہ ر

نشان ذیل سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

المشتہر

[illegible] محلہ افضل گنج مکان مولوی غیاث الدین صاحب وکیل

عصر جدید

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو دیر سوا تین برس سے شائع ہوتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بیکار اور فضول بحثوں میں پڑنے کی بجائے کام کی باتوں پر متوجہ ہوں۔ فضول [illegible] کاہلی۔ بیکاری کو ترک کریں۔ پیشہ ور گداگری کو [illegible] محنت اور کام اور جائز ذرائع معاش کی طرف آمادہ ہوں۔ تعلیم معمولی سے بجائے فضول تقلید اہل فرنگ کے اتفاق و اتحاد کا سبق لیں۔ مذہب کا صحیح خیال اور خوف خدا لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رشوت دغا کی فضولیات اور فریب لینے کا مرض دور ہو۔

اسکے آنریری اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے ایل ایل بی۔ وکیل ہائیکورٹ سکرٹری اصلاح بدن (سابق چیف جج ریاست الیر کوٹلہ) ہیں اور اس رسالہ نے مسلمانوں کو ایک حد تک بیدار کیا ہے ..... قیمت نمونہ ۲ر جواب طلب امر کے واسطے جوابی کارڈ۔

المشتہر

منیجر عصر جدید گوگل گنج۔ لکھنؤ

حمد بلگرامی

دنیا میں ہزاروں باکمال ایسے قبر میں آرام فرما رہے ہیں جن کے نام و نشان تک سے لوگوں کو واقفیت نہیں - اور ہوتی بھی تو کیونکر اس لئے کہ وہ بغیر اپنی کسی شہرت یا یادگار کے چھوڑے اس عالم سے رخصت ہوئے ہیں - اور اپنے کمال کے ساتھ اپنا نام و نشان بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں -

اسی طرح سے اب بھی دنیا باکمال حضرات سے خالی نہیں - تلاش کرنے سے بہت سے ایسے ملینگے جن کا نام بھی کبھی کسی نے نہ سنا ہوگا - اُن کو خود اس طرف توجہ نہیں ہے اور لوگوں کو اسکا خیال کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے حضرات کا پتہ لگا کر کم سے کم اُن کا تذکرہ اور اُن کے کمالات کا حال تو لکھکر شائع کر دیں جس سے لوگ واقف ہو کر اونکے کمالات کے فیض سے سیراب ہوں اور بعد اُن کے اُن کا نام عمدہ شہرت کے ساتھ تواریخ کے اوراق میں جگہ پاکر صفحۂ ہستی پر باقی رہے - خدا کا شکر ہے کہ اب بہت سے اہل قلم اس طرف رجوع ہو کر بڑی سرگرمی سے اسمیں ترقی دکھا رہے ہیں -

مجھکو بھی عرصے سے اسکا خیال اور کوشش ہے لیکن بوجوہ چند میں اب تک اسکا کوئی عملی نمونہ نہیں دکھا سکا -

اب کی بار کانفرنس میں شرکت کی غرض سے میرا علی گڈھ جانا ہوا وہاں میرے خاص کرمفرمائے باذاق شاہ محمد نذیر صاحب ہاشمی غازیپوری نے مجھکو مجبور کیا کہ جسطرح سے ہو میں علاوہ اور مشاہیر کا تذکرہ لکھنے کی سب سے پہلے اپنے اُستاد کا تذکرہ لکھوں اور اُردوی معلےٰ کے ذریعے سے اسکی اشاعت کروں - آخر مجھکو اُن کی یہ رائے پسند آئی اور اس کام کے لئے مستعد ہو گیا -

افصح الفصحا حضرت حمد لکھنوی مدظلہ العالی کے نام نامی سے آگاہی رکھنے والے اور اُن کے چٹ پٹے کلام کے والہ وشیدا تو شاید ہی ہندوستان بلکہ اور غیر ممالک میں کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں نہوں مگر اُن کے تاریخی حالات کے جاننے والے بیشک بہت کم ہوں گے اور یقیناً اُن کے کلام کے قدردانوں کو اُنکا تذکرہ دیکھنے کا اشتیاق بھی اُنکے کلام فصیح کے دیکھنے اور سُننے سے کچھ کم نہ ہوگا۔

حضرت حمد عثمانی لکھنوی کا نام نامی محمد محمود ہے اور رفیق الدولہ دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر متخلص بہ ظہیر کے خلف الصدق قوم شیخ حنفی مذہب ہیں۔ نسب کا سلسلہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے آباو اجداد کا قدیمی وطن شہر قنوج تھا جسمیں سلطان شمس الدین ایلتمش کے عہد میں اوّل اول آپ کے جد اعلیٰ حضرت حاجی محمد سالار تشریف لاکر سکونت پذیر ہوئے۔ اودھ کے نامی گرامی قصبہ بلگرام میں آپ کے پردادا شیخ امام الدین کا عقد ہوا جب سے وہاں کے لوگوں کے خواہش واصرار اور اس رشتہ مندی نے اُن کو وہیں رہنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ آپ کے جد امجد منشی محمد مسعود صاحب وہیں پیدا ہوئے۔ اور عالم شباب میں مع اپنے پدر بزرگوار شیخ امام الدین صاحب کی عہد نواب سعادت علیخاں بہادر میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور دربار نواب میں باریاب ہوکر تا حیات میر منشی دفتر وزارت وبخشی گری وغیرہ عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہے اور وہیں کی سکونت دائمی اختیار کی۔ آپ کے والد ماجد منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر کہ جنکو نواب معتمد الدولہ سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ وزیر اعظم شاہ اودھ عرف آغا میر نے متبنیٰ کیا تھا بعد وفات اپنے والد کے نواب صاحب موصوف کے ذریعے سے سنہ ۱۲۳۹ ہجری میں سکرٹری دفتر وزارت بمنزلہ نائب وزیر بخطاب دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر مقرر ہوکر خلعت زرین وجیغہ مرصع ومالائے مروارید وغیرہ

سے ممتاز ہوئے۔ بجائے مہر وزارت آپ ہی کی مہر ہوتی تھی عہد حضرت واجد علیشاہ بادشاہ اودھ تک اسیطرح برابر عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہتے چلے آئے۔ المختصر لکھنؤ کے اعلیٰ درجے کے رئیسوں میں تھے۔

جناب منشی محمد محمود صاحب حمد مدظلہم العالی ماہ جمادی الاولےٰ ۱۲۵۸ ہجری چوبیسویں ۲۴ تاریخ بروز پنجشنبہ وقت ظہر خاص شہر لکھنؤ محلہ بازار جھاؤلال میں پیدا ہوئے اور وہیں زیر سایۂ عاطفت اپنے پدر بزرگوار کے تعلیم و تربیت پائی جناب مولانا شاہ محمد عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کے سامنے ادا ہوئی۔ یادہ فیض آپ نے اپنے والد ماجد ہی سے پایا گو کبھی کبھی معلموں کی بھی تعلیم رہی۔

پانچ برس کی عمر میں کیننگ کالج میں جناب گورنر جنرل لارڈ صاحب بہادر وائسرائے ہند اور نیز بہت سے راجوں تعلقداروں وغیرہ کے سامنے ایسی حاضر جوابی کے ساتھ امتحان دیا کہ اس زمانے میں یہ تعجب خیز امر کہ بڑی دھوم دھام سے اخبار میں شائع ہوا اس کیفیت کو آپ کے والد صاحب نے بالتشریح لکھا ہے اس امتحان کی کامیابی میں کتاب لغت سرکار سے مرحمت ہوئی اور ارگن باجا جناب ایلس صاحب بہادر پرنسپل کیننگ کالج نے اور ایک قلمدان پر تکلف مجا ہوا مع دوات نقرہ جناب چودھری نعمت علی صاحب سندیلوی نے عنایت فرمایا اسکے علاوہ ہر سالانہ امتحان میں آپ کی خداداد ذہانت کا ثبوت ہوتا گیا اور برابر بہت سے واقعے درمیان میں اسی کے مثل ظہور میں آئے۔ سات برس کی عمر میں پارۂ عم تبارک پڑھکر ناخواندہ پورا کلام اللہ استاد کو سنا دیا آپ نے چند کتب درسیہ لکھنؤ سے پڑھیں۔ جب آپ کے والد ماجد کو اس تعلیم پر پورا اطمینان نہوا تو یہ بار خود انہوں نے اپنے سر لیا۔ اور برابر آپ کو تعلیم دیتے رہے۔ آپ کی طبیعت بچپن ہی سے اسقدر موزوں واقع ہوئی تھی کہ کبھی ڈھونکے سے بھی کوئی شعر نہ موزوں

نہیں پڑھا۔ ایام طفلی میں چاہے تلفظ میں غلطی باقی رہی ہو مگر ناموزوں زبان سے نکلنا غیر ممکن تھا۔ شاعری کا مادہ خلقی ہے۔ بچپن ہی سے اپنے والد ماجد صاحب کو اکثر متفرق اشعار کہکر سُنایا کرتے تھے۔ کوئی شعر کبھی ناموزوں نہیں کہا۔ دس برس کی عمر میں بخوبی غزل کہتے تھے۔ جیسے کہ فی زماننا مبتدی موزوں طبع شعرا کہہ سکتے ہیں۔ کسی وقت فکر سخن سے غافل نہ رہتے تھے۔

آپ کے والد صاحب کو اُردو کی شاعری خصوصاً طرز عاشقانہ سے بالکل رغبت نہ تھی لیکن جب آپ کی طبیعت اور شوق کا یہ حال دیکھا تو غزل کہنے کی ممانعت بھی نہ کی بلکہ نہایت شوق کے ساتھ اکثر اوقات نکات شاعری سے آگاہ فرمایا کرتے تھے۔ آخر اُنہیں کے اشارے سے آپ ملک الشعرا جناب شیخ امداد علی صاحب بحر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ شیخ صاحب آپ کے والد کے احباب میں سے تھے اور اُنکو بہت مانتے تھے۔ لہذا اُن کے پاس خاطر اور آپ کی رنگینی طبع کی وجہ سے بدل وجان اصلاح میں کوشش فرماتے اور تعلیم فن شعر گوئی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے تھے۔ آپ کی فکر بلند اور ذہن رسا کو دیکھکر نہایت خوش ہو کر اکثر اپنے احباب سے آپ کی بہت سی تعریف کرتے اور فرماتے کہ اگر میری زندگی نے وفا کی تو میرے تلامذہ میں سے یہ ایک ایسے شاگرد ہونگے جن پر کلی اطمینان ہو سکے۔ سنہ ۱۲۹۲ ہجری میں جب آپ کے والد نے انتقال فرمایا اور کیننگ کالج میں اُن کی جگہ پر سخنور نامی و گرامی جناب منشی غلام حسین صاحب قدر بلگرامی پچاس روپیہ مشاہرے پر مدرس درجۂ اول مقرر ہوئے تو چونکہ آپ پیشتر سے کالج مذکور میں اپنے والد سے کتب فارسی پڑھتے تھے اور نام درج رجسٹر تھا لہذا حضرت قدر سے پڑھنے لگے وہ بھی چونکہ آپ کے والد کو بہت مانتے تھے اسوجہ سے تعلیم و تدریس میں کوشش بلیغ کرتے تھے آپکا شوق شاعری حد سے بڑھا ہوا تھا جب حضرت قدر کو اس سے آگاہی ہوئی

تو انہوں نے شعر گوئی سے منع کیا اور فرمایا کہ تم اس خیال میں نہ پڑو ورنہ تحصیل علوم میں حرج واقع ہوگا۔ آپ نے یہ سال دیکھکر اپنی شعر گوئی سے انکار کر دیا۔ اور اُن کی پوشیدگی میں مشق سخن ہوتی رہی اور برابر حضرت تجر سے بدستور اصلاح لیتے رہے۔ البتہ بزم مشاعرہ کی شرکت سے پرہیز رکھا۔

جب آپ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا امتحان پاس کرکے منشی کا خطاب پا چکے تو افسوس اُسی زمانے میں حضرت تجر نے انتقال فرمایا۔ تحصیل کتب فارسی سے تو اطمینان کر ہی چکے تھے اور حضرت قدر بلگرامی سے حسن عقیدت رکھتے تھے ناچار شوق شاعری کا اظہار کرکے ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی۔ اُن کو دیکھکر تعجب ہوا کہ پہلی غزل ایسی کیونکر ہو سکتی ہے۔ پھر آپ نے اپنی شعر گوئی کا ماجرا ابتدا سے کہہ سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم شاگرد نہیں بلکہ میرے قوت بازو ہو اور امداد فن شعر و تعلیم عروض و قافیہ میں دل و جان سے کوشش کی۔ اور آپ کی اصلاح کا یہ ڈھنگ مقرر کر دیا کہ زیادہ اشعار کہوا کر اُن میں سے اپنی پسند کے لائق چن دیا کرتے تھے۔ اگر کسی شعر کا کوئی مضمون عمدہ ہوتا اور اُسمیں کوئی نقص پاتے تو اُسکو درست کر دیا کرتے تھے یہ بات آپ میں تو ابتدا ہی سے تھی کہ جو عیب شعر میں دیکھا کہ اصلاح ہوتی پھر دہوکے سے بھی اُسکو آپ کے کلام میں دخل نہ ہوتا تھا۔ یہ ذہانت اور یادداشت دیکھکر حضرت قدر اکثر اپنے شاگردوں کی غزلوں پر آپ کے سامنے اصلاح دیا کرتے بلکہ آپ ہی کے ہاتھ سے بنواتے اور جملہ عیوب اور وجوہ اصلاح سے واقف کرتے جاتے تھے۔ بعض جگہ آپ ہی ایسا ایک نہ ایک لفظ بتا دیتے تھے کہ وہ پھڑک جاتے تھے حضرت قدر نے خاص آپ ہی کے خیال سے بازار جھاؤلال میں آپ کے مکان کے متصل سکونت اختیار کی تھی۔ اسوجہ سے جو بات اور شاگردوں کو برسوں میں حاصل ہوئی وہ آپ کو دنوں بلکہ گھنٹوں میں حاصل ہوتی تھی۔ المختصر تھوڑے ہی

دنوں کے بعد آپکا کلام عیوب شعر سے پاک ہونے لگا فقط ترقی الفاظ کی اصلاح باقی رہگئی جس سے ہر شخص تاحیات استاد مستفید ہوتا رہتا ہے۔

جب آپ کی مشق سخن اس حد کو پہونچگئی تو قدر مرحوم نے اپنے بعض تلامذہ کی اصلاح آپ ہی کے تعلق کردی۔ اور عام طور سے اصلاح کی اجازت دیدی۔

قدر مرحوم کے بعض شاگرد ایسے ابتک موجود ہیں کہ اُنکے انتقال کے بعد شعر و سخن میں آپ ہی سے مشورہ رکھتے ہیں گو بظاہر قدر مرحوم کے شاگرد بنے ہوئے ہیں آپ کو قریباً چار سال تک شعر و سخن میں اُن مرحوم سے مشورہ رہا۔

جبکہ امتحان میں کامیاب ہوکر آپکا اسکالرشپ منجانب سرکار مقرر ہوگیا اور اوّل زمانہ حضرت قدر بلگرامی کی شاگردی کا تھا تو کیننگ کالج میں جناب پرنسپل کیننگ کالج کی فرمایش سے ایک قطعہ فارسی جناب نواب گورنر جنرل بہادر وزیر اعظم قیصر بالقابہ کی مدح میں لکھکر اُسی کالج مذکور میں راجوں۔ تعلقداروں اور رؤسا شہر کے جلسۂ عظیم میں پیش کیا جسوقت حسب الحکم اُس قطعہ کو پڑھا تو جلسۂ مذکور میں ہر طرف سے سخن کی داد ملی اور نواب گورنر جنرل بہادر موصوف نے اٹھارہ کتابیں اور ایک گلاس نقرہ مینا کار اپنے ہاتھ سے بطور انعام کے مرحمت فرمایا۔

بعدہ قدر مرحوم کی زندگی تک کتب فارسی اور عروض و قافیہ اُنہیں سے پڑھتے رہے اُن کے انتقال کے بعد بطور خود شب و روز کتب بینی اور تحقیقات اور مشق سخن میں ہمہ تن مصروف رہے۔ گردش زمانہ سے بعد وفات اپنے والد مرحوم کے بہت پریشان خاطر رہے۔ چونکہ آپ کے جد امجد امیر الامرا جناب منشی محمد مسعود صاحب اور والد ماجد رفیق الدولہ دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر ظہیر ہمیشہ عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہے اور آپ نے بھی زمانے کے دیکھتے اپنے والد ماجد کے وقت میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ پرورش پائی تھی اور

بوے امارت سرشت میں تھی لہذا تھوڑی تکلیف بھی آپ کے لئے بہت ہو گئی چنانچہ خود اپنے حسب حال فرماتے ہیں ؎

ہو گیا خواب وہ جاہ و حشم آبائی	اے خدایوں تو بنا کر نہ بگاڑا ہوتا

اُسی حالت بیکاری و پریشانی میں ایک مدرسہ موسوم جوبلی اسکول بلگرام میں قائم ہوا اور اُسمیں ایک مدرس فارسی دان کی ضرورت ہوئی تو آپ نے پہلے اپنی سند بخدمت ڈپٹی انسپکٹر صاحب مدارس ضلع ہردوئی و ممبران کمیٹی مدرسہ مذکور روانہ کی بعد اُسکے درخواست فارسی منظوم ارسال کی۔

یہ درخواست منظور ہو کر آپ کے نام پروانہ طلبی روانہ کیا گیا ۱۳۰۶ھ ہجری میں ماہ رمضان المبارک کی بارہویں تاریخ کو بلگرام میں پہونچکر مدرسہ مذکورہ بالا کے مدرس فارسی مقرر ہوئے اور اپنے جد امجد کے مولد میں پہونچنے کی خوشی میں یہ رباعی کہی۔

رباعی

صد شکر کہ حمد در وطن آمدہ است	چوں معنی خوب در سخن آمدہ است

بشگفت بہ بلگرام گلہاے سخن
کاین بلبل شیدا بچمن آمدہ است

اور مورخ نامی شیخ غلام حیدر صاحب ارشد بلگرامی نے یہ قطعہ تاریخ کہا

قطعہ

شکر حق حمد سخنور لکھنؤ بگزاشتہ	سر زمیں جا یگہ آورد در زیر قدم
سال تاریخ ورود ارشد بدست من رسید	در وطن حمد آمدہ یا در تن بے روح دم

۱۳۰۶ھ

اُسی زمانے میں آپ نے ایک خواب دیکھا اور عین خواب میں حضرت شیخ الاولیا مولانا شاہ محمد فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی نور اللہ مرقدہ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور خواب سے بیدار ہوتے ہی فی البدیہہ یہ رباعی کہی۔

رباعی

صد گونہ بجان سپاس یزداں کردم	کو روشن دل ز نور ایماں کردم
بختم بیدار گشتہ ای حمد بخواب	بیعت بر دست فضل رحمان کردم

اور اسکی اطلاع ۲ر شوال ۱۳۰۸ھ کو حضرت مولانا قدس سرہ کے حضور میں بذریعہ تحریر کی جسکے جواب میں مولانا صاحب نے سب ماجرائے خواب پڑھکر خاص اپنے دست وقلم مبارک سے خط کی پیشانی پر ارقام فرمایا۔

(از فضل رحمٰن دعا سلام برسد خواب شما مبارک است مدام شادکام باشند آمین)

اور آپ کے بھائی جناب محمد میاں صاحب (جنکے ہاتھ یہ اشتیاق نامہ بھیجا تھا) سے فرمایا کہ وہ میرے مرید ہوگئے یہ ہی ایک طریقہ ہے اب میرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر ملاقات کے واسطے آجائیں تو مضائقہ نہیں۔ چونکہ آپکا حسن عقیدت مولانا صاحب کی طرف بہت تھا لہذا تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۳۰۹ھ ہجری میں ماہ جمادی الاولیٰ کی بائیسویں تاریخ کو بروز جمعہ اپنے برادر موصوف کے ساتھ مراد آباد میں پہونچکر ظاہرا بھی مرید ہوکر دولت ارادت سے مالامال ہوئے۔

آپ ایک نہایت مستغنی المزاج۔ کم سخن اور آزاد منش آدمی ہیں عزلت گزینی پسند ہے لوگوں میں زیادہ بیٹھنے اور فضول باتوں سے سخت نفرت ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ کی ہر وقت کی مونس وہم صحبت کتب اور بارع صحبت احباب اصلاح تلامذہ اور شغل تصنیف وتالیف ہے شعر وسخن کی طرف ایسی کچھ طبیعت محو ہے کہ اسکے سوا دوسری فکر ہی نہیں سارے مصائب وتکالیف دنیاوی ایک طرف اور ایک عمدہ مضمون نکل آنے کی خوشی ایک طرف چنانچہ خود ہی کہا ہے اور بہت ٹھیک کہا ہے ؎

اپنی کچھ فکر نہیں فکر مضامین کے سوا	تمنے اسے حمد فن شعر نہ سیکھا ہوتا

باوجود کار ملازمت و افکار چند در چند ابتک تصنیف و تالیف کا ذخیرہ یہ ہے۔

(۱) قواعد صرف و نحو۔ (۲) مثنوی اُردو موسوم باسم تاریخی خرمن شوق۔ ۱۳۰۲ھ (۳) مثنوی اُردو دیگر بطرز و جواب گلزار نسیم۔

(۴) لغت زبان اُردو مسمّٰے بہ ہزار داستان۔ جسمیں ہر لغت اور محاورے کے ساتھ لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ کے اشعار مثال میں موجود ہیں۔ ناتمام۔

(۵) انشاء و جرایم۔ یہ مسدس اودہ اخبار لکھنؤ میں طبع ہو چکا ہے۔

(۶) مراتب ستہ۔ چہ نصیحتانہ مسدس۔ یہ بھی اودہ اخبار لکھنؤ میں طبع ہو چکے ہیں۔

(۷) لواے حمد۔ ذکر میلاد نبوی۔

(۸) مثنوی قند مکرر۔ جسکو منشی نولکشور صاحب مالک مطبع اودہ اخبار کی فرمایش سے ۱۳۰۴ھ میں تصنیف فرمایا اسمیں شکسپیر کے ترجمہ اُردو کے تین قصے نظم کے ہیں قریب دو ہزار چہ سو اشعار کے اسمیں ہیں۔

(۹) مشاہیر بلگرام کا تذکرہ فارسی۔

(۱۰) دیوان فصاحت نشان موسوم باسم تاریخی ارمغان جدید۔ ۱۳۱۳ھ

(۱۱) رسالہ متروکات وغیرہ موسوم باسمی تاریخی مخزن تحقیق۔ ۱۳۱۵ھ

اسمیں تمام اپنے اور دیگر فصحا کے متروکات وغیر فصیح وغیرہ الفاظ مع عیوب شعر و غلطی املا و فوائد و تنبیہات مفیدہ وغیرہ نہایت تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔

راقم نے جناب کا تذکرہ لکھنے میں بہت اختصار پر نظر رکھی فقط ضروری حالات وہ بھی مختصر طور سے قلمبند کئے۔ اکثر شعرائے نامی سے جو مباحثے اور معرکے ہوئے یا بعض کم مایہ معترضوں نے ٹوک کر دندان شکن جواب پائے اُن کی تصریح کرنی خالی از طوالت نہیں اگر شرح سوانح عمری لکھی جائے تو پوری ایک کتاب ہو جائے۔

المختصر بالفعل آ ملازمت گورنمنٹ اسکول بلگرام ضلع ہردوئی اوقات بسر کر رہے

ہیں۔ چونکہ عرصے سے قیام ہے اور بوجہ سلسلۂ قرابت بلگرام میں مکان ذاتی بھی موجود ہے اور مستغنی المزاجی و بے پروائی انتہا درجے کی ہے لہذا ایسا کچھ اُنس ہوگیا ہے کہ اور کہیں باہر جانا پسند نہیں۔

افسوس کہ ایسے ایسے ہنرمند کس مجبوری کی حالت میں کس مپرسی کے زندان میں اپنی بے بہا زندگی کے دن پورے کر رہے۔ دعا ہے کہ جلد کوئی والئے ملک رئیس اعظم حسن لیاقت کے موافق قدر و منزلت کرکے آپ کے آبا و اجداد کے مثل آپ کو بھی مناصب اعلےٰ پر ممتاز فرمائے آمین۔ آپ کے اکثر شاگرد لائق و فائق موجود ہیں۔

آپ کے کلام سے عجب شوخی اور فصاحت ٹپکتی ہے زبان کی صفائی اور روز مرہ میں تو اپنا نظیر نہیں رکھتے آجکل لکھنؤ کے نامور اُستادوں میں ہیں۔ آپ کے کلام کا رنگ و طرز اپنے اُستاد حضرت تجرؔ مرحوم لکھنوی سے بہت ملتا جلتا ہے بلکہ بندش کی صفائی اور طبیعت کا چلبلا پن زمانۂ حال کے موافق بڑھا ہوا ہے۔ اس موقع پر ایسی بات ہی نہیں کہ ہمارے سخن شناس احباب ایسے لایق اُستاد کے حال سے واقف ہو کر اُسکے کلام کے مشتاق نہوں لہذا پہلے ہم اُس دو غزلے کے اشعار ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو عالیجناب نواب محمد ابراہیم علی خاں بہادر تخلص بہ خلیلؔ والی ٹونک کی طرح عطیۂ گلدستۂ ریاض سخن میں جناب ممدوح نے فرمایا تھا۔ اسطرح کا گدستہ بھی بپاس تخلص جناب نواب صاحب گلزار خلیل کے نام سے شائع ہوا تھا اور آپ کا ارشاد تھا کہ ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ شعرا نامی اسطرح میں کیسے کیسے گل کترتے ہیں۔ حضرت داغؔ دہلوی مرحوم اور دیگر سخنوران نامی نے اسطرح میں خوب خوب زور لگایا تھا مگر جناب ممدوح نے ایسے ایسے شعر نکالے کہ گلدستہ شائع ہونے پر صدہا انصاف پسند سخن شناسوں کی زبان سے یہی سُننے میں آیا کہ حمد لکھنوی

کی غزل جڑھی بڑھی رہی اور بڑے بڑے نامیوں کی غزلیں اُسکے مقابلے میں پھیکی تسلیم کی گئیں۔

غزل

فرحت دلونکو دیتے ہیں اشعار بن کے پھول
کیا کیا مہک رہے ہیں ریاض سخن کے پھول

خوشبو طرح طرح کی سنگھاؤ پھن کے پھول
کچھ اس چمن کے پھول کچھ اُس چمن کے پھول

آغوش ہی میں آتے نہیں یہ دماغ ہے
پھولے نہیں سماتے ہیں گلرو پھن کے پھول

کیسے مہک رہے ہیں ذرا سے ملگجے نہیں
اُترے ہوئے ہی کپڑے ہیں اُنکے بدن کے پھول

شادی ہر اک چمن رچی ہے بہار کی
لو سال بھر کے بعد کھلے اس دلہن کے پھول

خوشبو میں گیسوؤں کے تھے دو خوں بسے ہوئے
مہکے شب وصال کرن پھول بن کے پھول

اشک اُن کی آنکھ سے گرے ماتم میں غیر کے
نرگس سے دیکھے جھڑتے ہوئے نشتر نکے پھول

بلبل چہک قفس ہی میں ہو جائیگی بہار
منقار کی کلی سے کھلینگے چمن کے پھول

کانوں میں کہا رہے ہیں ہوا زلف یار کی
نامے بنے ہوئے ہیں غزال ختن کے پھول

یہ جو سنا کہ ہار تھے گوندھے ہوئے مرے
سب پھینکے نوچ نوچ کے ماری جلن کے پھول

گلرو جو ہیں تو سیر چمن سے بھی عار ہے
آئینہ دیکھ لیتے ہیں گھر میں پھن کے پھول

یہ رنگ وہی ہاتھ میں اُس گلعذار کے
کاغذ کے گل بھی کرتے تو سب جھوم جھوم کے پھول

ناوک فگن ہیں باغ میں جھونکے نسیم کے
رہ رہ گئی ہیں کانٹوں کی پیکاں سے چمن کے پھول

اے حمد لکھنؤ ہے نہ وہ سیر عیش باغ
غربت میں یاد آتے ہیں کیا کیا وطن کے پھول

کیا اشتیاق ہے کہ ہو تیار پھن کے پھول
ہم بیٹھے ہیں جھونکے ہیں چمن کے پھول

کہتے ہیں دیکھکر مرے باغ سخن کے پھول
ہم روز پہنکر دیتے ہیں سیر دن پھن کے پھول

اللہ آپ سیر کو نکلے پھن کے پھول
تقدیر اُس چمن کی یہ ہیں جس چمن کے پھول

آنکھوں پہ بھی بٹھائے تو ہرگز نہ بار ہوں
یہ نازنین جتنے ہیں سب ہیں بدن کے پھول

اونکو ہوا یہ شوق ابھی سے ستم ہوا
کچھ گل کھلا نیوالے ہیں شاید بہن کے پھول

فردوس ہی شہیدونکو اُس تیغ کا چمن
گل ہیں سپر کے خلد بریں کے چمن کے پھول

اللہ کرے بہار میں گلچیں کا سینکے
پڑ جائے آتش گل گلزار بن کے پھول

رنگین کفن بھی ہو کہ میں رنگیں مزاج تھا
نیچے کفن کے بوٹے ہوں اوپر کفن کے پھول

پیکر یقین ہے رند گنا ہونسے پاک ہوں
ساقی جو آئے شیخ کی پگڑی میں چھن کے پھول

کمسن ہو زلف بکھری ہی رُخسار اوتار دہار
ملتے ہیں دونوں وقت نہ بیٹھو بہن کے پھول

اُس گل کی ہیں ہوائے وفا میں کھلے ہوئے
سب رہ گئے ہیں زخم جگر اپنے بن کے پھول

بوئے گل مراد سی عاشق کو کر دو مست
اک دن لپٹ ہی جاؤ مری جاں بہن کے پھول

اللہ رے ابکی باد بہاری کا زور شور
ہیں ڈھیر اونچے پیڑونسے ہاتھوں چمن کے پھول

کلک اپنا گلفشاں ہی صفت میں نظام کے
اے حمد اوده میں پھول رہی ہیں دکن کی پھول

اب چند مختلف غزلوں کے منتخب اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیۂ ناظرین بانمکین کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

دل سے جب سے ہی خیال رخ جاناں نکلا
پھر جو اس گھر میں کیا غور تو ویراں نکلا

جب چلی دست جنوں بنکے چلی باد بہار
سو جگہ سی ہے ہر اک گل کا گریباں نکلا

رہگیا طائر جاں بلبل شیدا بنکر
جوہر تیغ میں قاتل کے گلستاں نکلا

جستجو کی تو حسینوں میں لگا دلکا پتہ
دیکھنا پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں نکلا

خنجر و تیغ لئے بیٹھے ہو کیوں محفل میں
بزم میں کسکے لئے رزم کا ساماں نکلا

حمد مضموں جو کہا کینچدی اوسکی تصویر
سارے عالم کا مرقع ترا دیواں نکلا

ولہ

بیوجہ کب یہ دلکی مری دیکھہ بھال ہے
کہیئے نہ کہیئے آپ کی صورت سوال ہے

دن رات دلمیں موی کمر کا خیال ہے
ہم ایک شیشہ رکھتے ہیں اُسمیں بھی بال ہی

یوں اوسنے پونے دل کہیں جا ملا نہ ہو
کیا آپ سمجھی ہیں کوئی چوری کا مال ہے

دل ابتو نذر زلف سیہ فام ہو چکا
پھبتی ہی اوسپہ خوب کہ موذی کا مال ہے

باور اگر تمہیں نہیں آتا بتو نہ آئے
اللہ جانتا ہے جو کچھہ دل کا حال ہے

خوش پاکر اپنی آئینے فرماتے ہیں چہ خوش
ہمنے تو یہ سُنا تھا بہت خیر حال ہے

باتونمیں دل بہلاتے ہیں خوبان لکھنو
حمد انکی کیا زبان ہی کیا بول چال ہے

خود دیکھنے کی آنکھہ نہیں ہے نظر نہیں
ورنہ ظہور جلوہ جاناں کدہر نہیں

احوال کس سی پوچھئے یاران رفتہ کا
جاکر اُدھر کوئی بھی پلٹتا ادھر نہیں

ہے روز حشر اور شب غم کا ایک طول
اوسکی نہیں ہے شام تو اسکی سحر نہیں

آنکھوں کے روکے رُکتی نہیں کس رہی ہی قتل
جادو گرونکی باندھی بھی بندھتی نظر نہیں

اللہ ری بیخودی کہ وہ پہلو میں بیٹھکر
دلکو نکال لیگئے ہمکو خبر نہیں

یہ رنگ یہ زبان تو بیشک وہی ہی حمد
افسوس پر یہ ہے کہ جناب سحر نہیں

ولہ

آگئی فصل جنوں پھیلی ہیں ویرانونمیں
تھالی پھرتی ہے وہ بیڑیں ہیں بیابانونمیں

ہوش جاتے رہے پھنسکر تری دیوانونمیں
راستہ بھول گئے خضر بیابانونمیں

ہونیوالی ہی جدائی ترے دیوانونمیں
بیڑیاں کٹتی ہیں کہرام ہی زندانونمیں

ہر طرف فصل بہاری کی ہے گرما گرمی
آگ لالے نے لگادی ہی بیابانونمیں

دل میں آکر مرے گھبرا کے وہ فرماتے ہیں
ہمتو لو آکے یہاں گھر گئے ارمانونمیں

دھجیاں ابکی جنونِ دامنِ صحرا کی اُڑیں
نہ بچے تار پہاڑوں کے گریبانوں میں

پانوں دونوں چلے سوزن کی طرح وحشت میں
دوہرے بخیے کئے ہیں دشت کے دامانوں میں

شرم سے ابروؤں کے آگے کٹی جاتی ہیں
تیغیں سر ڈالے ہیں سب اپنے گریبانوں میں

پہلے کب تھی یہ صفائی یہ زباں یہ بندش
احمد منصف جو ہو وہ دیکھلے دیوانوں میں

خاکسار

سید مقبول حسین وصل بلگرامی

دارالسلطنت فرانس کی سیر

(۵) تابع ماقبل

یہ زمانہ جو میں نے پیرس جانیکے لئے تجویز کیا تھا کسیقدر بعد از وقت تھا کیونکہ مئی اور جون کے مہینے وہاں جانیکے لئے عمدہ ہوتے ہیں اور یہی مہینے پیرس کا "سیزن" کہلاتے ہیں مگر میرے دل میں جو سب بڑا خیال اس انتخاب زمانہ کے وقت تھا وہ یہ تھا کہ اُس مشہور و معروف دن یعنی ۱۴ جولائی کو جبکہ فرنچ نیشن (French nation) اپنی سلطنت جمہوری کی سالگرہ مناتے ہیں اور عروس پیرس اپنا گونگھٹ اُٹھاتی ہی وہاں کی بہار دیکھوں - اس ہفتہ میں ہزاروں دوسرے ملکوں کے لوگ آتے ہیں اُس قابل یادگار روز جشن کے لئے بڑی بڑی تیاریاں ہوئی تھیں - شہر کے بڑے بڑے چوک پھریروں سے سجائے گئے تھے - اور بڑے بڑے کونوں پر رات کے وقت بینڈ بجانیوالوں کے واسطے محرم کی سبیلوں کی طرح تخت وغیرہ باندھکر جگہ بنادی گئی تھی - جب یہ دن آیا تو صبح کے وقت فرانسیسی فوج کا بہت بڑا ریویو ہوا - میں تڑکے ہی لانگ شام (Long champ)

اس تماشے کو دیکھنے پہونچا - انگریزی سفارت کے ذریعہ سے مجھے یہاں کے ٹکٹ ملگئے
تھے اور حسن اتفاق سے جو جگہ بیٹھنے کے لیے ملی وہ پریزیڈنٹ موسیو لوبے سے زیادہ
دور نہ تھی یہ ایک مہتم بالشان نظارہ تھا مگر باستثنا چند چیزوں کے یہانکے تماشوں
نے میرے دل پر بہت کم اثر کیا - فرانسیسی پیدل فوج اور توپخانہ کو بہ لحاظ سپاہیوں کے
جسموں کے یا اُن کی وجاہت یا وردی کے مین بہت اچھا نہیں کہتا - مارچ پاسٹ
(March past) بہت اچھی طرح کیا گیا مگر اتنا اچھا نہیں جتنا کہ میں نے انگریزی فوج
میں دیکھا ریپبلکن گارڈز (Republican Guards) بہت شاندار تھا اور انگلستان کی
لائف گارڈز (Life Guards) کی طرح تھا مگر انگریزی لائف گارڈز کے سپاہی
ذرا زیادہ پھرتیلے اور قدآور ہوتے ہیں - فرانسیسی فوج کے اس ریپبلکن گارڈز
نے جو تمام فوج میں چوٹی کا دستہ کہلایا جاتا ہے [illegible] نزدیک سوار دستے
دستے نے اُس [illegible] وزیر بعض بعض کرتب نہایت عمدہ دکھلائے لوگوں نے مجھسے کہا کہ
فرانسیسی سپاہی بہت بہادر ہوتے ہیں مگر اُنکے افسر لائق نہیں ہوتے ہیں اس
ریمارک کے سُنتے ہی مجھے وہ ریمارک یاد آگئے جو عام طور پر ہم ترکوں کی فوج کے
متعلق سنتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی فوج نے اب بہت کچھ ترقی کرلی ہے
اور بمقابلہ گزشتہ زمانہ کے جبکہ نہایت ذلت کے ساتھ اُنہوں نے جرمنیوں کے
مقابلہ میں شکست کھائی تھی اب اُن کی حالت بہت اچھی ہے مگر اسمیں کلام نہیں کہ
جنرل اندری (General Andre) سابق وزیر فوج نے کچھ زیادہ اصلاحیں
نہیں کیں اور ابھی بہت کچھ زمانہ چاہیے جب یہ جرمنیوں کے مقابلہ کے لائق
سمجھی جاسکیں گے - مجھسے لوگوں نے کہا کہ بحری و بری سپاہ کے بعض اعلیٰ عہدہ
دار اکثر اپنا وقت عیش و عشرت سستی و آرام طلبی میں گذارتے ہیں سپاہیوں کے
چہروں پر ڈاڑھیاں کچھ مجھے اچھی نہیں معلوم ہوئیں اور بعض بعض کی شکلیں تو

اس ڈاڑھی سے نہایت ہیبت ناک معلوم ہوتی تھیں۔ افسر بھی کچھ غیر معمولی طور تیز اور پھرتیلے نہیں تھے۔

یہ دن گویا عید کا دن تھا مگر رات دن سے کہیں زیادہ بڑھی چڑھی تھی۔ اس قومی جشن کا اوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں بہت چرچا ہے اگر سچ پوچھئے تو یہ انہیں لوگوں کے خوشی کا دن ہے۔ بڑے اور فیشن ایبل طبقہ کے لوگوں میں اس روز کوئی غیر معمولی حرکت یا خوشی نہیں پائی گئی اُن کے لئے ہر روز عید ہوتا ہے اور میں نے فیشن ایبل کوارٹرس میں روزمرہ سے کچھ زیادہ چہل پہل نہیں دیکھی۔ رات کی حالت کچھ ہمارے محرم کی راتوں کی طرح تھی اور میں نے چند ایسے عجیب و غریب تماشے دیکھے جو عمر بھر نہ بھولونگا۔ اٹیلین کوارٹر کے قریب تمام چوکوں پر اور بڑے بڑے قہوہ خانوں میں ایسا ہلڑ تھا کہ میں محو حیرت کھڑا دیکھتا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت بند ہوگئی تھی اور اُن تختوں پر جو سڑکوں پر لگائے گئے تھے نہایت دلکش بینڈ بج رہا تھا اور بڈھے اور جوان چاروں طرف خوشی میں ناچتے پھرتے تھے۔ بعض بعض چوکوں پر دو رویہ درخت چینی لالٹینوں سے سجائے گئے تھے اور تمام عالم چراغاں معلوم ہوتا تھا۔ اِدھر اُدھر سڑکوں پر نہایت دلچسپ "میری گوراؤنڈ" بنائے تھے جہاں کرسیاں اور نہایت سلیقہ کے ساتھ سجی ہوئی کوچیں بچھی تھیں اور غریب و امیر سب آکر ناچ دیکھتے اور پیرس کے ایک خاص محلہ میں جو منمیتر (Monmatre) کے نام سے موسوم ہے بیشک غیر قابل بیان نظارہ تھا۔ تھوڑی دیر تک میں تصویر کے مانند حیرت کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ ناچ گھر میری گوراؤنڈز (Merry go-round) اور قہوہ خانے سب مردوں اور عورتوں سے بھرے تھے جو ایک دوسرے دلگیاں کرتے اور بادہ نشاط میں جھوم رہے تھے پیرس میں عام طور پر ہر رات عیش و نشاط کے جلسے نظر آتے ہیں مگر اس رات کو اسقدر کثرت تھی کہ گویا لوگ اُبلے پڑتے تھے

جیساکہ میں اوپر بیان کرچکا ہوں کہ فیشل ایل محلہ مثل شانزی لیزی (Champs Elysées) وغیرہ میں کسی خاص قسم کی چہل پہل نہ تھی وہاں کی دلچسپیاں معمولی تھیں اور نسبتاً بہت سکون معلوم ہوتا تھا۔ یہ ہلڑ رات بھر رہا۔ حسن اتفاق سمجھئے یا سوء اتفاق خود اوس کمرے کے نیچے جہاں میرا بستر تھا سڑک پر ایک میری ایک گوراؤنڈ (Merry-go-round) کا سامان نصب تھا۔ اُس شب جب میں گھومتے گھومتے تھک گیا تو اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھکر نیچے لوگوں کا تماشہ دیکھنے لگا حتی کہ باجے کا نغمہ اب کانوں کو بُرا معلوم ہونے لگا اور بجائے لطف کے بے لطفی اور نیند کی وجہ سے تکلیف سی محسوس ہونے لگی۔ اب بھی جبکہ یہ لکھ رہا ہوں کانوں میں اوس رات کی عورتوں کی چیخوں کی آواز گونج رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ کہیں پر عورتوں اور مردوں کے چھوٹے چھوٹے مجمع ہیں اور کہیں صرف ایک ہی مرد اور ایک عورت ہے جو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بے باکانہ گویا نشۂ سرور میں مست ٹہل رہے ہیں اور ایک دوسرے کے بوسے لیتے جاتے ہیں اور سب ملکر ایک حالت مجموعی میں ایسا عجیب وغریب اور کسیقدر مضحک ڈراما بن گئے ہیں کہ اسکی نظیر دنیا میں کہیں اور پیرس کے سوا ملنا ممکن نہیں۔

میرے اثنائے قیام پیرس میں شاہ کجکلاہ ایران کی تشریف آوری کی وجہ ہر طرف ایک ہنگامہ سا تھا۔ شاہ شانزی لیزی ہوٹل (Champs Elysées Hotel) میں مقیم تھے۔ یہ ہوٹل گویا عیش وطرب کی مشین ہے اور لطف وعیش ونشاط ولوازمات عیاشی میں تمام یورپ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ یہ ایک بہت عالیشان عمارت ہے جسمیں بکثرت پرتکلف وآراستہ سیلون (Salon یعنی کمرے) ہیں جہاں ٹھہرنے والے کو عیش وعیاشی کے ساتھ گذر کرنے میں کسی چیز کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ یہاں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور ایک چھوٹے سے کمرے کا روزانہ کرایہ بائیس ۲۲ تیئیس ۲۳ روپیہ سے کم نہیں۔ مگر شاہ نے پوری دو منزلیں اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے

واسطے کرایہ پر لی تھیں۔ مظفرالدین قاچار کو دیکھنے کا کئی مرتبہ مجھے اتفاق ہوا لیکن اُن کی وجاہت کا اثر کبھی میرے دلپر نہ ہوا۔ پہلی مرتبہ تو اُن کی صورت یعنی نگون چہرہ بڑی بڑی موچھیں۔ آنکھیں جنمیں عیاشی اور بے فکری کا خمار تھا۔ مجھے کچھ خوفناک سی معلوم ہوئی مگر دوسری مرتبہ جب دیکھا تو کسیقدر میرے خیال میں تبدیلی ہوئی اور میں نے کہا کہ پہلی مرتبہ جلدی سے رائے قائم کرنے میں میں نے شاید مبالغہ سے کام لیا تھا لیکن اسمیں شک نہیں کہ میرے دلپر اس بادشاہ کی عظمت بالکل قائم نہیں ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اُس نے اپنی رعایا کے لئے کوئی کام نہیں کیا اور صرف عیش و عیاشی کی خاطر اپنے سفر میں لاکھوں روپیئے صرف کرتا تھا۔ اگر اسی کو اپنے ملک و دولت کی ترقی اور رعایا کی رفاہ و تعلیم میں صرف کرتا تو کسقدر اچھا ہوتا۔ شاہ کے ہمراہی پیرس کے سڑکوں پر ادھر اُدھر اوڑتے پھرتے نظر آتے تھے۔ اُن کی جسم پر فراک کوٹ تھا اور سروں پر ایرانی ٹوپی۔ فرانسیسیوں نے انکے طرح طرح کے کارٹوں اور مضحک تصویریں اخباروں میں چھاپیں۔ انکی یہ حرکت بہت سخت قابل اعتراض اور انگریزوں کے طبیعت کے متضاد تھی کیونکہ آخرالذکر کسی طرح اپنے مہمانوں کا مضحکہ کرنا پسند نہیں کرتے۔

فرانس کی پولیٹکل لائف دیکھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ انگریزی سفارت خانہ سے نہایت آسانی کے ساتھ چیمبر آف ڈیپوٹیز (chamber of deputies) کی مباحث میں شریک ہونیکے لئے ایک ٹکٹ مجھے ملگیا۔ چیمبر آف ڈیپوٹیز جو گویا فرانس کا پارلیمنٹ ہی سلطنت جمہوری کا مبدا و منشا ہے۔ لیکن عمارت اندر اور باہر دونوں جانب بہت سادی ہے اور انگلستان کی عظیم الشان ہوسز آف پارلیمنٹ (houses of parliament) کے مقابلہ میں زیادہ شاندار نہیں معلوم ہوتی۔ مباحث کا کمرہ نصف دائرہ کی شکل کا ہے اور کالج تھیٹر کی مثال بنچیں بچھی ہوئی ہیں۔

افسوس ہے کہ میں فرانسیسی زبان اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تھا اسلئے وہاں کے عالمانہ تقریروں سے کوئی دلچسپی حاصل نہ کر سکا۔

میرے پیرس کے قیام نے اب ایک پلٹا کھایا اور ایک نئی صورت اختیار کی یعنی مسر گنگا لندن واپس جانے والے تھے اور میرا ارادہ اُن کے بعد اُس مکان میں رہنے کا نہ تھا اسلئے میں ایک ہوٹل میں اُٹھ گیا جسکا نام میرے ایک دوست نے لندن ہی میں مجھے بتا دیا تھا۔ میرا قصد کچھ دن اور رہکر یہانکے اسپتال وغیرہ دیکھنے کا تھا۔

یہ ہوٹل ایک بہت خوبصورت مختصر سا مکان تھا۔ اور اُن سڑکوں میں سے ایک سڑک پر جو آرچ ڈی ٹرائمف (Arch de triumph) سے شہر کے فیشن ایبل محلوں میں سے ایک محلہ کی طرف مڑتی تھیں ایوینیو ڈی فرای لینڈ (Avenue de friedland) میں واقع تھا۔ اسکی مالکہ ایک انگریز لیڈی تھی۔ وہ اور اُسکے بچے کچے سب اسی مکان میں رہتے اور کبھی کبھی بعض منتخب مہمانوں کو ٹھیرا لیا کرتے تھے۔ یہ عورت نہایت نیک تھی اور گو کہ انگریز تھی مگر ہمدردی اور خیالات و جذبات میں بالکل فرانسیسی تھی۔ وہ اور اُسکا خاندان سب فرانسیسی مایا ہو گیا تھا۔ اُسکا مذہب پروٹسٹنٹ تھا (فرانس میں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک اب بھی ایک دوسرے سے بہت زیادہ تعصب رکھتے ہیں) اور تھیر ایسی مہربان تھی کہ میں ہمیشہ اپنا کھانا اوسکے اور اُسکے بچوں کے ساتھ کھایا کرتا ہے۔ یہاں مجھ سے ایک انگلش جنٹلمین سے ملاقات ہوئی جو اسی لیڈی کا عزیز تھا اور ظاہرا نہایت خوش مزاج دلچسپ اور نیک طبیعت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ہماری ملاقات رفتہ رفتہ دوستی کے درجہ تک پہونچگئی اور پیرس کے قیام کے یہ چند روز اوسکی ہمراہی میں بہت دلچسپی کے ساتھ گذرے کیونکہ وہ فرانسیسی زبان خوب بول سکتا تھا اور یہاں کے لوگوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔

یہ گھر تمام امریکن لیڈیز سے جو ظاہرا عمدہ اور دولت مند طبقہ کی معلوم ہوتی

تھیں بنرا ہوا تھا۔ انہیں میں سے ایک لیڈی سے میری ملاقات ہوئی جسکی لڑکی میز پر مجھسے بہت ملکر بیٹھتی تھی اور کھانیکے بعد ڈرائنگ روم میں ہم دونوں خوب خوب باتیں بہت سی دلچسپ مضمونوں پر کیا کرتے تھے یہ دونوں ماں بیٹیاں مجھسے بہت دلچسپی ظاہر کرتی تھیں مگر خدا کا شکر ہے کہ ان تعلقات کے بیل زیادہ نہیں پھیلی۔ امریکن عورتیں درحقیقت بہت حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہروں کو امریکہ میں پیچھے چھوڑ کر تمام عالم میں ماری ماری پھرتی ہیں اور ہمیشہ اپنے ان وفادار شوہروں (کیا بلکہ نوکروں) سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتی رہتی ہیں۔ تمام دنیا کی عورتوں میں جتنی آزادی انہیں حاصل ہے کسی دوسری عورت کو نہ ہوگی اور اگر ان کی یہ وفادار شوہر انکی مذاق کے موافق ثابت نہ ہوئی تو پرانے جوتے کیطرح تبدیل کر ڈالنے میں بھی باک نہیں ہوتا اور امریکہ میں ایسے واقعات ایک دو نہیں ہزاروں ہی ہوتے ہیں۔ صرف اسبات کو خیال نہ کرو تو یہ عورتیں تمام یورپ کی عورتوں سے زیادہ مہذب اور شائستہ ہوتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا عام رجحان جہانتک میں نے غور کیا لباس اور جواہرات کی طرف معمولاً ہوتا ہے۔ پیرس کی عورتیں اپنی لباس میں نہایت تکلفات اور نزاکت خرچ کرتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ امریکہ کی عورتیں فیشن میں تھوڑی دنوں میں ان پیرس والیوں سے کہیں بڑھ جائینگی۔ مسٹر پانٹنگس (میرے دوست) کہتے ہیں کہ مجھے انکا گھما کر الفاظ ادا کرنا بہت برا معلوم ہوتا ہے اور میری کان ان کی چپڑ چپڑ نہیں سن سکتے تاہم میرے لئے اُن کی صحبت بہت دلچسپ تھی اور مجھے ان کی اعلی طبقہ کے لوگوں کی طرز معاشرت کا کسیقدر اندازہ ہوگیا۔

پیرس کے ایک قہوہ خانہ میں میرے ایک انگریز دوست یکایک ملگئے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑے۔ اور بے انتہا خوش ہوئے اور کئی ایک فرانسیسیوں سے میری ملاقات کرائی جنہوں نے اپنے ہاں میری دعوتیں کیں اور اس طریقہ سے

پیرس کے عمدہ طبقہ کے لوگوں کی طرز معاشرت معلوم کرنے کا اتفاقاً ایک عجیب موقعہ مجھے ملا۔ شہر پیرس اور پیرس والوں کے متعلق میری رائے ابھی تک ڈانواڈول ہے اور ممکن ہے کہ دوسری تیسری مرتبہ جب وہاں جانے کا پھر مجھے اتفاق ہو تو اسمیں استحکام اور شاید کچھ تغیر بھی ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ پیرس میں ڈومسٹک لائف اسقدر اچھی نہیں جسقدر کہ لندن میں ہے۔ لندن میں لوگ فرصت کی اوقات میں گھر میں رہکر اچھی طرح آزادی اور خوشی کے ساتھ بچوں کے ساتھ ڈومسٹک لائف کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ بخلاف اسکے پیرس میں زیادہ تر قہوہ خانوں اور ناچ تماشوں میں لوگ فرصت کی اوقات گذارتے ہیں اور اپنے ساتھیوں اور ہمجولیوں سے بھی بجائے گھر کے ایسے قہوہ خانوں میں ملاقات کرتے ہیں جو اُنکے مذاق خاص کیموافق ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کی زندگی خواہ وہ اعلیٰ طبقہ کے ہوں یا ادنیٰ کے اسقدر لہو ولعب میں بسر ہوتی ہے اور اسقدر بے اصول اور بھپورے طریقہ پر وہ لوگ سامان عیش مہیا کرتے ہیں کہ مجھے معلوم کرکے بہت نفرت ہوئی۔ اور موجودہ تہذیب کی جہاں اور بلائیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو ذرا خود مختاری اور معاش کی طرف سے بیفکری حاصل ہے اُن کی ہمتیں اکثر پست اور طبیعتیں اکثر دنی ہوتی ہیں اور ہمیشہ یہ لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ہر روز ایک نیا سامان عیش مہیا رہے اور روز ایک نت نئی چیز ہو جو عیش پسند طبیعت کی خلش دفع کرتی رہے۔ طبیعتیں حد سے زیادہ ذکی الحس ہیں اور ہوس عیش اسقدر ہے کہ اگر دنیا کے تمام سامان عیش میسر ہو جائیں تب بھی اس آگ کا شعلہ بلند ہی رہیگا اور دلمیں لاکھوں ایسی خواہشات باقی رہینگی جنہیں حاصل کرنے کا شوق ہر وقت تڑپاتا رہیگا۔ اس ہوس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض قومیں بالکل بیکار ہو جاتے ہیں اور قوموں کی خصوصیات پر اثر پڑنے لگتا ہے۔ ان عیش و عشرت کے بندوں کی زندگی جسطرح گذرتی ہے اُسے میں نے ذیل کے چند

صورتوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) ایک نہایت فیشن ایبل ہوٹل میں رہنا۔

(۲) بارہ بجے سو کر اُٹھنا اور پلنگ ہی پر پڑے پڑے کچھ چار پینا۔

(۳) کپڑے پہننا اور ڈیڑھ بجے کھانا کھانا۔

(۴) پانچ بجے اپنے کسی آشنا کو ساتھ لیکر ٹمٹم پہ بیٹھکر بائی ڈی بولون کی سیر کرنا

(۵) شانزی لیزی (Champs Elysées) یا کسی اور جگہ کسی نہایت فیشن ایبل شان میں شب کا کھانا کھانا۔

(۶) کسی ناچ گھر یا ناچ کے تماشے میں جانا اور ۱۱ بجے تک کسی ناپاک مذاق میں منہمک رہنا۔ یا کسی اوپیرا (Opera) میں تماشا دیکھنے جانا۔

(۷) بارہ بجے کسی ایسے تھیٹر میں جانا جو رات گئے شروع ہوا کرتا ہو یا کسی ایسی قہوہ خانہ میں جانا جو رات بھر کھلا رہتا ہو اور وہاں کے تماشوں میں ہمہ تن مصروف ہو کر رات کاٹنا۔

(۸) پانچ بجے صبح کو سو جانا۔

اس طرح آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لئے بے انتہا روپیہ کی ضرورت ہے یعنی کم سے کم ۱۰ پونڈ روزانہ چاہئیں۔ تمام قسم کی عیش و عشرت کے سامانوں کا جو دولت کے ذریعہ سے مہیا ہو سکتے ہیں تصور کرو اور خیال کرو کہ ان سامانوں کو اودھ کے رنگیلے بادشاہ نے کسقدر روپیہ صرف کر کے جمع کیا ہوگا مگر تم اودھ کے ان تمام سامانہائے نشاط کا مقابلہ اگر پیرس کے موجودہ عیش و نشاط کے سامانوں سے کروگے جو اسقدر کم خرچ سے نصیب ہو سکتے ہیں تو واجد علی شاہ کا عیش بے حقیقت نظر آئے گا۔ میں بے انتہا بے انصافی کرونگا اگر ایک ٹھیٹھ فرانسیسی کی طرز معاشرت کو جسطرح اوپر بیان کر آیا ہوں لکھکر خاموش ہو جاؤں اور یہ نہ بیان کروں کہ وہ لوگ جوان

عیش وعشرت کے مقامات کو عزت بخشا کرتے ہیں درحقیقت فرانسیسی نہیں بلکہ غیر ملک والے امریکہ۔ انگلستان اور روس کے باشندے ہوتے ہیں۔ پیرس تشریف لانے سے انکا مقصد صرف لہو ولعب ہوتا ہے اور ان سے زیادہ پیرس کے عیش وعشرت کے مقامات یا یوں کہئے کہ مہذب بدمعاشوں کے اڈون کے سرپرست خود فرانسیسی نہیں ہوتے۔ یہاں بعض بعض ناپاک مقامات ایسے ہیں جن کی سرپرستی اگر یہ غیر ملک والے نہ فرمائیں تو اُسکا چلنا محال ہے کیونکہ خاص پیرس والے ان تمام چیزوں کی زیادہ شوقین نہیں ہوتے۔

ایک معمولی پیرس کے رہنے والے اور ایک معمولی لندن والے کا مقابلہ کیا جائے تو پیرس والا نہایت پرہیزگار معلوم ہوگا۔ پیرس میں شراب کی مدہوشی بہت شاذ کوئی نظر آئیگا بخلاف اسکے لندن میں یہ ایک معمولی بات ہے لندن کے پبلک ہاؤس ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا دوزخ کا کوئی طبقہ ہے جسمیں شرابی ہی شرابی بھرے ہیں لیکن پیرس میں یہ پبلک ہاؤس بہت صاف اور ستھرے نظر آئینگے اور یہاں لندن کا سا کبھی کوئی مجمع نظر نہ آئیگا جہاں میلے کچیلے کپڑے پہنے مزدور جمع ہوں اور شراب کے قدح کے قدح لنڈھاتے چلے جاتے ہوں۔ یہانکے مزدور لندن کے مزدوروں سے زیادہ اچھے اور ستھرے لباس میں نظر آئینگے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ لندن کی طرح یہاں غیر ملک کے مزدوروں سے مقابلہ بہت کم ہے۔

میں ہر روز بغور دیکھتا ہوں کہ یہاں کے عام آدمی حتی کہ منیمر (Manmatre) کے طبقہ غربا کے لوگ بھی اور اُنکے بچے نہایت ہی صاف اور پاکیزہ نظر آتے ہیں ان لوگوں کا اگر لندن کے اسی درجہ کے لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو کوئی نسبت نہ معلوم ہوگی۔ لندن کے غریب لوگ ایسے گندے اور میلے کچیلے ہوتے ہیں کہ ایک منٹ بھی اُن کے پاس کھڑا رہنا محال ہے۔

خود شہر پیرس کو صفائی کے لحاظ میں نے اپنے خیال کے مقابلہ میں بہت کچھ گرا ہوا پایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عہدہ دار اس زمانے میں کچھ بے توجہ اور سست سے ہیں۔ سڑکیں گو کہ لندن کی سڑکوں کی طرح میلی اور خراب نہیں تاہم سوای شانزی لیزی (Champs Elysees) کے کوئی سڑک ایسی نہیں ہے جو سنگ مرمر کی سطح کی سی صاف نظر آئے جیسا کہ میں ہندوستان میں سنا کرتا تھا۔ سنتا ہوں کہ برلن اس معاملہ میں دنیا کے تمام شہروں پر ترجیح رکھتا ہے۔ یہ طریقہ مجھے بہت پسند آیا کہ یہاں چوکوں کے کونوں پر لکڑی کی دکانیں لگی ہیں جنمیں بڑھیا عورتیں کاغذ بیچتی ہیں اور بکثرت ہر جگہ پھولوں کی دوکانیں ہیں سواری کا سامان بھی لندن کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔ یہاں کی آہنی بسیں (گاڑیاں) لندن کے بسوں سے زیادہ تیز ہیں۔ علاوہ ان کے بکثرت بجلی کی اور موٹر ٹرام گاڑیاں چلتی ہیں جن پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک جگہ سے دوسری جگہ ہم اڑے چلے جا رہے ہیں۔ آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک چاہے کتنا ہی فاصلہ ہو بآسانی سفر کر سکتے ہیں۔ اور انتظام ایسا معقول ہے کہ آدمیوں کے ہجوم سے نہایت آسانی کے ساتھ بچتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح نہایت آسانی اور آرام سے بہت کم خرچ کر کے آدمی ایک جگہ سے دوسری جگہ پیرس میں آ جا سکتا ہے۔ گاڑیوں کا کرایہ بھی نسبتاً بہت کم ہے اور انمیں ایک آلہ لگا ہوتا ہے ٹکسا میٹر (Taxameter) نام جو خود بخود طے شدہ فاصلے کے لحاظ سے کرایہ کا حساب کر کے بتا دیتا ہے۔ اس سے نوواردوں اور اجنبی لوگوں کو بہت آرام ملتا ہے فقط

"مانی"

از پیرس

انتخاب بیاض

جناب منشی سید انور علی صاحب انور متوسل بھوپال

نواب فصیح الملک داغ دہلوی

عبث نباہ کے وعدے سے تم تو ڈرتے ہو — یہ کون بات ہے اک دن بگاڑ کر لینا

میرے دل کو دیکھکر میری وفا کو دیکھکر — ولہ — بندہ پرور منصفی کرنا خدا کو دیکھکر

میرزا حبیب فریبی اصفہانی ایں رباعی بحالت نزع گفتہ

یاران باہم چو عیش بنیاد کنید — در صحبت ہم خاطر خود شاد کنید

شکرانہ عیش و کامرانی گاہے — از حسرت و ناکامی ما یاد کنید

قالغی خیوشانے

بخم بادہ نمک محتسب زخامی کرد — باہل میکدہ آخر نمک حرامی کرد

حکیم مومن خان مومن دہلوی

مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے — رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے

حکیم مومن خاں مومن دہلوی

پھر وہ وحشت کے خیالات کہیں میں پھرنے — دشت یاد آتے ہیں آہو ہیں نظر میں پھرنے

مائلی تاشکندی

رخ نمودی و مرا بے سر و ساماں کردی — آفریں باد عجب کار نمایاں کردی

شیدا

دریں چمن نہ گل و لالہ شبنم اندوداست — کہ خندۂ گل ایں باغ گریہ آلوداست

شہرت

نہ من شہرت تمنا دارم و نے نام می خواہم — فلک گر واگذارد یک نفس آرام می خواہم

فقط

کانگرس اور مسلمان

مارچ اور اپریل کے اردوی معلی میں حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس دتاولی کا مضمون کانگرس کے متعلق شائع ہوا ہے جسمیں آپنے اول کانگرس کے ان نقائص کو بیان کیا ہے جن کی وجہ سے مسلمان اسمیں شریک نہیں ہوئے اور بعدازاں بنارس کانگرس کے رزولیوشنوں کے متعلق بحث کی ہے اگر حاجی صاحب ممدوح اس مضمون میں وہ وطیرہ اختیار کرتے جو کہ اسلامی اخبارات میں اختیار کیا جاتا ہے یعنی جہاں کانگرس کا نام آیا وہاں گالیوں کی بوچھار ہوئی تو اسکے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ آپ نے اس نہایت ضروری مسئلہ کے متعلق معقول اور متین طریقہ سے بحث شروع کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی چند غلط فہمیوں کے متعلق کچھ لکھا جاوے۔

آپ کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ جبتک مسلمانوں کے خاص حقوق کی حفاظت کا انتظام نہ ہوجاوے اُنکو کانگرس میں شریک ہونے سے نقصان پہونچیگا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو جسوقت کانگرس سے مخالفت شروع کی گئی تھی اسوقت دو بڑی وجوہ اس مخالفت کے لئے پیش کئے جاتے تھے اول یہ ہے کہ پولٹیکل ایجیٹیشن ہماری حالت کے لئے موزوں نہیں ہمکو محض سرکار کی مہربانی پر بھروسہ کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کرنے سے مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا۔ شکر کا مقام ہے کہ اب سبب نمبر (۱) کا ذکر بہت کم یا بالکل نہیں کیا جاتا اب یہ نہیں کہا جاتا کہ ہندوستانیوں یا مسلمانوں کے لئے پولٹیکل ایجیٹیشن میں دخل دینا کفر ہے محض فرشتہ صفت انگریزی گورنمنٹ کی خوشامد کرنا کافی ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ ایک بہت

بڑی فتح ہے جو کانگرس والوں کو حاصل ہوئی ہے - اب ہمارے مسلمان دوست پولیٹکل اجیٹیشن کو اصولاً برا نہیں کہتے اور اسکی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں بحث اسمیں ہے کہ آیا کانگرس جس طریقہ سے کام کر رہی ہے اسمیں کہانتک ترمیم کی ضرورت ہے کیا عجب ہے کہ جسطرح تجربہ نے ایک غلطی کو رفع کر دیا اسیطرح چند دن بعد دوسری غلطی بھی خود بخود رفع ہو جاوے -

حاجی صاحب موصوف نے بھی مضمون مذکور میں یہ مان لیا ہے کہ اجیٹیشن ضروری ہے اور کانگرس کا وجود ہندوستانیوں کے لئے نفع بخش ہے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کن شرائط کے ساتھ اسمیں شریک ہونا چاہئے - آپ کو یہ شکایت ہے کہ کونسل کی ممبری میں مسلمانوں کو کافی حصہ نہیں دیا جاتا - مسلمان اعلیٰ عہدوں پر کم مقرر ہوتے ہیں وغیرہ - اس بحث کے دو حصے ہو سکتے ہیں اول یہ کہ مسلمانوں کی کمی کا ذمہ دار کانگرس ہے یا وہ خود - اور دوسرے یہ کہ کسی خاص گروہ کی کمی کے پورا کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کہانتک اپنی آواز بلند کر سکتی ہے - میں حاجی صاحب کی خدمت میں ادب سے یہ عرض کرونگا کہ مسلمانوں کا پولیٹکل اجیٹیشن میں شریک نہونا اور بعد ازاں اس اجیٹیشن سے جو نفع حاصل ہوا ہو اسمیں حصہ رسدی نہ پانے کی شکایت کرنا کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا - اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ مسلمان ہندوؤں پارسیوں اور عیسائیوں سے یہ کہیں کہ تم اجیٹیشن کرو ہم تمہارے شریک نہونگے بلکہ جسوقت تم اجیٹیشن کروگے اسوقت گورنمنٹ سے یہ کہینگے کہ یہ لوگ باغی ہیں بے ایمان ہیں اور گورنمنٹ اور مسلمانوں کے دشمن ہیں ہم بڑے وفادار ہیں ہم گورنمنٹ کا ساتھ دینگے اور یہ باتیں کہکر ہم گورنمنٹ کی عنایت کو اپنے طرف منعطف کرینگے لیکن جسوقت باوجود ہماری علحدگی کے اجیٹیشن سے کوئی نفع حاصل ہوگا مثلاً کاونسلوں میں ممبروں کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا اسوقت دیکھو کونسر منتخب کرنا گو ہم اسوقت تمکو گالیاں

دیتے ہیں پولیٹیکل ایجیٹیشن کو بُرا کہتے ہیں اور اپنے اہل ملک کے خلاف ہو کر گورنمنٹ کے نگاہو نہیں بہلے بنتے ہیں لیکن ان سب باتوں کو اسوقت تم بھول جانا اور ہم سے برادرانہ برتاؤ کرنا۔

حاجی صاحب موصوف نے تقسیم بنگال کے مسائل پر غالباً غور کیا ہوگا مشرقی بنگال کے مسلمان کن کن طریقوں سے بہکائے گئے اور انکے بعض سربرآوردہ لیڈروں نے اپنے تین عام بنگالیوں سے الگ کرلیا ممالک متحدہ اور پنجاب کے اخبارات مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو للکار رہے ہیں کہ دیکھو ہندوؤں کے شریک مت ہونا یہی موقع گورنمنٹ سے نفع حاصل کرنے کا ہے ہندوؤں کو بکنے دو تم بہلے بنے رہو اور سر بمفیلڈ فلر کی عنایتوں سے فائدہ اُٹھاؤ اب فرض کیجئے کہ دو برس یا چار برس بعد مشرقی بنگال کے کونسل میں ممبروں کے انتخاب کا وقت آوے اور اسوقت ہندو مسلمانوں کو اپنے ووٹ نہ دیں تو حاجی صاحب موصوف سخت ناراض ہونگے اور کہینگے کہ دیکھو ہمارے حقوق کی حفاظت نہیں ہوتی میں حاجی صاحب سے یہ پوچھتا ہوں کہ انکا یہ کہنا کہاں تک حق اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ جبکہ یہ بات عملاً ثابت ہوگئی کہ مسلمانان بنگال کو بلحاظ انکے شمول گورنمنٹ سروس یا کسی اور لحاظ سے زیادہ فائدہ نہیں ہوا اور جبکہ مخالفت تقسیم میں مسلمانوں کے نام بھی پائے جاتے ہیں پھر مسلمانوں کو اس تجویز (یعنی عام بنگالی قوم کا ایک حکومت کے تحت میں رہنا) کی تائید میں کوئی بڑا ہرج نہیں معلوم ہوتا" جسکے معنی یہ ہوئے کہ اگر واقعی مسلمانوں کو گورنمنٹ سروس سے فائدہ کی امید ہو تو ملکی اور قومی نمک حرامی میں کوئی ہرج نہیں۔ مجھکو تعجب ہے حاجی صاحب کی قلم سے یہ الفاظ کیونکر نکلے۔

اگر آپ ہندوؤں سے اچھا سلوک چاہتے ہیں تو آپ بھی انسے اچھا سلوک کیجئے

نہیں کہ ان سارے اخبارات میں جو خالص اسلامی جوش کے نمونے اور اسلامی پریس کے طرّہ دستار سمجھے جاتے ہیں ہر وقت اور ہر موقع پر ہندوؤں کو گالیاں دیجاویں پولیٹکل ایجیٹیشن کو بُرا کہکر اور گورنمنٹ سے ہر موقع پر ہندوؤں کو باغی نمکحرام بتلاکر اپنا رسوخ جتایا جاوے اور پھر ہندوؤں سے یہ امید کیجاوے کہ وہ باوجود ان سب باتوں کے ہمکو کونسل کی ممبری کے لئے منتخب کر دینگے حاجی صاحب کو یونیورسٹیز کمیشن کا قصہ یاد ہوگا اور آپ کو غالباً یہ بھی یاد ہوگا کہ سرگرو داس بنرجی نے ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کیا لکھا تھا اور حضرت بلگرامی نے کمیشن کی رپورٹ پر کسطرح چپ چپاتے دستخط کر دیئے تھے کیا انہیں باتوں سے اہل ملک کو دلوں میں اعتبار پیدا ہو سکتا ہے آپ کانگرس میں شریک ہوجیئے پولیٹکل ایجیٹیشن میں جن مصیبتوں اور صعوبتوں کا سامنا ہوتا ہے ان کو برداشت کیجئے گا تو ہے وقت ہماری کام آئی اور پھر کامیابی کے وقت اپنا حصہ رسدی حاصل کیجئے۔ باوجود اس عام مخالفت کے جو جو مسلمان کانگرس کے شریک رہے ہیں انکو کانگرس نے اس اعزاز کے عطا کرنے میں دریغ نہیں کیا ہے جو اسکے اختیار میں تھا۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ کی خوشامد کرکے اور ہندوؤں کو گالیاں دیکر پہلے اس سے نفع حاصل کریں اور پھر ہندوؤں میں بھی اعتبار اور رسوخ قائم کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھکو پھر مشرقی بنگال کا ذکر کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ اس وقت اس پالیسی کی ایک بیّن مثال ہے دیکھئے اسلامی اخباروں میں بابو سرندرناتھ بنرجی کیساتھ کیا سلوک کیا جارہا ہے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ انکے ساتھ کیا گیا اور جسطرح کانفرنس کے ڈیلیگیٹوں کے ساتھ برتاؤ کیا گیا وہ نہایت مناسب اور الانسب تھا میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بابو سرندرناتھ بنرجی نہایت نالائق سہی لیکن جسطرح مسٹر آمرسن نے انکے مقدمہ کا فیصلہ کیا اسکو کیا آپ انصاف کہہ سکتے ہیں میں مسلمان اخبار نویسوں سے

پونچھتا ہوں کہ آپ نے مسٹر امرسن کی کارروائی کو پڑھا ہے اور اگر پڑھا ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی کارروائی قانون کے موافق تھی - چور ڈاکو قاتل بھی جسوقت عدالت کے روبرو آتے ہیں اُسوقت وہ انصاف کی امید رکھتے ہیں کیا بابو سرندرو ناتھ ان سے بھی بدتر تھے - اور وہ بدتر بھی سہی - تب بھی جو ملزم عدالت کے سامنے آئے اسکے ساتھ عدل کیا جانا چاہئے اسکے ساتھ قانون کا برتاؤ ہونا چاہئے - مسٹر امرسن نے جو کچھ کیا وہ اظہر من الشمس ہے آپ ان کی اس حرکت پر آج محض اسوجہ سے بغلیں بجا رہے ہیں کہ بابو سرندرو ناتھ کانگرس والے ہیں بنگالی ہیں ہندو ہیں لیکن کل آپ انہیں بابو سرندرو ناتھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ کونسل میں اور کانگرس میں آپ کے خاص حقوق کی حمایت کریں اگر یہ ظلم و ستم نہیں تو اور کیا ہے -

پس اسکے قبل کہ آپ کونسل کی ممبری کی خواہش کریں آپ کو اس جد وجہد میں کانگرس والوں کا ساتھ دینا چاہئے جس سے انتخاب کا حق حاصل ہوتا ہے تاکہ ان لوگوں میں آپکا اعتبار پیدا ہو - لیکن علاوہ اسکے ایک بات اور بھی ہے بغیر پولیٹکل ایجیٹیشن میں شرکت کرنے کے پولیٹکل حقوق کے استعمال کی لیاقت نہیں پیدا ہوتی حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ ہر صوبے میں قابل اور لائق مسلمان موجود ہیں - ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر انہیں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے پولیٹکل مسائل پر غور کیا اور ان مسائل پر تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے اپنی لیاقت کو اہل ملک پر ثابت کیا ہے ایک زمانہ تھا کہ جب محض دولت یا ریاست ممبری کے لئے کافی ہوتی ہوتی تھی انگریزی زبان کا جاننا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا اب بھی کہیں کہیں ایسا ہے مگر اکثر اب ممبروں کے انتخاب میں علاوہ ان کی ذاتی وجاہت کے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ یہ پولیٹکل مسائل کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ان کو خدا نے ان مسائل کے سمجھنے

اور انپر بحث کرنے کے لئے دماغ بھی عطا کیا ہے یا نہیں اور اگر قابلیت ہے تو وہ آزاد خیالی کے ساتھ ہے یا نہیں - پولیٹیکل قابلیت اور آزاد خیالی یہ دونوں باتیں ممبری کے لئے نہایت ضروری ہیں ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہوں مگر وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے - خاموشی کی پالیسی نے جس کی بنا بیس برس ہوئے علی گڈھ میں ڈالی گئی تھی انکو گونگا بنا دیا ہے جو لوگ مسلمانوں کے وکیل اور قائمقام سمجھے جاتے ہیں ذرا انکا حال دیکھئے - البشیر - وکیل وطن - ریاض الاخبار - ان اخباروں کو میں نمونے کے طور سے لیتا ہوں - اگر میں غلطی نہیں کرتا تو انکے اڈیٹر انگریزی زبان سے وہ واقفیت نہیں رکھتے جو آجکل ہندوستان میں اخبار نویسی کے لئے ضروری ہے اسکو میں صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے بدقسمتی خیال کرتا ہوں کیونکہ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اکثر یہ اصحاب ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ جنکو پڑھکر ہنسی آتی ہے - جسوقت پنڈت مدنموہن صاحب مالوی نے الہ آباد کے کلکٹر کی بے اعتنائیوں سے مجبور ہوکر میونسپل کمشنری سے استعفےٰ دیا تھا اسوقت اسی صوبہ کے ایک اردو اخبار نے اظہار مسرت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب غالباً پنڈت صاحب کو کونسل کی ممبری سے بھی مستعفی ہونا پڑیگا - غالباً مطلب یہ تھا کہ چونکہ آپ الہ آباد سرکل کے میونسپلٹیوں کی طرف سے کونسل میں منتخب ہوئے تھے - اسلئے میونسپلٹی سے علیحدگی کونسل سے علیحدگی کا باعث ہوگی کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ ایک سربرآوردہ اخبار کو قواعد انتخاب سے اسقدر لاعلمی ہو - یا وہی مشرقی بنگال کے قصہ کو لیجئے - بابو سرندرناتھ کو گالیاں دیتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ سر ہیمفیلڈ فلر کو چڑھانے کے لئے اسال پراونشل کانفرنس انکے صوبے کے ایک ضلع میں مقرر کی - اصل یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس اور پراونشیل کانفرنسوں کے اجلاسوں

کے مقامات ایک سال قبل طے ہو جاتے ہیں اور ہر سال کسی نہ کسی صوبہ یا شہر کی طرف سے کانگرس اور کانفرنسوں کو آیندہ سال کے لئے دعوت دیدی جاتی ہے چنانچہ پارسال جب ضلع میمن سنگھ میں بنگال کانگرس کا اجلاس ہوا تھا تو اسیوقت یہ طے ہو گیا تھا کہ آیندہ اجلاس برلیسال میں ہوگا اسوقت نہ صوبہ مشرقی بنگال کا وجود تھا نہ اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کا۔ یہ حال ان حضرات کی واقفیت کا ہے شاید یہ کہا جاوے کہ یہ معاملات جزوی ہیں میں کہونگا کہ جزوی معاملات کے بنا پر بھی اگر آپ کسی کی رنج و تکلیف پر اظہار مسرت فرمائیں یا کسی کو گالیاں دیں تو آپ کا فرض ہے کہ واقعات کو اچھی طرح جانچ لیجئے علاوہ بریں بڑے بڑے ملکی مسائل پر بھی کچھ حالت بہتر نہیں نظر نہیں آتی۔ ایک افلاس ہند کے مسئلہ کو لیجئے اسکی دو شاخیں ہیں ایک سرکاری مالگذاری کی زیادتی جو زراعت سے متعلق ہے دوسری کاریگروں کی تباہی جو حرفت سے متعلق ہے مسٹر رومیش دت نے اپنے مشہور و معروف لکھنؤ والے ایڈریس میں پہلے مسئلہ پر نہایت قابلیت سے بحث کی تھی اور انہوں نے اپنی تصانیف میں ان دونوں مسئلوں پر سرکاری کاغذات کی مدد سے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ انہیں مسائل پر مسٹر دادا بھائی نوروجی اور مسٹر ڈگبی نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ افلاس کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے کہ جسپر آیندہ ہندوستان کی بہبودی اور تباہی کا بہت کچھ دارومدار ہے۔

میں حاجی موسیٰ خانصاحب سے پوچھتا ہوں کہ جن اردو اخبار نویسوں کی تحریر ہندوستان سعید کے ہزاروں مسلمانوں کی رائے پر اثر ڈالتی ہے انمیں ایک بھی ایسا ہے جسمیں ان کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے کی لیاقت ہو ان میں ایک بھی ایسا ہے جس نے اس مسئلہ کو سیاست مدن کے اصولوں سے جانچا ہو۔

انہیں ایک بھی ایسا ہے جو مسٹر گوکھلے کے بجٹ اسپیچوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی تکلیف گوارا کرتا ہو۔ مصارف فوجی ہی کے مسئلہ کو لیجئے۔ اگر کبھی اخبارات مذکور رائے زنی کی تکلیف گوارا کرتے ہیں تو کہدیتے ہیں کہ مسٹر گوکھلے کا اس مسئلہ پر کچھ کہنا فضول ہے کیونکہ فوج میں سرکار کمی نہیں کر سکتی وغیرہ وغیرہ مگر انہیں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس مبحث کی تاریخ پر غور کیا ہو۔ پہلے ہندوستان کی فوج انگلستان کی لڑائی لڑنے کے واسطے جب باہر جاتی تھی تو اسکا کل خرچ ہندوستان کے خزانے سے دیا جاتا تھا۔ چاہے ہندوستان سے فوج جنگ انگریزی قیدیوں کو چھڑانے کے لئے جاتی یا مصر میں انگریزی اقتدار قائم کرنیکے لئے۔ اسکے کل مصارف ہندوستانی دیتے تھے۔ سالہا سال کی کوشش کے بعد جب اس فنانی القوم و ادا بھائی نوروجی کے کہنے سننے سے ولبی کمیشن مقرر ہوا تو اس نے یہ طے کیا کہ جب ہندوستانی فوج انگلستان کی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے باہر بھیجی جاوے تو اسکا خرچہ انگلستان کے خزانہ سے دیا جاوے چنانچہ اب ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ کافی نہیں ہے حاجی موسیٰ خانصاحب خود فرماتے ہیں کہ "ہاں اسمیں شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان فوجی تیاری کا بار غریب ہندوستان پر ڈالنا ضرور نامناسب ہے خاص کر جب کہ ان اخراجات کی بیشی کی حقیقی غرض الشیا میں برٹش تفوق ہے تو لازم ہے کہ خزانہ انگلستان بھی اس خرچ کے بڑے حصے کا متحمل ہو" میں عرض کرتا ہوں کہ کیا اسلامی اخبارات کا فرض نہیں کہ وہ اس دقیق اور ضروری مسئلہ کے ان پہلوؤں پر غور کرکے اس پر بحث کریں اور ایسی رائے کا اظہار کریں کہ جس سے مسٹر گوکھلے ایسے آدمیوں کے دلیل اور حجت کو تقویت ہو۔ اور ایک افلاس کے مسئلہ پر کیا منحصر ہے جتنے بڑے بڑے پولیٹکل مسائل ہیں اور جنکے لئے کانگرس جدوجہد کرتی ہے ان سب کی طرف سے ایسی ہی لاپروائی برتی جاتی

ہی۔ وہاں تو اگر بحث ہوتی ہے تو ان مسئلوں پر کہ لڑکا نہیں دس بدقسمت مسلمان آریہ بنالے گئے اور پچاس خوش قسمت ہندو مسلمان ہوگئے۔ میں نہیں کہتا کہ ان مسائل پر بحث نہ کیجاوے نہیں ضرور کیجاوے اور اگر آریہ اخبارات ایک کہیں تو ان کو چار نہیں دس سنائی جاویں لیکن ان خفیف مسائل کو اخبار میں وہی درجہ دیا جاوے جسکے وہ مستحق ہے یہ نہیں کہ سارا اخبار اسی سے پُر ہو جیسا کہ آجکل ہوتا ہی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان خفیف اور پیش پا افتادہ امور کے متعلق کالم کے کالم سیاہ کرنا آسان ہے۔ دقیق پولیٹیکل اور اقتصادی مسائل پر بحث کرنیکے لئے قابلیت اور محنت درکار ہے

غرض یہ کہ اگر حاجی موسیٰ خانصاحب چاہتے ہیں کہ کانگرس کے پلیٹ فارم اور گورنمنٹ کی کونسلوں میں مسلمانوں کو اعلیٰ رتبہ ملے تو وہ اپنے اہل مذہب کو خلوص دل سے پولیٹکل ایجیٹیشن میں شریک کرانے کی کوشش کریں۔ محض مردم شماری کے اعداد سے وہ رتبہ اعلیٰ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسکے لئے ضرور چاہیے کہ اہل ملک کے دلوں میں اعتبار پیدا کیا جاوے اور پولیٹکل فرائض کے ادا کرنے کی لیاقت کا اظہار کیا جاوے۔ اعتبار اور لیاقت یہی دو وصف ہیں جنہوں نے پارسیوں کے مٹھی بھر جماعت کو کانگرس کی صف اولین میں جگہ دلائی ہے۔

مسٹر دادابھائی نوروجی۔ سر فیروزشاہ مہتا۔ مسٹر واچا کون ہندوستانی ہے جو انکو اپنا بزرگ اور لیڈر نہیں سمجھتا۔ اگر پارسی بھی یہی کہتے کہ ہماری جماعت تو بہت ہی تھوڑی ہے۔ ہندو اور مسلمان تو ہمکو ملکر پیس ڈالینگے ہمارے لئے کانگرس کی شرکت نہایت خطرناک ہے ہم اسوقت شریک ہونگے جب ہمارے خاص حقوق کا انتظام ہوجاوے گا تو اسکا کیا نتیجہ ہوتا۔ اگر سید احمد خانصاحب نے بوجوہات کانگرس سے علیحدگی نہ اختیار کی ہوتی تو انکا وقار کسی حالت میں اور لیڈروں سے کم نہ ہوتا ان کی رائے کو کانگرس کے پنڈال میں وہی وقعت ہوتی جو بابو

سرندر ناتھ یا سر فیروز مہتا کے رائے کو ہے۔ مگر انہوں نے مدرسۃ العلوم کی حفاظت اور استحکام کے خیال سے ایسا نہیں کیا اور صرف علیحدگی پر اکتفا نہ کرکے کانگریس کی مخالفت بڑے زور شور سے کی۔ مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا کہ تمہارے لئے پولیٹکل ایجیٹیشن سے دور ہی رہنا اچھا ہے اس پالیسی کا اثر مسلمانوں کی تعلیم یافتہ گروہ کے اخلاقی جرأت پر جو کچھ ہوا اسکا اعادہ فضول ہے۔ اب اگر مسلمان اپنا اعتبار اور وقار از سر قائم کرنا چاہتے ہیں تو وہ محنت و کوشش کرنے سے حاصل ہوگا اخلاقی جرأت کے اظہار سے حاصل ہوگا۔ پولیٹکل مسائل پر تحریر و تقریر کرنے سے حاصل ہوگا اہل ملک کے ساتھ ملکر کام کرنے سے حاصل ہوگا۔ نکاح کی سی شرطیں کرنا فضول ہیں۔ فقط "حوبیند"

جنگ روس و جاپان

آسوقت ایک ایسی کتاب ہمارے سامنے ہے جس نے زبان اردو کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، یہ کتاب جنگ روس و جاپان ہے جو مولوی ظفر علی خانصاحب بی۔ اے کی لٹریری کوششوں کا قابل قدر نمونہ ہے جس طرح اس کتاب کا فاضل مصنف اس سے مستغنی ہے کہ کوئی اسکو پبلک سے انٹروڈیوس کرے اسیطرح اسکی اس قابلانہ تصنیف کا ایک ایک حرف اپنی خوبیوں کی آپ شہادت دے رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے اصل کتاب میں بطور دیباچہ جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس خوبی سے کتاب کے لفظی و معنوی محاسن پر ریویو کیا ہے اسکے بعد پھر کیا لکھوں؟ مگر ماموروں مجبور کا معاملہ ہے۔ اور چونکہ ایک عزیز دوست کے اصرار پر انکار کرتے بن نہیں پڑتا اس لئے

ناظرین سے امید ہے کہ اگر میرے سرنگوں قلم سے ایک کرٹک کے فرائض پوری طرح ادا نہ ہوسکیں تو مجھکو معذور رکھیں گے۔

چونکہ سب سے پہلے پڑھنے والے کی نگاہ مضمون کتاب کی نوعیت پر پڑتی ہے لہذا دیکھنا یہ ہے کہ جنگ روس وجاپان کے مضامین کس قسم کے ہیں کیا یہ کتاب قصے کی ہے؟ نہیں۔ کیا تاریخ ہے؟ نہیں۔ کیا کوئی فلسفی تصنیف ہے؟ نہیں کوئی عاشقانہ کلام کا مجموعہ ہے؟ نہیں۔ کسی پولیٹیکل مسئلہ کے متعلق ہے؟ نہیں۔ پھر کیا ہے؟ ایک ایسی معجون مرکب ہے جسکا تعلق ان سب سے ہے اور خصوصیت کسی سے بھی نہیں ہے! اور یہی ڈراما کی اصل شان ہے۔ ڈراما نویس ہو یا ناول نگار اوسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ ابھی میدان جنگ میں گھوڑے دوڑا رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو پولیٹیکل حلقے میں بال کی کھال نکال رہا ہے؟ ابھی مجالس علمیہ میں فلسفی اور واعظ کی بھیس میں دُرفشانی کر رہا تھا اور اب راگ رنگ کی محفل میں طبلے پر تھاپ مارتا اور نغمہ سرائیاں کرتا ہے، کہیں صوفی ہے، کہیں ست، کبھی ناصح ہے کبھی شاہد پرست، مختصر یہ ہے کہ عمر دعیار کا اوتار ہو تو ڈراما یا ناول لکھ دوسرا لکھ بھی نہیں سکتا۔

اچھا تو ان باتوں کو ظفر علی خاں نے کہاں تک نباہا ہے۔ انصاف ہمکو اس کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ گو ڈراما ہمارے لئے بالکل نئی چیز ہے اور اوسکے نمونے اُردو میں النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ تاہم جنگ روس وجاپان کے لائق مصنف نے اپنی کوشش میں خاص کامیابی حاصل کی ہے۔

ایک تاریخی ناول ہونے کی حیثیت سے جسقدر واقعات جنگ خوش اسلوب پیرائے میں اس مختصر مجموعے میں فراہم کئے گئے ہیں، وہ اس دنیا کی یادگار لڑائی کے متعلق ضروری معلومات کا کافی سرمایہ کہے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ خلوانہ

پیرائے میں فردوسی اور میر انیس کی سی معرکہ آرائیاں نہیں دکھائی گئی ہیں تاہم ابتدا سے جنگ سے لیکر عہدنامہ صلح تک جاپان نے جو جوانمردی اور استقلال دکھایا ہے اور جو جو نمایاں فتوحات حاصل کی ہیں اُنکا بیان دلچسپ قصے کے پیرائے میں کیا گیا ہے اور ساتھ ہی تاریخی حیثیت میں بھی کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے۔

چونکہ تاریخ اور پالی ٹکس کا ساتھ چولی دامن کا ہے، لہذا اس میدان کو بھی ہمارے دوست نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور موقع موقع سے دول عظام کی سیاسی پالیسی کو بیان کر دیا ہے جو خیالات اس بحث پر ظاہر کئے گئے ہیں وہ اگرچہ ضمنی اور مختصر ہیں تاہم کچھ کم قابل قدر نہیں ہیں۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ دول اسلامی کو عیسائی پالی ٹیشن جس نظر سے دیکھتا ہے اور جن حاسدانہ و مغویانہ چالوں سے عرصہ پالی ٹکس میں عیسائیت اسلام کو مٹانا چاہتی ہے اُن پر نہایت متانت اور آزادی سے روشنی ڈالی ہے یہ بھی دکھایا ہے کہ مدعیان تہذیب ابلہ فریبی کی باتیں بنا کے قیام امن کے بہانے سے کسطرح حقوق انسانی کی پامالی میں رات دن کوشاں رہتے ہیں اور گورے رنگ والوں کے سوا دوسری مخلوق خدا کے ساتھ انکا برتاؤ کیسا ہے۔ اس بحث کو مصنف دو جاپانی عورتوں کے زبانی اسطرح بیان کرتا ہے۔

ایمی۔ ..... یہ روس کا شہنشاہ وہی شخص ہے جس نے اب سے چند سال پہلے تمام دنیا کے تاجداروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اب عالمگیر امن و صلح کا دور آگیا ہے .... الخ"

سہیلی۔ میرے خیال میں شہنشاہ روس کا مطلب اس تجویز سے یہ تھا کہ مہذب یعنی مسیحی طاقتیں آپسمیں جھگڑا فساد نکریں اُس نے اسبات کا ٹھیکہ کچھ تھوڑا ہی لیا تھا کہ غیر مہذب قومیں جیسا کہ ایشیا کی کل اقوام سمجھی جاتی ہیں اور جنمیں جاپانی بھی

داخل ہیں امن و عافیت کی برکتوں میں شریک ہوں۔ ایشیا والوں کو یہ تہذیب اور شائستگی کے اوتار وحشی سمجھتے ہیں اور اسلئے اُنکے ساتھ سلوک بھی جانوروں کا سا کرتے ہیں۔ زار روس پر ہی کیا موقوف ہے اسٹریلیا کو دیکھ لو اتنے بڑے براعظم پر جو تیس چالیس کروڑ کی آبادی کے لئے کفایت کر سکتا ہے تیس چالیس لاکھ متنفس جنکو صرف اتنا امتیاز حاصل ہے کہ اُن کا چمڑا گورا ہے قابض ہوگئے ہیں اور کسی پیلے یا سانولے یہانتک کہ ایسے گورے رنگ کے شخص کو بھی جبکی رگوں میں خاص یورپ کا خون نہ دوڑتا ہو داخل نہیں ہونے دیتے۔ ایشیا والوں کو جس نفرت اور حقارت سے یہ لوگ دیکھتے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بس جہاز پر گورے ملاح نہوں اُسپر اپنی ڈاک تک کے لائے جانے کے روادار نہیں۔ میں نے امریکہ کے ایک میگزین میں ایک دفعہ پڑھا تھا کہ ہندوستان کے ہندوؤں کا کھانا اگر کوئی غیر قوم و ملت کا شخص چھو لیتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ کھانا بھرشٹ ہوگیا یہ روایت بیان کرکے صاحب مضمون نے ہندوؤں کو غیر مہذب قرار دیا تھا اور اُن کی اس مذہبی رسم کو وحشیانہ پن سے تعبیر کرکے اُنکا مضحکہ اُڑایا تھا۔ لیکن معلوم نہیں وہ اسٹریلیا کے گورے چٹے مہذبوں کی نسبت کیا رائے قائم کرے گا جن کی چٹیاں تک ایشیائیوں کے چھونے سے بھرشٹ ہوجاتی ہیں۔

اگرچہ اس تقریر کا خاتمہ بھی مصنف نے اپنی حسب عادت دبی زبان سے کیا ہے، اور بحث کے پولیٹکل رُخ کو پھیر کے اخلاق پر لاڈالا ہے، لیکن مبتدا اور خبر کے اختلاف سے نتیجہ وہی نکلتا ہے جس سے تقریر کی ابتدا کی گئی ہے چھوت کی ابتدا بھی پولیٹکل ہے ہندوؤں کی تقسیم ذات کا قانون بھی پولیٹکل تھا۔ اور مسلمانوں کا مسئلہ "انما المشرکون نجس" بھی پولیٹکل ہے۔ پس ہم یہی کہینگے کہ جو کچھ

مغایرت یورپ ایشیا کے ساتھ برتتا ہے وہ سب پولیٹکل ہے اخلاق کو اُسمیں مطلق مداخلت نہیں۔ بلکہ اصل حقیقت تو یوں ہے کہ جیسی جیسی ترقی علم و تہذیب کی یورپ میں ہوتی جاتی ہے، اُسیقدر وہاں ایشیائی فلسفہ اخلاق کا زور ہوتا جاتا ہے۔ کہ جو اصول وید نے ہزار ہا برس قبل اور اسلام نے تیرہ سو برس پہلے قرار دیئے تھے۔ آج جرمن فرانس امریکہ وغیرہ کے فلاسفر ان کی سچائی کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں پھر ہم اسکو کیونکر مان لیں کہ جو سلوک ہمارے ساتھ کئے جاتے ہیں وہ ہماری بد تہذیبی و بد اخلاقی کی وجہ سے ہیں۔

پولیٹکل مباحث کے ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کو نظر انداز نہیں کیا ہے تاہم روس کے انتظامات اندرونی اور رعایا کی بد دلی و بے اطمینانی کی حالت کا بیان اس خیال کو پیدا کرتا ہے کہ ہمارا نوجوان گراجوئٹ اس بات کو بنظر استحسان نہیں دیکھتا کہ بیسویں صدی کی کوئی مہذب گورنمنٹ رعایا کو جائز حقوق دینے سے چشم پوشی کرے۔ مظفر خاں اور اقبال خاں کی گفتگو میں مسئلہ حقوق رعایا کی نسبت کسیقدر وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔ اقبال خاں کہتے ہیں "میری رائے میں وہ شخص جو کسی اصول کا پابند ہو (خواہ یہ اصول بُرا ہی کیوں نہو) اُس شخص سے لاکھ درجے اچھا ہے جسکا کوئی اصول نہ ہو۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا یہ فوجی اصول قرار دے رکھا ہے کہ کسی اعلیٰ فوجی خدمت پر کسی ہندوستانی کو مامور نہ کرینگے۔ اس کو خواہ اُن کی بے انصافی سمجھو خواہ اُن کی دور اندیشی پر محمول کرو پھر بھی یہ اُن کی مشرقی حکمت عملی کا ایک ایسا مستحکم اصول ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے اور اس لحاظ سے میں اُنہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یا۔ سچ پوچھو تو کون اپنی داڑھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں دینا پسند کرتا ہے۔ انگریز کچھ ہندوستانیوں کے تایا جان تو ہیں

نہیں کہ وہ دلی عقیدت سے اُن کے سامنے زانوے ادب تہ کرکے بیٹھیں گے
بعض بعض ہندوستانیوں کا اگر آج بس چلے تو انگریزوں کو کان پکڑ کر باہر نکال
دیں" اسکے بعد چند اعلیٰ عہدوں کے نام گنا کر جن پر برائے نام ہندوستانی
ممتاز ہیں، لکھتے ہیں" اور یہ اور بات ہے کہ تجاہل عارفانہ یا جہل مرکب کی وجہ سے
محکوم ہو کر وہ (ہندوستانی) حاکموں کی برابری کا خیال کریں اور ایاز ہو کر
محمود کے ہمرتبہ ہونے کا دم بھریں اور بیحیائی اور شوخ چشمی کی راہ سے یہ تصور
کرنے لگیں کہ اُن کی زبان اُنہیں وہ حقوق دلوادے گی جو صرف تلوار سے
حاصل ہو سکتے ہیں"

میرے خیال میں کانگریسی گروہ کی نسبت ریمارک ضرورت سے زیادہ سخت
ہے۔ مجھے ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ مسلمانوں
کی پست ہمت، نیم مردہ، اور نا تعلیم یافتہ قوم پولیٹکل معاملات میں دلچسپی لے یا نہ
لے اور اپنے حق کی قدر کرے یا نہ کرے؟ مگر اتنا ضرور کہونگا کہ تقریر مذکورہ بالا
میں مبالغہ آمیز خوشامد کے علاوہ دو جملے اسقدر نامناسب اور غلط خیال پھیلانے
والے ہیں جن کا کسی تعلیم یافتہ کے قلم سے نکلنا کبھی مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا اولاً
یہ کہنا کہ بعض ہندوستانی ایسے ہیں کہ اگر موقعہ ملے تو انگریزوں کو کان پکڑ کے
ہندوستان سے نکال دیں ایک بالکل مضر قوم اور غلط اتہام ہے جو اکثر ناعاقبت
اندیش اور جاہل مسلمان حامیان کانگریس پر عاید کرتے ہیں۔ دوسرے اُن لوگوں
کو جو عام انگریزوں کے مقابلے میں (نہ کہ شاہی خاندان کے) ہندوستانیوں
کے جائز حقوق اس بنا پر طلب کرتے ہیں کہ ہماری نہایت مہربان ملکہ مرحومہ نے
ان کے دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور ہمارے شہنشاہ معظم خلد اللہ سلطنتہ نے پھر
اُس وعدہ کی تجدید کی ہے، شوخ چشم اور بیحیا بنانا، اور ایاز قدر خود بشناس

کہکے پبلک کو مغالطہ دینا کہ بیسویں صدی میں بھی آزادی نہیں بلکہ یہ دور بھی اُسی دور غلامی کے مثل ہی میں نہیں سمجھتا کہ کیسی باتیں ہیں۔

پھر جیسا کہ براکٹ کی عبارت (خواہ یہ اُصول بُرا ہی کیوں نہ ہو) سے ظاہر ہے، ایک ہی بات کو محمود اور مردود قرار دینا بھی نئی منطق ہے۔ نیز یہ قول بھی غرابت سے خالی نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو فوج میں اعلیٰ عہدے دینے سے انگریزوں کی داڑھی انکے ہاتھ میں آجائیگی نیا اکبر نے اپنی ڈاڑھی اسی خوف سے مُنڈوا دی تھی کہ ٹوڈرمل اور مانسنگھ جیسے اعلیٰ ہندو افسر کہیں اکھاڑ نہ لیں اور یہی اصلی راز تھا اُسکی سلطنت کی ترقی اور استحکام کا برخلاف اسکے یہ عالمگیر کے وقت میں جو مغلیہ سلطنت کی بنیاد مرہٹوں نے متزلزل کردی اُسکا باعث شاید یہ ہوگا کہ اوسکی داڑھی بہت لمبی تھی! کیا ایسی غلط تاویلوں سے ہمارے دوست ۵ شاہ عادل را رعیت لشکر است ۵ کے مسلمہ اُصول کو غلط ثابت کرسکینگے؟ بہرکیف، سیاسیات کے عنوان میں بعض ایسے متضاد مباحث ہوگئے ہیں جنسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مصنف اپنے دلی خیالات کو دبانا چاہتا ہے۔ جب ہم اخلاقی پہلو سے کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی باتیں ہمکو ایسی ملتی ہیں جو قابل تسلیم اور لائق تقلید ہیں ڈراما کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اُسمیں ایسے مضامین کافی مقدار میں ہوں جنسے سننے والوں کی فیلنگ پر اثر پڑے۔ اور باوجودیکہ اس کتاب کا پلاٹ تاریخی اور رزمیہ ہے، مصنف نے کوشش کی ہے کہ جابجا اخلاقی نتائج مترتب ہوتے جائیں۔ خود کتاب کا ہیرو (اوکیو) اور اُسکی ماں ایثار نفس اور حب قومی کی اعلیٰ ترین مثالیں پیش کرتے ہیں، بسکٹ فروش لڑکے اور نیز اُس قیدی کا قصہ جس نے اپنی لاش کو طبی کالج میں دینے کی وصیت کی تھی، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، تیسری مثال ایثار نفس کی جو مکاڈو کی پریوٹ لائف سے پیش کی گئی ہے وہ اور بھی زیادہ حیرت انگیز اور عبرت خیز ہے۔ شہنشاہ (جاپان) کے دسترخوان برخلاف معمول چند قسم کے کھانے چنے گئے ہیں اور وہ اپنی ملکہ سے استفسار کرتا ہے کہ آج خاصے میں اسقدر اہتمام اور تکلف کیوں کیا گیا؟ کیا آغاز جنگ کے وقت ہمنے عہد نہیں کیا تھا کہ جب تک جنگ ختم نہ ہولیگی ہم برابر سادہ کھانا کھایا کرینگے اور وہ

بھی اس قسم سے زیادہ ہوگا اور جب ملکہ اس تھوڑے سے تکلف کا باعث جنگ نانکن کی مہم بالشان
فتح کی خوشی کو بتاتی ہے تو اسکو یوں جواب ملتا ہے "کیا تمہارا پاک اور بے لوث دل
اس بات کو جائز رکھتا ہے کہ تمہارا خاوند گوناگون نعمتوں کی طرف جو اس دسترخوان
پر چنی ہیں اسبات کے جانتے ہوئے ہاتھ بڑھائے کہ جاپان کی رعایا میں سے ہزاروں
بی بیوں کے شوہر نانکن کی خونریز گھاٹیوں پر آلودہ خاک و آغشتہ خون ہو چکے ہیں
میری آنکھیں ان بہادروں اور خصوصاً ان کے بیس ماندوں کی یاد سے نمناک ہیں
اور دل داغدار" پھر جب ان واقعات کا مقابلہ بیگم روس کی اُس تقریر سے کیا جاتا ہے
جو اُسیں اور زار میں اخراجات عطر اور ادائگی بل کے متعلق ہوئی ہے اور من بعد
ان دونوں شاہنشاہوں (زار اور مکاڈو) کی اخلاقی حالت کو نتائج جنگ پر منطبق کرنے
سے خود بخود نپولین کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ "جنگ میں بھی قوائے جسمانی
پر قوائے روحانی کو دس گنا اقتدار حاصل ہے۔ یہاں پر مصنف نے جو طریقہ تقابل اختیار
کیا ہے، جس میں آورد کا شائبہ بھی نہیں معلوم ہوتا، اُسپر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا
ہے۔ جابجا متفرق اخلاقی مسائل بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ امیر البحر کراخاف اور میڈم
کراڈوسکی کے وحشیانہ تعلق کے تذکرے میں یورپین طرز معاشرت پر نکتہ چینی کرتے
ہوئے پردہ نسواں کی حمایت کی گئی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ میں ہمکو کسیقدر اختلاف ہے
مگر اسمیں شک نہیں کہ مصنف کا ریمارک نہایت باموقعہ ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ سے اور نیز میدان جنگ میں گرانڈ ڈیوک بوری کی محفل رقص و سرود
کا سماں دکھلا کر ضمناً یہ بتایا گیا ہے کہ قوم میں اخلاقی کمزوریوں کا پیدا ہو جانا ہی اسکے
زوال کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ اس مقام کو پڑھ کر بے اختیار نادر شاہ کا حملہ اور
محمد شاہ کا دربار یاد آجاتا ہے۔

یورپین تہذیب کی اندھی تقلید پر سر جن میجر ہموشی کی تقریر میں جس خوبی اور
قابلیت سے ریمارک کئے گئے ہیں وہ بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔ خصوصاً شراب کے نقصانات
کو طبی دلایل کے ساتھ ایسے پُر اثر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس دو صفحے کے مضمون

[illegible]

کی قیمت کتب اخلاق کی کئی جلدوں سے بھی بڑھ گئی۔

اور بھی بہت سی بیش قیمت نصیحتیں مختلف مقامات سے اخذ کیجا سکتی ہیں مگر ہم بہ خیال طوالت سبکو ترک کرکے صرف ایک اور نظیر ایسی پیش کرتے ہیں جس سے بہتر مثال حسن خلق کے ہو نہیں سکتی اور وہ مکاڈو کا یہ تار ہے "اگر صلح و جنگ کا دارومدار چند ارب روپیہ جیسی بے حقیقت شے کے ملنے یا نہ ملنے ہی پر ہے تو جاپان ایسا طامع اور خود غرض نہیں کہ روپیے کی خاطر خونریزی کو جائز رکھے"

یہی وہ تار ہے جس نے پریزیڈنٹ روزولٹ (نہیں بلکہ تمام دنیا) کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے کہ "میں آپ کو (سفیر جاپان کو) آپ کے شاہنشاہ کی اس فیاضی و فراخ حوصلگی پر جسکی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ مبارکباد دیتا ہوں"

غرضکہ ساری کتاب ہندوستان کے ایک فاضل جرنلسٹ کی اس اجمالی مگر پُر مغز ریمارک کی شرح تفصیل ہے کہ "اہل جاپان نے فلسفہ و ادب میں عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرکے یورپ کے سامنے پیش کیں لیکن یورپ انہیں ناشائستہ ہی سمجھتا رہا! اسکے بعد انہوں نے رنگ برنگ کے سوتی اور ریشمی کپڑے اور چینی کے برتن اور آرائش و ضروریات کے سامان کے دلپسند نمونے تیار کرکے مغربی تہذیب کے نقادوں کی خدمت میں روانہ کئے لیکن پھر بھی وہ کودن اور جاہل اور غیر مہذب ہی رہے، آخر انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور ڈیڑھ لاکھ روسیان ابیض کا گلا کاٹ ڈالا اسپر ان کو فوراً تہذیب و شائستگی کا تمغہ ملگیا اور وہ دفعتہً مہذب اقوام کے زمرے میں داخل ہوگئے"

اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ جو مدعی تہذیب و اخلاق ہے اسکے قوائے ملکوتی قوائے بہیمی کے مقابلے میں کس قدر کمزور ہیں مگر یہیں سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ جب تک اخلاق درست نہوں، علم و ادب ترقی نہ پائے۔ صنعت و حرفت میں کمال حاصل نہو یعنی بالجملہ انسان انسان نہوے اُس وقت تک وہ محاربہ تو کجا دوسرونکے

مقابلے میں اپنی محافظت بھی نہیں کر سکتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج سے بیس برس پہلے بھی جاپان میں یہ ہمت تھی کہ وہ تلوار کے اُٹھتا اور ڈیڑھ لاکھ روسیاں ابیض کا گلا کاٹ کے (اگر گلا کاٹنا ہی شائستگی ہے) یورپ سے منہ تہذیب شائستگی حاصل کر لیتا؟ یہ محض قواے ملکوتی کی تکمیل حب قومی کا جوش اور ایثار نفس کی برکت تھی جس نے اُسکو اسدرجہ پر پہونچایا کہ ایک پودے نے کو دیو کے مقابلے میں فتح ہوئی اور دنیا کو دکھا دیا کہ یوں تکبر عزازیل کو خوار کر دیتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مطالب کتاب کے متعلق اسقدر لکھنے کے بعد ایک نظر ادبی حیثیت سے ڈالنا بھی ضروری ہے۔ مولوی ظفر علی خانصاحب کو اُردو کی لٹریری دنیا میں جو شہرت اور درجہ حاصل ہے اسکا اظہار کی حاجت نہیں۔ دکن ریویو جیسے معتبر پرچے کی ایڈیٹری کے علاوہ ان کی وہ متعدد تالیفات جنمیں خیابان فارس کی سی باوقعت اور ضخیم کتاب بھی شامل ہے، انکو کرسی اعتبار پر جگہ دینے کے لئے کافی تھیں تاہم وہ تالیفات تھیں اس تصنیف نے تو سونے پر سہاگے کا کام کیا زبان اور شاعری کے لحاظ سے مولوی ظفر علیخاں قابل تعریف اور پنجاب کے اُن اعلیٰ اہل قلم میں شمار ہونے کے مستحق ہیں۔ جنکی زبان اُردو بہت کچھ احسانمند ہے۔ مجھے اون لوگوں سے سخت اختلاف ہے جو چند غیر مانوس یا خلاف محاورہ الفاظ کے استعمال کے باعث خواہی نخواہی بھی اہل پنجاب کی مخالفت پر آمادہ اور اُن کی بیش بہا کوششوں پر خاک ڈالنے کی فکر میں رہتے ہیں جنکے عشر عشیر نمونے بھی ابھی تک دلی و لکھنؤ نہیں پیش کر سکے۔ سچ کہا ہے ہمارے قومی شاعر نے۔ ؎

حالی کو تو بدنام کیا اُسکے وطن نے	؎	پر آپنے بدنام کیا اپنے وطن کو

ناظرین میری مذکورہ بالا تحریر کی نسبت یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں اہل پنجاب کی عموماً اور ظفر علیخاں صاحب کی خصوصاً بھیٹنی کر رہا ہوں اسلئے اصل مطلب کیطرف رجوع کر کے اپنے دوستے اُس اختلاف رائے کی معافی چاہتا ہوں جو میرے اُنکے مابین واقع ہو جائے۔

یوں تو عموماً نظم و نثر کی خوبی یہ ہے کہ مطلب سہل الفاظ میں بیان کئے جائیں، عبارت میں بلا ضرورت طول نہ دیا جائے، تشبیہ و استعارات کا استعمال محض اُنہیں مواقع پر ہو جہاں اُنسے بیان میں کوئی لطف پیدا ہوتا ہو اور معنی کی توضیح ہوتی ہو کیونکہ وضاحت مضمون کے لئے تمثیل کی بالکل ایسی مثال ہے کہ پہلے کسی شخص کا حلیہ بیان کیا جائے اور پھر اوسکی تصویر پیش کر دیجائے۔ پھر جسطرح ان اُمور کا لحاظ نظم کی بہ نسبت نثر میں زیادہ ضروری ہے اُسیطرح نظم و نثر دونوں کے مقابلے میں ڈراما زیادہ تر اس پابندی کو چاہتا ہے۔ ڈراما میں بجز روزمرہ کی گفتگو کے اور کچھ نہیں ہوتا، اور روزمرہ کی گفتگو کا یہ طریقہ نہیں کہ اُسمیں لغت لڑھکائے جائیں ڈراما میں تو حسن اور نیز اثر جبھی پیدا ہو سکتا ہے جب معمولی بات چیت میں جوش پیدا کیا جائے۔ مگر جنگ روس و جاپان کا اسلوب بیان وہی ہے جو اس مصنف کی دوسری تصنیفات میں پایا جاتا ہے، مغلق الفاظ، پیچیدہ جملوں، عالمانہ تقریروں، نثر میں بے ضرورت تشبیہوں اور استعاروں، نظم میں غیر مانوس ترکیبوں اور لغت کی بھرمار سے جو مولوی ظفر علی خانصاحب کی تحریر کی خصوصیات ہیں، یہ کتاب بھی باوجود ناٹک ہونے کے خالی نہیں ہے تمثیلاً ہم ذیل میں چند فقرے نقل کرتے ہیں۔

"میں حضور کو یقین دلاتی ہوں کہ جب میں نے اور شاہی خاندان کی دوسری شہزادیوں نے اپنے ہاتھوں سے فوج کے زخمی سپاہیوں کے لئے پٹیاں تیار کی ہیں تو مع کیا تھا ہم سب نے اپنی جان نثار فوج کے مصیبتوں پر اتنے آنسو بہائے ہیں کہ پٹیاں تر ہو گئی ہیں لیکن میں اُس خاک کے ذرّوں کو جس سے ایک جیتی ہوئی فوج کے کام آئے ہوئے سپاہیوں کا جسم آلودہ ہو قبائے زرافشاں سے بہتر سمجھتی ہوں" یہ ٹکڑا اس طول طویل تقریر کا ہے جو ملکہ جاپان اور مکاڈو میں دسترخوان پر ہوئی ہے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ میاں بیوی کی باہمی گفتگو ہے یا مناظرہ۔ دوسرے موقعہ پر بلوائیوں کی زبانی جوش اور ہنگامی کیفیت میں فرماتے ہیں "ہائیو ہی ہو اُس نابکار ہوم سکرٹری کا گھر جو صلح کا سب سے بڑا ممد و موید ہے،

اسی کے مشورہ سے ہمارے شہنشاہ نے ایسی شرائط پر روس کے ساتھ صلح کر لی جنسے تمام دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ گئی۔ کیا ہمارے ہزاروں لاکھوں ہموطنوں کے خون سے منچوریا کے میدان اور بحرالکاہل کی موجیں اسی لئے رنگی گئی تھیں کہ ملعون روسیوں سے تاوان نہ لیا جائے اور کیا ہماری گاڑھی کمائی کے اربوں روپیے پانی کی طرح بیدریغ اسی لئے خرچ کئے گئے تھے کہ اسکے معاوضے میں ہمکو سگھالین بھی جسپر ہم بزور شمشیر قابض ہو گئے تھے ملے تو نصف یہ تمام الزام اسی بدبخت ہوم سکرٹری پر عاید ہوتے ہیں" یہ فقرہ بھی سراسر آورد سے بھرا ہوا ہے اور جوش کا کہیں پتہ نہیں جبکہ یہ خاص موقعہ تھا۔ باقی تمام کتاب کا اندازہ مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

نظم میں بھی یہی بات ہے کہ اکثر حصے پرزور ہیں مگر بہت کم پرجوش ہیں۔ مثلاً پہلی تقریر سکاڈو کی جس سے کتاب کا افتتاح ہوتا ہے اگرچہ رجز ہے مگر اسمیں رجز کی شان مفقود ہے۔ کچھ تو مضامین ایسے سیدھے سادے ہیں جو ایک مورخ کے قلم سے ضرور اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر شاعر کی زبان سے لطف نہیں دیتے۔ ثانیاً بحر ایسی اختیار کی گئی ہے جو بحرالکاہل کی مماثل اور مولانا حالی کے قومی مرثیوں کے لئے زیادہ تر موزوں ہے۔ اسیطرح ایک موقع پر جبکہ گورنر یونیشی کو بیانسی کا حکم سنا کے دربار برخاست کرتا ہے اور تنہائی میں اسکی آخری وصیت کو یاد کر کے جو حب قومی کی حیرت انگیز مثال ہے، متاثر ہوتا ہے اور اسحالت میں یہ اشعار پڑھتا ہے۔

نکلا ہے آب و تاب سے خورشید خاوری	زیبا اسیکے واسطے ہے جلوہ گستری
شرمندہ اسکی آب سے ہیں روشنان دہر	رخشندہ اوسکی تاب سے ہیں خشکی و تری

یہ تمہید کئی شعروں میں ختم ہوئی ہے اور پھر اصل مدعا تین شعروں میں بیان ہوا ہے کہ جس قوم میں ایسے ایسے جری اور جانباز لوگ ہوں اسکو غنیم کی یورش کا کیا خوف۔ بلاشبہ اس قسم کے اشعار اگر کسی قصیدے کی تشبیب ہوں تو نہایت شاندار اور شاعر کی طباعی کا عمدہ نمونہ سمجھے جائینگے، مگر ایسے موقع پر جبکہ موت اور حب الوطنی مل کر انتہا درجہ کا حیرت خیز سماں دکھا رہی ہیں بالکل بیمحل سے معلوم ہوتے ہیں۔

اسی قبیل کے وہ اشعار ہیں جو ایمی کی زبانی اُس موقعہ پر لائے گئے ہیں جبکہ آوکیو میدان جنگ کو جا رہا ہے اور وہ اُس سے رخصت ہونے آئی ہے۔ نیز دوسرے ایکٹ کے پہلے سین میں امیر البحر ٹوگو کی تقریر کے ابتدائی حصے میں بھی بجائے اسکے کہ جنگ کے متعلق ہدایتیں ہوتیں یا پُرجوش رجز ہوتا جس سے سپاہیوں کے دل میں اُمنگ پیدا ہو، ابر اور سمندر کا سماں باندھ کر غیر ضروری تقصد پیدا کر دیا ہے، جسکو سوا طول کلام کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی نظیریں مل سکتی ہیں جنکو ہم بخوف طوالت نظر انداز کر کے ان اضافی باتوں کو محض جوان طبیعت کی اُمنگوں سے منسوب کرنا مناسب سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ مشق اور سن کے ساتھ ساتھ خود بخود کلام میں سادگی اور روانی پیدا ہوتی جائیگی۔

غرضکہ مجموعی حیثیت سے کیا بلحاظ مضامین اور کیا بلحاظ شاعری و نثاری ساری کتاب لائق تعریف ہے جسکے لئے ہم اپنے دوست کو مبارکباد دیتے ہیں اور پبلک سے امید کرتے ہیں کہ وہ مصنف کی محنت کی داد دینے اور اس بیش بہا جوہر کی قدر کرنے میں کوتاہی نہ کریگی۔

ضامن کنتوری۔ محبوب نگر۔ جانم پیٹہ

مکتوبات امیر مینائی

(مرتبہ حضرت ثاقب مدیر قند پارسی علیگڈھ)

حکیم برہم صاحب کے نام (۷ جون ۱۸۹۱ء) پیارے برہم دعائیں لو۔ نور چشم ممتاز نے امیر اللغات سے متعلق تمہارے حکموں کے تعمیل کر کے کارڈ اطلاعی تمکو لکھ بھیجا اب اس خط میں کوئی بات جواب طلب نہیں البتہ وہ قطعہ جسکا ایک مصرع تمنے لکھکر تین مصرع اوپر کے مانگے ہیں وہ بھیجتا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک ہی لفظ جو عہد واجد علیشاہ مرحوم میں کہے تھے یاد نہیں رہے اسلئے کہ عہد شاہی تک جو کلام مرتب ہوا تھا وہ غدر میں تلف ہو گیا۔ اسوقت خیال کرنے سے جو مصرع یاد آئے وہ یہ ہیں ؎

مجھکو حصہ دے کے ٹالا غیر کو بوسہ دیا	دیکھتا جا اور مرے دمباز اپنے طور کو
حصہ کس کو دیدیا کسکو ذرا انصاف کر	دو دو بے حلوا مجھے حلوائی بیدرد و داد کو

منشی نظام الدین صاحب کے تنگ حالی سے بہت دل دکھا اللہ تعالیٰ رحم فرمائے انکے صفات انسانی کا کیا حال ہے کبھی لکھیگا مگر نہایت راستی کے ساتھ تحقیقی باتیں جو قابل اعتماد کامل ہوں فقط امیر فقیر۔ محمد احمد مع اخوان تسلیم رساں ہیں۔ جلیل سلام کہتے ہیں رسیم ایک برس سے اس دفتر میں نہیں ہیں راجہ جونپور کی سرکار میں نوکر ہیں سال بھر کے بعد کل اُنکا خط آیا ہے۔ امیر فقیر۔

بندۂ ثاقب کے نام

مخدومی حضرت ثاقب سلمہ اللہ الواہب۔

سلام مسنون اخلاص شحون قبول ہو اور دیر رسی جواب معذوری واقعی پر محمول ہو۔ پیالۂ محبت نامہ آیا تو مرآۃ الغیب ہم پہچانے کے فکر ہوئی اُسکو چھپے ہوئے کئی برس ہوئے مینے دو نسخے لے تھے وہ نذر دوستان نزدیک و دور ہو چکے۔ اس شہر میں تاجران کتب کے پاس بھی نلانا چار مطبع منشی نولکشور کو لکھا ابتک جواب نہیں آیا۔ میری پاس نفیسہ سدسات جن کے نام ذکر شاہ انبیا۔ صبح ازل۔ شام ابد۔ لیلۃ القدر ہیں موجود ہیں۔ مرآۃ الغیب۔ گوہر انتخاب محامد خاتم النبیین۔ مضامین دل آشوب نہیں ہیں۔ موجودات میں جسکی طرف التفات ہو بھیجدوں اور کوئی امر تحریر اولین میں جواب طلب نہ تھا۔ تحریر ثانی سے امتحان انگریزی درجۂ اول میں کامیاب ہونا معلوم ہوا اور ایسا جی خوش ہوا کہ اپنی کامیابی کا مزہ ملا۔ حق تعالیٰ وہ دن لائے کہ مژدہ صدر آرائی سننے میں آئے۔ الٰہی مدام سکارہ سے محفوظ اور لذائذ سے محظوظ رہیے زیادہ کیا لکھوں کہ نہ بیماری سے نجات ہوئی ہے نہ پرستاری سے۔ مکروہات دنیاوی اور اندیشہ ہائے اخروی علاوہ ہیں اللہم اغفر ذنوبی واستر عیوبی۔ راقم آثم۔

امیر احمد عفی عنہ۔ ۲۔ فروری ۱۸۹۱ء۔ محمد احمد تسلیم گزار ہے۔

قطعہ

کچھ وعدہ ہوا کہ آخر الجاد میں جناب مولوی محمد برکت اللہ صاحب بدایونی تشریف لائیں گے ہنوز وفات نائب دلی نہ کی خبر پر کچھ چیاں پڑھا کر
کہ دفعتاً ملال پر یہ خبر غلط نکلی۔ اور مرزا مائل مرحوم نے بے بل نظم اس واقعے کی نسبت ارزوی عطا کرنے تعمیر پڑھا

لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو مر گیا — کاش اٹھاتا یہ ہستی کا مزا
عشق میں مرنا تو پہلی چیز ہے — بن مرے عاشق ہو کیونکر کامیاب
زندہ دل مرنے سے جیتے ہیں سدا — صاف احیاء ہے قرآنی خطاب
واہ کا عاشق مرے پردیس میں — خوب فرمایا: بھلا۔ اچھا۔ جناب
ہند کی الفت پہ یاں جیتے ہیں ہم — گرچہ ہے پردیس میں رنج و عذاب
خدمتِ قوم و وطن سے زندگی — ہند کی خدمت میں جینا ہے ثواب
ہم مرے اور غیر ہوں حکام ہند — یہ خطا ہے یہ نہیں ہرگز صواب
ہند کو آزاد دیکھیں ہے امید — ذالک یاتی عن قریب الاعجاب
دوست لکھتے ہیں کہ تم تو مر گئے — مر چکے ہم پھر تو کیونکر دیں جواب
گر خطائے دوستاں۔ فال نکو — ور جفائے دشمناں۔ بانگ غراب

احیاء یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہ ۱۲

خواب اور خیال ایک ہی جنس ہیں۔ اور خواب میں کسیکو مردہ دیکھنا طولِ عمر پر حمل کیا جاتا ہے
کیس بلا کو تو ان کے کوسنے سے بھی ڈھور مرے ہیں۔

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ محمد احسن اللہ خان صاحب نائب مدیر تنبیہ

جان اسکی ادا دل پہ کھلتی ہی رہیگی — تیر جو چلتی ہے سو چلتی ہی رہیگی
ظالم کی تو عادت ہے ستانے کی رہیگی — اپنی یہی طینت ہے بہلتی ہی رہیگی
دل رشک عدو سے ہے سراسر آتش — شمع تری بزم میں جلتی ہی رہیگی
عزم مزار یار کا ہے میں بنا ہی رہیگی — تلوار ہے کوچے میں چلتی ہی رہیگی
ایک آن میں دیکھیں ہیں ہزاروں آفتیں — کیا جانے تری تقدیر بدلتی ہی رہیگی
انداز میں تیری ہیں حرارت ہی حیا ہیں — عیاں ایک نہ ایک بات نکلتی ہی رہیگی

وحشت کو رہا انس جو یوں فن سخن سے
یہ شاخ ہنر پھولتی پھلتی ہی رہیگی

غزل جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

دی ستم ناروا کیا کہئے
حضور آپکے طرز جفا کو کیا کہئے

ملال خندہ اغیار سے ہے دل ٹکڑے
فغاں بے اثر و نارسا کو کیا کہئے

وہ حال پوچھتے ہیں کسی خیالمیں مست
خموشی دل بے مدعا کو کیا کہئے

خود اپنی عمر کی بیگانہ وار اگر ہو روش
زبان سے پھر کسی ناآشنا کو کیا کہئے

فغان خاطر ناقوس کی نہ داد ملی
برہمنو یہ تمہاری خدا کو کیا کہئے

یہ کیا کہ جانبہ بیجا ہو اور اُف نہ کرو
تری جفا کو اور اپنی وفا کو کیا کہئے

شکست رشتہ امید سے بحال ہوا
فراق میں دل غم آشنا کو کیا کہئے

نوید آمد دلبر نے جان دی محشر
خلاف وقت نزول قضا کو کیا کہئے

غزل جناب مولوی مخدوم عالم صاحب آثر مارہروی

[illegible] دوستو رائی مری یوں غیر کرے
ہو اگر یہ ہی عنایت تو خدا خیر کرے

[illegible] دل ہی میں ہو موجود کسیکا جلوہ
کس لئے کوئی طواف حرم و دیر کرے

[illegible] کہ عیادت کو رقیب آتا ہے
کام جو دوست کے کرنیکا ہو وہ غیر کرے

اس ہوا میں ہے کہ بیتاب ہے جنت کی تمنا
آکے رضواں ترے کوچہ کی ذرا سیر کرے

ہم نہ توڑینگے کبھی عہد وفا ہے جتنے بھی
بیوفائی اُسے کرنا ہے تو وہ غیر کرے

[illegible] بھلائی جو بھلائی کے عوض ہیں تو کیا
بات تو جب ہے کہ تو شر کی عوض خیر کرے

[illegible] یوں ہیں زمانہ کے مخالف جیسے
رہ کے دریا میں مگر مچھ سے کوئی بیر کرے

[illegible] کے عقاید سے فرماتے ہیں
اے اثر تیرا خدا خاتمہ بالخیر کرے

حسرت موہانی

[illegible] نازنیں از راہ کرم پہونچا تھا
شب غریب کو سامان بہم پہونچا تھا

[illegible] اصحاب کروں کیا حسرت
رنج ایسا دل مایوس کو کم پہونچا تھا

اردوی معلے

یعنی صحیح و فصیح اردو کا ایک ماہوار اور قابل دید رسالہ جسکے سال ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں حجم ۲۰ صفحے کمال چھپائی کاغذ نہایت پسندیدہ سلنے کا پرچہ ۲ ہر کے گلستانے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ دواوین مع رسالہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (۴) فی سعید کاغذ پر) علاوہ رسالہ طلبہ غیر مستطیع حضرات) مقاصد ضروری بنمونہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالیسیں درخواست خریداری بنام منیجر اردوی معلی علیگڈھ آنا چاہیئے

لہ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں (۱) رپورٹ اردو بھی کا نگریس (۲) دیوان میر تقی (۳) اور دیوان قائم چاند پوری شاگرد میر (۴) شائع ہوئے اور ۱۹۰۹ء کی سشماہی آخر میں دیوان حضرت استاد جرات نذر کیا گیا۔

دیوان غالب لہ

سعید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پرچہ حضرت مرزا غالب کی نظر سے گذرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اردوی معلے علیگڈھ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم تقریباً ۱۱۰ صفحہ مع محصول و فصیح دیباچہ عہ درخواست خریداری بنام۔ منیجر اردوی معلے علیگڈھ آنا چاہیئے قیمت مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ تا صفحہ ۳۴ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

لہ غالب میں تقطیع پہلے سے بڑی کر دی گئی ہے اور اشعار کے مطابق میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ جابجا ترمیم بھی کر دی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے۔

منیجر اردوی معلے علی گڈھ

دی ریلیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و دیگر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال ہر قسم کے چند منتخب ساڑھے سندھ یا الوان کی ایک کمپنی قائم کی گئی ہے جو صرف نہیں کہ وہ صرف بالخلوت ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی رنگ کے لئے نفع نہایت ہو کر رہے۔ مثلاً اس کمپنی کا مال ہر طرح کے ہندوستانی طرز کے سستے یا اندر نفیس ہر قسم کا کپڑے از قسم تنکی چادرہ دھوتی و بالا پوش و رومال کستی و سوتی لنگا و ساڑھیاں ہر قسم ہر رنگ کے ہندوستانی ہر قسم و ہر رنگ کا دوپٹہ چھاپ و سادہ و بکن و دوپٹہ یا بوٹا فتہ وغیرہ لائق تیاری و شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ باستانی پہنچائے جاتے ہیں۔

نفاست و پائداری میں یہ خاص بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر قبول کہ ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔

فرمائشی لڑکے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں (فرمائشیں ذیل کے پتہ سے آنی چاہئیں)۔ المشتہر ڈاکٹر شرافت حسین سکریٹری ریلیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور محلہ تاتار پور

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول مدوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اردوی معلے غزلوں کا انتخاب اس احتیاط و مرغوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا ضخیم دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع ۲۰×۲۲/۸ حجم جزو قیمت عہ (۸) مع محصول ڈاک المشتہر۔

منیجر اردوی معلے علیگڈھ

شرح اجرت اشتہار اردوی معلے

	اشتہار ۲ کالم	نصف صفحہ یا ایک کالم	ثلث کالم
سالانہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ششماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سہ ماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ہر بار	[illegible]	[illegible]	فی سطر ۲ [illegible]

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک ۱۵

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور پینتیس چیزیں مفت

ناظرین کو خوب خیال ہوگا کہ یہی ریلوی فیشن کی جیبی گھڑی کسی وقت میں دوسرے سوداگر سات روپیہ کو بیچا کرتے تھے لیکن جب ہمنے دساور سے چالان خود منگایا اور قیمت ہم نے گشادی تب اور سوداگر حسد سے بھوکے مگر کریں ہمنے اب اسکے ہمراہ پینتیس چیزیں مفت دینا شروع کردیں یہ گھڑی ۲۴ گھنٹے کی کوک کی سچ سکنڈ ڈاک فانوس ریلوی اور تار گھر کے لئے موزوں ہے۔ قسم راسکوپ سادہ ڈائل کی پائیدار سے پریت رام چاندی کی کانی میں چاندی کی اکتھی ڈبل کیس کا نیٹی سال لفظ چوڑی گھڑی سنہری جالدار سنہری ڈبل کیس مقصی نیتی سال شے ۲۰ آنس کلاک روز مرہ چابی ہمنے

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ جوتے

ہمراہ ہر بردار دارش خوشنما لیس بوٹ شین لیدر دقت ہر وقتی سے

ایضاً ۔ رنیس لیدر ۔	۔
ایضاً ۔ کانپوری بڑیکا ۔	۔
لیموں شور نخاف رنگ	۔
پمپ شو دلایق دارش ۔ ۔ ۔	۔
کرکٹ شو کینوس فلنسنگ رنگ	۔
ایضاً اصلی دارش ولایتی ۔	۔

کانپور کے ہر قسم کے زین

زین سپاہی مع جلد سامان ...	۔
زین پالی دار مع سامان ...	۔
زین پلو مع جلد سامان ...	۔
زین گھوڑ دوڑ کا جلد سامان ۔	۔
زین چکر دار پونے کے جلد سامان ۔	۔

کانپور کے ہر قسم کے ساز

ساز فٹ پیڑا کانپور ۔ ۔ ۔	۔
ساز گانگہ بڑا کانپوری پرزہ	۔
ساز ٹیٹم بڑا کانپوری پرزہ	۔
ساز چوڑی دارش پرزہ فوقی ۔	۔
ساز گرجل چمڑا کانپوری پرزہ	۔

ہمراہ انکے ہر قسم کی اشیاء دیسی و ولایتی رہتی ہیں۔

المشتہر

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس ۔ سوداگر کانپور چوک ۱۵

ممیرے کا سرمہ

مصدرہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسر نامور ڈاکٹر اور ایان ان ریاست اور ولایت کے یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹر نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت و تاریکی چشم دھند جالا۔ پڑھال غبار۔ پھولا۔ سسل۔ سرخی۔ ابتدائی توتیا۔ ناخنہ۔ پانی جانا خارش وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی ضرورت نہیں رہتی عرصہ سے لیکر بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ چوسال بھر کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ۔ ممیرہ کا سفید اعلیٰ قسم فی تولہ تین روپے خالص ممیرہ فی ماشہ بتیس روپیہ۔ مصری سرمہ فی تولہ ۴ روپیہ

المشتہر

بروفیسر نامنگ ملو والیہ مقام ٹاڈ ضلع گرداسپور پنجاب

ان سے بڑھکر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میا سنگھ صاحب نے خود بنایا ہے۔ آپ خود اور بہت سے مریضوں پر استعمال کرکے دیکھا ہے اور میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ نادر ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کے واسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنے تجربہ میں آجتک کوئی سرمہ اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں دیکھا۔ میں ان کو جن کی آنکھوں میں زرابی اسی قسم کی شکایت ہے بڑے زور سے استعمال کرنیکی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا باقی آنا۔ دُبہ۔ خارش سرخی چشم کے واسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ اور سچ سچ آپ نے اس سرمہ سے دانوں میں ایجاد کرکے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہے اسکا شکریہ الفاظ میں ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ اسکے سرمہ سے فیضیاب ہوکر فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔

راقم

[illegible] رام صاحب ڈاکٹر حضور نواب صاحب بہادر بہاولپور

[illegible] ایسا دل مایوس کو کیا ہوتا تھا

رجسٹرڈ نمبر ۲۵۱

اردوی معلیٰ

جلد (۶) | بابت ماہ جون ۱۹۰۶ء | نمبر (۶)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے

فہرست مضامین

(۱) مصحفی	صفحہ	(۵) بیاض النور	۲۰
(۲) اقوام ہند میں اتفاق باہم از قاضی تلمذ حسین صاحب بی۔اے	۹	(۶) دارالسلطنت فرانس کی سیر از "ثانی"	۲۷
(۳) مکتوبات امیر مینائی از حضرت ثاقب۔ مدیر قند پارسی	۱۹	(۷) مثنوی حضرت عیش مرحوم عطیہ جناب مولوی فدا حسین صاحب	۴۲
(۴) صداقت از شروانی جونوی	۲۳	(۸) غزلیات متفرق	۴۶

مقام اشاعت دفتر اردوی معلیٰ علی گڈھ

احسن المطابع علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول - للعہ سالانہ
قسم دوم - ۴ سالانہ }

شملہ

اور اس سلسلہ کوہستان کے مفصل حالات
کتاب لطف کہسار میں نہایت قابلیت سے بکمال محنت و
تحقیق لکھے گئے ہیں۔ انگریزی و اردو وغیرہ زبانوں میں
ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی۔ خط پاکیزہ۔ کاغذ اعلیٰ چھپائی مطبع
رفاہ عام سٹیم پریس لاہور۔
عبارت دلفریب۔ طرز بیان طلسم خیز۔ انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ

مختصر فہرست مضامین

(۱) مصنف کی پہاڑ پر تعیناتی
(۲) اس سلسلہ کوہ کی رجائی کیفیت
(۳) کوہستان اور اسکے حقیقی لطف
(۴) شملہ کالکا کالٹ روڈ اور ریلوے
(۵) پہاڑی جیپ اور ریسلے
(۶) پہاڑی عوارض اور انکے حالات کا انکشاف
(۷) جنگل اور جانور۔
(۸) بارش اور برف کے نظارے
(۹) پہاڑی جہازیوں کے حالات
(۱۰) پہاڑ کی سیر کے اعلیٰ سے اعلیٰ سیر بورڈ کے خاکے

اور دیگر بیسیوں مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ سیر بورڈ کے خاکے
کھینچے گئے ہیں قیمت معہ محصول ڈاک محض ۱۴ر

اردو بہر گوسنگتا (یعنی مراۃ الغیب) ایکہزار جلد میں سے
پچاس جلدیں باقی ہیں قیمت معہ محصولڈاک ۱۲ر ملنے کا پتہ
ڈاک خانہ اکال گڈھ ریاست پٹیالہ منشی رائے بھگونت
رائے اڈیشنل نائب ناظم۔

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت شیخ العالم مخدوم عبدالحق ردولوی
قدس اللہ سرہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
قیمت ۸ر

دیوان مجروح

میر مہدی حسین مرحوم شاگرد غالب قیمت ... عہ

اردوی معلیٰ جلد پنجم

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع رپورٹ
بمبئی کانگرس بلا قیمت

قیمت عہ مع محصول۔ دفتر اردوی معلیٰ علی گڈھ
سے طلب کرو

البیان

ایک علمی تاریخی رسالہ

قیمت سالانہ پیشگی ... ... (للعہ)
مقام اشاعت .. .. دفتر البیان لکھنؤ
زبان ..... عربی مع ترجمہ اردو
(نوٹ) یہ رسالہ پہلے ماہوار شائع ہوتا تھا اور سے قیمت تھی
سال عہد سے اب پندرہ روزہ شائع ہوتا ہے اور قیمت صرف
للعہ رہی ہے، ہر نمبر کی ضخامت معمولاً دو جز ہوتی ہے صفحہ
میں عموماً دو کالم ہوتے ہیں۔ ایک میں فصیح عربی اور دوسرے
میں بامحاورہ اردو ترجمہ۔ مضامین تحقیق سے لکھے جاتے ہیں
اور اسلامی خبریں بکثرت ہوتی ہیں (درخواستیں باجازت دیلو
آنی چاہیں)

عصر جدید

یہ ایک ماہانہ رسالہ تین جز و پر سوا تین برس سے شائع
ہوتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ مسلمان **بیکار اور
فضول بحثوں** پڑنے کی جگہ کام کی باتوں پر
متوجہ ہوں۔ فضول خرچی کاہلی۔ بیکاری کو ترک کریں
پیشہ ور کاریگری کو رواج دیں۔ محنت اور کام اور جائز ذرائع
معاش کی طرف آمادہ ہوں۔ تعلیم مغربی سے بجائے
فضول تقلید اہل فرنگ کے اتفاق و محنت کا سبق لیں
مذہب کا صحیح خیال اور خوف خدا لوگوں کے دلوں میں
پیدا ہو۔ شادی رسمی کی فضولیات اور قرض لینے کا مرض
دور ہو۔

اسکے آنریری اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے
ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ سکرٹری اصلاح تمدن (سابق
چیف جج ریاست ماہیر کوٹلہ) ہیں اور اس رسالہ نے مسلمانوں
کو ایک حد تک بیدار کیا ہے۔ قیمت نمونہ ۲ر جا۔ طلب
امور کے واسطے جوابی کارڈ۔

المشتہر
منیجر عصر جدید گولہ گنج۔ لکھنؤ

الیا دل مایوس کو کر پہونچا تھا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصحفی (سنہ ۱۱۶۴ھ تا سنہ ۱۲۴۰ھ)

نام و تخلص | شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص خلف شیخ ولی محمد امروہہ کے رہنے والے تھے۔ زمانہ طالب علمی دہلی میں بسر کیا اور کسب کمال کے بعد لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو کر وہیں کے ہو رہے۔ یہانتک کہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں ۷۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

عادات و مشاغل | خوش خلقی اور خوش مزاجی کے ساتھ ادب و لحاظ کی پابندی کے باعث سے جہاں رہتے تھے عزیز دلربا ہو کر رہتے تھے۔ تباہی دہلی کے بعد بعد نواب آصف الدولہ بہادر لکھنؤ آئے اور مرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ اور آخر وقت تک شغل شعر و شاعری میں مصروف رہے اور اسدرجہ استعداد و مشق بہم پہونچائی کہ دنیائے استادی میں عدیم المثال قرار پائے۔

کہنہ مشقی و تصنیفات | انکی کہنہ مشقی سے متعلق تذکروں میں اکثر روایتیں نظر سے گزرتی ہیں مثلاً مضمون نثر کو دیکھ دیکھ کر اسطرح پر بے تکلف نظم کر دیتے تھے کہ دیکھنے والوں کو نقل کا گمان ہوتا تھا یا طرح مشاعرہ پر لاتعداد اشعار لکھتے چلے جاتے تھے جنمیں سے بعد کو شاعر اپنے نام سے پڑھنے کے لئے لوگ غزلیں چھانٹ کر مول لیجاتے تھے۔ اسپر بھی اردو کے آٹھ دیوان، ایک دیوان فارسی اور تذکرہ شعرائے اردو و فارسی کے ان سے یادگار باقی ہیں جنکے مطالعے کے بعد انکی استادی اور مشاقی کے ثبوت کے لئے پھر کسی دوسری دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔

شاگرد معاصر | اور اس سے بڑھکر ثبوت انکے کمال فن کا یہ ہے کہ جتنے استاد انکے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے نکلے اتنے دلی سے لیکر اسوقت تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے چنانچہ انکے معاصر استادوں میر حسن جرأت و انشا کے شاگردوں کی تعداد انکے متوسلین کے دسویں بلکہ بیسویں حصے کے برابر بھی نہیں ہے حتی کہ میر حسن کے صاحبزادے میر خلیق خود اپنے والد کے اشارے سے انہیں کے شاگرد ہوئے اور شاگردی پر قایم بھی رہے

ذیل میں ہم ایک نقشہ سلسلہ مصحفی کا درج کرتے ہیں جسکے ملاحظے سے معلوم ہوگا کہ مصحفی کے بعد لکھنؤ کے تمام مشہور استاد انہیں کے حلقہ بگوش تھے یہانتک کہ بعض تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے مطابق شیخ ناسخ کو بھی اسطرح محمد عیسیٰ تھا انہیں سے تلمذ تھا چنانچہ دیباچہ دیوان ششم مصحفی کی عبارت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے جس میں مصحفی لکھتے ہیں کہ "حصہ نسبت الوان ایں خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تھا است و بفقیر رسوخے از تہ دل دارد مقسوم گشت"

نقشہ سلسلۂ مصحفی

مصحفی

(۱) آتش

سرسبز (۱) مسرور (۲) نذر (۱۱) طبیق (۱۰) خاص (۹) ہوس (۸) عیشی (۷) اسیر (۶) تنا (۳) تہیتی (۵) شعور (۴) منظر (۸) خان (۱۱) محمود (۳) نصیر (۱۵) کرم (۱۴)

واقف — کامل — ملازم

اُنس — مونس

تعشق — عشق — تجید

شفق — حکیم — امیر — افضل — جہاد

وفا — آہ — جاہ — انور — کوثر — نواب — ریاض — عبیل — سفر — سیم — حفیظ — شفق — ثاقب — صفدر

شیدا — اصغر — فیض — اعظم — نشاور — سلیم — شرف — خلیل — صبا — زار — شوق — نبی — ماہ — نسیم — قدس — قمر شاہی

قمر موہانی — آغا — حنا — فوق — کیف — ازل — فروغ — صفدر — رشید ہمدانی

نوٹ۔ اس نقشے میں ہر استاد کے شاگرد رشید کا نام درج ہیں اور پھر سلسلہ وار دائیں بائیں کے بعد دیگرے صیغہ مرتبہ دیگر شاگردوں کے نام درج ہیں جیسا کہ شاگردان مصحفی کی فہرست میں تمیز دیکر ظاہر کر دیا گیا ہے۔

مصحفی کی شاعری

مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ سخن پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعراے متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے چنانچہ انکی غزلوں میں کہیں میر کا درد ہے تو کہیں سودا کا دبدبہ۔ کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی۔ کہیں واقعات میں جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہیں ترکیب الفاظ اور انداز بیان میں انشا کا طنطنہ اور جبروت صرف ہوا ہے۔ کہیں پر غزلوں کو قطعات مسلسل پر ختم کرنے میں جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش نظر ہوتا ہے تو کہیں مشکل ردیف قافیوں کو بخوبی و صفائی نباہنے میں شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور پھر ان سب کے علاوہ جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی گہنہ مشقی اور استادی یکجا کردیتی ہے انکا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مصحفی کی زبان اگرچہ میر و سودا کی قدیم زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اسدرجہ شیریں اور سبک واقع ہوئی ہے کہ اکثر اسکی حلاوت اس زمانے میں بھی ناظرین کے دلوں میں اسکے متروک الاستعمال ہونیکا گمان نہ پیدا ہونے دیگی ملاحظہ ہو

جب واقف راہ و روش ناز ہوئے تم	عالم کے میاں خانہ براندار ہوئے تم
رات پردے سے ندا نہ جو کسو کا نکلا	شعلہ سمجھا تھا اُسے میں یہ بھبوکا نکلا
اس نازنین کی باتیں کیا پیاری پیاری ہیں	پلکیں ہیں جسکی چھریاں آنکھیں کٹاریاں ہیں
جاگا ہے رات پیاری تو کسکے گھر جو تیری	پلکیں اونیندیاں ہیں آنکھیں خماریاں ہیں
ترسا نہ مجھکو کہنچ کے تلوار مار ڈال	گر مار ڈالتا ہے تو ایکبار مار ڈال
صیاد مجھکو کسنے کہا تھا کہ فصل گل	مجھکو قفس میں کرکے گرفتار مار ڈال

"مجھسے کہا تھا" کی جگہ "مجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے اگرچہ بعض لوگ علم کے معنوں میں اب بھی اسکا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔

عارض نہ تیری زلف پریشان میں دیکھا	یوسف کو زلیخا کے میں زندان میں دیکھا

فارسی اضافت کے ساتھ اعلان نون بھی غالب کیوقت تک جائز تھا اب اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں کا استعمال بحذف "نے" علامت فاعل بھی قدیم شیوۂ سخن طرازی ہے۔

فارسی محاوروں کے ترجموں کا اردو لفظاً سے جوڑ ملانا بھی شعرائے متقدمین کا خاص جوہر ہے چنانچہ مصحفی نے بھی بعض محاوروں کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ اردو زبان میں آمیختہ کیا ہے کہ ارباب بینش ان کو دیکھینگے اور تعجب کرینگے۔

زلفوں کی برہمی نے برہم جہاں مارا	پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا
جب کوہ و بیاباں میں جا ہمنے قدم مارا	فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا
تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا	اس جنبش مژگاں نے عالم کو بہم مارا
میں تیرے تغافل کا کشتہ ہوں کہ عاشق کو	معشوق کی آنکھوں نے اس لطف سے کم مارا
اے مصحفی جو میرے اشعار بیاضی تھے	میں صاد کیا ان پر اور سب کو قلم مارا
مجھ صید ناتواں سے مگر عار لیگیا	قاتل جو اپنی کھینچ کے تلوار لیگیا

اب ہم اپنے بیان کی تائید میں دواوین مصحفی سے ہر رنگ کا کلام پیش کرکے مختلف اساتذہ کے انداز سخن سے اسکا موازنہ کرینگے۔ اول چھوٹی بحر میں ان کی دو غزلیں ملاحظہ طلب ہیں

گرا بر گھرا ہوا کھڑا ہے	آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کسکا جو سمندر	مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسم گل۔ چمن میں ہر نخل	پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد برابر اسکے قد کے	دہشت سے بجا ہوا کھڑا ہے
خونین کفن شہید الفت	دولہا سا بنا ہوا کھڑا ہے
اے جان محل کہ مصحفی کا	اسباب لدا ہوا کھڑا ہے
دیکھ اسکو اک آہ ہمنے کرلی	حسرت سے نگاہ ہمنے کرلی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے	اس شوخ سے راہ ہمنے کرلی
جب اسنے چلائی تیغ ہمپر	ہاتھوں کی پناہ ہمنے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا	کج اپنی کلاہ ہمنے کرلی

دی ضبط میں جبکہ مصحفی جان	شرم اسکی گواہ ہمنے کرلی

ان دونوں غزلوں کی سادگی اور صفائی خصوصاً دوسری غزل کا درد میر تقی میر کے کلام سے یاد دیتا ہے اگرچہ بحیثیت مجموعی مصحفی کا کلام میر سے دوسرے درجہ پر ہے۔ میر کی سادگی اور درد کے ساتھ ہی ساتھ سودا کا زور اور دبدبہ بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

منظور گر نہیں ہی تماشائے خلق ہی	وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے
کسطرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن	دور سپہر درپئے ایذائے خلق ہے
کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھکو فائدہ	الا حصول کا وقت بیجائے خلق ہے
چل تو بھی مصحفی کہ وہ نکلا ہے بزم میں	ہے بار عام نوبت مجرائے خلق ہے

تم گرم ملے ہمسے نہ سرما کے دنوں میں	ہیں آئے بگرمی بھی تو گرما کے دنوں میں
نے غرفے سے جھانکے نہ کبھی بام پر آئے	پنہاں رہے تم حسن دل آرا کے دنوں میں
جی ہی میں رکھی اپنے میاں جی سے جو اپنے جی	کچھ ہمنے کہا تمسے تمنا کے دنوں میں

بلبل خوش صفیر ہوں گلشن روزگار کا	کچھ میں نشید خواں نہیں زمزمۂ بہار کا
لالہ ہوا بروئے خاک رنگ مصحفی پہ آسمان	خون کہاں کہاں گراز غم دل فگار کا

خالص عاشقانہ انداز میں سادگی بیان کے ساتھ واقعیت مضمون کا نباہنا جرأت کا حصہ ہے لیکن مصحفی نے بھی جا بجا اپنی غزلوں کو اس رنگ میں جرأت سے ملا دیا ہی مثلاً لکھتے ہیں

چھپایا منہ سے ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا	تغافل نے تمہارے خاک میں ہمکو ملا ڈالا
نہ اٹھا حشر میں بھی اسکی تیغ ناز کا مارا	کیا خوں اسنے اک عالم کا اور وہیں پھینکوا ڈالا
مرض تھا مصحفی کو صعب تر یہ خوب وہ سمجھا	کہ جوں توں آپ کو اسنے ترے کوچے میں لا ڈالا

شب گھر سے جو سیٹی کی وہ آواز پہ نکلا	نکلا تو ولیکن عجب انداز پہ نکلا
دل مجلس خوباں میں جو گم رات ہوا تھا	صد شکر اسی محرم ہمراز پہ نکلا
اے مصحفی حسن اسکا جو دیکھے ہی کہے ہی	یہ طرف ستارا فلک ناز پہ نکلا

اس غزل کے دوسرے شعر میں "کے پاس" کی جگہ "پہ" استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محاورہ نواح بداؤں وغیرہ میں اب بھی مستعمل ہے۔

حسن کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا
چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نکل آنے لگا

میں ہی کچھ بیصبر و طاقت عشق میں اسکی نہیں
دل بھی اب بیطاقتی کو کام فرمانے لگا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اُس سے واقف ہی نہ تھا
یا یہ عالم ہے کہ عالم اسپہ مر جانے لگا

کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آکر کہدیا
جسکو سُنکر سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا

مجھکو ساقی کی یہ محفل میں ادا بھائی بہت
مصحفی کو جام خالی سے جو ڈھکانے لگا

ہی ہے ٹک اسطرف کو اجی پھر کے دیکھ لو
اک ناتواں کا جائے ہی جی پھر کے دیکھ لو

کیا مجھکو چھوڑ نزع میں جانا ضرور ہے
اور یونہی ہے خوشی تو ذری پھر کے دیکھ لو

مارا ہی جسکو کنج نظری سے اُسے میاں
ابرو کی یوں کہے ہی کجی پھر کے دیکھ لو

تم مصحفی کو چھوڑ کے بسمل چلے گئے
رخصت چلے ہی اتنی ندی پھر کے دیکھ لو

مصحفی کے کلام کی خوبی زیادہ تر شگفتہ و دراز قافیوں اور ردیف کی تلاش اور پھر ردیف کو مختلف طور پر نباہنے کی ترکیب پر منحصر ہے اور یہی مسلک تھا تقریباً تمام پرانے شاعروں کا جو لکھنؤ میں مصحفی کے بعد بھی ہوس و عیشی تک اور دہلی میں شاہ نصیر کے بعد ظفر تک قائم اور پسندیدہ اہل نظر رہا۔

مندرجہ ذیل منتخب غزلوں کو پڑھکر ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ مختلف ردیفوں کو اُستاد نے کن کن پہلوؤں سے نباہا ہے اور قادر الکلامی و شاقی کی کیسی کیسی مثالیں بروئے کار آئی ہیں۔

بھیگے ہے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگارین کف پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں مُنہ پہ ترے سینہ کی بوندیں
جوں لالہ ترا حسن ترا اور بھی چمکا

جینے کا نہیں کوئی اگر یونہیں عزیزو
یہ طفل پریزاد ذرا اور بھی چمکا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے اسکی
کمبخت یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

اے مصحفی کیا بات کہوں درد جگر کی
جوں جوں کہ میں کی اُسکی دوا اور بھی چمکا

از بسکہ مرے دید کا حیران میں کچھ ہے
اک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے

خالی ہی چلے آئے ہیں ہم سیر چمن سے
داماں میں کچھ ہے نہ گریبان میں کچھ ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
والله تری نرگس فتان میں کچھ ہے

اے مصحفی مرنے کی مرے سنکے وہ بولا
کیا لگتا ہے مر جانے کو انسان میں کچھ ہے

جس کشتے کا زخموں میں ہو چور بدن سارا
خوں میں نہ بھرے کیونکر پھر اسکا کفن سارا

گر شمع کے رونے میں ہو ایسی ہی رنگینی
بھر جائیگا لوہو سے تا صبح لگن سارا

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے آ بیٹھا
دیوانے تری خاطر کرتا ہے وطن سارا

جسدم کہ وہ گھر میں رکھکر کٹار نکلا
جس رہگزر سے نکلا عالم کو مار نکلا

آئی زبان جو اپنی جنبش میں نزع کے دم
تیرا ہی نام منہ سے بے اختیار نکلا

تہمت ہے مصحفی پر سیر چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

اک تیغ کے لگتے ہی لگی جان ٹھکانے
اچھا تو ہے لگ جائے کہ انسان ٹھکانے

نومید پھر اواں سے تو قاصد نے کہا یوں
یہ خط نہیں لگتا کسی عنوان ٹھکانے

اے دست جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریباں ٹھکانے

تھی تھوڑی سی کچھ رات یہ پروانہ کہے تھا
جسوقت لگی شمع شبستان ٹھکانے

گہ دوش پہ پڑتی ہے تو گہ دوش کمر پر
ڈھونڈھے ہے تری زلف پریشاں ٹھکانے

الجھا ہی تو کس سے جو ترے جامے کی پیاری
نے چین ٹھکانے ہے نہ دامان ٹھکانے

آویزہ بنا محمل لیلے کے جرس کا
صد شکر لگا اب دل نالاں ٹھکانے

پھر کھینچو تلوار میاں غصے میں آکر
عاشق کو لگاتی ہی یہی آن ٹھکانے

اے مصحفی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا
لیکن نہ لگا اک یہ پریشاں ٹھکانے

یاران عدم رفتہ گئے دور بہت سے
ہمسار[1] کے پیچھے رہے رنجور بہت سے

پلکی جو کہیں ہاتھ سے شب اسنے گلابی
مجلس میں ہوئے شیشۂ دل چور بہت سے

اے مصحفی جھانکیں نہ کبھی اسکی گلی لیک
ہاتھوں سے ہم اس دل کے ہیں مجبور بہت سے

دیکھ اسکی شب وصل میں اوسان ہمارے
پھر پھر کے ملک ہووے ہے قربان ہمارے

جب ہو نکا ضبط غم عشق تو آخر
کیا پھوٹ بہی دیدۂ گریاں ہمارے

کل پاں کا رنگ آئینے میں دیکھ وہ بولے
کیا لال ہوئے ہیں لب دندان ہمارے

---

[1] "ہمسار کے" یعنی "ہم سے"۔ یہ محاورہ دکن میں ابتک مستعمل ہے۔

پہنے ہوئے دیکھا ہی اُسے سرخ جو جامہ	ہی دجلۂ خون تا بگریبان ہمارے
اور اس سے مصحفی کیا ہووے گی شہرت	جیتے ہی لکھے جاتے ہیں دیوان ہمارے

ان غزلوں کو دیکھنے سے ثابت ہوگا کہ میر تقی کے رنگ میں مصحفی میر حسن کے ہم پلہ، سودا کے انداز میں انشا کے ہمپایہ اور جعفر علی حسرت کی طرز میں جرأت کے ہمنوا ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اپنے ان سب ہمعصروں سے باعتبار کمال سخندانی و مشاقی برتر ہیں اور یہ بات ہے کہ راقم کی نگاہ میں میر و مرزا کے بعد اور کوئی انشا و انکے مقابلے میں نہیں جچتا۔ معلوم نہیں کہ صاحب آبحیات نے کس بنا پر سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی جا بجا کوشش کی ہے۔ سید انشا کی طباعی اور قابلیت میں کسکو شبہ ہو سکتا ہے لیکن دربار لکھنؤ کی مجبوریوں نے ان کی ظرافت کو دائرہ اعتدال سے خارج کرکے انکے کلام کو بقول شیفتہ ساقط الاعتبار بنا دیا تھا، چنانچہ نظر بحالات موجودہ انہیں مصحفی کے مقابل لانا مصحفی کے کمال کی توہین کرنا ہے اور بس۔

اب ہم اپنی اس مختصر تحریر کو مصحفی کے چند متفرق مطلعوں پر ختم کرتے ہیں جنکی خوبی اور دلفریبی میر کے نشتروں اور سودا کے خنجروں سے کسی حال میں کم نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں اور مسرت اندوز ہوں۔

اک ذرا دیکھیو اس رشک پری کا سونا	میں تو دیکھا نہیں اس بیخبری کا سونا
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دنکو رات کرنا	کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا
زلفوں سے اسکی میں نے جسدن کہ ہاتھ دھویا	ابر سیاہ اگر تربت پہ میری رویا
تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر	شعلہ سا شب پھرے تھا سرو سمن کے اندر
دل لیگیا ہی میرا وہ سیمتن چرا کر	شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر
شب ہجراں تھی میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا	غرض اس شب عجب اک بیسر و پائی کا عالم تھا
بن دیکھے جسکے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہیں	کیا فہر ہے جو اس سے برسوں جدائیاں ہیں
میں وہ نہیں ہوں کہ اُس بت سے دل مرا پھرے	پھروں جو اس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے
راہ میں کشتہ پڑے ہیں کئی ارمان بھرے	بچکے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے
ہے غریبی میں خبر کسکو وطن والوں کی	کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

فقط "حسرت"

اقوام ہند کے درمیان باہم اتفاق

(۷ اپریل کو مسٹر تصدق احمد خاں نے سٹڈنٹس یونین کلب میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان اگر ہندوستان میں ایک ممتاز قوم کی حیثیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں دوسری قوموں کی کوششوں میں شریک ہونا چاہیئے۔ ۸ کو مباحثہ ختم نہ ہو سکا اسلئے ۸ کو دوبارہ شروع ہوا اور اوسروز میں نے بھی تقریر کی جسکا خلاصہ یہاں لکھا جاتا ہے۔)

ہم صحیح طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ قومیت کس بنا پر قائم ہوتی ہے اور بنی نوع انسان میں جو نیشنلٹی کا فرق ہے اسکا کوئی ایک خاص سبب نہیں بتا سکتے۔ مختلف وجوہ سے قومیت قائم ہوتی ہے اور اسوقت میں یہی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جن اسباب کو لوگ ہندوستان میں مانع قومیت بتاتے ہیں، وہ کہاں تک درست ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ایک نسل ہونا قومیت کے لئے ضروری ہے اور ہندوستان میں اسکے نہ ہونے سے وہ قیام قومیت سے مایوس ہیں۔ ممکن ہے کہ ابتدائے زمانہ آفرینش میں ایک فرقہ کا دوسرے سے مابہ الامتیاز یہی باعث رہا ہو۔ کیونکہ جہانتک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ایام میں اتفاق کے ذریعے صرف خاندان اور قبیلے تھے مگر ہمارے زمانہ میں یہ حال نہیں ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف نسلوں کے لوگ ایک نیشن میں ہیں اور وہ سب اپنے کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ اور کسی ملک کو جانے دو انگلستان ہی کو لو اُس جزیرہ کے اصلی باشندوں کو برٹن نے فتح کیا انکے بعد رومی آئے رومیوں کے بعد سیکسن قومیں اس جزیرہ میں داخل ہوئیں اور وہیں آباد ہوگئیں سیکسن کے بعد نارمن آئے اور وہ بھی وہیں رہگئے (انگلستان میں نارمن کے داخل ہونے کا وہی زمانہ ہے جبکہ سلطان محمود کے فتوحات کے سبب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہونے لگے تھے۔)

اسوقت مختلف خون اور مختلف نسلیں انگلستان میں خلط ملط ہیں اور سب

بڑھکر یہ کہ اسکاٹلینڈ والے انگلستان والوں سے بالکل مختلف ہیں مگر تمام جزیرہ گریٹ برٹن کے نام سے پکارا جاتا ہے اور وہاں کا ہر باشندہ برٹش کہلاتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ انگلستان کی مثال اگر پرانی سمجھی جائے تو کناڈا کی تازہ مثال موجود ہے کہ فرانسیسیوں نے ابتدا میں وہاں نوآبادی قائم کی چنانچہ ملک میں فرانسیسیوں کا بہت بڑا عنصر ابھی تک موجود ہے۔ مگر کناڈا کی تمام آبادی اپنے کو ایک نیشن سمجھتی ہے اور نہ صرف زبانی اسکا اعتراف کرتی ہے بلکہ عملاً بھی ایسا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر ہندوستان میں مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں تو وہ متحد و متفق نہ ہوسکیں۔ میرے خیال میں یہ وجہ مانع ترقی اتحاد و اتفاق نہیں ہے۔

دوسری وجہ مانع قومیت جو پیش کیجاتی ہے وہ زبان ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس ملک میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہوں اور ایک صوبے کا باشندہ دوسرے صوبے کی زبان نہ سمجھ سکتا ہو وہاں ہم خیالی کیونکر پیدا ہوسکتی ہے اور قومیت کے قائم ہونے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ حقیقت میں یہ سوال بہت غور طلب ہے۔ بابل میں جب لوگوں نے آسمان تک مینار بنانا چاہا تھا تو خدا کو بھی اس سے بہتر ترکیب نہ سوجھی کہ ان کی زبانیں مختلف کردے اور بالآخر وہ منتشر ہوجائیں۔ مگر یہ سوال ایسا مشکل نہیں ہے جیسا بظاہر معلوم ہوتا ہے سوئٹزرلینڈ ایک ایسا ملک ہے جہاں تین مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں مگر کوئی یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ وہاں قومیت میں اسکی وجہ سے ذرہ برابر بھی کمی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان کا اختلاف زبان اس کی قومیت اور اتفاق میں مانع نہیں ہے۔ ہندوستان میں قدیم ایام سے دو زبانیں مروج رہی ہیں ایک اعلیٰ طبقہ کی زبان اور دوسری ادنیٰ طبقہ کی۔ ہندوؤں کے زمانہ میں سنسکرت اعلیٰ طبقہ کی زبان تھی اور مختلف اطراف میں وہاں کی مقامی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے وقت میں فارسی نے سنسکرت کی جگہ اور اب انگریزی

اس کی قائمقام ہے - ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ زبان اسوقت پھیلی ہوئی ہے - ایک مرہٹہ یا مدراسی ایک بنگالی یا پنجابی سے اسی زبان میں گفتگو کرتا ہے - ہندوستانیوں کے تمام با اثر اخبارات اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں - ہر ایک ایسے مجمع میں جسمیں مختلف صوبہ جات ہند کے لوگ شریک ہوتے ہیں اسی زبان میں تقریریں ہوتی ہیں - اور جس طبقہ کے لیے ایک زبان ہونے کی ضرورت ہے اُس نے انگریزی کو بہت کچھ حاصل کر لیا ہے اور حاصل کرتا جاتا ہے رہگئے غیر تعلیم یافتہ لوگ تو انکو اسکی ضرورت نہیں ہے کہ تمام ہندوستان کی زبان ایک ہو ان کی کل ضرورتیں اسی صوبے کی زبان میں انجام پاسکتی ہیں جسمیں وہ رہتے ہیں اسلئے اس خیال ہی کو ایک سر سے خارج کر دینا چاہیے کہ مختلف زبانوں کے رواج سے بنا رقومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ ایک زبان کی جسقدر ضرورت ہی وہ انگریزی سے پوری ہو رہی ہے اور روز بروز اسکا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے

تیسرا سبب مانع اتفاق مذہب خیال کیا جاتا ہے - ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ مذہب نے دنیا پر حکومت کی اور انسان کے تمام افعال و حرکات کا محور مذہب رہا ہے - مگر اس زمانہ میں مذہب کا اثر بہت کچھ دلوں سے زائل ہوگیا ہے (مگر میں یہ نہیں کہتا کہ یہ اچھا ہے یا بُرا) اور خاص کر قومیت کے باب میں تو مذہب لاشے محض ہے - یورپ کی سیاست میں مذہب داخل نہیں ہے سیاسی ضروریات میں مذہب سے مدد لیجاتی ہے - مگر مذہب کے واسطے کوئی سیاسی فعل نہیں ہوتا - اس خصوص میں مذہب اسلام پر غور کی زیادہ ضرورت ہے اسلام بیشک تمام دنیا کے لئے آیا ہے مگر یہ کہنا کہ اسلام نے کسی زمانہ میں بھی قومی تفریق کو مٹا دیا تھا درست نہیں ہو سکتا سرسید مرحوم اور مولانا شبلی کی تصانیف کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ مجھ سے اس امر میں اتفاق کرینگے کہ اسلام سے اور حکومت سے

کوئی تعلق نہیں ہے اور جنکو ہم اسلامی سلطنتیں کہتے ہیں وہ درحقیقت قومی سلطنتیں تھیں۔ بنو عباس کے آخر زمانہ تک اور اسپین میں عربوں کی سلطنت رہی اسکے بعد ترکوں اور مغلوں کا زور ہوا اور یہ سب سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں نہ اس اعتبار سے کہ انکو مذہب سے کوئی تعلق تھا بلکہ صرف اس اعتبار سے کہ وہ مسلمان قوموں کی حکومتیں تھیں۔

اور کسی ملک کے نسبت خواہ کچھ ہی رائے کیوں نہ ہو مگر ہندوستان کی بابت کوئی دو شخص اس امر میں مختلف الرائے نہیں ہو سکتے کہ یہاں مسلمان مذہبی حیثیت سے نہیں داخل ہوئے اور نہ یہاں اُنہوں نے مذہبی سلطنت کی۔

اُنہوں نے یہیں کا باشندہ ہو کر یہاں حکومت کی ہے اور ان کی حکومت صحیح معنوں میں ہندوستانی حکومت کہی جا سکتی ہے۔ سوائے اسکے کہ بادشاہ مسلمان تھے اور کوئی بات حکومت میں ایسی نہیں تھی جسمیں ہندو اور مسلمانوں کا فرق ہو۔ بعض مسلمان ہمیں یہ وعظ سُناتے ہیں کہ ہم ہندوستان کو غیر ملک سمجھیں اور عرب۔ ایران و ترکستان کو اپنا اصلی وطن خیال کریں مگر کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ان خیالات کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ آیا چھ کروڑ مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر کے ان ممالک میں جا بسیں؟ بعضوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کو کسی خاص ملک کی قومیت کا پابند نہ ہونا چاہئے بلکہ "کل مؤمن اخوۃ" کے اعتبار سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک قومیت ہونی چاہئے۔ وہ شاید اس حدیث کو بھول جاتے ہیں کہ "حُب الوطن من الایمان"۔ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ توطن، اور قومیت سے مذہبی اخوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں مگر ساتھ ہی ہندوستانی بھی ہیں۔ عربی۔ عجمی۔ ترکی۔ چینی۔ مصری مسلمانوں کے ساتھ ہماری مذہبی اخوت ہو سکتی ہے۔ مگر ہمارا قومی اتفاق صرف ہندوؤں کے ساتھ ہو سکتا ہے اور بس۔

میرا خیال ہے کہ مذہب نہ قومیت کا قائم کرنے والا ہے اور نہ اسکے قیام میں مانع ہے یہی حال حکومت کا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نسل۔ زبان اور مذہب لازمی

طور پر نہ قومیت کے قائم کرنے والے ہیں اور نہ اسمیں مابرج ہی ہوتے ہیں تو ہمارا خیال طبعی طور پر حکومت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید حکومت کا ایک ہونا قومیت قائم ہونے کا باعث ہو۔ مگر ادنیٰ غور سے یہ خیال بھی غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ ترکی کی مثال اسکی بین دلیل ہے کہ باوجود اتنی طویل مدت حکومت کے وہاں قومیت نہ پیدا ہوسکی۔ روسی حکومت کو بھی آج کل بھی دشواریاں درپیش ہیں۔

اسکے بعد ہم قیاس کرتے ہیں کہ غالباً ملک قومیت کا باعث ہے۔ ملک دو طرح کے ہیں ایک وہ جن میں قدرت نے ایسی خصوصیتیں رکھی ہیں کہ وہ دوسرے اقطاع ارض سے ممیز ہیں اور ان کی حد بندی بھی نیچر نے کی ہے۔

دوسرے وہ جو انسان نے اپنی ضروریات کے اعتبار سے مقرر کرلئے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بھی قومیت کے لازمی بواعث نہیں ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ ایک ملک میں ایک ہی قومیت ہے اور ایسا بھی ہے کہ ایک ملک میں مختلف قومیں ہیں۔

پس غور کرنا چاہئے کہ جب یہ سب چیزیں قومیت کی میزان کو کسی پلہ کو گراں یا ہلکا نہیں کرتیں تو آخر وہ کیا شئے ہے جسکی وجہ سے آج ایسے سخت قومیت یورپ میں پیدا ہوگئی ہے۔ وہ شئے اغراض کا متحد ہونا ہے۔

جس قوم کو چاہو جانچو اسکی قومیت آج اسی پر قائم ہے کہ اسکے افراد ایک خاص غرض پر متحد ہیں ورنہ نسل کا اختلاف انمیں موجود ہے، زبان کا اختلاف انمیں موجود ہے مذہب کا اختلاف انمیں موجود ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض متحد ہیں، اور کون کون سی طاقتیں انمیں متحد بنانے میں کام دے رہی ہیں۔ سب سے اول زبان کو لیجئے جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے انگریزی زبان اس غرض کو باحسن وجوہ پورا کر رہی ہے کہ تمام تعلیم یافتہ فرقہ ایک ہی زبان میں باہم مکالمہ اور مراسلہ کرسکے بلکہ سچ پوچھو تو انگریزی زبان نہ صرف اتحاد قومی کا ذریعہ ہے بلکہ اسکا بہت بڑا سبب ہے۔ انگریزی لٹریچر قومیت کے خیال سے بھرا ہوا ہے اور اسی لٹریچر نے

ہندوستان میں بہت کچھ روح قومیت کی پیدا کی ہے۔ تعلیم بھی اتحاد کا بہت بڑا سبب ہو رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں منافرت بڑھ رہی ہے میں اس سے انکار نہیں کرتا، مگر میرا مقصد یہ ہے کہ یکساں تعلیم کے سبب سے یکساں فکر و تخیل دماغوں میں پیدا ہو رہا ہے اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس کا اثر اگرچہ نمایاں طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوا ہے۔ مگر ہوگا اور ضرور ہوگا۔

نسلیں اگرچہ ہندوستان میں بہت ہیں مگر مدت اقامت اور اثر آب و ہوا نے سب کا خمیر ایک کر دیا ہے بہت باتیں یکساں ہیں اور مختلف رسوم و رواج نے باہم مل جلکر ایک خاص امتزاج حاصل کر لیا ہے اور اب نہ ہندوؤں اور نہ مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی نسبت آریہ یا سامی قوموں سے کریں بلکہ اب سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہی اُن دونوں کی زندگی ہے اور ہندوستان ہی ان کی موت ہے۔

ہندوستان کے مختلف اقطاع کی آب و ہوا اگرچہ ایک دوسرے سے بہت کچھ متباین ہے پھر بھی ہندوستان اپنے قدرتی حدود کے اندر ایک ملک ہے اور پشاور سے راس کماری تک جو لوگ آباد ہوتے ہیں سب ایک ملک کے باشندے سمجھے جاتے ہیں اور ایک ملک کا ہونا بھی اتحاد قومی کا بہت مدد معاون ہے۔ ہندو اور مسلمان اس ملک میں اس طرح آباد ہیں کہ وہ اپنے ضروریات کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ جو لوگ مسلمانوں اور ہندوؤں کو جُدا جُدا قوم بنانا چاہتے ہیں بہتر ہو کہ وہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرالیں ایک میں ہندو رہیں اور دوسرے میں مسلمان ورنہ موجودہ حالت میں اس خیال کو ترقی دینا کہ دو قومیتیں قائم ہوں مشکلات کا بڑھانا اور جو آسانی قدرت نے ہمیں ایک بننے کے لئے عطا کی ہے اسکا ضائع کرنا ہے۔

ان سب سے بڑھکر جو قوت اسوقت ہندوستان کے اتفاق کی باعث ہو رہی ہے۔

خواہ بالقصد ہو یا بلاقصد وہ حکومت ہے۔ گورنمنٹ کا غیر ہونا ہندوستان کے اتفاق کا بہت بڑا مددگار ہے۔ ہر ایک ہندوستانی انگریزوں سے اپنے کو غیر سمجھتا ہے اور اسکے مقابل میں دوسرے ہندوستانی کو وہ اپنا ہمجنس خیال کرتا ہے اور یہ ایک ایسی کشش اور کوشش ہے جو ہر جگہ خود بخود اپنا عمل کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں انگریزوں کا برتاؤ بھی ہندوستانیوں کے مابین خیال اتحاد پیدا کرنے میں کم کام نہیں دیتا۔ مسٹر سوئنی لکھتے ہیں کہ "ایک انگریز کی خفیف بدخلقی بھی انگریزوں کی طرف سے نفرت اور ہندوستانیوں میں اتحاد کے بڑھانے میں حصہ لیتی ہے"۔ جنبت حکومت سے زیادہ ہندوستان کو قومیت کیطرف بلانے والا ہندوستان کا ایک قانون ہے۔ ہر قانون کا اثر تمام ہندوستان پر یکساں پڑتا ہے اور اس کی مضرت یا منفعت میں سب یکساں شریک ہوتے ہیں۔ ہر ایک ایسا قانون جسکو رعایا اپنے حق میں مضر خیال کرتی ہو ایک نئی اینٹ ان کی عمارت اتحاد میں بڑھاتا ہے چنانچہ یہ امر مسلم ہے کہ لارڈ کرزن کے (reactionary) ری ایکشنری انتظامات نے ہندوستان کو جسقدر متحد کیا ہے شاید بیس برس کی کانگرس اتنا نہ کرتی۔

یہ قوتیں ایسی ہیں جو ہندوستانیوں کو اتحاد کی طرف بلاتی ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا ہندو اور مسلمانوں کے اغراض ایسے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر ملکی اور قومی ضروریات میں کوشش کریں۔ ہماری مراد یہاں اُن ضروریات سے ہے جنپر ملک کی ترقی اور تنزل کا انحصار ہے۔ ادنیٰ[1] قسم کے اخبارات نے جن امور کو معرکۃ الآرا قومی مسائل بنا رکھا ہے۔ وہ حقیقت میں اس اہمیت کے قابل نہیں ہیں جو انہیں دیجاتی ہے

---

[1] ان اخبارات میں کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ دونوں قوموں میں اسطرح کے اخبارات شائع ہوتے ہیں اور ملک کی بدقسمتی سے ایسے اخبارات کی اشاعت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جو سمجھدار لوگ ہیں وہ اسطرح کے اخبارات کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ملک کی ضروریات میں اول اقتصادی یعنی (Economic) ضروریات ہیں۔ اقتصادی ضروریات میں تجارت اور ملک کے محاصل اور مخارج داخل ہیں۔ اس زمانہ میں تمام قوموں کی جد وجہد صرف میدان تجارت میں ہو رہی ہے اور اسی پر قوموں کی ترقی اور تنزل کا انحصار ہے مگر ہندوستان کی ابتک کوئی خاص تجارتی پالیسی نہیں قائم ہوئی ہے۔ انگلستان میں فری ٹریڈ اور پروٹکشن کے مباحث اس شدومد سے ہو رہے ہیں لیکن ہندوستان پر اسکا کوئی اثر نہیں ہے۔ جبتک ملک کی کوئی خاص تجارتی پالیسی نہ ہو اسکی تجارت کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو سکے اگر ملک کی تجارت کو ترقی ہوگی تو اسمیں مسلمانوں کا ایسا ہی فائدہ ہے جیسا ہندوؤں کا اور اگر تجارت کو تنزل ہوگا تو اسمیں مسلمانوں کا ویسا ہی نقصان ہے جیسا ہندوؤں کا بلکہ چونکہ مسلمان ہندوؤں سے نسبتاً مفلس ہیں دونوں حالتوں کا اثر ان پر زیادہ پڑیگا۔ آج کل بعض اطراف میں دیسی صنعت کو ترقی دینے کی جان توڑ کوشش ہو رہی ہے مگر مسلمانوں کے اخبار انہیں یہی سمجھائے جاتے ہیں کہ جہانتک ہو سکے اسکی مخالفت کرو، اور دوسرے کو ڈبونے کی کوشش میں خود ہی ڈوب جاؤ۔ ؎

ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے ڈوبینگے

تجارت کا معاملہ ایسا ہے کہ اسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دوش بدوش چلنا چاہئے اور ملک کی مادی ترقی کے مسائل کو حل کرنے میں دونوں قوموں میں کوئی اختلاف نہونا چاہئے۔ تجارت کے بارے میں اگر ہندوؤں نے ایک پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں نے دوسری تو دونوں کا ستیاناس ہونے کے سوا کچھ نہوگا۔

دوسری اقتصادی ضرورت ملک کے محاصل اور مخارج پر قابو حاصل کرنا ہے اور یہ ایسی غرض ہے کہ اسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی کوئی وجہ موجود نہیں پائی جاتی۔ ٹیکس کا بار جسقدر ہندوؤں پر پڑتا ہے اسیقدر مسلمانوں پر۔ اگر ٹیکس ہلکا ہوگا تو مسلمان بلا امتیاز اُس سے ویسے ہی متمتع ہونگے جیسے ہندو۔

اور جو پالیسی اس بارہ میں گورنمنٹ کی قرار پائیگی اسکا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر ایک ہی ہوگا۔ ٹیکس کا کم ہونا ہی رعایا کے درد کی دوا نہیں ہے بلکہ وصول شدہ ٹیکس کا مصرف ملک کی خوشحالی اور بدحالی پر بہت کچھ موثر ہے۔ آج کل جسطرح ٹیکس کا روپیہ صرف ہوتا ہے وہ مفاد ملک کے بہت منافی ہے۔ اسپر گورنمنٹ کو توجہ دلانا ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا فرض ہے۔ پھر کوئی سبب نہیں ہے کہ دونوں قومیں بالاتفاق اپنی آواز بلند نہ کریں تاکہ اسکا کچھ نتیجہ ہو ورنہ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کچھ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔

اقتصادی ضروریات کے بعد پولٹیکل ضرورتیں ہیں۔ جب تک کسی قوم کو پولٹیکل حقوق نہ حاصل ہوں اسکا شمار زندہ قوموں میں نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی حالت ایسی ہے کہ پولٹیکل حقوق اسکو ایک دم سے نہیں ملسکتے رفتہ رفتہ حاصل ہو سکتے ہیں مگر اسکے لئے بھی ایک مدت درکار ہے اور وہ بھی اسحالت میں کہ کل ملک متفقہ کوشش کرے۔ مسلمانوں کا بیشک یہ فرض ہے کہ ہر حال میں اپنے تحفظ حقوق کی پوری کوشش کریں اور پورا اطمینان حاصل کرلیں۔ اگر کوئی انہیں یہ صلاح دے کہ وہ اپنے کو دوسری قوموں کے رحم پر چھوڑ دیں تو میرے خیال میں کوئی سمجھدار مسلمان اسکے ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ مگر تحفظ حقوق کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سرے سے حصول حقوق ہی سے چشم پوشی کیجائے۔ ادنی اخبارات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی پالیٹکس صرف یہ بتا رکھی ہے کہ چند قلیل تنخواہ کی سرکاری ملازمتیں ملجائیں۔ مگر جب تک ملک کے اندرونی نظم ونسق پر اہل ملک کو قدرت نہ حاصل ہو، اسوقت تک یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ تمام پولٹیکل حقوق سے محروم ہیں۔ موجودہ وزیر اعظم نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ "عمدہ انتظام کرلینا دوسری بات ہے مگر عمدہ گورنمنٹ ہرگز اس گورنمنٹ کی قائمقام نہیں ہو سکتی جو خود رعایا کی بنائی ہوئی ہو" اسلئے جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہندوستانی انگریزوں سے بہتر انتظام نہیں کرسکتے انکو وزیر اعظم کا قول دیکھنا چاہئے۔ کیا یہ غرض کل ہندوستانیوں کو اتحاد کی طرف بلانے والی نہیں ہے۔

ملک کی اندرونی پالیسی کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ اسوقت ان ہندوستانیوں کا درپیش ہے جو ملک سے باہر ہیں۔ ملک کی ترقی کا بہت کچھ انحصار اُن افراد اور اس سرمایہ پر بھی ہوتا ہے جو ملک سے باہر کام میں لگے ہوں۔ گورنمنٹ خود اُن ہندوستانیوں کی حالت درست کرنے کی حامی ہے جو ہندوستان سے باہر کام کر رہے ہیں۔ مگر تنہا گورنمنٹ کیا کر سکتی ہے اگر کل ملک اُسکے ساتھ نہو۔ اور اسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تفرقہ کسی طرح روا نہیں رکھنا چاہیئے۔

غرضکہ ملک کی ترقی کا دارومدار اسی پر ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں اور جب تک یہ نہیں ہے کچھ نہیں۔ سب سے اول اسی کی کوشش کرنی چاہیئے اسکے بعد آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔

معاشرتی اتحاد کی نسبت میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ چند روز ہوئے نواب محسن الملک بہادر نے اسکی ضرورت پر زور دیا تھا اور اُنسے بہتر کون بیان کر سکتا ہے۔

لیکن جہاں بعض سامان اتحاد کے پیدا ہو گئے ہیں اور دونوں قوموں کی ضرورتیں اسکی متقاضی ہیں کہ وہ باہم ملکر کام کریں وہاں عوائق اور موانع بھی درپیش ہیں اور اُن کا رفع کرنا اس شخص کا جسکے دل میں کچھ بھی ملک کا درد ہو فرض ہے۔ سب سے اوّل مانع کمی تعلیم ہے۔ ابتک جو تعلیم ہندوستانیوں کو ملی ہے اُس نے قومیت کا ایک خیال ضرور انکے دلوں میں پیدا کر دیا ہے مگر وہ اس کا استعمال ایک محدود دائرہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تنگ خیالی کم ہو جائیگی۔ دوسری بڑی دقت جس کے سبب سے تمام کاموں میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے سچے لیڈروں کا نہ ہونا ہے۔ اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ موجودہ لیڈروں کی صداقت یا حب الوطنی میں شک کرتا ہوں۔ نہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ وہ لیڈر ہیں اپنے ذاتی وقار اور عزت کے سبب سے۔ مگر وہ کسی حال میں اپنے کو قوم کا جواب دہ نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ قوم نے ان کو لیڈر نہیں مقرر کیا ہے اور اسیوجہ سے جہاں بعضوں کے رسوخ ذاتی سے رعایا کو فائدہ پہونچتا ہے وہیں بعضوں کے رسوخ سے رعایا کو نقصان بھی پہونچتا

ہے اور کوئی اُسنے باز پرس نہیں کر سکتا - جیسے کہ حال میں (Edward Clarke) سر اڈورڈ کلارک سے باز پرس کی گئی ہے -

علاوہ ازیں قومیت کا اعلیٰ خیال جو اسوقت لوگوں میں پیدا ہو رہا ہے وہ ملک میں بالکل نیا خیال ہے اور ہر نئے رواج کے دور میں یہی ہوتا ہے کہ پہلے ایک عجیب ہماہمی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اسکے بعد اصلی اور مستقل صورت نمایاں ہوتی ہے - اسی لئے اس خیال کے نفوذ میں بھی ہمیں تھوڑا انتظار کرنا چاہیئے - علاوہ بریں ایک اور طرح کی حُبّ الوطنی بھی پیدا ہوتی جاتی ہے یعنی ہر صوبہ بجائے خود اپنے خیالات کا مرکز ہو - اور گورنمنٹ بھی اسکی معاون ہے جیسا کہ لارڈ کرزن کے مراسلہ تقسیم بنگالہ سے ظاہر ہوتا ہے - ایک حد تک یہ بالکل صحیح اور بجا ہے کیونکہ مقامی خصوصیات سے کوئی شخص علیحدہ اور بری نہیں ہو سکتا - لیکن امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ حب الوطنی کل ملک اور گروہ کے لئے وسعت حاصل کریگی - ہماری راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں مگر ہمکو کسی حال میں بھی ناامید نہونا چاہیئے - فقط

تلمذ حسین - مدرسۃ العلوم علیگڈھ

مکتوبات امیر مینائی

مرتبۂ ثاقب

قاضی عبدالجمیل صاحب مرحوم رئیس بریلی کے نام

(۱) (۲۸ر دسمبر ۱۸۹۹ء روز پنجشنبہ ریاست رامپور)

جناب قاضی صاحب مجمع مکارم فراواں سراپا لطف و امتنان دام بالمجد والکرم -

سلام نیاز انضمام کے بعد التماس ہے کہ بندہ زادہ کوچک محمد مسعود احمد انٹرنس میں امتحان دینے کی ضرورت سے کالج کے بورڈنگ ہوس میں ۳۱ر دسمبر سے ۱۰ر جنوری تک مقیم رہیگا - میری خوشی تو یہ تھی کہ آپ ہی کے مکان راحت نشان پر قیام ہوتا مگر اُس کے

مصالح متعلق امتحان اُسکو بورڈنگ کے قیام پر مجبور کر رہے ہیں اور وہ ضعیف البیان اور اس زمانے میں محنت کی وجہ سے نہایت ناتواں ہو رہا ہے کوئی عنوان اُسکے راحت اکل و شرب کا اس سے بہتر نظر نہیں آتا کہ اگرچہ وہ بورڈنگ ہوس میں رہے مگر باعتبار ماکل و مشارب کی آپہی کا مہمان ہو کسی طرح کا تکلف اُسکے لئے نفرمایا جائے۔ صرف سالن اور روٹی اور سحر کے واسطے کھیر یا دودھ میں نان پاؤ ہو۔

ملاذا۔ جسطرح سے بنظر اخلاص و نیازمندی بے تکلفانہ آپ کو اس امر کی تکلیف دی ہے امید کرتا ہوں کہ اسیطرح آپ بھی تکلف نفرمائیں۔ اور اپنے ناتوان بچوں کے مثل تصور فرما کر پرہیزی کھانا اپنے آدمی کے ہاتھ اوقات معینہ پر کالج میں بھجوایا کریں۔ کالج میں محل اقامت سے وہ خود آپ کو آگاہ کرے گا۔ زیادہ سوا منت بزبری کے کیا عرض کیا جائے۔

آپ کے فرزند ارجمند قاضی خلیل الدین صاحب کو سلام مسنون دعا مشحون۔ اطفال عقیدت خصال تسلیم گزار ہیں۔

فقیر امیر احمد امیر بنائی

(۲)

مولوی حبیب الرحمن خانصاحب حسرت شروانی کے نام

مکرما۔ نہایت کم فرصت ہوں۔ سراسری غزل دیکھی ضروری تصرف کیا زیادہ حاجت بھی نہیں۔ امید ہے کہ مجھکو اپنا داعی خیر سمجھکر ہمیشہ خیریت سے مسرور کیا کیجئے۔

امیر فقیر - ۱۸ر جنوری ۱۸۸۹ء

(۳)

صاحب موصوف کے نام

میرے قدردان میرے مہربان۔ سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون لو۔ مدت کے بعد محبت نامہ آیا پیاری نظم و نثر نے مسرور کیا۔ سر کے پاؤں۔ بری زمین تھی آپنے غزل زور طبیعت سے بہت اچھی کہی۔ ایسے زمین میں تکلف اور بناوٹ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ آثر باقی۔ مزے کی زمین تھی اُسمیں مزے کے شعر نکلے۔ میں نے دونوں غزلوں کو فوراً دیکھا اور بواپسی ڈاک بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ مجھکو ہمیشہ

اپنا خیر خواہ سمجھکر کبھی کبھی خط لکھا کیجئے اور ادھر سے جواب میں تاخیر ہو تو کم فرصتی کا عذر قبول کر لیا کیجئے۔ لغت اردو کی نسبت بھی توجہ چلی جائے۔ اس کی فکر کیجئے کہ یہ لغت محبوب ہو کر نکلے اب تک جو لغات اردو میں ہیں انشاء اللہ اُن سے تو مفید تر ہونیکی امید قوی ہے مگر افکار رسا ادھر متوجہ رہیں کہ جامعیت بڑھے اور نفع عام تر ہو تو کیا عجب ہے کہ ایسی باتیں بڑھتی جائیں۔ آپ گھڑی دو گھڑی روز ادھر بھی توجہ رکھیں تو آپ کی جوان فکر ضرور عمدہ باتیں پیدا کریگی۔ اصول جو جو خیال میں آیا کریں اُنکو ضبط کرتے جائیے اور مجھے لکھتے جائیے وہ مثل اصول لغت عربی ایک رسالہ اصول لغت اردو کا ہو جائیگا۔ کلیات اور اکثریات مضبوط جمع ہو جائینگی۔ اپنے کتب خانے کی فہرست بھیجئے تو شاید کوئی کتاب مفید مجھکو سستی مطلوب ہو۔ شمس اللغات خان آرزو کا کوئی صحیح نسخہ ہو تو ضرورت ہے۔

امیر فقیر۔ ۱۹ اپریل ۸۹ء

حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی کے نام

پیارے کوثر۔ مجھے بیماریاں و بیمار داریاں خصوصاً اور ملروہات دنیوی عموماً نہیں چھوڑتے کہ میں احباب سے سرخرو ہوں تم بھی میرا قصور معاف کردو۔ افسوس کہ طرح گلچیں گزشتہ جبدن آئی اُس دن خیال ہوا کہ ضرور دیکھکر بھیجوں گا پھر ایسے حالات رہے کہ آج تمہارے لکھنے پر غزل کا آنا یاد آیا۔ عذر خواہ ہوں اور اس غزل کو اُسیوقت دیکھکر بھیجتا ہوں۔ کتاب لغت کی بدولت زیر باری حد سے بڑھی ہوئی ہے خدا رحم فرمائے۔ پیشاب کا مرض سخت مکلف ہے چوکی پر جاتے جاتے پاؤں تھک جاتے ہیں اور ہر بار رُک کر ہوتا ہے دیر ہوتی ہے تو عسر بول بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں کو جب سے روگ لگا ہے تب سے لکھنا اور کتاب دیکھنا گویا چھوٹ ہی گیا ہے دوسرے کی محتاجی اور زیادہ مکلف ہے اور اکثر ہرج بھی ہوتا ہے۔ اب یہ دو سطریں لکھیں اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کڑوا سے لگیں بصارت میں بھی کمی ہونے لگی۔ سب احباب سلام کہتے ہیں اور اطفال تسلیم رساں ہیں پیارے

کوثر۔ پچھلی غزلوں کے شعر کچھ بنے ہیں کچھ بغیر بنے ہیں۔ خدا کرے دیکھ لوں تو بھیجوں۔

تمہاری سچی محبت کا منت پذیر

امیر فقیر۔ ۶ راگست ۱۸۹۲ء

بنام ثاقب کے نام

گرامی گوہرا۔ نامہ دلنواز آیا۔ فرمائش تقریظ رسالہ سبعہ سیارہ نے دلنوازی کی داد دی مگر افسوس ہے کہ مجھ سے اس زمانے میں حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی اسلئے کہ خود بھی بیمار ہوں اور کئی مریضوں کا پرستار ہوں۔ سب پر طرہ یہ کہ سرکار دولتمدار کے احکام کی تعمیل سے مطلق فرصت نہیں اگر بالفرض صحیح بھی ہوتا تو ضرور کچھ لکھتا اگرچہ میری تقریظ اس قابل نہیں ممکن تھی کہ اُسی رسالے کے آخر میں پیوند ہوتی۔ زربفت کے لباس میں ٹاٹ کا ٹکڑا کیونکر کھپ سکتا ہے مگر خیر آپ کی خوشی تو ہو جاتی۔ افسوس کہ اس دولت سے بھی محروم رہا اگر زندگی باقی ہے تو کبھی تلافی ہو گی امید ہے کہ عذر پذیری کو کام فرما کر عفو جرم سے سرفراز کیجئے۔ خدا کرے آپ امتحان میں پورے اُتریں اور خاطر خواہ کامیاب ہو کر روز افزوں ترقیاں پائیں۔

امیر احمد عفی عنہ۔ ۱۸ نومبر ۱۸۸۰ء

صداقت

سچ سے روح کو تقویت ہوتی ہے اور جھوٹ سے مردہ ہو جاتی ہے (حدیث شریف)

حق بات کے اظہار میں کسی بڑے آدمی اور کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا چاہئے (حضرت عمرؓ)

راستی موجب رضائے خداست	کس ندیدیم کہ گم شد از رہ راست	

میرے خیال میں انسان کو جس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہئے یا جسکی سب سے زیادہ عادت ڈالنی چاہئے وہ "راستی" ہے کیونکہ اُسکا اثر روزمرہ کی زندگی پر بے انتہا پڑتا ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ "جھوٹ سے خداوند تعالیٰ اور انسان

دونوں کو بالطبع نفرت ہے۔ اور صداقت انسان کا خلقی جوہر ہے مگر بہت سی اوپری اثر (مثل خوف و عجب وغیرہ) انسان کو اس سے باز رکھتے ہیں اور نیز بعض وہ معاملات جنکا تعلق انسان کی ذات سے ہو اُسے جھوٹ بولنے کا عادی کر دیتے ہیں۔"

انسان کو ابتدا ہی میں یہ بات دل پر اچھی طرح نقش کر لینی چاہیئے کہ وہ ایک ایسی دُنیا میں سکونت پذیر ہے جہاں ہر ایک چیز کا وجود ہے اور کوئی ایسی چیز جو وجود نہ رکھتی ہو بیچارہ محض خیال کیجاتی ہے۔ اُسے سوسائٹی کے ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے یہ بات کہ "اپنی ذات کو اصلی حالت سے کمتر کرکے دکھلانا اُس سے برتر کرکے دکھلانے سے بدرجہا بہتر ہے" اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ وہ شخص جو محض ظاہر داری کی غرض سے کسی بے اصل کام میں سرگرمی دکھاتا ہے درحقیقت جھوٹ بولتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے برائے چندی اُسے کسی مشکل سے جسمیں وہ اسوقت مبتلا ہو نجات ملجائے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں معاملہ کی اصلیت کھلجائیگی۔ کیونکہ سچ بات کا ظاہر کر دینا زمانہ کا خاصہ ہے۔ اور اس شخص کو سوائے شرم و ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جسطرح کہ کھوٹی چیز ٹھوس چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی اسی طرح وہ کام بھی جسکے کرنے سے مقصود بالذات تو کچھ اور ہو مگر ظاہر کچھ اور کیا جائے کبھی انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا جھوٹ جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے انسان سے کیوں سرزد ہوتا ہے؟ اور اسکے وجوہات کیا ہیں؟ اسکا جواب نہایت آسان ہے۔ تجارت پیشہ اشخاص میں جو لوگ اس بُری خصلت کے عادی پائے جاتے ہیں اُن کا مقصود اس جھوٹ سے سوائے نفع اُٹھانیکے دوسرا نہیں ہوتا۔ مگر عام لوگ جو میرے مخاطب صحیح ہیں ذیل کی تین وجہوں میں سے کسی ایک کے سبب سے اس قسم کے جھوٹ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کاہلی۔ عجب خودستائی۔ بزدلی و اخلاقی کمزوری۔

انسان کو ہر وقت اور ہر حالت میں ان ہر سہ عیوب سے بچنے کی خاص طور سے کوشش کرنی چاہیئے۔ کاہل اور سست آدمی کام سے جی چرانے کیوجہ سے وقت و موقع پر مناسب اور ضروری کارروائی کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ خود بخود ایسی ترکیب نکالتا ہے جس سے اُس کے اصل مرض کاہلی پر پردہ پڑا رہے۔

مثال کے طور پر ایک کاہل طالب علم (مگر ایسے شخص کو طالب علم کہنا ٹھیک نہ ہوگا منعلم کا خطاب زیادہ مناسب ہوگا) کو لیجئے کہ اُسے باغ و بہار کا ایک صفحہ اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کو دیا جائے تو بجائے اسکے کہ وہ اپنے دماغ سے کام لیکر محنت سے خود اُسکا ترجمہ کرکے دکھلائے وہ اُسکو انگریزی ترجمہ سے نقل کرکے دکھا دیتا ہے اور دفع الوقتی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ کیا یہ جھوٹ نہیں ہے؟ اُستاد کا تو درحقیقت اس تمام جھگڑے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ سے مترجم کی قابلیت کا حال معلوم کرے مگر وہ کاہل آدمی بجائے اس کے کہ خود کچھ کرکے دکھائے کتاب سے نقل کر دیتا ہے اور مُعلّم کو پتہ ہی نہیں چلنے دیتا کہ اُسکی قابلیت کتنی ہے۔ میرے نزدیک ہر ناپائدار اوپری اور سطحی کام حقیقت میں ایک قسم کا جھوٹ ہے جس سے اُسکے فاعل کو شرمندہ ہونا چاہیئے۔

عُجب اس قسم کے جھوٹ کا دوسرا محرک ہے۔ بعض اوقات اکثر لوگ جو عام طور سے جاہل اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو زیادہ قابل اور باوقعت ثابت کرنے کی غرض سے ایسے کاموں کے کرنے کی طرف جن سے اُنکی معلومات اور قابلیت زیادہ معلوم ہو متوجہ ہو بیٹھتے ہیں اور اسطرح موقع و بے موقع وہ اپنی تعریف کرنے کی بُری عادت میں پھنس جاتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بایں شان و شکوہ ظاہری لوگوں کی نظروں میں بجائے قدر و منزلت پیدا کرنے کے اور بھی زیادہ ذلیل اور حقیر ہو جاتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی جہالت کا اعتراف کرنے میں جو اُس کی آیندہ زندگی کے لئے نہایت فائدہ بخش ثابت ہوگا نہایت تعجیل سے کام لے ورنہ بحالت دیگر وہ قریب

جس کے ذریعہ وہ اپنی معلومات کا سکہ بٹھاتا اور لاعلمی کو دوسروں سے چھپاتا ہے رفتہ رفتہ اُس کی طبیعت ثانی بنجائیگا اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بھی اپنی اصلی حالت دریافت کرنے سے قاصر ہوجائیگا اور اسطرح وہ اپنی تمام عمر مغالطہ دہ نمائش میں جسکی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔

ان دونوں سے زیادہ سخت مرحلہ تیسرا ہے جسمیں انسان کو بڑی بڑی قوتوں کا سامنا ہوتا ہے اور وہ بزدلی یا اخلاقی کمزوری ہے۔ آجکل خود بینی کے انسان کو مجبوراً کنارہ کش ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس زمانہ کی مہذب سوسائٹی میں یہ بات اچھی طرح رواج پاگئی ہے کہ اُسکے افراد میں سے جب کوئی شخص اس مرض میں مبتلا دیکھا جاتا ہے تو اُسپر چارونطرف سے ملامت کی بوچھار شروع ہوجاتی ہے جسکے سبب سے وہ اس بدخصلت سے مجبوراً محفوظ رہتا ہے۔ مگر بزدلی یا اخلاقی کمزوری اس قسم کے حملوں سے بالکل مامون رہتی ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ جو شخص شروع میں اپنی رائے لوگونکے سامنے ظاہر کرنے سے جھجکتا ہے خواہ کیسی ہی کیوں نہو۔ اُسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بات پر سرے سے کوئی معقول رائے قائم ہی نہیں کرسکتا اور اسطرح وہ ایک ایسی قوت سے جو انسان کو حیوان سے امتیاز بخشنے والی ہے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجاتا ہے۔ اخلاقی جرأت فی الحقیقت بجملہ اُن چند قابل قدر اعلیٰ اوصاف کے ہے جو انسان میں خدا تعالیٰ نے ودیعت کئے ہیں مگر افسوس ہے کہ بہت کم اشخاص اسکا مصرف جانتے ہیں۔

سوسائٹی کو سب سے زیادہ واجب التعظیم روایات قوانین اور بعض اوقات اخلاقی جرأت کے استعمال کے خلاف ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں سچائی کو ہاتھ سے ندینے کے لئے فراست اور قوت فیصلہ کی اجتماع کی ضرورت ہوتی ہے جو شاذ و نادر اشخاص ہی میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سچائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جسکا اظہار مناسب نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ دنیا میں کوئی شے سچ سے زیادہ تلخ

نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُسکا اظہار سوشل انٹریسٹس کے خلاف ہو ایسی صورت میں خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ دوسری وہ جسکو ہر حال میں ظاہر کرنا چاہیے خواہ کتنی ہی بڑی مخالفت کا خوف ہو اور اور اگر ایسے موقع پر انسان حق کے اظہار سے رُکے تو وہ یقیناً بزدل اور ڈرپوک ہے ہم اپنے اس مضمون کو سقراط کی ایک نصیحت نقل کرکے ختم کرتے ہیں:۔ سچ بولنے والے کی عزت کرو اگرچہ وہ تمہارے عیب کہتا ہو اور دروغگو کو حقیر سمجھو اگرچہ وہ تمہارا ثنا خواں اور مداح ہو۔

(پروفیسر لیکی) "شروانی بلونوی"

انتخاب بیاض

جناب منشی سید انور علی صاحب انور متوسل بھوپال

منشی مظفر علیخاں اسیر امیٹھوی

نبض بیمار جو لے رشک مسیحا دیکھی — آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

میرزا نوشہ غالب دہلوی

باید زد و ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند — آری دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

جامی

جان تن فرسودہ را با غم ہجراں گذاشت — طاقت مہمان نداشت خانہ بمہماں گذاشت

ملا محمد طاہر غنی کشمیری

مرا بخانہ سفالے ز بینوائے نیست — خوشم کہ در کف من کاسہ گدائی نیست

زین العابدین میرزا

اسیر بند غم خانماں سے دانم — مجاور قفس ام آشیاں سے دانم

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی

بر میاں بر زدہ داماں ز کجا می آئی — مرحبا گر بشکار دل ما مے آئی

محمود بیگ سالم

نمی گردید کوتہ رشتۂ مطلب رہا کردم — حکایت بود بے پایان بجا موشی ادا کردم

دارالسلطنت فرانس کی سیر

(نمبر ۵) تابع ماقبل

پیرس کے عجائب و غرائب

پیرس میں اسقدر رستاران اور قہوہ خانے ہیں کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔ دن کے وقت ان قہوہ خانوں میں اک سکوت کا عالم رہتا ہے اور لوگوں کی آمد رفت بالکل نہیں ہوتی لیکن جیوں ہی کہ شام آتی ہے ہر طرف اک ہل چل شروع ہوجاتی ہے اور لوگوں کی تعداد میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ ۸ بجے رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور قہوہ خانے لیڈیز کے طرح طرح کے لباسوں سے گلستان کی طرح شگفتہ معلوم ہوتے ہیں یہ اک ایسا دلچسپی اور مسرت کا سین ہوتا ہے کہ کہیں اور دیکھنا محال ہے۔

گرانڈ بولوارڈ (Grand Boulvard) جو پیرس کا ایک چوک ہے وہاں آپیرا (Opera) (ناچ گھر) کے دائیں اور بائیں یہ مقامات بکثرت نظر آتے ہیں انکی وسیع اور روشنی سے جگمگاتے ہوئے کمرے دیکھکر خواہ مخواہ راہ چلتوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ یہاں تھوڑی دیر آکر بیٹھیں۔ گرمی کے زمانے میں ان کمروں کے سامنے باہر پگڈنڈی کے پاس کرسیاں پڑی رہتی ہیں اور سنگ مرمر کی گول میزیں بچھی ہوتی ہیں جن کے گرد لوگ چاء پینے کے لئے بیٹھتے ہیں تاش یا کوئی کھیل جو مرغوب خاطر ہو کھیلتے ہیں اور ساتھ ہی اک نازک اور اعلیٰ درجہ کے مغنیہ کا گانا سنتے جاتے ہیں۔

پیرس کے بعض رستاران عمدہ کھانوں کے اعتبار سے مشہور ہیں جہاں یورپ میں سب سے زیادہ اچھا اور نفیس پکا ہوا کھانا ملسکتا ہے لیکن اخراجات اسقدر زیادہ ہیں کہ جس کسی کی جیب اشرفیوں سے لبالب نہ ہو اُسے وہاں جانے کا خیال ہی نہ کرنا چاہیئے۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہاں بلاکر ایک مرتبہ دعوت دی

تھی اور جب ہم کہا چکے تو کہانے کے عوض میں تین پاؤنڈ نکالکر دئے اُنہیں ان کثیر اخراجات کا علم تھا اور کچھ بیوقوف بناکر ٹھگے نہیں گئے۔ مسٹر پانٹی فیکس انگلستان کے اعلیٰ اور شریف ترین خاندان میں سے ہیں اور اون آزاد۔ خودغرضی کے عیب سے پاک۔ راستباز اور ایماندار لوگوں میں اُنکا شمار ہے جیسے انگلستان کے طبقہ وسطی میں اکثر نظر آتے ہیں۔ ہم میں اکثر مختلف مضامین پر نہایت طویل گفتگو رہتی تھی اور گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عیسائیت کے بالکل قائل نہ تھے اور دین عیسوی پر (اس زمانے کے اکثر روشن خیال لوگوں کے مانند) انکا بالکل ایمان نہ تھا اور اسلام کی عظمت بہت انکے دلمیں تھی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا صرف اس شخص کے ساتھ رہنے کی وجہ تھی جو میں پیرس کے اسقدر عجیب و غریب مقامات دیکھ سکا جہاں بہت کم اجنبی آدمی گذر پاتے ہیں اور یہ گذر بھی اُسوقت نصیب ہوتا ہے جبکہ ہزاروں پاؤنڈ خرچ ہو چکتے ہیں اور اون رہنماؤں اور رہبروں کی جیبیں جنہیں درحقیقت راہزن کہنا چاہئے خوب بھر چکتی ہیں۔ مسٹر پانٹی فیکس پیرس سے بخوبی واقف تھے اور گذشتہ دس سال سے برابر ہر سال پیرس جاتے اور خوب اللے تللے کرتے تھے۔ مجھپر اُن کی بہت عنایت تھی اور مجھے بھی ان کی ذات پر پورا اعتماد تھا کیونکہ جس خاتون نے مجھے انسے انٹروڈیوس کیا تھا وہ میری بہت بڑی دوست اور انگلستان کے اعلیٰ درجہ کی لوگوں میں سے تھی۔

ضمناً بطور معترضہ کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں ہر طرح کی خارو خاشاک پر میرا گذر ہوا اور مسٹر پانٹی فیکس کے ہمراہ میں نے وہ وہ عجائب و غرائب دیکھے کہ ایک طالب علم کے دائرہ امکان سے باہر ہیں مگر ہر جگہ عقل سلیم کی مشعل میرے ہاتھ میں اور خدا کے فضل و کرم کا سایہ میرے سر پر تھا۔ میں یہ فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی جگہ میری طبیعت متزلزل نہیں ہوئی اور میری مضبوط طبیعت نے کہیں حزم و استقلال کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان غیر معمولی مقامات

کو دیکھکر جو یورپ کے بہترین عیش وعشرت کے مقامات ہیں اب میرے دل میں اس مقام کو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی ہوس باقی نہیں رہی۔

میں یہاں کے رسٹاران کا ذکر کر رہا تھا۔ جہاں خود مجھے ایک جگہ ڈنر میں جانے کی نوبت آئی۔ ہمارا کھانا نہایت خوبصورت دوشیزہ لڑکیوں نے میز پر چنا جنکے جسم پر دن بھر کے نام نہایت نازک ریشم کی ہلکو ہلکو گاؤن تھی۔ یہاں نہایت فیشن ایبل لوگ آیا کرتے ہیں اور اخراجات بھی بے حد وکثیر ہیں۔ خود یہ جگہ نہایت عالیشان اور بے انتہا نفیس سجی ہوئی ہے اور صرف مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں بیٹھکر مجھے ایسی شرم آئی کہ ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں گیا۔ لیکن شانزی لیزی (Champs Elysees) کے رسٹارانوں میں اکثر ہم جایا کرتے جہاں ایسی بے حیائی نہ تھی اور تہذیب نظر آتی تھی۔ جہاں چنناری درختوں کے نیچے۔ روز روشن کی طرح منور رانوں میں اکثر شام کے وقت ہم لوگ گانا سُنا کرتے اور جب رات ہوتی تو قہوہ خانہ کافز (Cafe de Paris) میں جاکر کافز (جنہیں میٹھے پاپڑ سمجھنا چاہیئے) کھاتے۔ چاء پیتے اور خوب غپ شپ لڑاتے تھے گرانڈ بولوار (Grand Boulvard) پر سب زیادہ فیشنل قہوہ خانہ کافی ڈی بی (Cafe de Rio) ہے جسمیں اکثر غیر ملک والے جایا کرتے ہیں دولت ظاہری یعنی تمول۔ حسن صورت وتزک واحتشام کے جو سین یہاں نظر آتے ہیں کہیں اور اسکی مثال ملنا ممکن نہیں۔ یہاں ایک چاء کی پیالی ایک شلنگ (۱۲ر) میں آتی ہے اور کرسیوں پر بیٹھکر ہر قسم کے کھیل تماشے اور دیگر تفریح کی اشیاء آدمی دیکھ سکتا ہے اب ایک رقاص آتا ہے اور ناچکر اور کچھ لیکر چلا جاتا ہے۔ کوئی نٹ آجاتا ہے جو اپنے کرتب وغیرہ دکھاکر اور کچھ پیسے لیکر چلا جاتا ہے۔ کبھی کوئی خوبصورت نازک چھوٹی سی لڑکی پھول بیچتی آتی ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بیچارا نووارد بہت سی خوبصورت ظاہرا نہایت نفیس لباس پہنے نازک نازک عورتوں میں محصور ہوجاتا ہے

یہ عورتیں پیرس میں بکثرت ہیں اور اپنے تئیں لٹل ویمن (Little women) کہتی ہیں
انہیں اجنبیوں کو پھانسنے کے طرح طرح کے داؤں آتے ہیں مثلاً وہ آپکے پاس
آئینگی اور نہایت تہذیب اور شائستگی سے جسمیں ادائے تصنع کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی
ہے آپ سے باتیں کرینگی اور آپکے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ جائینگی اور ملازم سے
کہینگی کہ اس گلفروش لڑکی سے پھول خرید لاؤ۔ پھول لینگی اور آپ کے سامنے
بیٹھینگی اور دو تین میٹھی میٹھی باتیں کرکے آپکو یکایک چھوڑ کر چلی جائینگی اور پھول والے
کا یہ بل آپ کو ادا کرنا پڑے گا۔ بہت سے ایسے بھی واقعات دیکھنے میں آئے ہیں
جہاں ان عورتوں نے بالکل اجنبی آدمیوں کے ساتھ بیٹھکر پورا کھانا کھایا ہے اور
بات بھی نہیں کی اور چلتی نظر آئی ہیں اور دعوت کا پورا خرچ اُسی غریب نووارد
کے سر پر پڑا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ باتیں پہلے ہی سے معلوم ہو چکی تھیں
اور ہم انکے مقابلے کے لئے پوری طور سے تیار رہتے۔ ان کی اس دلربایانہ عشوہ
وادا اور بناوٹ کی تہذیب و شائستگی کے جال سے بچنے کے لئے ہم گونگے اور
بہرے بن گئے انکی سب کچھ سُنی مگر نہ اُن سے کچھ بات کی اور نہ اوس طرف کچھ التفات
کیا۔ ایک اور قسم کا جال یہ عورتیں بچھاتی ہیں یعنی کسی عورت یا مرد کو دوستانہ طور
پر مدعو کرتی ہیں اور اس سے بڑی پرانی ملاقات ظاہر کرتی ہیں۔ یہ بیچارا ہی
اگر بھولا بھالا اور یہانکے مکر و فریب سے ناواقف ہوا تو بہت جلد اُن کا دوست
اور ہمدرد بنجاتا ہے۔ اسیطرح سے اُسے لبھا کر اور اچھی طرح دعوت چکھکر چلتی پھرتی
نظر آتی ہیں اور کُل اخراجات کا بار اس بیچارے کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ حسن اتفاق
سے میرے ساتھ بھی اسیطرح کا معاملہ پیش آیا اور بجائے اسکے کہ اونکا حربہ مجھپر اثر
کرے میرا ہی وار پہلے چل گیا۔ یعنی ہم دونوں (میں اور میرے دوست سٹر بانٹی
فیکس) ایک دن شارڈان دی پیری (Jardin de Paris) میں ٹہل رہے تھے
کہ ایک عورت نے ایک مرد کے ہاتھ یہ پیام میرے پاس بھیجا کہ ایک خاتون جو
آپ کی پرانی دوست ہیں آپ کو وہاں بلا رہی ہیں۔ میں فوراً اُسی چال کو سمجھ گیا

اور قصداً اپنے دوست کو ٹھیرا کر اُسطرف چلا وہاں پہونچکر میں نے ایک عورت کو دیکھا جس سے مجھ سے کبھی کی ملاقات نہ تھی۔ اوسنے نہایت تواضع و تکریم کے ساتھ بالکل بے تکلفانہ جیسے پُرانے دوست ہوتے ہیں مجھے کھانا کھانیکے لئے دعوت دی۔ وہ تو کھانا منگانے میں مصروف رہی اور میں خاموش کسیقدر بے اعتنائی کے ساتھ کھڑا رہا اور جب میں نے خوب دیکھ لیا کہ کھانا میز پر چن دیا گیا ہے تو آہستہ سے کھسک آیا۔ اس تمام کھانیکا میں بیش قیمت شرابیں بھی تھیں کل بار اُس عورت کو اپنے جی پر پتھر رکھکر برداشت کرنا پڑا ہم دونوں اوسکی پریشانی دیکھ دیکھکر خوب ہنستے رہے۔ اور جب وہاں سے روانہ ہوئے تو بڑی دور تک وہ عورت ہمارے پیچھے پیچھے آئی اور مسٹر پانٹی فیکس سے میری اس بے اعتنائی کی بہت شکایت کرتی رہی۔

یہاں اک اور قہوہ خانہ ہے جسکا نام کافی ڈی میکسم (Cafe de maxim) ہے۔ یہاں اکثر دولتمند لوگ آیا کرتے ہیں۔ یہاں لٹل ویمن (Little women) ذرا بہتر درجہ کی معلوم ہوتی ہیں اور زرق برق پر شوکت لباس میں جیسے جھوٹے جواہر ٹکے ہوتے ہیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ اعلیٰ طبقہ کی عورتوں میں اور انمیں تمیز کرنا محال ہے۔ یہ عورتیں اسقدر زیادہ چھچھوری نہیں ہوتیں اور نہ اتنا تنگ کرتی ہیں جتنا کہ ہم اوپر کسی قہوہ خانے کے ذکر میں بیان کر آئے ہیں۔

ایک اور بہت بڑا قہوہ خانہ ہے جسکا نام کافی امیریکاں (Cafe American) قہوہ خانہ امریکنس) ہے۔ یہ ساڑھے گیارہ بجے رات کو کھلتا ہے۔ فیشن ایبل لٹل ویمنین (Little women) اور اونکے یار آشناؤں کا اڈا ہے۔ صبح کے پانچ بجے تک یہ کھلا رہتا ہے۔ جو لوگ یہاں آتے ہیں اکثر اس قسم کے ہوتے ہیں جو رات گئے اوپیرا (Opera) سے لوٹتے ہیں اور اس قہوہ خانے میں آکر کھانا کھاتے ہیں۔ لٹل ویمنوں (Little women) کا ایک غول کا غول اُن کا منتظر رہتا ہے اور جب یہ لوگ داخل ہوتے ہیں تو ہنسی اور قہقہوں

کے ساتھ اکا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور پانچ یا چھ بجے صبح تک اسیطرح ہنسنا۔ ناچنا۔ کودنا۔ ہاتھا پائی کرنا اور طرح طرح کے لہو ولعب برابر جوش و خروش کے ساتھ جاری رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں پیرس بھی بہت کچھ تہذیب کا پیرایہ لئے ہوتی ہیں اور اگر کوئی چاہے کہ اس سے زیادہ کھلم کھلا فحش دیکھے تو اُسے چاہیئے کہ نمیٹر (Nanmatre) کی عشرت گاہوں میں سے کسی جگہ جائے۔

پیرس کا یہ حصہ بالکل فیشن ایبل نہیں ہے۔ یہاں بعض قہوہ خانے ایسے ہیں جو رات دن کھلے رہتے ہیں مگر نشاط و طرب کا اصلی وقت ۱۲ بجے رات سے شروع ہوتا ہے جبکہ فیشن ایبل لوگ عمدہ عمدہ لباس میں گاڑیوں سے کودتے اور اور کافی (ڈوریٹ (Cafe dorat)) میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس مقام پر اسوقت ایسی حیرت انگیز اور عجیب و غریب عیش و نشاط کے سین نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ بڑے بڑے مہذب و شائستہ لوگ ہاتھ ناچتے۔ کودتے۔ بوسہ بازی کرتے اور طرح طرح کی لہو ولعب کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں سے قریب ایک اور جگہ ہے جسکا نام کافی تیاران (Cafe Eiran) ہے جو رات بھر کھلی رہتی ہے اور تمام دن ایک ہلڑ سا رہتا ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ دو حبشی لڑکے عجیب طرح سے جسے دیکھکر بیساختہ ہنسی آتی تھی ناچ رہے ہیں اور لوگ قہقہوں کے مارے مکان سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ ہر شخص مجھے یہاں ہنستا یا گپ شپ لڑاتا اور عیش و نشاط کی ترنگ میں جھومتا نظر آتا تھا۔ رات تاریک اور خوفناک تھی مگر اس ہال میں خوش و خرم نوجوان لوگ اپنی محبوباؤں کو گلے سے لگائے ناچتے اور اُچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ اس جگہ سے ملا ہوا ایک ناچ کا کمرہ ہے جو ۱۲ بجے بند ہو جاتا ہے اور جہاں ہر رات بہت دھوم دھام سے نہایت عمدہ ناچ ہوا کرتا ہے۔ ناچنے کی جگہ نہایت وسیع ہے اور ناچنے والے بھی بکثرت ہیں۔ کمرے کے اندرونی چھجوں پر جہاں اسقدر آئینے آراستہ ہیں کہ بالکل آئینہ خانہ معلوم ہوتا ہے۔ اور جہاں ناچ

دیکھنے والے بیٹھکر ناچ کا تماشا دیکھتے ہیں ایک عجیب وغریب منظر ہوتا ہے اسجگہ بکثرت مشتبہ چال چلن کی عورتیں ہر طرف منڈلاتی پھرتی ہیں اور نو وارد اگر کسی سے بات کرنا چاہے تو اُسے نہایت ہوشیاری سے کام لینا چاہئے کہ ان عورتوں میں سے کسی کے جال میں نہ پھنس جائے۔

منمیٹر (Monmatre) میں ایک اور نہایت دلچسپ جگہ ہے جسے مولان روز (Molan rouge) یا رڈل (Red mill) کہتے ہیں۔ یہ مقام بہت بدنام ہے اور اٹل وین (Kittewomen) اکثر اسے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا کرتی ہیں۔ یہاں ایک نفیس نغمہ خانہ ہے اور پشت پر ایک باغ ہے جہاں ہر طرف کرسیاں پڑی ہیں اور گوشوں پر نشست کی جگہیں بنی ہیں جہاں دو آدمی بیٹھکر نہایت مزے سے باتیں کر سکتے ہیں۔ باغ نہایت پُر رونق ہے اور ہر طرف چہل پہل نظر آتی ہے مگر ہمنے دیکھا کہ اکثر دوسرے درجہ کے لوگ جمع ہیں اس لئے فوراً باہر نکل آئے۔ اسی کے قریب دو نہایت نفیس اور عجیب عمارتیں ہیں جنہیں دیکھکر میں بہت متحیر ہوا۔ ایک کا نام "جنت" دوسرے کا "دوزخ" باہر دروازہ پر عجیب عجیب حیرت انگیز تصویریں بنی ہوئی ہیں "دوزخ" کے دروازے پر نہایت بڑی بڑی ہیبت ناک تصویریں تھیں اور "جنت" کے دروازے پر نازک خوبصورت پریوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پہلے ہم لوگ اس دوزخ میں داخل ہوئے۔ دروازہ پر ایک آدمی سے ملاقات ہوئی جو نہایت ہیبت ناک لباس پہنے ہوئے تھا یہ مالک دوزخ تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی زور سے اس نے یہ آواز دی "فرشتو" ان دو گنہگاروں کو لو جو بہت دور سے آئے ہیں اور خوب مدارات کرو" ہم ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے جہاں دیواروں پر بہت خوفناک تصویریں نظر آتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر گوشے سے اژدہے زبانیں نکالے حملہ کنان ہیں اس اثنا میں ہمارے لئے قہوہ آیا اور کچھ آدمی بھی جمع ہو گئے۔ یہاں سے ہم سب اوٹھکر ایک دوسرے چھوٹے سے کمرے میں گئے جہاں ہم نے عجیب عجیب منظر دیکھے

ایک لیڈی نے خود اسٹیج پر جانا پسند کیا۔ وہاں جاکر وہ کچھ دیر تک ساکت کھڑی رہی ہم نے دیکھا کہ شعلوں نے ہر چہار طرف سے اُسے گھیر لیا ہے۔ لباس میں آگ لگی۔ وہ جلگیا۔ اب جسم میں آگ لگی اور سب گوشت پوست جلکر ہڈیوں کا ڈھانچا ہی ڈھانچا باقی رہگیا۔ اسطرف یہ بہت ناک سین تھا کہ دوسری طرف سے ہم نے دیکھا کہ وہ لیڈی چلی آرہی ہے اور کسی قسم کے صدمے کا نشان اوسپر نہیں ہے ہاں جو کچھ اُسنے دیکھا ہے اُس سے گھبرائی ہوئی متوحش ضرور معلوم ہوتی ہے۔

اسکے بعد ہم جنت میں گئے۔ یہاں ایک موٹے سے ظریف صورت آدمی نے جو داروغہ جنت تھا ہمارا استقبال کیا اور نہایت ظریفانہ ہماری دلگی کے نام رکھکر فرشتوں کو آمد کی اطلاع دی۔ اندر جاکر ہم ایک گول میز کے گرد بیٹھ گئے جہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں رکھی تھیں۔ اب جنت کے عہدہ دار بڑے بڑے لمبی لمبی عباؤں میں عجیب و غریب ٹوپیاں اور پگڑیاں سر پر رکھے یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ انمیں ایک خاص آدمی کو دیکھکر مجھے بہت ہنسی آئی جسکی عجیب مضحک صورت تھی۔ چہرے پر ایک بہت بڑی لمبی ڈاڑھی تھی اور ایسی مقدس صورت بنائی تھی کہ گویا کوئی بہت بڑا بزرگ فرشتہ ہے۔ اس صورت کو دیکھکر مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہوسکی۔ کمرے کے اندر ایک چبوترے پر یہ شخص کھڑا ہوا اور ہلوگوں کو مخاطب کرکے کچھ کہنا شروع کیا اور اپنے ماتحت فرشتوں سے کچھ سوال بھی کرتا جاتا تھا۔ لوگ اس تقریر کو سُنکر بہت ہنستے تھے اور میں بھی اس ہنسی میں اُنکا ساتھ دیتا تھا مگر افسوس ہے کہ سمجھتا کچھ نہ تھا۔

اسکے بعد ہمیں پشت کی جانب ایک کمرے میں لیگئے جہاں ہم میں سے ایک شخص ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا۔ اور چارو نطرف سے پریوں نے گھیر کر اوسکی منتیں کرنی شروع کیں۔ کبھی اوسکے پیر چومتیں کبھی اوسکے گود پر گرتیں۔ مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ شخص خود انہیں نہ دیکھ سکتا تھا اور ہم سب تماشائی کل تماشہ کو دیکھ رہے تھے۔ اور قہقہہ لگا رہے تھے۔ ان پریوں کے بدنوں پر نہایت نازک اور ہلکے کپڑے کا لباس تھا جو بالکل جسم سے چپکا ہوا تھا۔ اور یہ بالکل عریاں معلوم ہوتی تھیں۔

ہم سب اس تماشہ کو بہت دیر تک دیکھتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔ اسکے علاوہ یہاں ایک اور مقام تھا جسے "کافن" (یعنی تابوت) کہتے ہیں وہاں بھی جاکر دیکھا کہ ایک عجیب تماشہ ہو رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے آیندہ زندگی کی حالت کو نہایت مزخرف پیرایہ میں تصور کیا ہے اور جو منشا سمجھا ہے وہ اسقدر مضحکہ خیز اور حیرت انگیز ہے کہ میں کبھی ہنستا تھا اور کبھی حیرت کرتا تھا کہ کسقدر دھوکے میں یہ لوگ ہیں۔

میں بیان کر رہا تھا کہ منیمیٹ (Monmatt) نہایت ہی چہل پہل کا مقام ہے بیشک یہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اور خاصکر چودھویں جولائی کی رات سے برابر ایک ہفتہ تک جو حالت رہی وہ بیان سے باہر ہے۔ ہر رات میلا رہا کرتا تھا اور لوگوں کو لہو لعب سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ بیشمار (Many and) میری گو راؤنڈ (Merry go round) سولش بیک ریلوی (Switch back railway) اور شوٹنگ مشینیں (Shooting machines) تھیں جنکے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔

کافی ڈڈریٹ (Cafe dansant) سے جب ہم گاڑی پر سوار اپنے ہوٹل کو واپس جا رہے تھے تو راستہ پر بھی طرح طرح کے لوگ اپنے نئے نئے رنگوں میں نظر آتے تھے سڑک پر چند بیفکرے نشہ سرور میں مست گاتے جا رہے تھے۔ جب ہم انکے قریب سے گذرے تو ہمیں دیکھکر زور سے وہ چلائے "منیمیٹ کے لوگو جیو! جیو! تمہاری عمریں دراز ہوں"۔ اسوقت میں نے ان کی نشاط و مسرت کا اندازہ کیا کہ کیسے ہنسی خوشی یہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسے بے فکرے ہیں کہ شاید کہیں اور انکی مثال ملنا محال ہے۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم بھی جواب میں یہی فقرے دہرائیں۔ زبان سے تو نہیں مگر دلمیں ہمنے بھی یہی فقرے دہرائے اور انکی مسرت ہمیں بھی مسرت معلوم ہونے لگی۔

پیرس کے اعلیٰ درجہ کی اور فیشن ایبل عشرت گاہیں شانزی لیزی (Champs Elysees) میں بکثرت ہیں۔ اس خوبصورت سڑک پر جیسا میں نے بیان کیا ہے ہر جانب چنارے درختوں کے نیچے نغمہ و سرود کے لئے بکثرت مقامات بنے ہیں۔ یوں تو

پیرس ان نغمہ وسرود کے مقامات کے لئے مشہور ہی ہے۔ مگر سب سے زیادہ عمدہ مقامات ژاردان (Jardin) ڈی پیری (de Paris) ماری نے (Marigny) اور امبسڈیو (Ambassadeur) میں ہیں۔ اول الذکر دو مقامات اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ژاردان جو اکثر میری تفریح کا مقام رہا کرتا تھا، ایک بہت بڑا باغ ہے جو ہر قسم کے سامان آرائش سے آراستہ ہے۔ سایہ دار درختوں کے نیچے ہر طرف کرسیاں پڑی ہیں اور وسط میں ایک نہایت خوبصورت بینڈ اسٹینڈ (Band stand) ہے اور سر پر ایک چھوٹا مکان نغمہ وسرود کے لئے مخصوص ہے۔ اسکے علاوہ اور بہت سی چیزیں مثلاً شوٹنگ گیلری (Shooting gallery) بنچ بال (Punch ball) فوٹو سیلون (Photo salon) ہیں اور زیر زمین بھی ناچ کے واسطے مقامات بنے ہیں جو کسیقدر فحش سمجھے جاتے ہیں۔ گانے کے لئے بہت سے اعلیٰ درجے کے گویئے ہیں اور کھانے پینے کے واسطے بھی اسجگہ بکثرت چیزیں مہیا ہیں میں ایک میز کے قریب بیٹھکر کچھ میوے کھاتا چاء وقہوہ پیا کرتا اور خاموش بیٹھا گانا سنا کرتا تھا چونکہ میں فرانسیسی زبان بخوبی جانتا نہ تھا اسلئے ان گانوں کا لطف بہت کم آتا۔ مگر بعد میں میرے دوست نے بیان کیا کہ شگفتہ زبان میں یہ نہایت ناپاک مضمون گائے جاتے ہیں اور ایسے فحش ہیں کہ انگلستان میں کوئی علانیہ گا نہیں سکتا۔

گیارہ بجے کے قریب گانا ختم ہوتا ہے اور پلیٹ فارم پر ناچ شروع ہو جاتا ہے اور لٹل ویمن (Little women) اپنی کیک واک اور طرح طرح کے ناچوں سے لوگوں کو محظوظ کیا کرتی تھیں۔

ژاردان (Jardin) فی الواقع پیرس کیا بلکہ یورپ کے بے انتہا دلچسپ مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ مسٹر پانٹی فیکس تو بے طرح اسکے گرویدہ ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں کہیں انہوں نے ایسا فرحت افزا مقام نہیں دیکھا۔ اسمیں شک نہیں کہ پیرس کی دوسری عشرت گاہوں کی طرح یہاں بھی "لٹل ویمن" (Little women) بکثرت نظر آتی ہیں۔

مگر یہاں اونکے حرکات وسکنات میں تہذیب کی بیڑیاں پڑی رہتی ہیں۔ ان عورتوں کی گروہ پیرس میں ہر جگہہ نظر آتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ کسب کرنا (Prostitution) فرانس میں کوئی گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ کوئی جگہ تمہیں ایسی نہ ملیگی جہاں ایسے مناظر دکھائی نہ دیں۔ لندن کی حالت اس سے بھی بدتر ہے مگر دوسری طرح پر۔ یعنی" قانون میں کسب کرنے کی سخت ممانعت ہے اگر کوئی آدمی کسی کے ساتھ کہیں دیکھ لیا جائے تو قانوناً اوسکا چالان ہو سکتا ہے مگر یہ ممانعت مخالفت کا اثر نہیں رکھتی اور محض برائے نام ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہزاروں قسم کی بیماریاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں۔ صحت خراب اور جسم تباہ ہو گئے ہیں بخلاف اسکے پیرس میں ہر لٹل ومین کے پاس ایک اجازت نامہ ہوتا ہے اور جب تک کہ وہ ہفتہ وار اسپتال میں جاکر اپنا معائنہ نہ کرائے وہ کبھی پیشہ نہیں کر سکتی۔ رنڈی آوارہ بازاروں میں پھرنے والی ہو یا کوئی مہذب مکانوں میں بیٹھنے والی یا کسی کی داشتہ ہو ہر اک کے لئے ضرور ہے کہ اک اجازت نامہ اپنے پاس رکھے اور ہفتہ وار عہدہ داران کو معائنہ کرائے۔ یہ عہدہ دار خاص طور پر نہایت احتیاط کے ساتھ معائنہ کرتے ہیں کہ کہیں کوئی بیمار نظر انداز نہ ہو جائے۔

ژاردان (Jardin) کے بعد ماری نی (Marigny) کا درجہ ہے یہ بھی نہایت فیشن ایبل مقام ہے اور تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے میری خیال میں ژاردان (Jardin) پر ترجیح رکھتا ہے۔ یہاں دو تین تماشے دیکھنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انگریز ناچ گانوں میں بالکل پیرس والوں کی نقل کرتے ہیں مگر پھر بھی لطافت وخوبی میں اُن کے قریب تک نہیں پہونچ سکتے۔

اُن دو مقامات کے علاوہ پیرس میں بکثرت تھیٹر۔ تماشہ گاہیں اور عشرت گاہیں ہیں اور انہیں سے اکثر ایسی ہیں جو صرف موسم سرما میں کھلتی ہیں انہیں میں سے ایک تھیٹر سارا برنارڈ ہے (Theatre Sarah Bernard) جو اس زمانے کی عجیب و غریب موجودہ ایکٹرس دی ڈوائن سارا (the divine Sara) کے نام سے موسوم ہے

لیکن ان سب سے زیادہ عالیشان مقام گرانڈ اوپیرا (Grand opera) ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا میں سب سے بہتر اوپیرا ہے اور درحقیقت یہاں کے سازو سامان کو دیکھکر یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اسکا بیرونی حصہ نہایت نفیس و شاندار ہے۔ راگ کی دیبی کا ایک بت سامنے نصب ہے اور ساتھ ہی ملک کے مشہور و معروف مغنیوں کے بت نصب ہیں جو اپنی انداز و وضع میں نہایت اعلیٰ درجہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ اندر کا حصہ بہت وسیع اور عالیشان ہے۔ اُس کی عظیم الشان دیواریں مرصع چھتیں نشست گاہیں جنپر نہایت عمدہ پچی کا کام کیا ہوا ہے۔ اور دمکتا ہوا سنگ مرمر کا زینہ یہ سب چیزیں ایسی خوبصورت اور نفیس بنی ہوئی ہیں کہ دیکھنے والا عالم تحیر میں بیخود ہو جاتا ہے۔ اسٹیج اسقدر وسیع ہے کہ تین سو آدمی ایک ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا ایک ہال ہے جسے "گرانڈ فوای" کہتے (Grand Foyer) ہیں یہاں اثنائے وقفہ نغمہ میں لوگ آکر ٹہلتے ہیں۔ یہ ہال ایسا نفیس ہے کہ دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اسکی دیواروں اور چھتوں پر ایسا خوبصورت اور دلفریب کام کیا ہوا ہے کہ دوسری جگہ نظیر نہیں ملسکتی۔ میں یہ سب کچھ دیکھکر ایسا متحیر کھڑا کا کھڑا رہ گیا کہ گویا کسی نے جادو کیا ہو۔ اُن لیڈیز اور جنٹلمینوں کے لباس بھی جو اسوقت اس ہال میں آکر ٹہلتے ہیں ایسے زرق برق نظر آتے ہیں کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی درحقیقت یہ سب کچھ ایسا دلفریب نظارہ تھا کہ میں عمر بھر کبھی نہیں بھولونگا۔

"لافوائی" (Lafoyer) درحقیقت ایسا عالیشان اور نفیس و خوبصورت ہال ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ جی چاہتا ہے کہ دہلی کے دیوان عام سے مقابلہ کروں مگر حُب الوطنی کہتی ہے کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اسمیں شک نہیں کہ دیوان عام کی نظیر اپنی طرح میں تمام عالم میں ملنا دشوار ہے لیکن "لافوائی" موجودہ زمانہ کی فن لطیف کا بہترین نمونہ ہے اور اپنے رنگ میں بے مثال۔ "لافوائی" کے علاوہ یہاں اور بھی بڑے بڑے ہال ہیں جہاں خورد و نوش کی چیزیں بکثرت رکھی رہتی ہیں۔ ان سب عمارتوں نے ملکر "دی گرانڈ اوپیرا" کو ایک نہایت عالیشان عمارت بنا دیا ہے۔

ان تمام عشرتگاہوں کو دیکھکر معلوم ہوا کہ یہاں عوام بھی ایسی عشرت گاہوں سے متمتع ہو سکتے ہیں جو ایک زمانہ میں صرف بادشاہوں کیلئے مخصوص ہوتی تھیں۔ یہ سلطنت جمہوری کی نعمتیں ہیں۔ میں نے یہاں ایک نئی بات دیکھی یعنی فرانس میں اکثر "اوپیرا" اور تھیٹر سرکاری ہیں چھوٹے چھوٹے قصبوں میں وہاں کے کارپوریشن (جماعت منتظمہ Corporation) کے سپرد انکا انتظام ہوتا ہے۔ فرانس میں اور نیز جرمن میں گانا قومی تعلیم کا جزو اعظم سمجھا جاتا ہے اور سرکار کا فرض ہے کہ اسکی نگرانی کرے گانے بجانے والے سرکاری نوکر سمجھے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے گرانڈ اوپیرا" کے جتنے ایکٹر ہیں وہ سب سرکاری ملازم ہیں یہ ایک ایسی بات ہے جو مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی۔ اسیطرح گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ ملک کے پرانے علوم و فنون کے بھی حفاظت کرے خواہ وہ کیسے ہی بے مقدار ہوں اور اون سے کچھ بھی نفع نہ ملتا ہو۔ گورنمنٹ نے پیرس میں مشجر کا کام بنانے کے کارخانے کو ابتک قائم رکھا ہے۔ یہ چیز گو کہ اب رواج میں نہیں ہے اور بازار میں اسے کوئی نہیں پوچھتا تاہم گورنمنٹ اس فن کو باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور صاحب فن کو بہ درغ کے طور پر تنخواہیں دیتی ہے۔ اسی طرح قدیم چینی کے کام کا کارخانہ بھی پیرس میں ابتک باقی ہے۔ ہائے! ایک ہمارا ہندوستان ہے اور ایک یہ یورپ۔ ہمارے ہاں کے فنون ضائع ہوتے چلے جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ پرانے زمانہ کے کتنے صاحب کمال صاحب فن موجود ہونگے مگر کوئی اونکا نام بھی نہیں جانتا یہاں بخلاف اسکے حالت ایسی ہے کہ خود گورنمنٹ اپنے ملک کے فنون کی نگرانی کرتی ہے پیرس میں تمباکو کا ایک کارخانہ ہے جو سرکاری ہے جسمیں بہت خرچ ہوتا ہے مگر اُس سے آمدنی بھی معقول ہوتی ہے۔

میں گرانڈ اوپیرا (Grand opera) کے سلسلہ میں یہ بیان کرنا بھول گیا کہ اوپیرا کیا چیز ہے اور اُسکا کیا مقصد ہے اوپیرا میں اسٹیج کے اوپر کوئی تاریخی یا محض جذباتی ڈراما نغمہ و سرود کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ اسکا مقصد تماشا کرنا کم ہوتا ہے اور ناچنا گانا زیادہ۔ ڈراما جسکے ساتھ یہ ناچ گانا ہوتا ہے محض لباس ہی لباس ہوتا

ہے اور صرف لوگوں کے جذبات پر زیادہ اثر پیدا کرنے اور نفس تماشہ کو اور زیادہ مرغوب بنانے کے لئے مقصود ہوتا ہے۔ یورپ میں اوپیرا میں گانا بہت بڑا فن سمجھا جاتا ہے اس فن کے بعض ماہر ایسے ہیں جنہیں ہزار ہزار پاؤنڈ ایک ایک رات کے ملتے ہیں۔ پیرس کے اس گرانڈ اوپیرا (Grand Opera) میں عالم موسیقی کے آفتاب و ماہتاب جمع ہوتے ہیں اور ایکدوسرے سے گوئے سبقت لیجانے میں مقابلہ کرتے ہیں کیونکہ یہی جگہ ہے جو تمام دنیا میں موسیقی کا دار العلوم کہی جاسکتی ہے۔

میں اس سفرنامہ کے خاتمہ پر یہ اور بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مسافروں کو عام طور پر جو واقفیت معمولی صورت میں حاصل ہوتی ہے وہ اُن ترجمانوں اور رہبروں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے جو ہر جگہ گدھ کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں۔ گرینڈ بولوار پر (Grand Boulevard) یا طامس کک کے دفتر کے سامنے اکثر ان حضرات کی ہمدرد صورتیں نظر آئینگی۔ انگریزی قصوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ جو وقت مگرمچھ دنیا ہی تو انہیں دیکھکر پہلے خوب روتا ہے پھر ایک ایک کرکے کھانا شروع کرتا ہے اسی طرح ہر بچہ پر روتا جاتا ہے اور کھاتا جاتا ہے۔ یہ حضرات بھی نووارد مسافروں کے ساتھ اسی طور کی ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ لوٹتے لوٹتے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ اور ہمدردی کے الفاظ اخیر تک بند نہیں ہوتے۔ انکا سب سے پہلا کلام یہ ہوتا ہے کہ "سرکار میرے ساتھ تشریف لیچلیں۔ ایسی ایسی پرچیں دکھاؤں کہ کبھی نہ دیکھی ہوں" اور دس آدمیوں میں سے نو لامحالہ اُنکے شکار بنتے ہیں اور خوب لٹتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جہاں یہ پہنچاتے ہیں وہ نہایت ذلیل تر ڈکلاس جگہ ہوتی ہے۔ شروع ہی سے ان لوگوں کے خیال سے میرے بدن پر لرزہ چڑھتا تھا اور حتی المقدور ان کے سایہ تک سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

مگر یہاں کے عجائب و غرائب مجھے دیکھنا نصیب تھے جو مسٹر پانٹی فیکس (Mr. Pontifex) ایسے شریف دولتمند اور پیرس کے چپہ چپہ سے واقف کار شخص سے ملاقات ہوگئی۔ جہاں گیا میں اُنہیں کے ہمراہ گیا اور جو کچھ دیکھا اُنہیں کے ساتھ دیکھا۔ تمام چیزیں اب تک میٹوگراف کی تصویروں کی طرح میری نظر کے سامنے پھر رہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے

کہ ایک خواب تہا جو دیکہا تہا جسمیں دلچسپی بہی تہی اور نفرت بہی۔ لطف بہی تہا اور بے لطفی بہی۔

پیرس درحقیقت حیرت انگیز مقام ہے مگر عیاشی اور بدکاری کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر آپ پیپ شو (Peep show) کو دیکہیں کہ کیا شے ہے تو متحیر رہ جائینگے اور کہینگے کہ اس فحش اور بے حیائی کی کہیں حد نہیں۔ پیپ شو میں ایک برہنہ عورت آتی ہے جسکے پیچہے ایک برہنہ مرد پکڑنے کو دوڑتا ہے مگر پکڑ نہیں سکتا۔ یہ مرد اکثر کوئی بیوقوف نووارد شخص ہوتا ہے جسے گانٹہہ کر لاتے ہیں۔ اسکے حرکات کو سب لوگ تماشے کے طور پر دیکہتے ہیں اور یہ بیچارہ اپنی رسوائی سے ناواقف بالکل اونہیں نہیں دیکہ سکتا۔ اسکے علاوہ اکثر مقام یہاں ہیں جہاں جہنڈ کے جہنڈ برہنہ عورتونکے ناچ کے لئے سامنے آتے ہیں اور طرح طرح کی حرکات کرکے اپنے بے شرم تماشائیوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ لندن میں بہی بیحیائی اور فحش اس سے کم نہیں مگر پیرس کی طرح بالاعلان کچہہ نہیں ہوتا۔ یہانکے لوگ شاید ایسی بیحیائی کے عادی ہوگئے ہیں جو لحاظ نہیں آتا۔

ایک مقام میں نے یہاں دیکہا جہاں ہمارے ملک معظم اپنے شباب کے زمانہ میں مدعو کئے جاتے تہے۔ ایسی خوبصورت سجی ہوئی جگہہ میری نظر سے کہیں نہیں گذری۔ اندر داخل ہونے کے لئے چہوٹے چہوٹے تاڑ کے درختوں کی دورویہ صفیں بنائی گئی ہیں۔ چہوٹے چہوٹے باغات آراستہ کئے ہیں۔ اندر کی عمارتیں مختلف ممالک کی وضع پر بنی ہیں جنمیں نہایت موٹے قالین کا انہیں ممالک کی وضع پر فرش ہے۔ میں یہ سجاوٹ دیکہکر محو حیرت رہگیا سنتا ہوں کہ دس لاکھ فرانک (Frame) سے زیادہ اس عشرت خانہ کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔

افسوس ہے کہ یہانکے بڑے بڑے مکانات مثلاً دوفیل (Dufayel) اور لافیٹ (Lafayette) وغیرہ کا حال جیسے بالکل چہوٹ گیا انہیں دوکانیں کہنا غلطی ہے۔ یہ تو خوبصورت اشیاء کی چہوٹی موٹی دنیائیں ہیں جنمیں صرف سرسری طور سے دیکہنے کے لئے گہنٹوں چاہئیں۔ انکا ذکر مجملاً ہی یہاں کرنا اسوقت طوالت سے خالی نہیں اسلئے معزز ناظرین سے عفو کا خواستگار ہوں۔ آخر میں اپنے ہموطنوں سے یہ کہے بغیر

نہیں رہ سکتا کہ اگر استطاعت ہو تو ضرور ایک دفعہ یہاں کی سیر کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں کیا کیا موجود ہے۔ مجھے تو پیرس کے ایک مرتبہ دیکھنے سے تسکین نہیں ہوئی اور اگر خدا یاوری فرمائے گا تو کئی مرتبہ مکرر سکرر دیکھونگا صرف اسلئے کہ یہاں جہاں عیب ہیں وہیں سیکڑوں خوبیاں اور صفتیں بھی ہیں اور بکثرت ایسی قابل دید چیزیں کہ دنیا میں انکی مثال نہیں ملسکتی۔ انسان کو چاہئے کہ ہر چیز کو دیکھے اور خذ ما صفا ودع ما کدر پر اپنا عمل رکھے۔ فقط "مانی"

ساقی نامہ درمیان فصول سہ گانہ و ایام بہار مسمّٰے بہ ابر آذر معروف بہ نیرنگ جنون

ای کلک سیاہ مست و طناز — ساقی نامہ کر ایک آغاز
کر وصف شراب ناب تحریر — مضمون ہوں لاجواب تحریر
الفاظ ہوں ثقیل اور سست — معنی نازک ہوں بندشیں چست
شوخی ہر شعر میں بھری ہو — مضمون ہم صورت پری ہو
ہر دائرہ ہو جو آفتابی — قرطاس کا رنگ ہو گلابی
منہ میں واعظ کے پانی بھر آئے — سننے والا بھی مست ہو جائے
زہاد جو میکدہ میں آئیں — پی پی کے شراب تلملائیں
صوفی کیطرح حال لائیں — ہو حق کے بلند ہوں صدائیں
کیفیت میکدہ نہ لوٹی — قسمت زاہد کی کیسی پھوٹی
ای ساقی گلبدن گل اندام — دے بھر کے مئے سرور کا جام
لے بادۂ خوشگوار ساقی — صدقے قربان نثار ساقی
دے جلد شراب ناب ساقی — ہوتا ہے جگر کباب ساقی
لے بادہ کہ روح کو ہو طاقت — اللہ رکھے بہ تجھ سلامت
پوری ہو جو دل کی آرزو ہو — ساقی دنیا ہوا رتو ہو
اے پیر مغاں تیرا بھلا ہو — تو روئے زمین کا باشاہ ہو
ہاں پردے حجاب کے اٹھا دے — شکل بنت العنب دکھا دے
اب لوٹ اسی پری پہ جی ہے — بوشیش عمل سے جھانکتی ہے
پہلو میں بٹھا دی اوسکو لاکر — بیٹھا ہوں لگائے تاک چھپکر
خود سونگھ رہا ہے جسکی بو مشک — جسکا ہے لقب نثار مشک
ہے حسن کی مجھکو چار سو دھوم — کہتی ہیں جسے رحیق مختوم
آرام کروں جو میں محل میں — ہر شب ہو وہی پری بغل میں
ہر گام پہ دل کا کام لوٹیں — مستانہ روش پہ جان دیں
غارتگر ہوش ہے سراپا — عشوہ غمزہ ادا کرشما
ہے فرق سے تا قدم پرستی — شوخی چل بل ترنگ مستی
آواز ملی ہے کیا رسیلی — آنکھیں پائیں ہیں کیا نشیلی
مونہہ جام شراب سے لگا دوں — بوسے لب دختر رز کے پیلوں
بو آئے شراب کی دہن سے — مستانہ پکے سہی سخن سے
کچھ ہونگی مبرز کرم ہیں — دے بادہ عیش جام جم میں

آئی فصل بہار ساقی
گھنگھور گھٹا کا دیکھ جوبن
کیا ہے گہرا سیاہ بادل
آنے پائیں یہاں نہ رندو
ہر مست پڑا ہے پائے خم پر
ہیں بس کہ شباب کے یہ دن ہیں
کہتا ہے کہ دے شراب انگوری
کچھ حال فضول آسمانی
جاڑے سے جو بڑ گیا ہے پالا
کہتے ہیں حضر ہی ایسی سردی
یہ بات نہیں ہے کچھ نئی بات
سردی کے سبب سے یہ سکوں ہے
گرمی جو ہوئی ہے آگ کی کم
سردی نے بڑھا دی قدر ایسی
سردی کا جو خور چار سو ہے
مضمون سردی کا جم گیا ہے
ہوتی ہیں بشر، خلق توام
ہوتا ہے سحر کو شکل حربا
سب سردی کے آگے طلبگار
باہر نہ دہن سے کچھ صدا آئے
امسال پڑی غضب کی گرمی
پانی دریا کا جل رہا ہے
ہر جسم ہے آبلوں سے پہلا

اب ضبط ہے ناگوار ساقی
کیا مست اٹھا ہے ابر بہمن
برسا تو بہر بن کو آج جل تل
قاضی مفتی عسس کوتوال ہو
بیٹھی یہ ہے میکشوں کا بستر
مستوں پہ چڑھا ہی ساقیا جن
ہاں اور پلا دے مجھکو جو کچھ
لکھ پی کے شراب ارغوانی
افسردہ ہیت ہو لکھنے والا
اس سن میں کبھی نہ ہم نے دیکھی
منہ سے نکلی کہ جم گئی بات
جنبش کرتی نہیں کوئی شے
کافر کو بہشت ہے جہنم
ہے لعل کے مول آگ بکتی
رشک کشمیر مکھسو ہے
قلمی خورہ قلم بنا ہے
سردی کے سبب گئے ہیں جم جم
منہ جانب آفتاب سبکا
دونوں کا بجا ہے گرم بازار
منہ کھول کے آپ صورہ جائے
گویا ہے جسم اب کی گرمی
سرطان ہاتھوں اچھل رہا ہے
عالم اللہ کا ہے جلتا

اب طبع بہت ہے کند ساقی
کہتا ہے گرج کے رعد ہر پل
گرنے کو کہیں لپک رہی ہے
قفل در میکدہ کہلا ہے
اللہ رے میکشوں کی محفل
یہ رند یہاں تو وہ کہیں ہے
بس جس بہت لگا نہ یک بک

دے بادہ تیز تند ساقی
اں بادہ کشو اٹھا لو بوتل
بجلی کیسی چمک رہی ہے
اک بھیڑ ہے بند راستا ہے
سب لوٹ رہے ہیں مثل بسمل
ہوش ایک کا ایک کو نہیں ہے
وصف خانہ میکدہ کہاں تک

صفت سرما

بے شبہ کسی نے سچ کہا ہے
سکتے اسکے پڑے ہوئے ہیں
اسطرح ہیں دانت کر کر کراتے
سردی کے سبب سے نشر گیا ہے
ہے صورت آب برف ٹھنڈا
کیا اوج پہ ہے وقار آتش
کیا لکھے کوئی دبیر و نثار
سردی کا جو ڈر سما گیا ہے
جس میں بشر بہ شکل تصویر
کیوں نرخ نہ روئی کا گراں ہو
گر صور بھی پھونکدیں سرافیل

جاڑا پالا بری بلا ہے
ٹھنڈی اسکے گڑی ہوئی ہیں
بادل جیسے ہیں گڑگڑاتے
روز ٹھنڈا پڑا ہوا ہے
ندا کمل دو شالہ دہتا
آغوش میں ہے نگار آتش
شکل مفلوج ہاتھ بیکار
شعلہ کا بدن بھی کانپتا ہے
جسکو دیکھو وہ ہے زمیں گیر
جس جنس کا مشتری جہاں ہو
سردی یہ اثر کرے یہ تعجیل

صفت گرما

کیا خاک چلینگے چلنے والے
آتش سے کنارہ کش سمندر
گرمی میں جستجو سے دریا

ہیں پاؤں خیال میں بھی چھالے
ہر وقت ہے ڈھونڈتا سمندر
خود رنگ رواں ہے سو دریا

کاہوں پہ ہے خود کباب سا ہی
تو باد سحر میں وصف اوکا
انگارہ بنا ہر اک ثمر ہے
ہر مرغ حواس باختہ ہے
لک لک سرتے ہیں منہ کو کھولے
گرمی بھلی کو یہ لگی ہے
جلنے کا جو خوف ہے سراپا
ہے غرق عرق ہر ایک اندام
گرمی کے سبب سے چشم گرداب
گرمی کا تعب نہیں گوارا

بھلی ہے برنگ دیگ لہری
ایسی گرمی کے منہ کو لو کا
جو نخل ہے آگ کا شجر ہے
ڈالی پہ کباب فاختہ ہے
قلق کرتے ہیں منہ کو کھولے
چادر پانی کی پھیک دی ہے
سایہ ہر چیز کا ہے عنقا
ہر ایک مکاں ہے رنگ حمام
ہے چاہ ذقن کی شکل بے آب
اڑتا ہے برنگ برق پارا

یہ آگ تو کس شمار میں ہے
گرمی کا تعب جو سہ رہا ہے
ہے طوق گلو جو قمریوں کا
سر مرغ نظر بھی دھن رہا ہے
سردی ایسی ہوئی ہے زائل
جنگل میں برستی ہے غضب آگ
شاعر کے سخن میں شان آتش
پلٹن کے ہوں لوگ ابر لے
گرمی کے جو صدمہ تعب ہیں

خود حشر عذاب نار میں ہے
ان ان دوزخ بھی کہہ رہا ہے
وہ گرم حدید سے زیادہ
ہر سیخ مژہ پہ بھن رہا ہے
کافور ہے ہم مزاج فلفل
اکھو شیشم چنار سب آگ
گویا ہے زبان زبان آتش
گورے لندن کے سب ہیں کالے
جھیلیں تالاب خشک لب ہیں

صفت ایام برشکال و بیان وحشت زدگان آشفتہ حال

برسات کی فصل کیا پڑی ہے
کرتی ہے جہان تلک نظر کام
بجلی کی چمک جو متصل ہے
اس فصل میں ہے یہ فصل جو
آتے ہیں نظر بری کو پہ انتار
عالم کو ہے جستجوی خورشید
ہوتا نہیں ایک دم اجالا
رویا کیسے بڑھے ہوئے ہیں
بجلی کی چمک سے دل ہے مضطر
ہے خشک نہیں جہاں تلک آب
جب سے ہے شروع فیل باراں
آتا ہے نظر دھنک میں ہر دم

جو چیز ہے وہ ہری ہری ہے
آتی ہے نظر میں خضر فام
عشاق کا بیقرار دل ہے
ہر وقت فلک پہ ابر موجود
پانی پڑتا ہے سو سلا دھار
ہے ابر نقاب روی خورشید
ہے شب کی طرح سے دن بھی کالا
ندی نالے بڑھے ہوئے ہیں
ہر خوف صدائے رعد سنکر
عالم ہے تمام عالم آب
ہیں اہل جہاں بہت ہراساں
ابروئے بت حسین کا ہم خم

اے صل علی عجب مزا ہے
بادل گردوں پہ چھا رہے ہیں
چلتی ہیں ہوا کے ٹھنڈی جھونکے
طوفان کا جہان میں ہے ساماں
لیتا نہیں ابر کھلنے کا نام
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
ساون بھادوں کی ہے اندھیری
ڈھرے ہے لبریز بے سخن ہیں
پڑتا ہے جہاں تسبیح الرعد
ہر سمت ادھر ادھر ہے پانی
کیا حسن شفق پہ دل ہے بسمل
تاریکی ابر چار سو ہے

سبزہ کو سمن لہک رہا ہے
مستانہ روش سے آ رہے ہیں
اٹھتے ہیں چھاتے بادلوں کے
بارش ہے کہ میری چشم گریاں
ہیں بند پڑے جہاں کے کام
جوبن اپنا دکھا رہی ہیں
کالی شب ہجر جیسے میری
جھیلیں تالاب موجزن ہیں
ہے ورد زباں تسبیح الرعد
سڑکوں پہ کمر کمر ہے پانی
ہے شام اودھ کا لطف حاصل
کجلی بن ہے کہ لکھنؤ ہے

لہرتی ہے چمن کی ہر روش پر
اودی اودی گھٹا نے کر دی
انداز نسیم کے نرالے
جو دیکھتا ہے چمن کی نزہت
ساقی مے لالہ گوں پلا دے
جو بات تری ہے وہ نئی ہے
رندوں کا قدم یہاں جو آیا
ہے اوج پہ کیا چمن کا اقبال
پھولوں کی طرف نظر نہیں ہے
گونجی ہیں فضائے آسماں میں
صد برگ کی ہے قبا بسنتی
موسن کی وہ سرسنی قبا تنگ
کیا لکھے قلم گلاب کا حال
جوہی ہے چنبیلی موگرا ہے
بوزرد گلوں کو دیکھ پائے
خوشے انگور کے وہ رنگین
گلچیں کا چمن میں ہے نشیمن
فواری جو چھوٹتے ہیں دن رات
وہ تیز رواں ہیں آبشاریں
مورونکا وہ رقص آفت جاں
دنیا سے ظروف می نرالے
شیشے ہیں تمام بام و در پر
طاقوں پہ چنے ہوئے برابر

معشوق بہار بن سنور کر
مستی بھیگی بتوں کے لب کے
مستانہ وہ بلبلوں کا نالے
آتی ہے نظر خدا کی قدرت
دیوانہ مزاجوں کو علاوے
کیا کچھ گہرے کی چڑھ گئی ہے
انگور کا شوق کھینچ لایا
دیوانی ہے خود بہار امسال
خود اپنی اسے خبر نہیں ہے
ہیں پنبہ بگوش سب حبابیں
دامان نظر جسد السنتی
ہر گل کے لباس کا جدا رنگ
ہر وصف گلاب میں زباں لال
بیلا کیوڑہ مہک رہا ہے
سرسوں آنکھوں میں پھولجائے
جب طرح فلک پہ عقد پروین
پھولوں سے ہرا بھرا ہے دامن
بے فصل کی ہو رہی ہے برسات
تنوں کی بھی کند بنے ہاریں
سنبل جسے دیکھ کر ہوا ساں
کنٹر شیشے سبو پیالے
مینا کا ہے کام بام و در پر
ہر رنگ کے لاجواب کنٹر

جب ابر سیاہ گھر کے آیا
پھولوں کا بہار پر وہ جوبن
بیخوار ادھر اودھر پڑے ہیں
اب حال جنوں جو لکھ رہا ہے
بکا بکا ترا بیاں ہے
دیتا نہیں جام عنبریں بو
پھونچا ہے بہار کا جو مژدا
سوتوں کی روش ہے آتی جاتی
گلشن سے جو لائی ہیں ہوائیں
یوں نکہت گل ہوست پھرتی
لالے کی قبا وہ ارغوانی
نسرین کہیں یاسمن کہیں ہے
دیکھا ہی کرے بشر ہر اک دم
سنبل کے وہ پیچ اور وہ خم
آنکھوں میں کبھی ہے زیر افلاک
نرگس کی اشارے وہ کلو نے
ہم کیا ہیں جو اندنوں ہوش کی
دیتی ہیں بہار روئے گل پر
لیتی ہیں دل و جگر میں چٹکی
ہر سمت کو بادہ کش قدح نوش
خم جام بھری ہیں ساقیوں نے
اللہ ری میکدوں کا عالم
ہر سمت سے رند آ رہے ہیں

موروں نے ستم کا غل مچایا
نرگس کے وہ نیلی نیلی چتون
انگور کی تاک میں کھڑی ہیں
دیوانہ مرا قلم بنا ہے
وحشت تری شکل ہی عیاں ہے
دیوانہ ہوا ہے ساقیا تو
کچھ اور ہی رنگ ہے چمن کا
پھرتی ہے نسیم لڑکھڑاتی
غنچوں کے چٹکنے کی صدائیں
جس طرح چلے کوئی شرابی
چنپا کا لباس زعفرانی
شبو کہیں نسترن کہیں ہے
داؤدی دیکھنے کا عالم
معشوق کی جیسے زلف برہم
سبزے کے بدن کی دھانی پوشاک
وہ ناز گلوں کے بلبلوں سے
سنتا نہیں باغباں خدا کی
بوندیں شبنم کی مثل گوہر
دلکش وہ صدائیں قمریوں کی
بیٹھی پہ پڑی ہوئے ہیں بیہوش
بیخانے سجے ہیں ساقیوں نے
آئینے لگے ہیں قد آدم
زاہد کی نظر جلا رہے ہیں

کچھ مست بہری جھومیں اندر
کچھ رند ذکا ہے ٹاٹ لگا ہے
اس بھیڑ میں کون کسکو پائے
سو نکلے تو دس ہزار آئے

سنجوار سروں کو دھن ترنم
ہر حق کی صدائیں سن رہیں
بیلیں انگور کی ہیں پھیلی
پیچیدہ بنگل زلف لیلی

سایہ انگور کا وہ ٹھنڈا
سنجوار ونکے جگنے اسما جا
کہنا سوالوں کا برابر
ساقی دنیا ہیں تپا کر

جنگل کا عروج پر ہے اقبال
دیوانوں کی بن پڑی ہے سال
صحرا کی فضا غضب دلاویز
موسم یہ بلا کا ہے جنوں خیز

اشجار کا رقص میں وہ آنا
پتوں کا ہوا سے کھڑکھڑانا
اُٹھ اُٹھ کے بگولوں کا وہ گرنا
دیوانوں کی جستجو میں پھرنا

نو دمیدہ پھولوں سے دشت گلشن
وہ بوقلموں گلوں کا جوبن
ہر نخل کی پر ثمر وہ ڈالی
اشجار کی رنگینیں نرالی

اُٹھتے ہیں جو گرد بادا موں
کرتے ہیں طواف قبر مجنوں
کہتا ہے یہ اُٹھ کے ہر بگولا
بور آم میں آیا ڈھاک پھولا

پاڑ ہے آہو چکاری پھیلے
صحرا ملو ہے وحشیوں سے
ساقی وہ ہوا چلی جنوں خیز
دے مجھکو شراب وحشت انگیز

ہاں اپنا کرم مجھے دکھا تو
حاضر ہے یہ جام چشم آہو
اب رخصت ہوش کی یہ دن ہیں
دیوانوں کے جوش کے یہ دن ہیں

اب تر ہے محدث قید خانہ
دیوانے ہیں دشت کو روانہ
دیوانوں کی شکل دیدنی ہے
جنگل جنگل کی رٹ لگی ہے

دن حشر ہیں تو بہار راتیں
مجذوب کی بڑ ہیں انکی باتیں
ٹکڑے ٹکڑے ہیں جیب و داماں
پرزے پرزے ہیں سب گریباں

ثابت نہیں ہم میں قبائیں
دیتے ہیں جنونکو بددعائیں
ہے زیب گلو جو طوق آہن
تسلیم کو جھک رہی ہے گردن

کی سب نے جو ہتکڑی سے بیعت
ہے سامنے دست بستہ وحشت
زنجیر یہ غل مچا رہی ہے
چلئے جنت بلا رہی ہے

ہے ساز صدائے ارغنونی
سب مست ہیں بادۂ جنونی
ہیں سرخ وہ گال گورے گورے
آنکھوں میں ہیں لال لال ڈورے

پی ہے جو شراب جام وحشت
آہو ہیں اسیر دام وحشت
نشہ سے چڑھی ہوئی ہیں آنکھیں
آہو سی بڑی ہوئی ہیں آنکھیں

کیا اوج پہ ہے دماغ سودا
سر پر ہے کلاہ داغ سودا
کچھ نام کا ننگ کا نہیں ہوش
سب کا ہے چراغ عقل خاموش

سب پھرتے ہیں بن بنکے ہیرو
ہاتھوں میں عصائے شاخ آہو
بے عیب لباس ہے بدن میں
عریاں بدنی کا رخت تن میں

بستر بھی زمانے سے نرالا
ایک ایک کے پاس مرگ چھالا
ہے نام سے آدمی کے نفرت
ہر وقت ہے وحشیوں سے صحبت

مٹی کی تمام تن ہے پوشاک
بالوں پہ ہزار من پڑی خاک
آنکھوں میں لگی ہے سرمہ آسا
گرد رہ آہوان صحرا

جنگل آباد اونکے دم سے
آزاد ہیں شادی و الم سے
پائیں مزار کوئی بیٹھا
مجنوں کی لحد کسیکا تکیا

زنجیروں کی ہر طرف کو جھنکار
ہے غور نشور کا نمودار
آفت دیوانے ڈھا رہے ہیں
ہر سمت سے غول آ رہے ہیں

آگے آگے وہ خستہ احوال
پیچھے پیچھے ہجوم اطفال
دیوانوں کو سب ستا رہے ہیں
پتھر لڑکے لگا رہے ہیں

ہے جوش پہ سکہ خون سودا
نعرے ہیں لیتے ہیں خاموشی
پھرتے ہیں جو دھوپ میں وہ پیدل
ہمراہ ہے آبلوں کی چھاگل

دیوانوں میں شامل کیا لگی ہے
دیوانہ ہے کون آدمی ہو
اپنوں کی نہ غیر کی محبت
سب کچھ ہے یہ عشق کی بدولت

جسپر ہوئی اسکی مہربانی
کی اوسکی اجل نے میہمانی
کیا جانئے عشق کیا بلا ہے
اس نوش میں نیش کا مزا ہے

کی جسنے کہ اس سے آشنائی
یہ جان لو اوسکی موت آئی
عاشق جو ہوا خبر کسیکا
دیکھا اُسکو ذلیل و رسوا

گر تجھکو خدا نے عقل بخشی
غافل عقبیٰ سنوار اپنی
تا چند یہ عشق و صحبت عیش
سُن مرد خدا نصیحت عیش

تمت

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ حضرت ثاقب

چلا تھا کوئی جاناں کو جنون عشق رہبر تھا
فدائے رونق آشفتہ دستاری مرا سر تھا

بہارِ دلکشا کرتی تھی کیا کیا گلشن آرائی
تصور میں مرے دن رات خطِ سبز دلبر تھا

ہمارے صبر سے پیدا تھا اک عنوانِ بیتابی
کبھی سر کی بھی لیتا تھا خبر جو ہاتھ دل پر تھا

ہمیں بیتاب رکھتی تھی ہوائے آستاں بوسی
ہماری وحشتِ خاطر کا مقصد کوئے دلبر تھا

تری مستانہ رفتاری سے ظاہر موج دریا تھی
تری ہنگامہ آرائی سے پیدا شورِ محشر تھا

نہیں آئینِ استغنا حریفِ عجزِ مشتاقی
دلِ آئینہ محوِ بیقراریہائے جوہر تھا

ستم اغیار کا سہنا مجھے چنداں نہ تھا مشکل
اُٹھایا میں نے محفل سے مجھے وہ تیر ابرو تھا

شہیدِ انتظارِ جلوہ و دیدار ساقی کو
حریفِ چشم و اگر دیدہ مشتاق ساغر تھا

مصیبت بیکسیہائے شب ہجراں کی کیا کہئے
ہمارے حال پر رونے کو بس اک دیدہ تر تھا

تصور اُس مہ کامل کا تھا کتنا نشاط افزا
مرے سینے کے خمخانے میں اک لبریز ساغر تھا

مزے پائے ہیں کیا کیا رات میں نے خواب راحت کے
مرے آغوش میں اے دوست گویا تیر اخنجر تھا

ابد تک دل رہا وحشت خراب بادۂ الفت
ازل سے میں گرفتار شفیع روز محشر تھا

غزل جناب منشی سید غیور حسین صاحب نسیم بھرت پوری

گھر مرے جبکہ وہ مہمان چلے آتے ہیں
دل میں روٹھے ہوئے ارمان چلے آتے ہیں

دیکھکر آئے ہیں کیا عارض و گیسو اُن کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

اُنکے آتے ہی نکل جاتے ہیں دل سے فوراً
اُن کے جاتے ہی پھر ارمان چلے آتے ہیں

مُڑ کے دیکھو تو سہی اپنے خریداروں کو
تم پہ ہوتے ہوئے قربان چلے آتے ہیں

چار اُنگل کا وہ پرچہ نہیں ہلتے مجھکو
پاس اغیار کے فرمان چلے آتے ہیں

بزم اغیار میں کس شخص نے گستاخی کی
کہ وہ خاموش پشیمان چلے آتے ہیں

کیا بتائیں کہ نسیم آتے ہیں کیوں آپکے گھر
مفت ہو نیکو پشیمان چلے آتے ہیں

غزلیات جناب مولانا شاد خان بہادر

نالہ فرقت میں بے ہر اسس کیا
کچھ فلک کا نہ دل نے پاس کیا

دستِ وحشت کا ہو بھلا یا رب
پُرزے پُرزے مرا لباس کیا

زیست کو اپنی موت سمجھے ہم
موت پر زیست کا قیاس کیا

عقل سے بڑھ گیا جنون اپنا
ہوش نے اور بے حواس کیا

لفظ اُلفت ہے اب نہ درہم داغ
سب کچھ اسے شاد تو نے ناس کیا

(ولہ)

مفر کس شے میں ہے جب خاکساری میں بھی آفت ہے
ہنسے برقِ غضب پر کیوں نہ خوشہ میری خرمن کا

بڑے ناز و نعم سے ناحق دلکو پالا میں نے سینے میں
نہ پیر و شیخ کا نکلا نہ یہ کافر برہمن کا

نمو ہے جسم ظاہر کو یہاں۔ واں جسم باطن کو
اگر سمجھو تو پیری میں بھی ہے عالم لڑکپن کا

نکالے بیٹھ کر کانٹے نہ اپنے پائے زخمی کے
کبھی بھولے سے دل توڑا نہ ہمنے اپنے دشمن کا

خزاں کے ہاتھ سے آسودگی دلکو نہیں ہوتی
ہمیشہ لالہ گوں رہتا ہے گوشہ اپنے دامن کا

تیرے درسے ہمیں دیر و حرم میں کھینچ لیکیوں ہیں
نہ ٹوٹا شیخ کو ہم نے نہ گھر چھینا برہمن کا

کہو بلبل سے جاتی ہے بہار اب تو سنبھل بیٹھے
قریب آیا زمانہ نالہ و فریاد و شیون کا

اسیر عشق بن کر بولنا قمری کا ناحق ہے
مزا جب تھا کہ جب گردن میں ہوتا طوق آہن کا

نظر بازی کا پیر آسماں کی خوف رہتا ہے
کئے رہتا ہوں ساغر پر ہمیشہ سایہ دامن کا

غزل حسرت موہانی

ہم طعنے ہیں ترکِ اُلفت کے
یہ نئی ڈھنگ ہیں شرارت کے

ہو تو قائل ہیں تیری الفت کے
ظلم کر کے مری وفا سے کیوں

وہ بھی ایام تھے قیامت کے
گریۂ بیقرار محرومی

ہو رہے ہیں گلے شکایت کے
ہمتو قائل ہیں تیری الفت کے

مرتے ہیں یہ اشک حسرت کے
یاد شوق گزشتہ کافی ہے

اب نہیں حوصلہ محبت کے
جان ناکامی محبت ہے

اُردوی معلےٰ

یعنی صحیح و فصیح اُردو کا ایک ماہوار اور قابل دید رسالہ جسکے ساتھ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں[1] حجم ۵۲ صفحے کتابی چھپائی کاغذ بغایت پسندیدہ نمونے کا پرچہ ۲ر کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا (۱) رسالہ دواوین علمدہ رسالانہ مع محصول۔ (۲) صرف رسالہ سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) عہ سالانہ (برائے طلبار و غیر مستطیع حضرات) مقاصد ضروری مجلہ دیگر بمقامہ لیکچر و پالیٹکس درخواست خریداری بنام منیجر اُردوی معلےٰ علیگڈھ آجا چاہئے

[1] چنانچہ ۱۹۰۷ء میں (۱) رپورٹ اگرو کنبی کانگرس (۸/) دیوان میر سوز (۲/) اور دیوان قائم چاند پوری شاگرد سودا (۲/) شائع ہوئے اور ۱۹۰۸ء کی ششماہی کے آخر میں دیوان حسرت اسادجرات نذر کیا گیا۔

دیوان غالب طبع ثانی[1]

سفید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے اڈیٹر اُردوی معلےٰ علی گڈھ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم تقریباً ۶ اجزو قیمت مع محصول و خرچ ڈاک صرف عہ

درخواست خریداری بنام۔ منیجر اُردوی معلےٰ علیگڈھ آنا چاہئے فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۴ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

[1] طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کردی گئی ہے اور اشعار کے مطالب میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ جابجا ترمیم بھی کردی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

المشتہر

(منیجر اُردوی معلےٰ علی گڈھ)

ڈی رئیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بھاگلپور کے چند ذی رسوخ رئیسوں نے مندرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہرگز یہ نیت نہیں کہ وہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ منشا اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس دیسی لٹھے کپڑے از قسم لنگی چادر و دھوتی و صافہ و رومال دستی و زنانی لہنگا و ساڑھیاں ہر قسم ہر رنگ کی و تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دھوپ چھاں و سادہ و چھپ و دوڑ یا دبانہ وغیرہ لائق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ بآسانی پہونچائے جاتے ہیں۔

نفاست و پائداری میں یہ خاص بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر خاص و عام پہچان چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمتیں بھی خاص رعایت رکھی گئی ہے کہ نمونہ ہندوستان و بیرون جات مفت بھیجے جاتے ہیں فرمائشیں ذیل کے پتہ سے آنی چاہئیں۔ المشتہر

ڈاکٹر شرافت حسین سکرٹری رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور محلہ تاتارپور

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اُردوی معلےٰ غزلوں کا انتخاب اہل اعتماد اور خوبی سے کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا نسخہ دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع ۱۸×۲۴ حجم ۱۸ اجزو قیمت صرف (۸/) مع ڈاک الخرچ۔ منیجر اُردوی معلےٰ علی گڈھ

تصریح اجرت اشتہار اُردوی معلےٰ

	صفحہ کالم	نصف صفحہ ایک کالم	نصف کالم
[illegible]	[illegible]	عہ/	ے/
[illegible]	عہ	ے/	ے/
[illegible]	ے	ے/	۸/
ایک بار	عا	عہ	فی سطر ۲/

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک ۱۵

چار روپیہ میں بلوی کھڑی اور پینتیس جنس مفت

تاریخ کو جو بنیالی ہمکا بھی ریلوی فیس کی تیسری ہر کی کیوقت میں دوست سوداگر مات کو بیاکاتے تھے لیکن جب ہم نے دنیا دست جالان خود منگا یا اور قیمت ہم نے کشادی کتب اور سوداگر صدت ہو کوت تکلیفیں نکالیں اب اس کے ہمراہ بیت چار جنس مفت دینا شروع کر دیں یہ گھڑی ۱۲ گھنٹے کی کوک کی اصل ۲ آنا ہے سکتے ہیں ہمارے خانہ ریلوی اور تار گھر کے لئے موزوں ہے۔

چھڑا سکو پیارہ فائل کی بازار ۔ بیٹ دار چاند کی کلائی بیٹ ۔ چاندی کی انگشتری کسی کی ۔ چوڑی کی ہری سہری جالدار ۔ ہنڈی ہنڈل کیس نقش گاڑی سائل ۔ اس کلاک روز جالی بازار

کانپور کے ہر قسم کے بونٹ جوتے

چیرا ان سر پر دار وارنش ۔ یہ بونٹ زین لیدر وارنش فی جوڑہ ۔ ۔ ۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اُردوئے مُعلّٰی

علی گڑھ

نمبر ۱ | بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء | جلد ۷

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

(فہرست مضامین)

(۱) تنہا - از حسرت ... ... صفحہ ۱
(۲) مقولات و قائل از مرزا سلطان احمد صاحب - ۹
(۳) اقسام شاعری از شمس العلما مولوی سید امداد امام صاحب اثر - ۱۷
(۴) مکتوبات امیر مینائی - ... ۲۵
(۵) مصاحبت ادبیہ از یلدرم بغداد - .. صفحہ ۲۹
(۶) دارالسلطنت فرانس کی مختصر تاریخ - ۳۱
از لطافت حسین خاں (علیگ) از لندن
(۷) ۱- برسات کی بہار - از عاجز بہاگلپوری
۲- صبح پیری از مولوی مرزا محمد ہادی صاحب
۳- غزلیات -
(۸) نوٹ ۴۹

مقام اشاعت دفتر اُردوئے معلّٰی علیگڈھ

احسن المطابع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول - بلعہ سالانہ
قسم دوم - عہ سالانہ }

اردوی معلیٰ

یعنی صحیح و فصیح اردو کا ماہوار اور قابل دید رسالہ جسکے ساتھ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ حجم ۵۲ صفحے لکھائی چھپائی کاغذ بغایت پسندیدہ مونے کا پرچہ ۱۲ر کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ دواوین للہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) عہ سالانہ (برائے طلباء غیر مستطیع حضرات) مقاصد ضروری بغلہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالیٹکس درخواست خریداری بنام منیجر اردوی معلیٰ علیگڈھ آنا چاہئے

لہ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں (۱) رپورٹ اردو بمبئی کانگریس (۲ر) دیوان میر سوز (۳ر) اور دیوان قائم چاند پوری تا گردسدا (۴ر) شائع ہوئے اور ۱۹۰۴ء کی ششماہی کے آخر میں دیوان حسرت استاد حسرات نذر کیا گیا۔

اردوی معلیٰ جلد پنجم

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع رپورٹ بمبئی کانگریس

قیمت عہ مع محصول۔ دفتر اردوی معلیٰ علی گڈھ سے طلب کرو

اردوی معلیٰ جلد ششم مکمل

از جنوری ۱۹۰۶ء تا جون ۱۹۰۶ء

(قسم دوم قیمت صرف عہ مع محصول)

المشتہر۔ منیجر اردوی معلیٰ علی گڈھ۔

شرح اجرت اشتہار اردوی معلیٰ

	صفحہ	نصف صفحہ یا ایک کالم	نصف کالم
سالانہ	للعہ	عہ ر	سے ر
ششماہی	عہ	سے ر	ہے ر
سہ ماہی	سر	ہے ر	عہ
ایک بار	عار	عہ	فی سطر ۲ر

شملہ

اور اس سلسلۂ کوہستان کے مفصل حالات کتاب لطف کہسار میں نہایت قابلیت سے بکمال محنت و تحقیق لکھے گئے ہیں۔ انگریزی و اردو وغیرہ زبانوں میں ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی۔ خط پاکیزہ۔ کاغذ اعلیٰ چھپائی مطبع رفاہ عام سٹیم پریس لاہور۔

عبارت دلفریب۔ طرز بیان طلسم خیز۔ انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مختصر فہرست مضامین

(۱) مصنف کی پیائد پر تعبیاتی
(۲) اس سلسلہ کوہ کی رجائی کیفیت
(۳) کوہستان اور اُنکے تحقیقی طلعت
(۴) شملہ کا کالکا کالٹ روڈ اور ریلوی
(۵) پہاڑی چھدا ور ہے
(۶) پہاڑی عورات اور اُنکے حالات کا انکشاف
(۷) جنگل اور جانور
(۸) بارش اور برف کے نظارے
(۹) پہاڑی جہازوں کو حالات
(۱۰) شملہ کی سیر

اور دیگر بیسیوں مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ سیر بونکے فوٹو کینیے گئے ہیں قیمت مع محصول ڈاک محض ۱۲ر

اردو ہر گوسنگتا (یعنی مراۃ الغیب) ایکہزار جلد تین سے پچاس جلدیں باقی ہیں قیمت سہ محصول ڈاک عہ ملنے کا پتہ ڈاک خانہ اکالگڈھ ریاست پٹیالہ۔ منشی رائے بھگوت رائے اڈیشنل نائب ناظم۔

دیوان غالب طبع ثانی لہ

سفید کاغذ پر محفوظ چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گذرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اردوی معلیٰ علی گڈھ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم تقریباً ۱۶ جزو قیمت مع محصول و خرچ ویلو صرف عہ ر

درخواست خریداری بنام۔ منیجر اردوی معلیٰ علی گڈھ۔ آنا چاہئے فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۳ تا صفحہ ۲۲ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

لہ طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کردی گئی ہے اور اشعار کے مطالب میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ حاجی رسم بھی کردی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے

المشتہر

(منیجر اردوئے معلیٰ علی گڈھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد عیسیٰ تنہا

(سنہ ۱۱۷۰ھ تا سنہ ۱۲۳۰ھ)

نام و تخلص محمد عیسیٰ نام تنہا تخلص اصل انکی شرفائے دہلی سے تھی۔ اپنے عہد کے دیگر ارباب کمال کے مانند انہوں نے بھی دہلی کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ کی مستقل سکونت اختیار کی اور مصحفی کے اولین شاگردوں میں درجہ امتیاز حاصل کیا۔ یہانتک کہ بعض تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے مطابق امام الشعرا شیخ ناسخ نے بھی کچھ دن ان سے اصلاح لی۔ اس روایت کی صحت میں ہمکو بہت کچھ شبہ ہے لیکن غلط ہونے پر بھی اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں تنہا کا پایۂ استادی معمول سے زیادہ بلند تھا یعنی اسقدر کہ لوگ استادی ناسخ کے فخر کو انکی ذات کے ساتھ منسوب کرسکتے تھے اور کیا بھی۔

اخلاق و عادات خوش خلقی خوش وضعی سلیم الطبعی اور رنگین مزاجی کے اوصاف کے علاوہ قدامت پرستی بھی تنہا کی طبیعت کا خاص رنگ تھا چنانچہ تمام عمر لکھنؤ میں بسر کرنے پر بھی دہلی کی زبان اور قدیم رنگ شاعری پر قائم رہے اور غالباً یہی وجہ ہوئی شاگردان مصحفی میں سے آتش و اسیر و شہیدی کے برخلاف اہل لکھنؤ نے تنہا کے بعد انکا نام عیشی و شعور و مخمور کے نامونکی طرح بالکل فراموش کردیا۔

تصنیفات لیکن دلدادگان انداز ناسخ و اسیر کی ناپسندیدگی سے انکی مشاقی اور استادی میں کوئی نقص نہیں عائد ہوسکتا۔ لاریب جن لوگوں نے کلیات تنہا کا نگاہ انصاف مطالعہ کیا ہے وہ آتش و اسیر کے بعد تنہا کو تمام شاگردان مصحفی سے افضل سمجھنے میں ضرور ہمزبان ہونگے۔ بعہد نواب غازی الدین حیدر سنہ ۱۲۳۲ھ کے لکھے ہوئے کلیات میں ۵۸۰ صفحوں کے ایک دیوان اردو کے علاوہ حسب دستور شعرائے قدیم ایک مختصر دیوان فارسی بھی ہے جسکے بعد کچھ مرثیے اور سلام، ۲۵۰ سے زیادہ رباعیات چند مخمس ایک مسدس اور ایک مختصر سی مثنوی ہے قصیدہ

البتہ کوئی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں یہ امر زیادہ تر تنہا کی بلند حوصلگی پر دلالت کرتا ہے اور ہم اسپر کہ انہیں قصیدہ گوئی کی قابلیت نہ تھی۔

شاگرد و معاصر تنہا کی قدامت پسندی کے سبب سے لکھنؤ میں انکے بہت کم شاگرد ہوئے جسکی وجہ ایک اور بھی ہے یعنی یہ کہ انکا انتقال مصحفی سے دس برس پہلے یعنی ۱۲۳۰ھ میں ہوگیا تھا اور اسطرح پر آتش و اسیر کی طرح انہیں مصحفی کے بعد تشنگان سخن کو سیراب کرنیکا وہ موقع نہ ملسکا تھا جو مصحفی کی موجودگی میں آتش و اسیر کو بھی نہ ملسکا ہوگا۔

تنہا کے سلسلۂ شاعری کا نقشہ

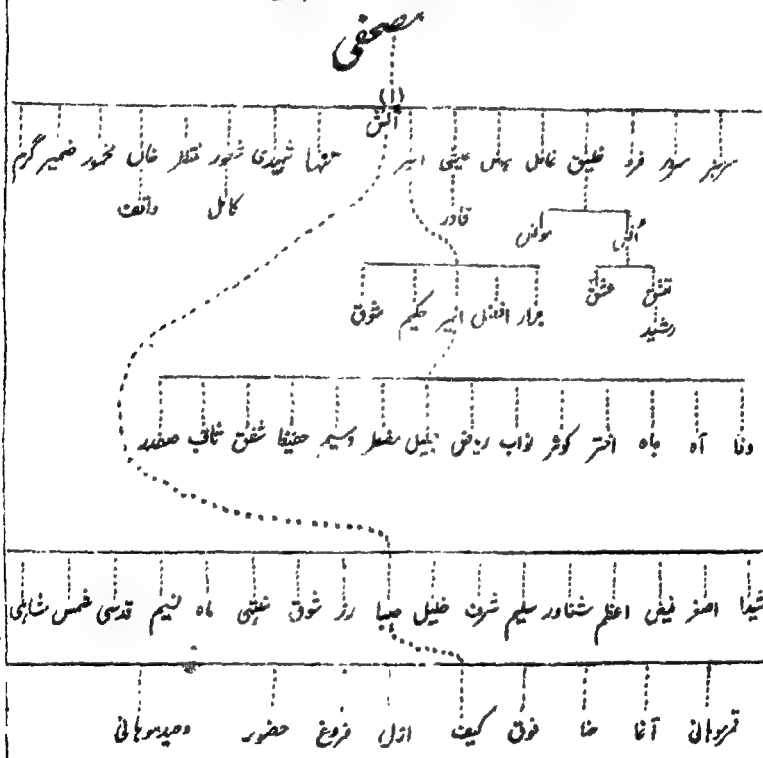

ملاحظہ اس نقشے میں ہر استاد کے شاگرد رشید کا نام درمیان میں اور پھر سلسلہ وار داہنے بائیں یکے بعد دیگرے حسب مرتبہ دیگر شاگردوں کے نام درج ہیں۔

۲ جن شاعروں کے نام اس نقشے میں آئے ہیں انکا مختصر حال بغرض اطلاع ناظرین اسکے بعد کے صفحوں میں درج کر دیا گیا ہے۔

شاگردان مصحفی

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	غیر مطبوعہ	معلوم یا نامعلوم
مصحفی	شیخ غلام ہمدانی اُستاد مشہور امروہوی۔	۱۔ دیوان اُردو ایک دیوان فارسی دو تذکرے	غیر مطبوعہ	معلوم دو دیوان مجموعہ
آتش	خواجہ حیدر علی لکھنوی استاد مشہور۔	۲ دیوان اُردو مشہور	م	معلوم و موجود
اسیر	تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی مظفر علیخاں اسیر	۳ دیوان اُردو مختلف مکتب عروض وغیرہ	-	معلوم و موجود
تنہا	محمد عیسیٰ تنہا دہلوی مقیم لکھنؤ۔	کلیات مشتمل دیوان اُردو و فارسی	غ	معلوم و موجود
عیشی	طالب علیخاں۔ فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔	" " "	غ	" " "
شہیدی	کرامت علیخاں۔ شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی تھی۔	دیوان اُردو مشہور	م	" " "
ہوس	نواب مرزا محمد تقی خاں صاحب مثنوی لیلی مجنوں مشہور	کلیات اُردو	غ	معلوم
شعور	شیخ عبد الرؤف بلگرامی اُستاد علی میاں کامل مرحوم لکھنوی	دیوان اُردو	غ	معلوم
غافل	منور خاں غافل	" "	م	معلوم و موجود
منتظر	نور الاسلام۔ انشا و مصحفی کے جھگڑوں میں بھی یاں حصہ لیتے تھے	" "	غ	نامعلوم بجز چند غزلیات
خلیق	نیر شمس برادر میر حسن صاحب مثنوی مشہور	" "	غ	" " "
خان	محمد اشرف خاں دہلوی اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے	" "	غ	" " "
فرد	محمد وحید الدین خاں کانپوری	" "	م	معلوم و موجود
مخمور	محمد جعفر لکھنوی	" "	غ	نامعلوم بجز چند غزلیات
سرور	شیخ پیر بخش کاکوروی	" "	غ	" " "
ضمیر	میر مظفر حسین لکھنوی مرثیہ گوئے معروف	مجموعہ مراثی و دیوان اُردو	غ	دیوان نامعلوم
سرسبز	مرزا زین العابدین خاں خلف نواب سالار جنگ۔	دیوان اُردو	غ	نامعلوم
گرم	میر حیدر علی دہلوی مصحفی و انشا کی جھگڑوں میں بھی حصہ لیتے تھے	" "	غ	نامعلوم
انس	میر مہر علی خلف و شاگرد خلیق۔	مجموعہ مراثی و غزلیات	غ	معلوم
مونس	میر نواب خلف و شاگرد خلیق مرثیہ گوئے معروف	کلیات مراثی و دیوان اُردو	م	دیوان غیر مطبوعہ معلوم
تعشق	سید مرزا دلدار شاگرد میر انس	دیوان اُردو	غ	معلوم
عشق	سید حسین مرزا " "	" "	غ	"

۹۱ جن شاعروں کی تخلص پر نشان (—) لگا دیا گیا ہے اُنکا مفصل حال علیحدہ لکھا جائیگا۔

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	[illegible]	معلوم یا نامعلوم
رشید	پیارے صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ شاگرد تشنہ	مجموعہ مراثی و دیوان اردو	غ	معلوم
امیر	منشی امیر احمد مرحوم مینائی استاد مشہور	۳ دیوان اردو ایک دیوان فارسی تذکرہ شعرائے رامپور امیر اللغات وغیرہ	م	معلوم و موجود
افضل	خلف و شاگرد اسیر	دیوان اردو	غ	معلوم
حکیم	" "	" "	غ	"
جرار	مرزا حسین بیگ	" "	م	معلوم و موجود
شوق	احمد علی شوق سلمہ اللہ تعالیٰ مثنوی ترانۂ شوق	ترانۂ شوق و دیگر مثنویات	م	" "
جلیل	حافظ جلیل حسن لکھنوی سلمہ اللہ تعالیٰ جانشین امیر مینائی	دیوان اردو	غ	معلوم
ریاض	منشی ریاض احمد خیرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ صاحب مزاج خاص	" "	غ	"
مضطر	افتخار حسین مضطر سلمہ اللہ تعالیٰ استاد نواب صاحب ٹونک	" "	غ	"
نواب	نواب کلب علیخاں بہادر مرحوم والی رامپور	۳ دیوان اردو ۲ دیوان فارسی	م	"
وسیم	محمد عسکری خیرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ ہم چشم لکھنو	دیوان اردو وزیر ترتیب	غ	"
کوثر	حکیم عابد علی خیرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ	" " " "	غ	"
حفیظ	حضرت حفیظ جونپوری سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان اردو	م	معلوم و موجود
اختر	منشی لطیف احمد خلف و شاگرد اسیر سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان اردو وزیر ترتیب	غ	معلوم
شفق	حسن مرتضیٰ سمادپوری سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان اردو	غ	عنقریب طبع ہوگا
جاہ	نواب بنیاد حسین کانپوری سلمہ اللہ تعالیٰ	" "	م	معلوم
ثاقب	مولوی محمد احسن اللہ خاں مدیر رسالہ قند پارسی علیگڈھ نظم و نثر فارسی میں یادگار ارباب کمال ہیں۔	مجموعہ اردو و کلیات فارسی	غ	عنقریب طبع ہوگا
آہ	منشی ممتاز علی سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان زیر ترتیب	غ	نامعلوم
صفدر	نواب صفدر علی خاں مرحوم رامپوری	دیوان اردو	م	معلوم
وفا[1]	مولوی حکیم عبدالہادی خاں رامپوری صاحب انداز خاص	دیوان اردو و مجموعہ فارسی	غ	معلوم

شاگردان اسیر

شاگردان امیر

[1] ان تلامذہ کے علاوہ امیر مرحوم کے اور بھی بہت سے قابل و ذکر شاگرد ہیں مثلاً حسرت شروانی۔ محمد احمد قریشی۔ حکیم بہیم۔ شمیم۔ گستاخ رامپوری۔ ابر رامپوری۔ فضا و جگر وغیرہم۔

	تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	[illegible]	معلوم یا نامعلوم
شاگردان آتش	صبا	میر وزیر علی استاد مشہور۔	کلیات اردو	م	معلوم و موجود
	خلیل	میر دوست علی بڈولوی شاگرد رشید آتش	دیوان اردو	م	" "
	رند	نواب سید محمد خان لکھنوی استاد مشہور	دو دیوان اردو	م	" "
	شرف	میر سادات حسین عرف آغا جو لکھنوی شاگرد رشید آتش	دیوان اردو	م	" "
	شوق	حکیم تصدق حسین عرف نواب مرزا لکھنوی	مجموعہ غزلیات و مثنوی ہزار عشق و غیرہ	م	" "
	سلیم	میر عباس سلیم لکھنوی۔	دیوان اردو	غ	معلوم
	منتہی	مرزا مسیتا بیگ لکھنوی	دیوان اردو	م	معلوم و موجود
	شناور	صاحب مرزا فیض آبادی	" "	غ	معلوم
	ماہ	مرزا عنایت علی ماہ اکبر آبادی برادر مرزا حاتم علی مہر	" "	غ	"
	اعظم	سید اعظم علی الہ آبادی	" "	غ	"
	نسیم	پنڈت دیا شنکر کشمیری صاحب مثنوی گلزار نسیم	مثنوی و دیوان مختصر	م	معلوم و موجود
	فیض	میر احسان علیخان بہادر لکھنوی۔	دیوان اردو	غ	معلوم
	قدسی	سید محمد اکبر دختر زادہ حضرت شاہ اجمل الہ آبادی	دیوان اردو	غ	نامعلوم
	اصغر	نواب اصغر علیخان وزیر بہادر شاہ مرحوم ظفر	دیوان اردو و مثنوی	غ	معلوم
	شمس	مرزا اکبر علی شمس لکھنوی۔	×	×	نامعلوم
	شیدا	نواب محمد حسین خاں لکھنوی	دیوان اردو	غ	"
	شاہی	مرزا نور الدین لکھنوی	" "	غ	معلوم
شاگردان صبا	کیف	شیخ فضل احمد لکھنوی شاگرد رشید صبا	دیوان اردو	م	معلوم و موجود
	فوق	میر دلدار حسن فرخ آبادی۔	" "	م	معلوم
	ازل	مرزا آغا حسن لکھنوی استاد سید نذر الرحمن حفیظ	" "	غ	نامعلوم
	حنا	عظیم آبادی صاحب دیوان عبد الکریم خان لکھنوی	دو دیوان اردو	غ	معلوم و موجود

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	[illegible]	معلوم یا نامعلوم
فروغ	حضرت فروغ لکھنوی شاگرد صبا۔	دیوان اردو	م	معلوم
آغا	آغا حسن لکھنوی	" "	غ	نامعلوم
حضور	محمد عبدالبصیر بلگرامی	" "	غ	معلوم
قمر	قمرالدین حسین خان موہانی	" "	غ	معلوم و موجود
وحید	منشی سرفراز علیخاں موہانی	" "	غ	معلوم

تنہا کی شاعری

تنہا کی شاعری کو بعینہٖ مصحفی کی شاعری سمجھنا چاہیے۔ مصحفی کے کلام کی طرح انکے ہاں بھی ہر رنگ سخن کے نمونے موجود ہیں، دواوین مصحفی کے مانند انکے دیوان میں بھی جابجا قدیم الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا لاجواب ترجمہ نظر افروز ناظرین ہوتا ہے۔ مصحفی کی طرح یہ بھی غلط العوام کو صحیح تسلیم کرکے بے تکلف نظم کر جاتے ہیں۔ غرضکہ ہر صورت سے شاگرد کی سخن سنجی اُستاد کی شاعری کا پرتو ثابت ہوتی ہے چنانچہ اسی خیال سے ہم بھی تذکرۂ مصحفی کے بعد انکی مختلف غزلوں اور بیتوں کو مع چند الفاظ مختصر نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

الفاظ قدیم	ناحق کی رنجشیں اب بھی نکالیاں ہیں بدنام تا ہو تو لے ہمنے تیری خاطر		اس دل نے تیری وضعیں ساری اڑالیاں ہیں بدنامیاں سبھوں کی سر پر اُٹھالیاں ہیں
	ہوویگا کوئی لطف و عنایت کا دوانا مجمع میں پریزادونکے کیا کام ہے میرا		تنہا ہے فقط آپ کی صورت کا دوانا ہوں میں تو گل اندامونکے جمگھٹ کا دوانا
ترجمہ ترکیب فارسی	مذکور لیچلا تھا شب ہمنشیں کسیکا		جی میں خیال گزرا میرے وہیں کسیکا
	لے ہاتھ میں ٹک دامن کو اُٹھا۔ ہے یہی کوئی چلنے کی ادا		خاک اسکی تو یوں برباد نہ دے جو راہ میں تیری خاک ہوا
غلط العوام	سونگھی ہو جسنے بو تیرے جعد سیاہ کی		ہرگز کبھی نہ بُو وہ گل یاسمن کرے
	سو پردے میں نے اسدم اپنا کیا گریباں		دامن جب اسکا تھا بنے اغیار گھر سے نکلا
	ہے دور پواجوں کا غنیمت ہی سمجھئے	۱؎	بنہ جائے جو اس دور میں حرمت سے کسیکی

۱؎ پاجی کی جمع پواج کے بجائے حاشیۂ دیوان پر فضا کا لفظ بھی موعود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا کو انگریزوں سے اتنی ہی بیزاری تھی جتنی مصحفی کو فرنگیوں سے [illegible]

سادگی و درد (میر تقی کا انداز)

تمنو فرماتے ہو کہ گھر جاویں
ہمکو کہدو کہ ہم کدھر جاویں

ہے گند ہے رہنے ہی میں چین اُنکی
بال بکھریں تو جی بکھر جاویں

خانہ آباد چھوڑ تیری گلی
ہم کس اُجڑے ہوئے نگر جاویں

روٹھ کر گردہ آ ملے تنہا
کام بگڑے ہوئے سنور جاویں

اتنی حجت اسے کیا کہتے ہیں
بیمروت اسے کیا کہتے ہیں

چشم تر گور غریباں پہ نہ کی
ابر رحمت اسے کیا کہتے ہیں

تو جو یوں خانہ نشیں ہے تنہا
ننگ جنت اسے کیا کہتے ہیں

مصحفی کا رنگ

اگر شعلہ بنا ہے یہ دل بیتاب آتش کا
دیا ہے ہمارے پاس ہی اسباب آتش کا

وہ میرا شعلہ خو آتش کا پرکالا بھبوکا ہے
کہ جسکو دیکھکر ہوتا ہے دل بیتاب آتش کا

لباس سرخ میں یوں ہے صباحت اسکو پنڈی کی
بدن نکلا ہو گویا پیرہن مہتاب آتش کا

لگا دی آگ ساقی نے لنڈھا کر شیشۂ مے کو
بہایا اُسنے شب محفل میں کیا سیلاب آتش کا

پسینا اسکے روئے آتشیں پہ آنکر دیکھے
نہ دیکھا ہو کبھی جسنے کہ تنہا آب آتش کا

غزل بر غزل جرأت

عجب طرح کی بہار اندنوں کسی پہ ہے
نہ حور میں وہ لطافت ہے نے پری پہ ہے

جو رفتہ رفتہ میں اُس بت سے لگ چلا تو کہا
مزاج آپکا شاید کہ رفتگی پہ ہے

نہ غافل اب ہو بہ ارشاد مصحفی تنہا
بہوش باش کہ عالم روا روی پہ ہے

یاد آتے ہیں پھر ہمکو ایام گرفتاری
پھر جوش جنوں لایا پیغام گرفتاری

ساقی نے دیا تھا جو معلوم نہیں مجھکو
جام مے گلگوں تھا یا جام گرفتاری

کیوں دام و قفس لاوے صیاد اگر سمجھے
صیاد کی الفت ہے خود دام گرفتاری

لے رنج قفس دیکھا نے دام کا غم ہمنے
کہئے تو ہمیں کہئے ناکام گرفتاری

جو ہیں ترے زنداتی، بہتر وہ سمجھتے ہیں
آرام رہائی سے آلام گرفتاری

زلفوں نے تری جوں توں باندھا ہی اسے آخر
ہر چند یہ دل تر پہا ہنگام گرفتاری

جاتا ہے زیارت کو یہ کعبۂ زندان کی
دل نے مرے باندھا ہے احرام گرفتاری

گھبراؤں تو اے تنہا تقدیر یہ کہتی ہے
بیصبر ہو اتنا اے خام گرفتاری

ایدہر بھی کبھی دیکھ تو اے جان تغافل
گھٹ جائیگی اسمیں نہ تری شان تغافل

یہ مقتل عشاق ہے چل بچکے یاں سے
بھر جائے نہ خوں میں زہ دامان تغافل

اک جھٹکے میں ہو جائیے دامن تلک اسکو
ہاتھ آئے اگر اپنے گریبان تغافل

کیا اس سے کہے خاک کوئی حال دل اپنا
رہتا ہو جو نت سر بگریبان تغافل

کر اپنے کرم پر تو نگہ اے ہمہ الطاف
ہر چند گنہگار ہے شایان تغافل

فقط

شوکت نقشی (انداز آسودا)

ہوا خالی جو مستوں کا مے گلرنگ سے شیشہ
تو جھنجھلا کر انہوں نے توڑ ڈالا سنگ سے شیشہ

کل اس مطرب پسر نے بزم میں کی زور بدمستی
لڑا مرنگ کو شیشے سے اور مرنگ سے شیشہ

ہوا جاتا ہے ٹکڑے ٹکڑے دل مجلس نشینوں کا
سناتا ہے صدائے قلقل اس آہنگ سے شیشہ

سفر سے جب کیا عزم وطن ہمکو نظر آیا
کئی منزل سے پیمانہ کئی فرسنگ سے شیشہ

خدا کے واسطے مطرب نہ ہرگز چھیڑنا اسکو
کہ مجھکو یاد آتا ہے صدائے چنگ سے شیشہ

بایں رندی جو تنہا ہم میں بو تقوی کی آتی ہے
ہماری بزم میں آتا نہیں اک ننگ سے شیشہ

سبک نقشی (از مخفی)

رنگوں گر خون دل سے اس گل شاداب کا جوڑا
نہ نکلے باغ امکاں میں اس آب و تاب کا جوڑا

کیا تھا آپکا اقرار تم نے نام کو رات
دکھا ہی راہ غرض خوب اس غلام کو رات

غرض سے دکھا منہ کو چھپا لیتے جو لوگ
قربان میں ان لوگونکے کیا لوگ ہیں وہ لوگ

خوبی ترکیب

نہ طاقتیں دل حرمان شعار میں آئیں
نقاہتیں یہ مرے جسم زار میں آئیں

میں اس میں ہوں متحیر کہ رنجشیں تنہا
کہاں سے خاطر بے رنج یار میں آئیں

ہر برگ گل باغ جہاں نازک ہے
شاخ شجر سرو رواں نازک ہے

اس باغ سے آشیاں اٹھائے بلبل
گل سے بھی دماغ باغباں نازک ہے

شوریدہ لیاقت خانی

زنالہ گرچہ مرا شب زباں بکام نشد
ولے چہ سود کہ کار من انصرام نشد

ہزار بار شب وصل درمیاں آمد
ہنوز قصہ مہجوریم تمام نشد

فدائے روئے تو ہرگز بسوئے ماہ ندید
اسیر زلف تو ہرگز اسیر دام نشد

دریغ عمر دریں حسرتم بسر آمد
میانہ من و او نامہ و پیام نشد

ترحمے بکن اے بیوفا کہ چوں تنہا
کسے بعشق تو رسوائے خاص و عام نشد

مقولات اور قائل

ہم اپنے اردگرد جو کچھ پاتے اور جو کچھ کرتے کراتے اور دیکھتے سنتے ہیں وہ جذب وانجذاب اور فعل وانفعال سے خالی نہیں جو کچھ ہوتا ہوا تا ہے خواہ وہ کسی غرض سے کیا جاوے دوسروں پر اُسکا اچھا بُرا اثر ضرور پڑتا ہے یا یہ کہ دوسرے اُس سے کسی نہ کسی طریق سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ ہمارے اقوال، افعال وخیالات بہتی نہریں ہیں جن کا اثر کنارہ اور کنارہ کی چیزوں اور قوتوں پر لزوماً پڑتا ہے عام اس سے کہ ایسے تاثر اور جذب کا اثر یا نتیجہ فوراً منصۂ ظہور میں آئے یا ایک خاص وقفہ کے بعد ہم ایک کام کرتے ہیں ایک بات کہتے ہیں خواہ اوس کی کچھ ہی غرض ہو اور خواہ اوسکا محل کچھ ہی ہو اُسمیں ایک متعدی تموج اور تضارب ہوتا ہے جسکے زور سے وہ دوسروں پر فوراً یا کسیقدر وقفہ کے بعد موثر ہوتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ سے صرف ایک آواز ہی دوسرے تک نہیں پہنچتی بلکہ اوس کا اثر بھی ساتھ ہی جاتا ہے خوشبو یا بدبو دور ہی سے دماغ اور قوت شامہ پر فوری اثر کرتی ہے فونوگراف اور گراموفون میں آوازوں اور صداؤں کا بند یا ملتصق ہوجانا اور ایک عرصہ کے بعد ہی اُن کا بہ ادنیٰ تغیر معرض سماعت میں آنا اس امر کی زندہ دلیل ہے کہ آوازیں انسانی قلوب اور صفحہ سماعت پر بھی جاکر اسی طرح ملتصق ہوجاتی ہیں اور انسان اُن سے متاثر ہوتا ہے۔

جب ایک آواز نکلتی ہے خواہ وہ کسی جسم سے نکلے تو اُسمیں ایک اثر اور جذب ہوتا ہے اور وہ دوسری ذات پر بذریعہ قوت التصاقی قائم اور منجذب ہوکر ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ایسے التصاق اور انجذاب کے واسطے یہ شرط اور یہ قید نہیں کہ آواز کسی خاص طاقت یا وجود سے سرزد ہو۔ انسان، حیوان، جمادات، نباتات، پتھر اور کنکر وغیرہ وغیرہ ہر وجود کی ضرب اور صدا اپنی ذات میں ایک اثر اور ایک صدمہ رکھتی ہے۔ ایک اینٹ پر اینٹ مارو تو اُس سے بھی ایک صدا نکلیگی اور اوسکا

اثر دوسروں پر ہوگا ایک ٹھوکر کی آواز سے بھی وہی اثر ہوتا ہے جو ایک جاندار کی صدا سے عموماً ہوا کرتا ہے۔ یہ دوسری بحث ہے کہ بعض صدائیں اور بعض آوازیں مطلب خیز ہوتی ہیں اور بعض کا مطلب کچھ نہیں ہوتا۔

جب ایک آواز نکلتی اور سنائی دیتی ہے تو سننے والا یا سننے والے سب سے پہلے اُس آواز پر کان دھرتے ہیں اور صرف وہ آواز ہی اُن تک پہنچتی اور اُن پر اثر کرتی ہے۔ آواز دینے والے کی شکل کا ارتسام نہیں ہوتا بلکہ آوازِ نازلہ صفحہ سماعت پر مرتسم ہو کر کسی نہ کسی نتیجہ یا خیال کی باعث ہوتی ہے۔ اگر پسِ دیوار سے ایک صدا آئے اور ہمارے کان اُس سے آشنا ہوں تو ہم سب سے پہلے اسکی کچھ ضرورت نہیں دیکھتے کہ اوسکے قایل کی تخصیص کریں بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسکا سبب کیا ہے اور وہ کیا کچھ مفہوم رکھتی ہے۔ مطلب اور مفہوم کی بحث کے بعد ہم آواز دینے والے کیطرف جاتے ہیں گویا یہ دوسرا درجہ ہوتا ہے۔

ریلوے، دفاتر اور سکولوں میں جب کبھی وقت مقررہ پر کوئی گھنٹی بجاتا ہے تو ہم کبھی یہ نہیں بحث کرتے کہ کس نے بجائی بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ کیوں بجی یا کیوں بجائی گئی۔

جب ہم ایک خوش آئند آواز سنتے ہیں تو سب سے پہلے آواز دینے والے یا گانے والے کی خوش گلوئی یا خوش الحانی اثر کرتی ہے نہ کہ آواز دینے والا یا گانے والا۔ بہت سی خوش گلو جانور اور مغنی بدصورت اور بدسیر ہوتے ہیں لیکن اُن کی آوازیں ایک فوری اور کشش کرنے والی لئے ہوتی ہے۔ اوسکی شکل و شباہت سامعین کی توجہ اور رجوع کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اوسکی خوش گلوئی اور خوش آوازی۔ فونوگراف اور گراموفون، پیتل تانبے، لوہے اور ٹن کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اُنمیں سے جو صدائیں اور جو آوازیں نکلتی ہیں وہ گو اصل صداؤں کا پرتو ہی ہوتی ہیں مگر اُن میں بھی ایک فوری اثر ہوتا ہے۔

سننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ فونوگراف یا گراموفون سے ایک آواز نکل رہی ہے بلکہ یہ کہ وہ آواز کیسی سُریلی اور کیسی پیاری یا عجیب ہے۔

ان واقعات اور طریق اثر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب سے پہلے۔

"مقولات ہی موثر ہوتے ہیں"

"مقولات ہی پر نظر ہوتی ہے۔"

"مقولات ہی صفحۂ سماعت پر مرتسم ہوتے ہیں"

"مقولات ہی سے غرض ہوتی ہے"

"مقولات ہی سے نتائج پیدا ہوتے ہیں"

مقولات کے بعد قایلین پر نظر پڑتی ہے اور اسمیں ایک مقولہ یا مقولہ کا مفہوم مقدم رکھکر قایل کی تعظیم یا توقیر کی جاتی ہے۔ قایل کی تعظیم اور وقعت اپنے مقولات کے اعتبار سے کی جاتی ہے نہ کہ مقولات کی وقعت قایل کی وقعت سے۔ گھنٹے اور گھڑی کی صدا یا ٹک ٹک اس لحاظ سے باوقعت نہیں ہوتی کہ اوسکا بجانے یا بنانے والا ایک انسان ہے بلکہ اس بہت سے کہ اُس صدا یا ٹک ٹک سے ایک ضرورت یا وقت کا استدلال ہوتا ہے اور ایک خاص موقعت آرزو پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر ایک اچھا قایل بُرا قول کہے اور اوسکے مُنہ سے ایک بُری آواز نکلے تو یہی کہا جائیگا کہ بہت بُری اور بہت منحوس آواز نکلی ہے۔ اگر ایک بُرا قایل ایک اچھا قول اور اچھی بات کرے تو یہی کہا جائیگا کہ ایک اچھی اور ایک سودمند بات کہی گئی ہے۔

ایک اچھا فعل بُرے اور بدنام فاعل کی بھی تعظیم کراتا ہے لیکن ایک بُرا فعل ایک اچھے فاعل کی بھی مذمت اور توہین کراتا ہے اگر ایک بزرگ منشی جھوٹ بولے یا جھوٹ کہے تو یہ کبھی نہ کہا جائیگا کہ اوسکا جھوٹ بولنا اسکی بزرگ منشی کے۔ جھوٹ نہیں ہے۔ ایک چور ڈاکو اگر دان کو دان کہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بوجہ اوسکے چور اور ڈاکو ہونیکے اُس سے انکار کیا جاوے۔

اگر ایک گلی ظرف یا مٹی کے صندوق میں سے سونا اور چاندی نکلتی ہے تو باوجود اسکے کہ وہ ایک گلی ظرف یا ایک مٹی کے صندوق میں سے نکلی ہے چاندی اور سونا ہی ہوگا اور ایک چاندی یا سونے کے بکس میں مٹی نکلتی ہے تو وہ مٹی ہی ہوگی۔ سونا

یا چاندی کے نلکے میں سے دریا اور کنوئیں کا پانی اپنی اپنی حیثیت اور کیفیت ہی میں نکلیگا۔ یہ نہیں کہا جائیگا کہ دریا کا پانی کنوئیں کا ہو جائیگا اور کنوئیں کا دریائی - آواز دینے والا ایک قالب ہے۔ قالب میں جو کچھ ڈالا جاوے گا وہی نکلیگا۔ خواہ قالب مٹی کا ہو اور خواہ کسی دھات کا۔ جن لفظوں میں گفتگو کی جاتی ہے، وہی لفظ آواز کی صورت میں مرتسم ہوتے ہیں اُن کے بدل میں اور الفاظ نہ آسکتے ہیں۔

لوگ ان تمام قاعدوں کے پابند ہیں اور اُسکی پابندی ضروری سمجھتے ہیں لیکن بعض اوقات باوجود سمجھنے کے بھی اس پابندی سے باہر ہو جاتے ہیں۔ معقولات کی تعظیم یا اُن کا اخذ قابلیت کے اعتبار پر کرتے ہیں خواہ کوئی مقولہ کیسا ہی منور اور سورسند ہو صرف اس وجہ سے اوس سے انحراف کیا جاتا ہے کہ۔

"اُس کا قابل یا مظہر فلاں ہے"

"وہ فلاں کے مُنہ سے نکلا ہے"

"اُسکی فلاں شخص تصدیق یا تائید کرتا ہے"

"اوسکی فلاں تائید یا تصدیق نہیں کرتا"

"وہ فلاں کے مقولات میں سے ہے"

یہ طریق عمل یا طریق اخذ بحث حقیقت کے منافی ہے گو اس سے ایک ضد یا ایک جیسے تو پوری ہو جاتی ہے لیکن حقائق الامور پر ایک حجاب آجاتا ہے اور اس اصول کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ۔

"حقایق بذاتہ کچھ قیمت نہیں رکھتے ہیں"

"بذاتہ اُنکی کوئی وقعت نہیں ہے"

"بذاتہ اُن کی کوئی حقیقت نہیں"

"مٹی ایک طلائی ظرف میں طلا بن سکتی ہے اور طلا ایک گلی ظرف میں گل ہو جاتا ہے تو ہا پانی میں پانی ہو جاتا ہے اور پانی لوہے کے برتن میں لوہا ہو جاتا ہے"

اگر یہ اصول اور یہ قلب ماہیت درست ہے تو بے شک یہ کہا جاوے گا کہ:-

"قول یا فعل کو اعتبار قایل یا فاعل کے اعتبار[1] پر موقوف ہے اور اگر یہ قیاس درست نہیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا۔

جب انسان ایک جائز طریقہ اور جائز معیار سے دور جا پڑتا ہے تو ہمیشہ ایک انقلاب اور خرابی پیدا ہونے لگتی ہے۔ حقائق کا انکشاف اُسی صورت میں بروقت اور مجرب ہوتا ہے جب وہ اپنے اصلی محور پر رکھے جائیں۔ اور حقیقتیں اصلی محور پر اُسی صورت میں رہ سکتی ہیں جب اون کا اخذ محض اُنکی ذاتی خوبی کی وجہ سے ہو نہ کہ نسبتی معیار سے۔ بے شک دنیا اور خیالات میں تضاد اور اختلاف ہے اور کلیتاً دور ہی نہیں ہو سکتا لیکن اگر نسبتی معیار عموماً ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔

دنیا کی اکثر محققانہ لڑائیوں اور اختلافوں کا موجب یہی نسبتی معیار ہوتا ہے اور اسی سے اکثر برائیوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ لوگ اپنی دُھن میں لگے جاتے ہیں اور حقائق کا محو ہوتا رہتا ہے۔

دراصل یہاں بہت سے لوگ چونہ گچ مزاروں یا مقبروں کی پوجا کرتے ہیں اور اُن راستوں سے گزرتے ہیں جو بظاہر صاف اور سیدھے ہوتے ہیں اگرچہ اُن میں بڑے سے بڑے مُردے ہی کیوں نہ مدفون ہوں اور وہ راہیں کسی صحرا اور لق و دق جنگل ہی میں کیوں نہ جاتی رہی ہوں۔ بعض لوگ ہمیشہ اسکے خواہاں رہتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی یا موقر شخص کی باتوں کی خواہ مخواہ تعریف اور مدح ثنا کریں خواہ اُن باتوں میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ بعض لوگ اسی واسطے بعض صحیح اور سودمند مقولوں سے پرہیز اور نفرت کرتے ہیں کہ اُن کا قایل یا گوینده کوئی مشہور شخص نہیں ہے۔ بعض لوگ بعض باتوں اور بعض مقولات کی اسیواسطے تردید اور تکذیب کرتے ہیں کہ اُن

[1] بے شک ایک اچھا قول اور ایک فعل اچھے قایل اور اچھے فاعل کی وجہ سے زیادہ تر روشن اور زیادہ تر موقر ہو جاتا ہے اور اوسکی وقعت اور بھی وزنی ہو جاتی ہے لیکن اس زاید روشنی سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی۔

"تمہارا قول یا تمہارا فعل اچھے قایل یا اچھے فاعل کی وجہ سے اچھا اور سودمند ہو سکتا ہے"۔ ۱۲

ماخذ اُن کا غیر ہے یا یہ کہ وہ اُن کی جماعت میں سے نہیں ہے۔ بعض لوگ ایک قول اور فعل کی اول تصدیق کرتے ہیں اور اوسکی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں لیکن جب اوسکے قایل کو معلوم کرتے ہیں تو پھر اُنہیں اُسی قول یا اُسی فعل سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اُنکی پہلی تعریف اور تصدیق صرف اسی وجہ سے اُڑجاتی ہے کہ اُسکا گوئندہ اُنکی جماعت کے خلاف نکلا ہے۔

ایک شخص ایک مقولہ یا ایک حقیقت کی برابر تصدیق کرتا گیا اور بڑے زور شور سے اُسکی تائید دلائل سے کرتا رہا لیکن جب اُسے اوسکے گوئندہ کا نام معلوم ہوا تو اوس نے جلد باز شرم کے ساتھ فوراً ہی تقریر کا رُخ پلٹ دیا گیا اور زور سے کہنے لگا کہ باوجود ان دلائل کے بھی اسی میں نقص ہیں چیف کورٹ پنجاب میں ایک دفعہ ایک مشہور وکیل برائے مدعی، اپنے موکل کی غلطی یا جلد بازی سے مدعا علیہ کے حق میں تقریر کرتا رہا یہاں تک کہ ججان چیف کورٹ پر بھی اوسکی استدلال اور دلائل قانونی یا واقعاتی کا اثر ہوا۔ لیکن یاد دلائے جانے پر وکیل صاحب چونکتے ہوئے اور اس خوبی سے یہ کہکر رُخ بدلا کہ یہ سب دلائل اور وجوہ جو مدعا علیہ اور اُسکا وکیل اپنے حق میں کہنے کو تھے میں خود ہی بیان کرکے اُن کی یوں تردید کرتا ہوں۔

یہ ہیں نسبتی معیار کی غلطیاں اور جلد بازیاں اگر وکیل خبردار نکیا جاتا تو تمام مواد مدعا علیہ ہی کے حق میں پیش کیا گیا تھا۔

چونکہ براہین اور دلائل کی حکومت ہر واقعہ اور ہر کیفیت پر مسلمہ ہے خواہ وہ واقعہ اور کیفیت بذاتہ کسی ہی کیوں نہو، اسیواسطے دلائل کی آڑ میں ہر قول اور ہر فعل پر نسبتی معیار کے اعتبار بحث کی جاسکتی ہے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ :-

"دُنیا کی حقیقتیں ہمپر صحت سے منکشف ہوں"

"اُن میں کوئی مزاحمت نہ ہو"

"اُن میں کوئی التباس نہ رہے"

تو ہمارا فرض ہے کہ۔

"ہم سب سے پہلے کسی قول اور فعل پر بحث کریں"

"قول اور فعل کو دیکھیں"

"قول اور فعل کا موازنہ کریں"

یہ نہ دیکھیں کہ اوسکا قایل یا فاعل کون ہے یا کس حیثیت کا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات ایک جاہل بھی صحیح معنوں میں گفتگو کرتا ہے۔ بہ مصداق۔ ؎

گاہ باشد کہ کودکے نادان	بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اُسکے استدلال کا ماخذ موجہ اور سلیم ہوتا ہے۔ خلاف اسکے بعض وقت ایک حکیم سے بھی صریح غلطی ہو جاتی ہے۔ ایک حکیم کے غلط استدلال کا صرف اسوجہ سے تسلیم کر لینا کہ وہ ایک حکیم کی طبیعت سے نکلا ہے حق پرستی کے خلاف ہے۔

کیا کوئی حکیم اور کوئی ہمارا غیر یا دشمن کبھی کوئی غلطی نہیں کر سکتا یا اوسکا کوئی قول اور کوئی تحقیق صحیح معیار کے مطابق نہیں آسکتی۔ غیریت، عداوت، مناقشت، دوستی، دشمنی کچھ اور ہے اور اقوال یا افعال سلیمہ یا قبیحہ کا صدور کچھ اور۔ اختلاف خیالات یا اختلاف ماخذ سے حقائق اور صداقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ آفتاب کی کرنیں خشکی اور دریا پر یکساں پڑتی اور یکساں ہی نکلتی ہیں۔ دو دشمن اور دو دوست باوجود اس رشتہ دوستی اور دشمنی کے تحقیق کے مشاق اور عادل رہتے ہیں اور اُن دونوں پر فیضان حقائق اور واقعات کا برابر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی عداوت اور کوئی اختلاف اس فیضان کا مزاحم اور مانع نہیں ہوتا اور نہ کوئی دشمنی اور کوئی دوستی ہی خلل انداز ہوتی ہے۔ زید اور بکر کی شخصیت ہمیشہ بطور خود کام کرتی رہتی ہے اگرچہ زید کے بشرہ اور چہرہ میں کوئی فرق یا کوئی نقص ہو لیکن اوسکی صداقتوں اور حقیقتوں میں کوئی نقص یا کوئی خوبی خواہ نخواہ باعتبار جسمانی خوبیوں اور نقصوں کے حائل نہیں ہو سکتی۔ زید مومن ہے، زید کافر ہے، زید بد معاش ہے، زید نیک معاش ہے۔ زید داڑھی رکھتا ہے، زید داڑھی منڈواتا ہے، زید دیسی لباس رکھتا ہے

زید انگریزی فیشن میں ہے، زید انگریزی خواں ہے۔ زید سنسکرت اور عربی داں ہے۔ زید ایشیا یا ہندوستان میں رہتا ہے، زید لنڈن اور برلن یا پیرس میں سکونت پذیر ہے۔ باوجود ان سب اختلافات کے زید کی چھوٹی بات چھوٹی اور اچھی بات اچھی ہے۔ نیکی نیکی ہوگی اور بدی بدی۔

زید چور اور ڈاکو ہو کر اگر کسی کو روٹی اور دودھ دے تو وہ روٹی اور دودھ ہی ہوگا۔ یہ نہیں کہ زید کی چوری اور ڈاکا روٹی اور دودھ کو پتھر یا آب حنظل بنا دیگا اسی طرح ایک عابد نماز گزار آب حنظل اور پتھر دیکر روٹی اور دودھ کا ثواب حاصل نہیں کرسکتا۔

ہاں اتنا ضرور فرق ہوگا کہ۔

"چور ڈاکو ہونے کی حالت میں یہ کہا جائیگا کہ بکر نے زید چور یا ڈاکو سے روٹی اور دودھ لیا یا ایک عابد اور نیک بخت سے"

بے شک یہ ایک تمیز ہوگی مگر اس سے یہ کیونکر لازم آگیا کہ روٹی روٹی نہ رہی یا دودھ دودھ نہ رہا۔

خذ ما صفا ودع ما کدر کا پرانا مقولہ جس میں ایک قیمتی فلسفہ مودع ہے اسپر ایک پوری روشنی ڈالتا ہے کہ قبول یا اخذ حقائق میں کس اصول پر چلنا چاہئے اور وہ کون طریقہ ہے جس سے دنیا کی حقیقتیں بے غل وغش ملتی ہیں اور جس سے دنیا کا انتظام خوبی اور عمدگی سے چلنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

خذ ما صفا اور دع ما کدر پر ہمیشہ عمل رکھو۔

ہمیشہ مقولات پر نظر رکھو قائل کی تخصیص سے اخذ حقائق میں ابتری نہ ڈالو۔ بات اچھی ہو۔ ہمیں اس سے کیا کہ اسکا قائل کون اور کیا ہے۔ جو چیز اور جو خیال اچھا ہے وہ لے لو۔ موتی کیچڑ میں ہو کر بھی موتی ہی رہتا ہے۔ فقط

(سلطان احمد۔ میاں والی پنجاب)

سگھڑ بیٹی | یعنی کنواری بچیوں کی سہیلی۔ از اڈیٹر صاحب اخبار تہذیب نسواں جسکے مضامین لڑکیوں کے لئے بغایت مفید ہیں۔
۱۸×۲۲ کی تقطیع پر اچھی چھپی ہوئی ہے اور منیجر تہذیب نسواں لاہور سے بقیمت عہ ملکتی ہے

بعض اقسام شاعری

از مولوی سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی

جاننا چاہئے کہ شاعریوں سے ایک قسم شاعری کی ہے جسکو لیرکس (Lyrics) کہتے ہیں اس قسم کو فارسی اور اردو کی غزل سرائی سے ایک گونہ مناسبت ہے بلکہ درحقیقت جو تقاضا اہل یورپ کے لیرکس کا ہے وہی ہملوگوں کی غزل سرای اور تمام دنیا کی اُس شاعری کا ہے جسکے لگاؤ میں سرائیدن کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال جاننا چاہئے کہ لیرکس کا تقاضا یہ ہے کہ اسمیں ایسے مضامین داخل رہیں کہ جو داخلی یعنی سبجکٹو (Subjective) انداز رکھتے ہیں اور اگر خارجی (Objective) رنگ رکھتے بھی ہوں تو داخلی انداز سے آمیزش پائے ہوں اگر لیرکس میں شاعر اس آمیزش کیساتھ خارجی مضامین کو حوالہ قلم نکرے گا تو اوسکا کلام بے مزہ ہوگا یہی سبب ہے کہ بعض فارسی اور اردو شعرا کی غزل سرائی مطبوع نہیں معلوم ہوتی ہے ایسے غزل سراؤں نے برخلاف تقاضائے غزل سرای مضامین خارجی کو بلا آمیزش رنگ داخلی اپنے کلام میں جگہہ دی ہے جسکے سبب سے اُن کی اکثر غزلیں روکھی سوکھی درد سے خالی بے اثر اور محض بے کیف معلوم ہوتی ہیں۔ لیرکس اور غزل سرائی کے لئے ضرور ہے کہ واردات قلبیہ اور پُرتاثیر امور ذہنیہ حوالہ قلم کئے جائیں اسطرح کی شاعری کے لئے شاعر کو اپنا عالم درونی کافی ہوتا ہے اُسے کوئی حاجت نہیں ہے کہ اپنے احاطۂ ذہنیہ سے باہر جائے۔ اُسکا ذہن ہی اوسکی دنیا ہوتا ہے اُسیکے اندر وہ سب کچھہ دیکھتا ہے اور جو کچھہ دل کی آنکھہ سے دیکھتا ہے اُسے حوالہ قلم کرتا ہے جتنے اوسکے کلام ہوتے ہیں اُسکے واسطے کلیات کا حکم رکھتے ہیں گو اُسکے وہ کلام کلیات کے طور پر دیگر افراد انسانی کے امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پر بھی صادق آئیں بالمختصر لیرکس یا غزل سرائی کو عالم خارج سے بہت کم تعلق ہے اسکی شاعری شخصی انداز رکھتی ہے یعنی جو کچھہ شاعر پر گزرتی ہے یا جو کچھہ اوسکی واردات قلبیہ ہوتی ہیں اُنہیں کو قلمبند کرتا ہے

بعض شاعری مشتمل بر لیرکس یعنی غزل سرائی

اور شروع سے آخر تک اُسکا کام یہ ہے کہ خود سرائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور جو کچھ موزوں کرے اُسمیں اپنے کو نہ بھولے اپنے شخص پر غیر شخص کو قایم نکرے ورنہ اُسکا کلام بے تاثیر ہوگا اسی صلاحیت کی بدولت حافظ خواجہ میر درد میر تقی مومن اور غالب کے کلام اسقدر پُر تاثیر دیکھے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے اپنی ذاتی واردات قلبیہ کو تحریر نکیا ہوتا تو اُنکے کلام میں اسقدر مقبولیت نہ ہوتی۔ ان شعرا کا ایک ایک مصرع بول اُٹھتا ہے کہ میں حافظ ہوں۔ میں درد ہوں۔ میں میر ہوں۔ میں مومن ہوں۔ میں غالب ہوں۔ فطرت نے اُن کو اور اُنکے ایسے شعرا کو غزل گو بنانے کے وقت اُنکے کانوں میں غزل گوئی کا گراں انطول میں سکھا دیا تھا کہ غزل سرائی کا دوسرا نام خود سرائی ہے برخلاف اسکے رزمی شاعری یعنی ایک (ہیرو) سے کہ جسمیں شاعری کو اپنی ذاتی حیثیت سے بہت کنارے ہونا پڑتا ہے اور کلیات سے جزئیات کیطرف رجوع لانا پڑتا ہے۔ جملہ ایشیائی اہل اسلام میں یہ شاعری بیشتر مثنوی کی شکل میں دیکھی جاتی ہے جیسے شاہنامہ فردوسی سکندر نامہ نظامی حیدری وغیرہ یا مراثی کی صورت میں جیسے بنات مراثی میر انیس و مرزا دبیر اعلی الت مقامات الخ۔ بہرحال ایک شاعری میں شاعر کو جسقدر مضامین عالم خارج سے لینا ہوتے ہیں اسیقدر اُسکے عالم درونی سے بھی اختیار کرنا پڑتا ہے پھر دونوں کی آمیزش بھی اُسے کرنا ہوتی ہے تخلیق افراد انسانی کے جیسے شخصی تقاضے ہوتے ہیں اُنہیں ملحوظ رکھنا رزمی شاعر کا کام ہے۔ رزمی شاعری اسی کی متقاضی ہوتی ہے کہ شاعر خود کو جہاں تک ممکن ہو بھول جائے اور اپنے شخص پر غیر اشخاص کو قایم کرے جیسا کہ ہومیروس نے ایلیڈ میں تمام تر اپنے کو اپنی ذاتی حیثیت سے کنارے کیا ہے اور جتنے اشخاص کا ذکر کیا ہے اُنکے جزئی اور مختص حالات درونی و بیرونی کو قلمبند کیا ہے یعنی ہر شخص کی تصویر جیسی درکار تھی کھینچی ہے مثلاً اگر اکلیز کو بیان کیا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکلیز ایک شخص محض علیحدہ انداز کا یولیسس وغیرہ سے ہے۔ اور جہاں ہلن کو بیان کیا ہے تو وہ انڈرومیکی سے بالکل ایک جدا انداز کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طور پر ہر خاص شخص کے خاص معاملات کو اس طور پر

تقاضا رزمی شاعری

دکھلایا ہے کہ وہ معاملات خواہ درونی اور خواہ بیرونی ہوں سوا ایک شخص خاص کے دوسرے
شخص پر صادق نہیں آتے ہیں اس طرز بیان کو کیرکٹر نگاری کہتے ہیں کیرکٹر
زبان انگریزی میں ایسے طور اطوار کو کہتے ہیں جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممیز
کرا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہی کیرکٹر نگاری ہے جسنے میر انیس کی شاعری کو بجد
ممتاز بنا رکھا ہے یہی کیرکٹر نگاری ہے کہ جس نے بالمکی اور بیاس کو مشہور عالم کیا ہے اور
یہی کیرکٹر نگاری ہے کہ جسکی عدم موجودگی سے فردوسی کی شاعری ہومیروس ورجل ملٹن
بیاس بالمکی اور میر انیس کی شاعری کو نہیں پہونچتی ہے۔

واضح ہو کہ ہومیروس کی کیرکٹر نگاری اسدرجہ کی نظر آتی ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کی
ڈراما نگاری کے لئے درکار ہے ڈراما (Drama) بزبان انگریزی ناٹک کو
کہتے ہیں یہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی شاعری ہے رزمی شاعری اور ڈرامے کی شاعری
میں فرق یہی ہے کہ رزمی شاعری سے زیادہ ڈرامے کی شاعری میں جزئیات معاملات
انسانی کا لحاظ رکھنا درکار ہوتا ہے اور افراد انسانی جو کسی ڈرامے سے متعلق
ہوتے ہیں اونکے پورے کیرکٹر کو اُنکے ہر جزوی افعال و اقوال کے مطابقت
کیساتھ حوالہ قلم کرنا ہوتا ہے علاوہ اسکے رزمی شاعری میں شاعر کسی قصہ کو بسبیل نقل
حکایت بیان کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اُس قصہ کے افراد انسانی کے
کیرکٹروں کو ملحوظ رکھکر اپنے بیان کو جلوہ دیتا ہے۔ ڈرامے میں وہی قصہ بسبیل نقل
حکایت نہیں بیان ہوتا ہے بلکہ وہی افراد انسانی جو اُس قصہ سے متعلق رہتے
ہیں تا وسعت تعلق ذاتی اپنے اقوال و افعال سے اُس قصہ کو خود بیان کرتے ہیں
قوت تخیل سے شاعر اپنے کو ہر فرد کا قائم مقام بناتا ہے اور جیسے وہ افراد ہوتے ہیں
ویسا ہی اپنے کو قولاً و فعلاً دکھلاتا ہے۔

غرض ڈراما یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم نصیب ہو وعظ و موعظت سے بھی
وہ کام نہیں نکل سکتا ہے جو اس شاعری سے ظہور میں آسکتا ہے۔ شاعر ڈراما نگار کا
یہ کام ہے کہ کسی ممتاز قصہ حکایت یا واقعہ کو اس طرح بیان کرے جیسا کہ فطرت اُسکے

ڈراما

غرض ڈراما

بیان کی متقاضی ہے تاکہ اُسکے بیان سے معاملات عالم کا فطری انداز ہویدا ہوسکے۔
ڈراما منتہائے شاعری ہے اور کوئی شخص ڈرامانگار نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ جزئیات
معاملات دنیا سے فطری اصول کے ساتھ باخبر نہو ڈرامے کے لئے قصہ یا حکایت
یا واقعہ کا اسقدر اہم ہونا ضرور ہے کہ وہ معمولی حیثیت کے معاملات سے ارفع ہو اور
خاتمہ اُسکا کوئی نتیجہ معقول جو خواہ مسرت خیز اور خواہ الم انگیز ہو پیدا کرسکے۔ جو ڈراما مسرت
خیز نتیجہ پیدا کرتا ہے اُسے بزبان انگریزی کامیڈی (Comedy) کہتے ہیں اسکی مثال
شیکسپیر کا وہ پلے (Play) ہے جسکا نام کامیڈی آف ایررس (Comedy of Errors)
ہے۔ پلے بزبان انگریزی ایک ایسے پورے قصہ کو کہتے ہیں جو بشکل
ڈراما لکھا گیا ہو۔ اس خاص پلے کا خاتمہ مسرت و انبساط پر ہوا ہے لیکن وہ ڈراما جسکا نتیجہ
الم انگیز ہو اُسے بزبان انگریزی ٹریجیڈی (Tragedy) کہتے ہیں اسکی مثال شیکسپیر
کا وہ پلے ہے جسکا نام ہیملٹ ہے چونکہ زبان عربی و فارسی میں ڈرامانگاری نہیں دیکھی جاتی
ہے اسواسطے کوئی مثال کسی پلے کی پیش نہیں کیجاسکتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ صنف شاعری
ایشیائی مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی ہے علاوہ افسوس کے بہت جائے تعجب ہے
کہ اہل اسلام نے یونان کے تمام علوم و فنون کو اختیار کیا مگر اُن کی شاعری کیطرف توجہ
نہیں کی اگر کرتے تو ضرور یونانی ڈرامانگاروں کے طریقہ شاعری کو اختیار کرتے۔ اس عدم توجہ
کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اپنے کو معاملہ شاعری میں کسی قوم سے کم نہیں سمجھتے
تھے اسواسطے غیر قوم سے اکتساب شاعری کو بیکار جانا یا یہ کہ چونکہ اہل اسلام اہل یونان کے
مذاق بت پرستی سے بہت دور تھے اور اہل یونان کی شاعریاں اس مذاق سے مملو تھیں
اُنہوں نے یونانی شاعری کی طرف توجہ کرنا خلاف مصالح مذہبی سمجھا۔ خیر جو سبب ہو،
جب اہل عرب نے معاملہ شاعری میں کسیطرح کی اعانت بیرونی کو روا نہ رکھا تو اہل
فارس نے بھی اپنے ملکی انداز شاعری پر قناعت کی پھر بیچاری اُردو جو فارسی کی محض
متتبع ہی بھلا کیا انحراف ورزی اختیار کرتی۔ اہل اسلام کا ڈرامانگاری کو اختیار نکرنا
افسوس انگیز امر ہے بلاشبہہ اُنہیں اس صنف شاعری کے اختیار کرنیکا موقع برابر ملتا گیا

کامیڈی

ٹریجیڈی۔ اسلامی شعرا میں عدم ڈرامانگاری۔

اسپر بہی وہ اسکی طرف مائل نہوئے - اوّل تو اُنہیں علوم یونان سی سابقہ پڑا - دوم یہ کہ اہل اسلام ہندوستان میں آئے اور حکمران ہندوستان ہوکر ہندوں سے شیر وشکر ہوئے اور اون کے محصل اور ممتاز اشخاص جیسے فیضی اور عبدالرحیم خانخانان اور علامہ بدایونی وغیرہ علوم سنسکرت سی بہرہ مند ہوتے گئے اسپر بہی اُنہیں سے کسی نے ڈرامانگاری کیطرف توجہ نہیں کی - حالانکہ سنسکرت کی ڈرامانگاری اُس درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی تہی کہ اہل یونان کی ڈرامانگاری کا جواب ہورہی تہی بلکہ اُس سے بہی شیئاً زاید بڑہی ہوئی تہی اور اسلئے بلا گفتگو بہت قابل توجہ متصور تہی - لاریب اہل اسلام اس صنف شاعری کو رواج دینے کے مواقع برابر پاتے گئے مگر افسوس ہی کہ عہد ماضی میں اسکی طرف مائل نہوئے اگر کاش اسکی طرف اُنہوں نے توجہ کی ہوتی تو اسوقت اسلامی شاعری اہل یونان اہل روم یا اہل ہند کی شاعری سے بلند پایگی میں کم نہوتی - بہرحال جائے مسرت یہ ہے کہ اب ملک ایران میں ڈرامانگاری کی ابتدا ہوئی ہے خوب ہوا کہ شعرای حال کے اس صنف شاعری کی طرف متوجہ ہونے سے فارسی کی شاعری کا تکملہ ظہور میں آئے - واضح ہو کہ ڈرامانگاری کے بغیر کسی زبان کی شاعری درجہ کمال کو نہیں پہونچ سکتی ہے - اگر اہل فارس کو ڈرامانگاری کا مذاق پیدا ہوا تو امید قوی ہے کہ شعرای فارسی کی نامطبوع مبالغہ پردازیاں بہی رخصت ہوجائینگی کسواسطے کہ ڈرامانگاری میں تبعیت فطرت کی بڑی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ تبعیت فطرت منافی مبالغہ پردازی ہے فارسی کی شاعری جو مبالغہ پردازیوں کے باعث معیوب ہورہی ہی نہایت اصلاح کی حاجت رکہتی ہے - اسکی اصلاح ڈرامانگاری کے بغیر غیر ممکن الوقوع ہے - خیر اگر اب بہی اہل اسلام ڈرامانگاری کی طرف میل فرمائیں تو بہت غنیمت ہی - اسوقت تک کی اُنکی ناتوجہی بہت حیرت خیز امر ہے - جاننا چاہیئے کہ ڈرامانگاری شاعری کا خاتمہ ہی - زبان سنسکرت میں ڈرامانگاری ایسے اعلیٰ درجہ کی دیکہی جاتی ہے کہ بہت محققوں کی یہ رای ہے کہ ابتک کسی قوم نے چہ ماضی وچہ حال اس صنف شاعری میں اُسکے برابر ترقی نہیں کی ہی - یورپ میں بلکہ تمامی دنیا میں شیکسپیر شاعر انگلستان بہترین ڈرامانگار سمجہا جاتا ہی اور واقعی اوسکی ڈرامانگاری کچہہ ایسے الہامی درجہ کی معلوم ہوتی ہے کہ اوسکے کمالات

ایران میں ابتدا ڈرامانگاری -

سنسکرت کی ڈرامانگاری -

شیکسپیر

کو دیکھکر عقل انسانی مبتلائے حیرت ہوتی ہے مگر اب بعد تحقیق ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ زبان سنسکرت کا ڈراما نگار شاعر کالی داس یا شیکسپیر کا ہم پہلو ہے یا شیکسپیر سے بھی بلند تر رتبہ رکھتا ہے۔ اسی سے سنسکرت کی شاعری کے رتبہ کو قیاس کرنا چاہیے کہ اس زبان میں کالی داس سا ڈراما نگار دیکھا جاتا ہے اور بیاس مصنف مہابھارت اور بالمیکی مصنف رامائن سے رزمی شاعر پائے جاتے ہیں بخیال راقم کسی زبان میں سنسکرت سے بہتر شاعری نہیں دیکھی جاتی ہے خاصکر ڈراما نگاری کہ کہیں جواب نہیں رکھتی ہے۔ اوسکی رزمی شاعری کا بھی جواب کمتر نظر آتا ہے۔ ہومر اور ملٹن بیاس اور بالمیکی کے پورے جواب نہیں ہیں ہاں اگر کوئی شاعر جواب میں پیش کیا جاسکتا ہو تو میر انیس ہیں کاش اگر کوئی ڈراما نگار اردو کا شاعر اسی درجہ کا جس درجہ کے میر انیس رزمی شاعر گزرے ہیں زبان اردو میں گزرا ہوتا تو لاریب دنیا میں سنسکرت کی شاعری کے بعد اردو ہی کی شاعری کا درجہ ہوتا۔ اس صنف شاعری کی معدومی سے عربی فارسی اور اردو کی شاعریاں نامکمل حیثیت رکھتی ہیں۔ بالمختصر معدومی ڈراما نگاری سے کامیڈی اور ٹریجیڈی کی شان ڈرامہ کی صورت پر عربی فارسی اور اردو کی شاعریوں سے پیش نہیں کیجا سکتی ہیں لیکن کامیڈی اور ٹریجیڈی کے انداز کو سمجھانے کیواسطے بعض مثنویوں کا بیان ذکر کیا جاتا ہے جو اگر بوضع ڈراما لکھی جاتیں تو کامیڈی اور ٹریجیڈی کی شکلیں پیدا کرتیں مثلاً مثنوی یوسف زلیخا کہ جسمیں ایک ایسے قصہ کا بیان ہے کہ جسکا نتیجہ مضامین مسرت انگیز پر مشتمل ہے یعنی وہ قصہ پہلے حضرت یوسف کی پریشانیوں کو اور حضرت یعقوب کے بتلائے رنج و آلام ہونے کو بیان کرتا ہے اور آخر کار حضرت یوسف کے ثروت کو پہونچنے اور حضرت یعقوب کے ملنے سے خبر دیتا ہے ایسا قصہ کہ جسکا خلاصہ یہ ہو کہ "پسرے بود پسرے داشت گم کردہ بود باز یافت" سوائے مسرت انگیز ہونیکے اور کیا ہو سکتا ہے اسی پر مثنوی میر حسن کی قصہ کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ وہ بھی ایک پیرایہ خاص میں حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کا قصہ ہے اور اسی لئے اس قصہ کا خاتمہ بھی خوشی اور مسرت پر ہوتا ہے بخلاف اسکے قصہ شیریں و فرہاد ہے جو پوری شکل ٹریجیڈی کی رکھتا ہے اور جس سے حزن و ملال کے سوا کوئی دوسری کیفیت منتج نہیں ہو سکتی ہے لیلی مجنوں کے قصہ کا

فارسی اور اردو کی مثنویاں جو کامیڈی اور ٹریجیڈی کی اسرار رکھتی ہیں

ی ہی انداز ہی اور راسخ کی وہ مثنوی ہی جسکا نام راز و نیاز ہے یہی پیرایہ رکھتی ہی۔

لیرک (Lyric) اپیک (Epic) اور ڈراما (Drama) کے علاوہ شاعری کی ایک قسم ہی جو شکل مثنوی ہوتی ہی اور اُس سے مراد اخلاق آموزی ہی اس شاعری کو بزبان انگریزی ڈای ڈیکٹک (Didactic) کہتے ہیں اس شاعری سے نصایح پند وغیرہ متعلق ہوتے ہیں اسکی مثالیں سعدی و سنائی و مولوی رومی علیہم الرحمۃ کے کلاموں میں افراط کے ساتھ موجود ہیں امیر المومنین علی علیہ السلام کے اشعار بھی بیشتر یہی رنگ رکھتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں ورڈسورتھ (Wordsworth) ڈرائیڈن (Dryden) اڈیسن و پوپ (Pope) وغیرہ بھی ڈای ڈیکٹک یعنی اخلاق آموز مذاق رکھتے ہیں یہاں پر قابل ذکر شاعری کی وہ قسم بھی ہی جسے بزبان انگریزی پیسٹورل (Pastoral) کہتے ہیں اس شاعری کا تقاضا یہ ہی کہ دیہی طریقہ زندگانی کا بیان عمل میں آئے یعنی کسان و چوپان کسطور پر زندگی کرتے ہیں اُنکے شاغل کسطرح کے ہوتے ہیں اور اُنکے ارادات و خواہشات کیا انداز رکھتے ہیں۔ یہ باتیں اس صنف شاعری میں حوالہ قلم ہوتی ہیں شاعر اپنے معاملات کو کسان و چوپان کے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہی۔ اس قسم کی شاعری کی مثالیں یورپ کے شاعروں کے کلام میں بہت ہیں۔ انگریزی شاعروں میں پوپ (Pope) نے اس رنگ میں بہت شعر کہے ہیں یہ مذاق قبل بعثت آنحضرت صلعم کے شعرائے عرب میں بھی دیکھا جاتا ہی۔ اہل عرب میں اس مذاق کا موجود ہونا کوئی عجائب نہیں ہے کیواسطے کہ بیشتر اہل عرب تقاضائے ملکی چوپان پیشہ تھے اور اب بھی ہیں۔ اس صنف شاعری کا ایک گونہ مناسبت وہ شاعری بھی رکھتی ہی جو زراعتی اور باغبانہ مذاق رکھتی ہے یونانیوں میں اس مذاق کا شاعر ہیسیڈ (Hesiod) تھا اور اس صوبہ بہار میں دو طبیعت دار زراعت پیشہ شخص تھے جو کہاگ اور ڈاگ کے نام سے مشہور ہیں۔

منجملہ اقسام شاعری کی ایک قسم شاعری کی مدح اور دوسری قدح ہی ان دونوں اصناف شاعری کی مثالیں ہر زبان میں بکثرت موجود ہیں اردو میں ان دونوں قسموں کی شاعریاں مرزا رفیع سودا سے بڑھکر کسی نے نہیں کی ہیں۔ اس جگہ یہ عرض کر دینا ضرور ہی کہ شاعر مدح میں

ڈای ڈیکٹک شاعری

پیسٹورل شاعری۔

زراعتی شاعری

مدح و قدح

ایسی مبالغہ پردازی کو راہ ندی کہ اُسکا کلام احاطہ فطرت سے باہر معلوم ہو اور نہ قبح میں اسدرجہ مہذب پیرایہ اختیار کرے کہ طبیعت کو تنفر پیدا ہو اگر مرزا سودا ان دونوں باتوں کو مدح و قدح میں مدنظر رکھتے تو اُنکی مدح گوئی اور ہجو گوئی کا جواب کہیں دنیا میں نہ ملتا۔ شعرای یورپ بھی طریقہ مدح و قدح کو اختیار کرتے گئے ہیں مگر فحش سے اُنکی تحریریں کمتر آلودہ نظر آتی ہیں۔

اصناف شاعری سے مرثیہ نگاری ایک نہایت عمدہ صنف ہے مرثیہ نگاری سے یہاں مراد صرف وہ مرثیہ گوئی نہیں ہے کہ دوستداران خاندان پیغمبر مصایب اہلبیت علیہم السلام کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں بلکہ تمام دیگر ایسے منظوم و غیر منظوم بیانات جو سرمایہ رنج و الم ہونیکے باعث اظہار غم و حسرت کیساتھ احاطہ تحریر میں آتے ہیں۔ مثلاً شاعر اپنے کسی دوست کی مرثیہ یا کسی شخص کے مبتلائے آفات ہونیکا مرثیہ لکھ سکتا ہے یا کسی غم انگیز معاملہ کو جیسے جہاز کا دوبا سکان میں آگ کا لگنا وغیرہ ہے قلمبند کر سکتا ہے۔ اسطرح کے مرثیے شعرای یورپ و ایشیا اکثر لکھتے گئے ہیں گرے (Gray) شاعر انگریزی نے ایک مرثیہ ایک دہات کے گورغریباں کے بیان میں لکھا ہے یہ مرثیہ دیدنی ہے اسطرح حکیم فاآنی نے ایک مرثیہ ایک امیرزادی ناکتخدا کی وفات میں نہایت سوز و درد کے ساتھ موزوں کیا ہے دو شعر اس مرثیہ کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں اُنکی پُرتاثیری محتاج بیان نہیں ؎

بہر بہار گل از زیر گل برآرد سر	گلے برفت کہ ناید بصد بہار دگر
گلے برفت کز امروز تا بدامن حشر	گلاب اوست کہ جاری بود ز دیدۂ تر

واضح ہو کہ یونتو مرثیہ نگاری ہر زبان میں دیکھی جاتی ہے اور مذہبی مرثیہ نگاری بھی ہر قوم میں کم و بیش طور پر مروج رہی ہے لیکن مذہبی مرثیہ نگاری جیسی اسوقت اُردو میں موجود ہے کسی زبان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ہرچند اُردو و فارسی کی خوشہ چین کہی جاتی ہے مگر اس صنف شاعری میں فارسی سے بہت زیادہ ترقی کر گئی ہے۔ ترقی کی یہ حالت ہے کہ فارسی کی شاعری کا تو کیا ذکر اس مرثیہ نگاری کی بدولت اُردو کی شاعری اہل یونان اہل روم اہل ہند اہل انگلستان کی شاعریوں کا سامنا کرنے کو مستعد نظر آتی ہے۔ اس ترقی عظیم کے باعث میر انیس ہوئے ہیں کہ جنکی بدولت زمین شاعری آسمان سے بھی بلند تر دکھائی دیتی ہے۔ فقط

(ماخوذ از بیاض حسرت)

ہر ایک دل و جاں کے مرغوب نظر آئے | میر من | میں خوب تمہیں دیکھا تم خوب نظر آئے

حضرت طاہر فرخ آبادی کے نام

شفیق یادآور مخلصان سلامت۔

سلام مسنون۔ غدر میں اموال بھی تلف ہو گئے جانیں بھی سینکڑوں ضائع گئیں یہ تو اوسنے کیفیات تھی مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ غارتگروں نے ہمتیں بھی لوٹ لیں صفات قدیمہ بھی خبر باد کہکر سدھار گئے محبت کا نشان بھی باقی رہا ہمدردی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی قوتیں سلب ہو گئیں حافظے کام کے نہیں باقی رہے میرا بھی یہی حال ہوا حافظہ میں مطلق قوت نہیں رہی اسی زمانے سے ریاست رام پور کو چلا جانا ہوا وہاں جاکر دنیا ہی نئی دیکھی اور رئیس کی التفات نے شب و روز میں کسی ساعت کو خالی نچھوڑا معہذا بسبب تامل کے اپنے انکار نے بھی کچھ حصہ وقت کا دبا لیا اسوجہ سے فرصت نہ ملی کہ یاران قدیم و مخلصان صمیم کو یاد کرتا اور یہی باعث ہوا کہ آپ کو بھی کبھی کچھ لکھ نہ سکا۔ اب مخدومی محترمی جناب حکیم محتشم علی صاحب کے ذریعے سے مدت دراز کے بعد آئینہ رابطہ قدیم کا زنگ چھوٹا اور نئی جلا دیگئی یعنی آپکا عنایت نامہ جسمیں کچھ فقیر کا ذکر ہو ملا۔ بنے سوچکر آپ کی تصویر خیالی ذہن میں کھینچی اور محبت دیرینہ کا مزا اٹھایا ؎

ای دفت تو خوش کہ وقتا خوش کردی

رہنما انبار بندہ زادہ کلاں نے بے شغلی سے تنگ آکر جاری کرنیکا قصد کیا ہے دو اشتہار اسکے بھی بھیجتا ہوں اور گذشتہ بعض احباب نے شائع کرنیکا ارادہ کیا ہے مینے بھی بتقاضائے ؎

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

انکی خاطر سے حتی الوسع اعانت کرنیکا وعدہ کرلیا ہے۔ فقیرزادہ یعنی منشی محمد احمد میرے حکم کے موافق اسکے انصرام کا کفیل ہوا ہے اسکے بھی چند قطع اشتہار بھیجتا ہوں۔ کساد بازاری چیزوں کی قدردانی کلیتہً آپ کی تحریر سے بھی زیادہ ہے مگر تاہم ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست — خم و خمخانہ با مہر و نشاں ست،

تلاش و کوشش ہوگی تو بہت نہ سہی تھوڑی ہی سہی قدرشناس پیدا ہو جائینگے یہ تحریر فرمانا آپ کا کہ میرا کلام اساتذہ کے اشعار کے سامنے کیا وقعت پیدا کرے گا دلیل کمال ہے

اسلئے کہ کمال آدمی کو ضرور ہی منکسر کر دیتا ہے امید ہے کہ اس گلدستے کو اپنا ذاتی گلدستہ تصور فرما کر ہمیشہ اسکی حسن افزائی ملحوظ رہے اور کلام تازہ انتخاب کے بعد عنایت ہوا کرے۔

ثم التسلیم۔ آثم امیر احمد عفی عنہ۔ محمد احمد تسلیم گزار ہے۔

لکھنؤ۔ کٹرہ ابو تراب خاں

مصاحبت ادبیہ

(Literary gossip)

(۱) اردوی معلی کہاں ہے؟

اس سلسلہ میں علم ادب کے ایک ادنے شیدائی کے پُر ان خیالات و ملاحظات کو کبھی کبھی قید کرنے کی کوشش کیجائیگی۔ گاہ بیگاہ کے مصاحبوں میں مجھے بھی شمار کیجئے۔

میں ادب کا ادنی اور گمنام شیدائی ہوں، اور اُسپر ستم یہ ہے کہ مہجور اور وطن سے دور! تاہم، زبان اور ملک کی محبت جو دلمیں جاگزیں ہے، وہ اسبات پر مجبور کرتی ہے کہ بیابان غرب میں ہچکولوں کی بہڑاس نکال کیا کروں: ؎

عالم ہو میں کچھ آواز سے آجاتی ہے		چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دلکا

کبھی آپ کو یہ تمنا بھی ہوئی ہے کہ آپ کو میر، درد، انشا و مصحفی کی صحبتیں نصیب ہوئی ہوتیں؟ میرے دلمیں ایسے خیالات اکثر گذرے ہیں۔

وہ صحبتیں تو ناممکن ہیں، مگر اب بھی کبھی کبھی، ایسے لوگ ملجاتے ہیں جنپر نہ نئے زمانہ کا رنگ چڑھا ہے اور نہ اُن کی زبان پر نئے زمانہ کے الفاظ۔

فرخ آباد میں ایک صاحب رہتے تھے جو لکھنؤ کے آخری رنگیلے دور کی یادگار تھے وہ سال

ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا بسا ہوا تھا کہ نئی چمک انہیں نہ لبھا سکتی تھی وہ اُس زمانہ کو حسرت سے یاد کیا کرتے تھے، اور اُسکے حالات دل تھام تھام کے بیان کیا کرتے تھے۔

اور کس زبان میں؟ ہماری کج مج ژولیدہ زبان میں نہیں کہ مطلب ادا کرنا چاہتے ہیں اور ہو نہیں ہوتا، بلکہ اُس پیاری لچھے دار زبان میں جو پچھلی نسل کے ساتھ زمین کے دو گز نیچے دبگئی، اور سطح زمین پر ایک جانشیں چھوڑ گئی، جسے اُس سے اتنی ہی مغائرت ہے جیسی نئی نسل کو پُرانے وقت کے لوگوں سے۔

یہ زبان، اور یہ لوگ اب ہندوستان میں کیاب ہیں۔ مگر لکھنؤ کے عہد شباب کی زبان سُننا منظور ہے تو ہندوستان سے باہر سفر کیجئے، اور عربستان میں آیئے۔ اُردو ے معلےٰ کربلائے معلےٰ میں ہے!

غدر میں، یا غدر سے پہلے، کچھ معزز خاندان ہجرت کرکے کربلا میں آ بسے تھے۔ ان لوگوں کی زبان سنئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کیں اور طے زمان و مکان کرکے، سودا و آتشا کی محفلوں میں پہونچ گئے۔ ان لوگوں کی زبان پر نئے اصطلاحات، نئے محاورے نہیں چڑھے ہے۔ ریل، تار، جج، کلکٹر، کانگرس، کانفرنس سے ناآشنائی ہے۔ وہی آتیاں، اور وہی جاتیاں ہیں! وہی کتو، نچو ہے۔ غرضکہ کچھ عجب پُر لطف عالم ہے۔

حضرت حسرت موہانی کہاں ہیں؟ وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں، (کیونکہ اُردو کی پاکیزگی کے دلدادوں کے لئے یہ بہشت ہی ہے) وہ اپنے موجودہ مباحث کو جنمیں اُردوئے معلےٰ نے اسقدر ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، چھوڑ کر آئیں اور دیکھیں اور سُنیں۔

مگر افسوس کہ یہاں بھی یہ یادگار رفتگان جماعت چراغ سحری ہے۔ موت کا فرشتہ

انہیں ہندوستان سے ڈھونڈتا ہوا، یہاں آپہنچا ہے، اور یہ لوگ یہاں سے بھی ہجرت کر کر کے، اُس ملک کو جا رہے جہاں غالب، و ذوق، آتش و مصحفی، میر و سودا، اور اب ہمارے داغ بھی محفل سخن جمائے بیٹھے ہونگے۔ نقط۔ (یلدرم)

دارالسلطنت فرانس کی مختصر تاریخ

پیرس دنیا کا عجیب و غریب شہر جسے لوگوں نے "ملکہ جادو نگار و عروس شیریں ادا۔ نفاست مجسم ہمہ تن شوکت و شان" کے پاکیزہ القاب سے یاد کیا ہے اسی جگہ واقع ہے جہاں ایک زمانہ میں دلدل ہی دلدل تھا۔ ہپاپوٹامس (Hippopotamus) ہاتھی اور دیگر خوفناک درندوں کا یہاں ملجا و ماوا تھا۔ گرد و نواح کے پہاڑ۔ خاصکر منمیٹر (Mammatre) میں بکثرت قدرتی و مصنوعی غار تھے جہاں وحشی آدمی۔ شیر اور ریچھ وغیرہ اپنا مسکن سمجھتے تھے ابتک کہیں کہیں غاروں میں ان آدمیوں اور جانوروں کی ہڈیاں ملی جلی پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ملک گیری کے لئے بہت کچھ جنگ و جدال ہوئی ہوگی۔ یہ شہر اتنا قدیم ہے کہ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ کس نے اسکی بنیاد ڈالی سنہ عیسوی سے پچاس برس قبل جب روما کے شہنشاہ جولیس سیزر نے ممالک عرب پر حملہ کیا تو اسوقت بھی یہ ایک خاصی حیثیت کا شہر تھا۔ اسکا قدیم نام لوٹیشیا ہی (Lutetia) اور شصت و چہار اقوام گیلیا میں (Gilia) سے قوم پیریسی آئی (Parisii) کا جو جزیرہ دریائے سین (Seine) میں آباد تھی یہ شہر دارالسلطنت تھا۔

سیزر (Ceasar) نے جب اسے فتح کیا تو اہل روما کے زیر حکومت اسنے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کی اور ابھی پچاس برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ایک دوسرا قریب کا جزیرہ بھی اسمیں شامل ہوگیا اور سو برس کے اندر ہی اندر اسکی آبادی ایک لاکھ تک پہونچ گئی۔ قوم پیریسی آئی (Parisii) کی آبادی یہاں زیادہ تھی اور یہ لوگ اسقدر مضبوط اور ضدی طبیعت کے تھے کہ فتوحات روما سے دو سو برس تک بھی ان کے دل سے عناد و مخالفت کی

مکتوبات امیر مینائی

مرتبہ ثاقب

حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی کے نام

پیارے کوثر کئے روز ہوئے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں اسکے جواب کا انتظار ہے مجھکو اتنی فرصت اور اطمینان نہیں کہ آپ کے خطوط کے جملہ مطالب پر نظر کروں اور ہر ایک بات کا جواب لکھوں اول غزل آج دیکھ لی بھیجتا ہوں آپ صاف کر کے گلچیں میں بھیجئے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ جلیل آہ تسلیم رساں ہیں۔

امیر فقیر۔ ۲۴ اگست ۱۸۹۲ء

حکیم برہم صاحب اڈیٹر ریاض الاخبار کے نام

رام پور۔ ۵ ستمبر ۱۸۹۲ء

پیارے برہم۔ سلام و دعا۔ ۳۰ اگست کا لکھا ہوا خط آیا غزلوں کا پلندہ بھی پہنچا آپ کی بہن کے یہاں چوری ہو جانا اور آپ کے کمرے سے سامان مہمانی احباب اٹھ جانا باعث افسردگی دل ہوا خداوند تعالیٰ حسن نیت کے اثر سے نعم البدل عطا فرمائے۔ وزیر صاحب بہادر کو ایک خط اسیدن روانہ کر چکا تھا جسدن آپکا خط آیا انکا وعدہ تو اس میں یاد دلایا گیا ہے اور اجازت چاہی گئی ہے کہ لطیف میاں وہاں حاضر ہو کر امیدواری کریں اور سلام سے مشرف ہوا کریں۔ انسپکٹری کی تخصیص کر کے لکھنا قبل اسکے کہ اس خط کا جواب آئے مناسب معلوم نہوا اگر وہ خط یاد دہی کا نہ لکھا ہوتا تو آپ کے رائے کے موافق انسپکٹری سلسلے میں جگہہ ملنے کی درخواست کرتا۔ برابر برابر دو خط بھیجنے پر خیال آتا ہے کہ مبادا جناب وزیر صاحب کی طبیعت پر گراں گزرے۔ نور عین لیاقت حسین کے واسطے بھی بہت خیال ہے اسواسطے کہ انکا تکفل کثیر اور وہ بہت پریشاں ہیں جناب قاضی صاحب کے

مژدۂ صحت سے آپ نے سامعہ نوازی کی میں بہت خوش ہوا میری طرف سے تہنیت صحت کسی موقع پر ادا کیجائے۔ (ج) سے آپکا کچھ بس نہیں چلتا اور وہ جسیم کے پیٹ میں ایک نقطہ ہے۔ اپنی فکر رسا سے کوئی اچھا اور معقول کام لو تو جی خوش ہو۔ یوں میرے بہلا دینے کی تو تمکو ہزار راہیں آتی ہیں جب قلم اٹھاؤ گے بہلا لوگے دیکھو غزلیں تمہاری دیکھیں۔ قدر کرو ایک ایک اصلاح بہت قدر کے قابل ہے۔ سرسری مت دیکھنا بہت غور کرنا۔ شعر تمنے کئی غزلوں میں بہت اچھے اچھے کہے ہیں وجوہ تصرف اکثر جگہ تمہارے ذہن سلیم پر اعتماد کرکے نہیں لکھے میں جس حال میں ہوں وہ مشغلۂ شعر و سخن کے بالکل مخالف ہے محض تمہاری خاطر سے تمہاری غزلیں دیکھی ہیں بستی کے بستی شاگردوں کے کلام سے بھرے پڑے ہیں۔ تم پہلے مجھکو مطمئن کردو پھر جتنا کلام چاہو بھیجو۔ حکیم صاحب حکمت کی باتیں تمکو بہت آتی ہیں کام کی بات ایک نہیں آتی۔ سچی بات لکھی ہے برہم نہ جانا۔

امیر فقیر

مولوی حبیب الرحمن خانصاحب حسرت شروانی کے نام

سخنور گرامی گہر۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس شحون۔ کرمت نامہ آیا ممنون التفات فرمایا۔ سب سے مقدم آپ کی تحریر جواب سوالات میں آئی جسکو دیکھکر بیحد ان نہایت مسرور ہوا اور واجب ہوا کہ تہ دل سے شکر گذاری کروں۔ اہل الرائے کی رائیں کمیٹی میں پیش ہوکر رد و قبول کا فیصلہ ہوگا ابھی دفتر امیر اللغات میں سکرتری ان کو جمع کرتا جائیگا۔ کمیٹی جب فیصلہ کریگی تو امر منفصل مختار مولف ہوگا۔ میں آخر میں پھر آپ کے عمدہ توجہ کی سپاس گزاری کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اپنی عمر اور عنوان معاشرت اور جملہ کیفیات سے مجھکو آگاہ فرمائیں اسلئے کہ ممنون اپنی محسن کے حالات سے بیخبر نہ رہے اور بچے کے حالات سے بھی واقف ہوجائے والسلام بالاکرام۔

سراپا تقصیر امیر فقیر۔ ۹ دسمبر ۱۸۸۹ء

صاحب موصوف کے نام

گرامی گوہرا۔ سلام مسنون اخلاص و دعا شحون۔ سعادت تحریر سراپا تنویر سرمہ کش دیدۂ

منتظر ہوں۔ کم فرصتی سے جواب ندیسکا۔ کیفیت آپ کی معلوم ہونے سے بہت سرور ہوا کہ تھوڑی عمر میں بہت کچھ آپ نے سیکھا ہے اللہم زد۔ اگرچہ مجھکو کثرت کار سے فرصت نہ تھی مگر یہ غزل اور سہرا اپنے دیکھ دیا اور کچھ محو و اثبات کیا کہ پہلی بار آپ نے بھیجا ہے اگر عذر کروں تو شاید خاطر نازک پر گراں گزرے۔ امید ہے کہ مجھ پیرانہ سال خستہ حال کو آپ اپنی عمر اپنے اقبال اپنے کمال کا ترقی خواہ تصور کریں اور کبھی کبھی یاد فرمایا کریں اور اپنی اب و عم زاد مجد ہما کے خدمت میں میرا سلام کہیں۔ والدعا۔

امیر فقیر مینائی۔ ۱۹ر دسمبر ۸۸ء۔

رسید ضرور لطف ہو تاکہ اطمینان ہو۔

بنام ثاقب کے نام

احسن الاحبا۔ مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب سلمہم اللہ الواہب۔

بعد سلام مسنون اخلاص مشحون کے واضح ہو کہ رافت نامہ مدت کے بعد آیا اور نور سرور دیدہ و دل بڑھایا۔ میں آپ کی کس کس عنایت کا شکر کروں کہ مجھ سے ناچیز کو بایں خوبی و اخلاق یاد فرماتے ہیں اور کوتہ قلمی کا گلہ کرتے ہیں اس شکایت کا شکر ہی ادا نہیں ہو سکتا خداوند تعالیٰ مکارہ سے محفوظ اور لذائذ سے محظوظ رکھے۔ آمین۔

اب میں بصد انفعال عذر کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں خود بھی بیمار رہا اور عزیزوں کا بھی بیمار دار رہا ایک عزیز کا انتقال ہو گیا اسکا ماتمدار رہا انکے علاوہ اور بہت سے مکروہات رہے جنکا بیان نہیں ہو سکتا امید ہے کہ آپ قصور عفو فرمائیں۔ تذکرۂ انتخاب یادگار حسب فرمائش سرکار مرتب ہوا اور چھپکر سرکار میں داخل ہوا میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیۂ احباب کروں علی الخصوص یہ تذکرہ جسمیں مجھکو حالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسے قلم کو دست کاتب میں مگر اب جو آپنے یاد فرمایا تو ضرور ہوا کہ ایک نسخہ بھیجوں تاجر سے کہا ہے متعاقب پہنچیگا اور دونوں تذکرے بہوپال میرے پاس ہیں آپ انکے بھیجنے کی تکلیف نفرمایئے۔ اپنے انگلستان جانے کی آپ نے بری سنائی یہ بار عظیم مہاجرت کا مجھ ناتواں سے کیونکر اٹھیگا خیر خداوند عالم ایسا کرے کہ آپ کو یہ سفر وسیلہ ظفر ہو اور آپ فائز المرام

وہاں سے آکر ہندوستان میں وہ مرتبہ پائیں کہ آپ کے خیر طلب اسپر فخر کریں زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر عفی عنہ - ۲۹ نومبر ۱۸۸۱ء

نور چشم محمد احمد قمر تسلیم رساں ہے۔

بنام ایضاً

کرم گستر اسمعی پرورا - تسلیم - اب کی سال مجھکو محرم کا تمام مہینا محرم کی دسویں کی طرح غم میں گذرا پوچھئے کیوں تو عرض کروں کہ عشرۂ ثانیہ میں جو عنایت نامہ آیا اس سے معلوم ہوا کہ میرا وہ نیاز نامہ جو مینے بجیر وصد در صحیفۂ اولین جواب میں لکھا اور بدیہۃً سیدسیارہ کے تاریخ لکھی اور آپ کو نہ پہنچا کاش اسی زمانے میں وہ خط پہنچ جاتا تو تقریظ نہ لکھ سکنے کی شرمندگی ہوتی افسوس ہزار افسوس کہ میرے طرف سے تو یہ تعمیل حکم میں جلدی اور آپ کو یہ گمان ہوگا کہ یہ تاریخ لکھنے کو بھی اڑا گیا - طرفہ یہ کہ ۱۵ محرم کو جو عنایت نامہ آپ نے لکھا اسمیں یہ لکھا کہ میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے کہیں اور جاؤنگا تو جنوری میں مجھے خط لکھنا پس محرم کے مہینے بھر مجھکو یہی رونا رہا کہ الہی جلدی یہ غم کے دن گذریں اور آپ سہارنپور پہنچیں - اور میں عذر واقعی لکھوں اور پھر تاریخ بھیجوں اور وہ پہنچے تو کچھ آنسو پونچھیں - الہی میری نارسائی بخت آپ کی قوت اقبال پر مترقی نہ ہو سکے اور یہ خط تلف ہونے پائے - خیر یہ مطلب تو تمام ہوا - سردی کی شدت جو آپنے لکھی ہے سب واقعی ہے ادھر بھی اب کی سال بہت شدت ہے اور میں چونکہ ضعیف البنیان ہوں اس موسم میں اکثر مریض رہتا ہوں سردی ہو خواہ گرمی تری ہو یا خشکی جو کیفیت غالب ہوتی ہے طبیعت اس سے مغلوب ہو جاتی ہے - میر رضا من علی صاحب جلال آئے اور پچاس روپے مشاہرے پر نوکر ہوئے مع الخیر میں زیادہ کیا عرض کروں - فرصت نہیں ملتی اور لکھتے وقت دل کی دل ہی میں رہجاتی ہے - قطعۂ تاریخ جو سراسری عرض کیا تھا وہ پھر بھیجتا ہوں پسند کے قابل تو نہیں مگر بپاس خاطر جبراً قبول فرمائے چاہے نہ چاہنے میں اختیار ہے مگر یہ خفگی تو جاتے کہ نہ تقریظ لکھی نہ تاریخ فقط - امیر فقیر عفی عنہ ۳ جنوری ۱۸۸۱ء بندہ پرور ابکی بیرنگ خط بھیجنے کا قصور معاف ہو نکٹ لگا کر بھیجا تھا وہ نہ پہنچا ابکی جلکر بیرنگ لکھا ہے - خدانخواستہ یہ بھی نہ پہنچا تو رجسٹری کی نوبت آئیگی فقط

ہو نہ گئی اور آخر کار خود اہل روما کے آپس میں انہوں نے پھوٹ ڈالدی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۸۶ء میں رعایا نے بغاوت کی اور غدر کے دو سرغنوں نے، جنہیں ایک پریسی آئی تا (Tiridates) اور دوسرا رومن (Roman) اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ یہ بغاوت ایک سال بعد فرو ہوئی اور اس استحکام کے ساتھ کہ ان دونوں بادشاہوں کے نام صفحات تاریخ تک سے مٹ گئے۔

شہنشاہ جولین کے زمانہ (۳۶۳ - ۳۳۱ء) تک اس شہر کا نام لوٹیشیا (Lutetia) رہا۔ اب اس بادشاہ نے چاہا کہ موسم سرما کے لئے یہاں ایک محل بنائے اور اہل روما کو لاکر بسائے اور یہاں کے باشندوں کو اپنے طریقے سکھائے۔ جب اس کوشش میں کامیابی حاصل معلوم ہوئی تو اس نے لوگوں کو بڑے بڑے حقوق دینے شروع کئے اور اصلی باشندوں کی تالیف قلوب کے لئے اس شہر کا نام بجائے "لوٹیشیا" کے "پیریسی آئی" رکھا۔ اور در حقیقت اس طریقے سے اسے کامیابی ہوئی۔ لوگ نہایت خوشی سے جوق جوق آنے لگے اور بسنے لگے اور اب آپس میں ایسا میل جول بڑھا کہ دیسیوں نے پردیسیوں (یعنی رومنس) کا مذہب تک اختیار کر لیا۔ ان تعلقات کی وجہ سے خود شہر نے ایسی ترقی کی کہ رومنس ہی کے زمانہ میں تجارت کی ایک بہت بڑی منڈی بن گیا۔

"پیریسی آئی" کو لوگ اب شہنشاہ جولین کے اصطلاحات کے بعد صرف "پیرس" کہنے لگے اور جولین کے جانشینوں نے یہاں کئی ایک محل بنائے اور سرما میں یہیں رہنا اختیار کیا۔ اب بھی ان محلوں کے ٹوٹے پھوٹے نشانات اور مسمار شدہ حماموں کی اینٹیں اپنے بانیوں کی عظمت و جبروت کے یادگار باقی ہیں۔ شمالی اقوام کو پیرس کی یہ ترقی دیکھکر رشک ہوا اور برسر کرو گی اٹیلا (Attila) ۴۵۱ء میں انہوں نے اس شہر پر حملہ کیا۔ مشہور ہے کہ سینٹ جنی ویو (St. Genevieve) نے جو اپنے زمانہ میں ولی اللہ مشہور تھے ۴۴۹ء میں قوم ہنس (Huns) کے اس حملہ کی خبر دی تھی اور اب جب یہ لوگ اٹیلا کے ہمراہ شہر کے باہر نظر آئے تو اپنی پیشین گوئی کو پورا ہوتا دیکھکر دعا مانگنے کے لئے سجدہ میں گر پڑے۔ یہ دعا قبول ہوئی اور ہنس (Huns) بلا حملہ کئے واپس ہو گئے

سنہ ۴۶۴ء میں شیلڈرک اول (Childeric I) بادشاہ قوم فرنکس (Franks) نے پیرس کا محاصرہ کیا۔ سینٹ جنی ویو (St Genevieve) ابھی زندہ تھی۔ انہوں نے لوگوں کو ہمت دلائی اور سپاہیوں کو ابھارا لیکن محاصرہ کرنے والوں نے اس سختی کے ساتھ آب و دانہ بند کیا کہ بالآخر اطاعت کرنی پڑی۔ اس زمانہ میں یورپ میں رسم تھی کہ فاتح اقوام مفتوح قوم کا قتل عام کرنے میں زن و بچہ تک کی پروا نہیں کرتے تھے مگر اس موقعہ پر سینٹ جنی ویو کی الحاح و منت ایسی کام آئی کہ رعایا قتل عام سے بچ گئی اسطرح شیلڈرک ( ) اول نے پیرس سے رومن اقتدارات کی جڑ اکھیڑ کر پھینک دی اور جب اسکا بیٹا کلووی (Clovis) تخت نشین ہوا تو اوسنے مذہب عیسوی اختیار کیا اور پیرس کو رومنس (Romans) کے اثرات سے پاک کرکے خالص فرانسیسی اثر کو بڑھایا۔ جہاں اب نارٹرڈیم ہے (Notre Dame) وہاں اوس زمانہ میں جیوپیٹر (Jupiter) کے نام کا ایک مندر تھا۔ اُسے ڈھاکر پہلا گرجا تعمیر کیا گیا۔ بعد میں شارلیمین نے (Charlemagne) پیرس یونیورسٹی کا پتھر رکھا۔

فرنکس کے زمانہ حکومت پیرس میں رومنس (Romans) نے کئی مرتبہ بہت سخت سخت حملے کئے ایک مرتبہ ایسا سخت حملہ ہوا کہ اگر اوٹو (Otto) المعروف بہ کاؤنٹ آف پیرس (Count of Paris) ایک بہت دولتمند اور صاحب قوت امیر اپنی فوج لیکر مدد کے لئے نہ آجاتا تو پیرس پھر رومنس کے ہاتھ میں چلا گیا ہوتا۔ اوسنے حملہ آوروں کو پسپا کرکے ملک سے باہر نکالدیا اور اس کے صلے میں سنہ ۸۸۵ء میں شاہ پیرس بنایا گیا۔ ایک صدی بعد ہوگیپی (Hugh Capet) کو جو اوٹو ( ) کی نسل میں تھا فرانس کا تخت ملا یہ گویا فرانس کا پہلا بادشاہ تھا جسکی اولاد میں لوئی شانزدہم تک تمام بادشاہ ہوئے ہیں۔

سنین سنہ ۱۰۰۰ء سنہ ۸۸۵ء میں پیرس نے نئی صورت اختیار کی اور قوم کا دارالحکومت سمجھا جانے لگا اور کیا بلحاظ دولت و آبادی اور کیا بلحاظ علوم و فنون دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔

سنہ ۱۲۲۳ء سنہ ۱۱۸۰ء میں جب فلپ اگسٹس (Philip Augustus) سریر آرائے تخت

فرانس تھا تو اس عروس پیرس کے بناؤ سنگار میں اُسنے بہت کوشش کی۔ فلپ کو پیرس سے عشق تھا اسلئے اپنی محبوبہ کو غنیم کے دستبرد سے بچانیکے لئے اُسکے گرد ۲۲۵ ایکڑ زمین احاطہ کرکے نہایت مضبوط پتھر کی فصیل تعمیر کی۔ اور اندرون شہر اسپتال اور بازار بنوائے۔ دارالعلوموں کے حقوق میں توسیع کی اور تمام سڑکوں پر پتھر کا فرش کرایا۔

اسکے بعد لوئی نہم (Louis IX) (۱۲۲۷ - ۱۲۱۵ء) کا زمانہ بھی پیرس کی ترقی کا زمانہ تھا۔ یہ بادشاہ علوم و فنون کا بہت شائق تھا۔ اسلئے پیرس نے امور ملکی، تجارت اور علوم و فنون میں بہت ترقی کی اور رابرٹ دی سار بون (Robert de Sorbonne) شاہی چیپلین نے بادشاہ کی مدد سے ۱۲۵۰ء میں ایک مذہبی دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جسے اب تک سار بونی (Sorbonne) کہتے ہیں۔

مگر پیرس کے باشندے روز ازل سے عجب بیچین طبیعت لائے ہیں انہیں کسیطرح قرار نصیب نہ تھا۔ اکثر بلوے کرتے، سلطنت کے خلاف جماعتیں قائم کرتے اور بادشاہ کی مخالفت کا علم بلند کیا کرتے تھے۔ فیوڈل سسٹم (Feudal system) جو اس زمانہ میں مروج تھا اوسنے نوابوں اور امرائے دولت کو اور زیادہ سرکش بنا دیا تھا اور عوام کی انقلاب پسند طبیعتیں ان کی آغوش تمرد میں پرورش پاتی تھیں۔ اسلئے اس باغیانہ جوش و خروش کو دوسری طرف متوجہ کرنیکے لئے فلپ چہارم (Philip IV) نے (۱۳۱۴ - ۱۲۶۸ء) میں میلوں اور کھیل تماشوں کو ترقی دی اور پیرس کو عیش و نشاط کی اشیاء سے بھر دیا۔ پہلا ڈراما جو پیرس میں کیا گیا وہ اسی بادشاہ کی سرپرستی میں ہوا تھا۔

چارلس پنجم (Charles V) نے (۱۳۸۰ - ۱۳۲۷ء) اس عروس کو زیور عمارات سے آراستہ کیا اور خود اپنے لئے ہوٹل ڈی سینٹ پول (Hotel de St. Pol) کا عالیشان محل تعمیر کیا۔ فلپ اگسٹس کے حدود فصیل سے باہر پیرس کی آبادی بہت پھیل گئی تھی اسلئے اسنے ۱۰۸۴ ایکڑ زمین احاطہ کرکے دوسری فصیل تعمیر کی۔

اس بادشاہ کے زمانہ میں کتب خانہ شاہی کی جسے اب بلیاتھیک نیشنیل (Bibliothèque nationale) کہتے ہیں اور جو دنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ سمجھا جاتا ہے بنیاد پڑی - اور علوم و فنون کو بہت بڑی ترقی ہوئی -

اسکے بعد چارلس ششم (۱۴۲۲ - ۱۳۶۸ء) تخت نشین ہوا - اسکا زمانہ پیرس کے لئے بہت پر آشوب تھا - خانہ جنگی قحط و وبا سبھی کچھ بلائیں نازل ہوئیں - سب پر طرہ یہ ہوا کہ انگلستان کے ہنری پنجم نے فرنچ کو ایجنکورٹ (Agincourt) میں شکست دیکر اپنے تئیں انگلستان و فرانس کا بادشاہ مشہور کیا - مگر زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور فرانس کو خدا نے فرانسیسیوں ہی کے لئے قائم رکھا ۱۴۳۶ء میں انگریز نکال دیئے گئے اور تخت چارلس ہفتم کو ملا - انگریزوں نے ہنری ششم کے زمانہ میں ایک اور کوشش کی اور اگر جوآن ڈاک (Joan d'Arc) کی ہمت مردانہ آڑے نہ آتی تو فرانس نکل گیا ہوتا - ان لڑائیوں نے شہر کو اسقدر تباہ و ویران کر دیا تھا کہ بھیڑیے (Wolves) سڑکوں پر پھرتے تھے - قحط و وبا اسپر اور طرہ ہوئے شہر کی آبادی جو ایک زمانہ میں تین لاکھ تک پہونچ گئی تھی ۱۴۶۶ء میں اسقدر کم ہو گئی کہ باہر سے لوگ بسنے کے لئے بلائے گئے اس تباہ حالت میں لوئی یازدہم (Louis XI) تخت پر بیٹھا اتفاق سے یہ بہت دانشمند بادشاہ تھا جسکے سایہ عاطفت میں پیرس نے پھر سنبھلنا شروع کیا - اسنے پھر تجارت و علوم و فنون کو ترقی دی رعایا کو حقوق عطا کئے - شفاخانے بنوائے - سڑکیں درست کرائیں اور ڈاک خانے قائم کئے -

لوئی دوازدہم (Louis XII) نے (۱۵۱۵ - ۱۴۶۲ء) جو اپنی مستعدی اور دانشمندی کی وجہ سے "رعایا کا مائی باپ" کہا جاتا تھا فتوحات بہت کیں مگر پیرس کو ترقی کم دی لیکن اسکا بیٹا فرانسیس اول (Francis I) (۱۵۴۷ - ۱۵۱۵) شہر کا دلدادہ تھا - علاوہ دیگر ترقیوں کے جو اسکے زمانہ میں پیرس کو نصیب ہوئیں یہ شہر علوم کا مرکز بن گیا - اسنے لوور (Louvre) کی پرانی عمارت کو منہدم کر کے موجودہ عمارت تعمیر کی اور عالیشان ہوٹل ڈی ویل (Hôtel de Ville) کی تعمیر شروع کی نئی سڑکیں بنوائیں ویران اضلاع کو آباد کیا اور ایک شاہی فری (Free) کالج قائم کیا - لیکن یہ سب ترقی ہنری دوم (Henry II) کی تخت نشینی کے ساتھ ہی خاک میں

ملکئی یہ ایک نہایت متعصب کیتولک بادشاہ تھا جس نے علانیہ پروٹسٹنٹ مذہب والوں کو گرفتار کرکے جلایا اسکے بیٹے فرانسیس دوم، میری ملکہ اسکاٹ کے شوہر نے بھی پیرس کے لئے کچھ نہیں کیا بلکہ اپنے ۱۷ ماہ ایام حکومت میں کیتولک اور پروٹسٹنٹ مذہب والوں میں بہت کچھ کشت وخون کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو اوسکی ماں کیتھرائن ڈی میڈیسیز (Catherine de Medici) نے زہر دیدیا اور اسکے بعد چارلس نہم دس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

اسکے دادا ہنری دوم نے پروٹسٹنٹوں کے خلاف قانون بنائے تھے وہ گویا ایک آگ تھی جسکے شعلے فرانسیس دوم کے زمانہ میں بلند ہوئے اور چارلس کے ایام حکومت میں ہر چہار طرف پھیل گئے۔ ہیوجی ناٹ پراٹسٹنٹ (Huguenot protestants) جان پر کھیلے بیٹھے انہوں نے بغاوت کردی۔ ڈیوک آف گائز (Duke de Guise) مشیر شاہ وسردار فرقہ کیتولک نے اس آگ کو فرو کرنیکا بیڑا اٹھایا مگر چند وجوہات سے کچھ نرمی کا برتاؤ کرنا پڑا جس سے کیتولک مذہب والوں کو شبہ ہوا کہ دربار سے پراٹسٹنٹوں کی مدد ہوتی ہی اس شبہ نے یہ ستم ڈھایا کہ اگست ۱۵۷۲ء کی چوبیسویں تاریخ کو جبکہ سینٹ بارتھولومیو کے دن سینٹ جرمین لازری رای (St. Germain l'Auxerrois) کے گرجے میں لور (Louvre) کے قریب عبادت کا گھنٹہ بج رہا تھا اسوقت پروٹسٹنٹوں کا ایک قتل عام شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ چارلس نے خود سبقت کی اور ایک کھڑکی میں سے خود پہلی گولی ماری۔ اسروز صرف پیرس میں دس ہزار ہیوجوناٹ قتل ہوئے مگر شہر کی اس تباہی کے بعد چارلس بھی کچھ زیادہ زندہ نہیں رہا۔ اور خود اسکی ماں نے زہر دیکر مار ڈالا۔ اسکے بعد ہنری سوم تخت نشین ہوا۔ اس نے کبھی پروٹسٹنٹ کی طرفداری کی اور کبھی کیتولک کی۔ اسلئے کبھی اس فرقہ نے بغاوت کی کبھی اوسنے اس کشت وخون میں پیرس کے سڑکوں پر خون کی ندیاں بہہ گئیں پیرس کی تباہی میں چارلس نے جو کچھ کسر باقی رکھی تھی اُسے اسنے پورا کردیا بالآخر ایک ڈامی نیکن (Dominican) راہب نے قاصد کے بھیس میں قریب پہونچکر پیٹ میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ خاندان ویلائی (Valois) کا یہ اخیر فرمانروا تھا جسکے قتل کے بعد ہنری چہارم

(۱۶۱۰ - ۱۵۵۳ء) بوربن (Bourbon) کا خاندان کا پہلا بادشاہ تخت نشین ہوا۔ اسنے بھی فرقہ کیتھولک سے بہت کچھ جنگ جدل کی مگر پیرس کی حالت کسیقدر درست کی اسکا بیٹا لوئی سیزدہم (Louis XIII) گو کہ محلات لاور میں نہیں رہتا تھا مگر زیادہ تر اپنا وقت شہر میں صرف کرتا تھا۔ محلات لاور (Louvre) کے گرد و پیش کے مکانات کی اسنے تکمیل کی اور اُس بازو کو جو اب تولیریز (Tuileries) سے ملحق ہے تھوڑا آگے بڑھایا۔ اسی کے زمانہ میں مشہور کارڈنل رکلو (Cardinal Richelieu) وزیر اعظم نے پیلے رائل (Palais Royal) محلات شاہی) کی تعمیر کی۔ اور مطبع شاہی۔ ژاردان ڈی پلانٹز (Jardin de Plantes) اور فرنچ اکیڈیمی (French Academy) کی بنیاد ڈالی۔

لوئی چہاردہم (Louis XIV) کے زمانہ میں بھی (۱۶۱۵ - ۱۶۳۸) جو فرانس کا سب سے بڑا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ بہت کچھ کشت و خون ہوا پھر بھی شہر پیرس کو اسکی ذات سے بے اندازہ فائدے پہونچے۔ اس نے محلات ورسائی (Versailles) میں رہنا شروع کیا مگر پیرس کے زیب و زینت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی اور ایسے ایسے مکان تعمیر کئے اور ایسی ایسی چیزوں کی بنیاد ڈالی کہ پیرس دنیا کا سب سے زیادہ عالیشان شہر کہلایا جانے لگا۔

اینٹی مارسیل (Etienne Marcel) کی پرانی عمارات کے برابر برابر اسنے بازاروں کا ایک سلسلہ بیسٹائل (Bastiles) اور میڈیلین (Madeleine) تک قائم کیا اور درختوں کی دورویہ عظیم صفیں آراستہ کیں جو اب بھی پیرس کے اعلیٰ ترین مناظر میں شمار کی جاتی ہیں۔ ورسائی (Versailles) کا عالیشان محل بھی جو تمام عالم میں بہترین محل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے۔

لوئی پانزدہم (Louis XV) نے اپنا دارالقرار تولیریز (Tuileries) کو بنایا اور اپنے باپ کی طرح پیرس کو بہت کچھ فائدہ پہونچایا۔ پیلس رائل (Palais Royal) کی اسنے دوبارہ تعمیر کی اور ڈی لا کانکارڈ (Place de la Concorde) کی بنیاد ڈالی۔ فوجی مدرسے قائم کئے ایلیسی (Elysee) کا عالیشان محل جہاں پریزیڈنٹ رہتا ہے اور محل بوربن جہاں اب چیمبر آف ڈیپوٹیز ہے تعمیر کئے۔ دارالضرب شاہی اور کئی گرجے بنوائے۔

لوئی شانزدہم (XVI منسکے) نے اپنے باپ اور دادا کی طرح سلسلہ تعمیر جاری کیا۔ بہت سی عمارتوں کی ابتدا کی اور بہت سی تمام کیں اسپتال سالپٹریری (Salpêtrière) اور ہوٹل ڈی ڈنولیڈ (Hôtel des Invalides) کا بے مثال گنبد جہاں اب نپولین کے قبر ہے اسی بادشاہ کے تعمیر کی ہوئی عمارتیں ہیں۔ فرانس کا انقلاب عظیم اسی زمانہ میں شروع ہوا یعنی ۱۷ جون ۱۷۸۹ء کو ورسائی (Versailles) سے ایک آگ کا شعلہ بلند ہوا اور طرفۃ العین میں تمام فرانس مشتعل ہو گیا باغیوں نے بادشاہ کو صرف معزول ہی نہیں کیا بلکہ ۱۵ جون ۱۷۹۳ء کو نیشنل کنونشن (Convention) نے متعدد الزامات لگا کر چھ روز بعد پلیس ڈی لاریوولیوشیاں میں جو اب پلیس ڈی لاکانکارڈ کے نام سے موسوم ہے سولی پر چڑھا دیا اسکی ملکہ میری (Marie antoinette) کو بھی یہی روز بد اکتوبر میں دیکھنا نصیب ہوا۔ جمہوریوں اور بادشاہ والوں کی لڑائی ابھی جاری تھی کہ نپولین اعظم کا ظہور ہوا جس نے اکتوبر ۱۷۹۴ء میں سلطنت کے حمایتوں پر پوری فتح حاصل کی۔ پیرس کی تاریخ اب گویا نپولین کے زمانہ کی تاریخ ہے۔ جو پرشیا۔ اسٹریا اور مصر کو شکست دیکر ۱۳ دسمبر ۱۷۹۹ء کو کونسل اول منتخب کیا گیا اور ۲ دسمبر ۱۸۰۴ء کو نائٹرڈم کے گرجے میں بادشاہ بنایا گیا۔ اسکے زمانہ میں پیرس نے وہ عروج حاصل کیا جو کبھی اوسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اسنے محلات بنوائے۔ محرابیں اور یادگاریں تعمیر کیں۔ مدرسے قائم کئے۔ اور پیرس کو تجارت کا مرکز بنایا۔ مگر یہ سب عروج حباب آسا تھا اور واٹرلو (Waterloo) کی شکست کے بعد جب ۳۰ مارچ ۱۸۱۴ء کو پیرس پر افواج متحدہ کا قبضہ ہوا تو تباہی کی کوئی انتہا باقی نہ رہی۔ آخرالامر کانگرس ایکس لاشیپل (Congress aix-la-chapelle) (۱۸۱۸ء) کے بموجب لوئی ہجدہم (XVIII منسکے) کو تخت ملا مگر خود یہ بادشاہ ایسا ضعیف الطبع اور زمانہ ایسا پرآشوب تھا کہ پیرس کی طرف یہ بہت کم توجہ مبذول کر سکا۔

چارلس دہم (Charles X) خاندان بوربن کا اخیر بادشاہ اسکے بعد تخت نشین ہوا اسکے سخت احکام نے بغاوت کی آگ کو جو ابھی سلگ رہی تھی پھر بھڑکایا اور جولائی ۱۸۳۰ء سے پیرس میں پھر بغاوت شروع ہوئی اور چارلس معزول کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔

نویں اگست ۱۸۳۰ء کو لوئی فلپ (Louis Philippe منسکے) تخت نشین کیا گیا۔ اسکے زمانہ میں تالیرانڈ

(Kellmann) لندن میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اسنے ورسائی (Versailles) میں نیشنل میوزیم کی بنیاد ڈالی۔ اور پیرس کو علوم و فنون کا مرکز بنانے میں بہت کوشش کی گو کہ اس زمانہ میں بھی بادشاہ کو مارنے کی کئی مرتبہ کوشش کی گئی تاہم ۱۸۴۶ء تک کسیقدر ملک میں امن رہا۔ ۱۸۴۷ء میں پھر منحوس ستارہ طلوع ہوا اور پیرس میں ایسا قحط پڑا کہ پہلے کنگلوں نے بغاوت کی پھر عام رعایا نے بدامنی کے آثار ظاہر کرنے شروع کئے جنکا انسداد لوی فلپ کی دست قدرت سے باہر تھا حتی کہ ۸ فروری ۱۸۴۸ء میں فرانس پر ایک عام بغاوت کا ابر چھا گیا لوی نے یہ شہر آشوب دیکھکر اپنا تخت و تاج پوتے کے حوالے کیا مگر چیمبر آف ڈپوٹیز (Chamber of deputies) نے شخصی حکومت کو بالکل جڑ سے اکھاڑ ڈالنے کی تجویز کی اور پھر دوسری مرتبہ جمہوری طرز حکومت فرانس میں اپنا جلوہ دکھانے لگی۔ لوی کے زمانہ میں پلیس ڈی لا کنکارڈ (Place de la Concorde) میں بہت سی عمدہ عمدہ ترمیمیں ہوئیں اور فرانس کے آٹھ بڑے بڑے شہروں کے ہمنام آٹھ نہایت عالیشان بت یہاں نصب کئے گئے۔ نوٹرڈام (Notre Dame) کے گرجے کی دوبارہ تعمیر ختم ہوئی اور محلات لوز مبور (Luxembourg) اور ہوٹی ڈی ولی (Hotel de Ville) میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا۔

دسویں دسمبر ۱۸۴۸ء کو پریزیڈنٹ حکومت جمہوری کا انتخاب ہوا اور چار سال کے لئے لوی نپولین بونا پارٹ (Louis Napoleon) منتخب کیا گیا جسکے بعد پھر دس سال کے لئے اُنکا انتخاب ہوا۔ اسکی طبیعت میں نپولین اعظم کی سی جودت تھی۔ اپنی حکمت عملی سے انتظام ملک داری پر اسنے ایسی قدرت ظاہر کی کہ شاہی اختیارات حاصل کرلئے ۱۸۵۲ء میں لوگوں کی طبیعتوں میں پرانے خیالات شخصی حکومت کے عود کرنے لگے اور طرز حکومت میں انقلاب آیا۔ عام رعایا نے لوی نپولین کو اپنا بادشاہ مقرر کیا۔

اسکا زمانہ گو کہ کم پر آشوب نہ تھا تاہم جو جو ترقیاں پیرس کو نصیب ہوئیں وہ کبھی پہلے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ گرانڈ اوپیرا (Grand Opera) کی عالیشان اور بے نظیر عمارت۔ نیا ہوٹیل ڈیو (Hotel Dieu) آٹیل کا وایاڈکٹ (Viaduct) متعدد اعلیٰ درجہ کے گرجے۔ پیرس کی پہلی نمائش۔ پیلیس آف انڈسٹری (Palace of Industry) نیشنل لائبریری

کا اضافہ۔ فرانسیسی قدیم اشیاء کا عجائب خانہ۔ متعدد قلعہ جات۔ یہ سب اسکے زمانہ کی یادگار ہیں۔ شہر کا رقبہ اٹھارہ ہزار چار سو دس (۱۸۴۱۰) ایکڑ یعنی دوگنے سے زیادہ ہوگیا۔ بہت سی سڑکیں وسیع کی گئیں اور نئے نئے راستے بنائے گئے مگر افسوس یہ سب ترقیاں بھی جو پیرس نے اس زمانہ میں کیں محض چند روزہ تھیں۔ اسپر ایسی بلائیں یکے بعد دیگرے نازل ہونا شروع ہوئیں کہ جو کچھ نپولین سوم کے زمانہ کی ترقیاں تھیں وہ اور جو کچھ اُس سے پہلے ہوئی تھیں وہ سب ان بلاؤں کی بھینٹ چڑھیں۔ ۱۸۷۰ء میں جرمنی سے لڑائی ہوئی۔ فرانس کو شکست ہوئی اور فتحیاب جرمن بڑھتے بڑھتے پیرس تک آپہونچے اور شہر کا محاصرہ شروع کیا۔ سخت خونخوار لڑائی ہوئی۔ انچہ انچہ پر سینکڑوں کٹ گئے اور قلعجات یکے بعد دیگرے فتح ہونا شروع ہوئے۔ ۲۷ دسمبر ۱۸۷۰ء سے شہر پر گولہ باری شروع ہوئی اور سوائے توپوں کی آواز، عمارات کے گرنے کی آواز اور لوگوں کی چیخ پکار کی آواز کی اور کچھ نہیں سنائی دیتا تھا۔ فرانسیسیوں نے بہت کچھ جد وجہد کی مگر آخر شہر فتح ہوگیا اور یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو فتحیاب فوج شہر میں داخل ہوئی۔ شرائط صلح بہت جلد طے ہوگئے اور جرمنس واپس ہوئے۔

پیرس کے تقدیر میں صرف اسیقدر مصیبت نہ تھی۔ جرمنس کی جاتے ہی کمیون (Commune) نے جسمیں زیادہ تر نیشنل گارڈ (National guard) کے سپاہی تھے، شہر کا محاصرہ کرنا شروع کیا۔ یہ لڑائی گویا فوج باقاعدہ اور نیشنل گارڈ (ھ ھ) کے درمیان تھی جسمیں ایسا عظیم کشت وخون ہوا کہ پیرس کی سڑکوں پر خون کی ندیاں بہنے لگیں اور شہر سے متجاوز ہوکر گرد ونواح کے قصبات تک قتل عام جا پہونچا۔ فرقہ کمیون (Commune) نے پادریوں، مجسٹریٹوں اور شہر کے معزز معزز لوگوں کو گرفتار کرلیا تھا اور بطور یرغمال کے قید کر رکھا تھا مگر خون ایسا سوار ہوا کہ ان کو بھی قتل کرڈالا۔ انکے غصہ کی آگ یہیں تک مشتعل نہیں ہوئی بلکہ مٹی کے تیل کے پیپے منگا کر تمام سڑکوں اور مکانات پر چھڑکنا شروع کئے اور شہر کو آگ لگادی۔ بہت سی بڑی بڑی عمارتیں مثلاً پیلیس آف جسٹس (Palais of justice) ہوٹیل ڈی ولی (Hotel de Ville)

تولیریز (Tuileries) منسٹری آف فینانس (Ministry of Finance) کونسل آف اسٹیٹ (Council of State) پیلیس آف دی لیجیان آف آنر (Palais de la Légion d'honneur) روڈی ریو ولی (Rue de Rivoli) وغیرہ جل گئیں۔ پینتھین (Pantheon) اور گرجہ ناٹرڈام کے (Notre Dame) بھی جلا دینے کا ارادہ تھا مگر ۲۸ مئی کی لڑائی میں شکست کھانے سے ان باغیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور فرانس کے سر پر سلطنت جمہوری کا پرچم نظر آنے لگا

یہ سب صدمات ایسے تھے کہ اگر کوئی دوسرا شہر ہوتا تو پھر کبھی مدت دراز تک نہ پنپتا مگر پیرس کے قسمت میں جسقدر جلد جلد تباہ و برباد ہونا لکھا تھا اُسیقدر جلد جلد سنبھلنا اور آباد ہونا بھی لکھا تھا اُسنے اس طوفان کے بعد بہت سرعت کے ساتھ اپنی اصلی حالت پر عود کرنا شروع کیا اور ایسی ترقی کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے ۱۸۷۸ء میں پیرس میں دوسری بڑی نمائش ہوئی جسنے ظاہر کر دیا کہ جو کچھ اس شہر نے ان عظیم فتنوں کے زمانہ میں کھویا تھا صرف وہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ حاصل کر لیا ہے اور ترقی کے میدان میں اسکا قدم پھر تمام شہروں سے آگے ہو گیا ہے۔ اس نمائش کی وجہ سے پیرس کو عمارت ٹراکیڈرو (Trocadero) نصیب ہوئی۔ ایک اور نمائش ۱۸۸۴ء میں ہوئی جس نے پیرس کی زینت و شان کو اور بڑھا دیا۔ اسپر مزید یہ ہوا کہ ۱۸۸۹ء میں یہاں ایک میلا لگا جسنے تمام دنیا کا میلا کہنا چاہیے اسکی یادگار میں مینار ایفل (Eiffel Tower) ابتک کھڑا قوم کی عظمت و شان کو یاد دلا رہا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں پیرس میں ایک اور عظیم الشان نمائش ہوئی جسنے تمام عالم کی نمائشوں کو ماند کر دیا اور ظاہر کر دیا کہ پیرس پھر وہی "ملکہ جہاں و نگار اور عروس شیریں ادا" ہی جو ایک زمانہ سے مشہور چلی آتی ہے۔ آج اس شہر کی یہ حالت ہے کہ زمین پر اپنا جواب نہیں رکھتا۔ علوم کا مرکز۔ علم ادب کا سرچشمہ عمارات کا گلدستہ اور دنیا کی تمام تہذیب کا مجموعہ ہے ؎

اگر فردوس بر روے زمین است	
ہمیں است و ہمیں ست و ہمیں ست	

محمد لطافت حسین خاں (علیگ) سینٹ بارتھولومیو کالج۔ لندن

برسات کی بہار

برسات آئی آگ بدن میں لگا چلی
مژدہ دیا بہار نے ٹھنڈی ہوا چلی

مُنہ برسے برق ابر کا گھونگٹ اُٹھا چلی
میخانے پر برسنے کو اودی گھٹا چلی

دھانی لباس پہنے ہوئے ہر شجر ہے آج
خم کی ہو خیر ساقیِ مہوش کدہ ہے آج

رم جھم برس رہی ہے سرِ شام سے جھڑی
جل تل ہے جس طرف نگہِ شوق جا لڑی

ہل چل ہے اک زمانے میں برسات کی پڑی
پہونچوں تک آستین ہے گنگا کی بہی چڑھی

زور و نپر آج رحمتِ پروردگار ہے
شاداب و بارور چمنِ روزگار ہے

آئی بہار۔ رشکِ جناں بوستاں ہوئے
دہقان رُت بدلتے ہی کیا شاداں ہوئے

پودوں کی تازگی سے ہری باغباں ہوئے
ہل بیل لیکے کھیت کی جانب رواں ہوئے

آغوشِ نو عروسِ چمن ہے بھری ہوئی
لے شخصِ آرزو تری کھیتی ہری ہوئی

جوبن برس رہا ہے عروسِ بہار پر
نزہت غضب کی چھائی ہے ہر برگ و بار پر

گل بوٹے پتے پتے ہیں اپنے نکھار پر
جلوہ ہے شمعِ طور کا ہر نوکِ خار پر

بڑھ بڑھ کے پتے پھولوں کے منہ چومنے لگے
مستی میں آکے نخلِ چمن جھومنے لگے

پھولا پھلا ہے نخلِ گلستانِ روزگار
صحرائے سبزہ زار ہے دامانِ روزگار

ہے عطر بیز غنچہ خندانِ روزگار
حسرت کا ہے اک آئینہ سامانِ روزگار

رنگینیِ بہار بہشتِ نگاہ ہے
گلشن نہیں ہے مظہرِ شانِ الٰہ ہے

کوئل کی کوکو اور پپیہوں کی پی کہاں
وہ عندلیب زار کی جادو بیانیاں
حق سرّہ میں مست وہ اک سمت قمریاں
طاؤس و کبک مست کی وہ خوش خرامیاں

جلوے جو برق حسن کے تاباں نظر میں ہیں
"جاندار سارے محو بہار سحر میں ہیں"

دلچسپ کیا ہی سبزۂ خودرو کی ہی بہار
دولہا بنا ہوا ہے ہر اک کوہ و سبزہ زار
گلہائے باغ پر ہے عجب تازہ تر نکھار
ہر برگ سے ہے قدرت صناع آشکار

اے ابر بہر شکال سحاب کرم ہے تو
سرچشمۂ حیات خدا کی قسم ہے تو

محمد فخر الدین خاں عاجز۔ بھاگلپوری

صبح پیری

از مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

گئی شام جوانی ہے زمانہ صبح پیری کا
بس اب اٹھ سونیوالے ہوگیا ہی نور کا تڑکا
کہاں تک سوئیگا کیوں لے رہا ہی نیند کے جھونکے
ابھی تو کنج مرقد میں تجھے تا حشر ہے سونا
افق سے سر کے کافور سحر کی نکہت آئی ہے
مہیا کرلے سامان حنوط و توشۂ عقبیٰ
ذرا کھول اب تو آنکھیں باندھ کالائے سفر غافل
جرس بجنے ہی کو ہے قافلہ تیار ہے سارا
یہ کیا غفلت ہے منہ دھو اٹھکو اب شکر خدا سے
صدا دیتا ہے میر کارواں لے ہوش میں آجا
ترے کردار پر ہے خندۂ صبح کفن غافل
ترے انجام پر ہے گریۂ شمع لحد گویا
بصارت کم ہوئی کب دیدہ بے نور کی تیری
ستارے صبح کے اب جھلملاتے ہیں وہ وقت آیا
قد خم گشتہ کہتا ہے کہ اب تو جھک اطاعت میں
گئے دن سرکشی کے دعوی نخوت ہو نازیبا
فروغ اب دے نشان سجدہ کو پیری میں اے غافل
سحر ہوتے ہی پیشانی پہ چمکے صبح کا تارا
نکرنا عہد پیری میں بہر وسہ دم کا اک لمحہ
فنا کردیگا اک دن یہ نسیم صبح کا جھونکا

دم لغزش خبر دی رعشۂ اندام نے غافل
لب بام آگیا ہے آفتاب زندگی تیرا

چھپائیگا بیاض صبح کب تک پردۂ شب میں
محاسن میں لگائیگا خضاب اب تا بکے تبلا

شکن اعضا میں آئی دور کر جمعیت خاطر
پریشاں ہو چلے تیری کتاب عمر کے اجزا

فنا کا وقت آیا جنبش سر خود موئد ہی
کیا قد دوتا نے تیری ہستی کو بشکل لا

حدوث عالم امکانکا مثبت خود تغیر ہے
نظر کر اپنی حالت پر کہ کیا تھا تو ہوا اب کیا

یہ خط نسخ فرد زندگی پر تیرے کھینچی تھی
جسے پیری میں اپنے جسم پر تو جھریاں سمجھا

یہ صیقل کی ہے پیری نے کہ تو دیکھ اپنی ہستی کو
نہیں یہ جھریاں ہیں جوہر آئینہ اعضا

وجود نیستی کا وہم اسے مغرور بیجا ہے
انانیت کا مرجع نفس انسان ہو نہیں سکتا

کہا یہ جھریوں نے زندگی کی منزلیں طے کیں
زہی ہمت رہا اس کام کا پیری کے سر سہرا

خیال زندگانی دلمیں کیوں ہر وقت رکتا ہی
حقیقت دیکھ تو اپنی کہ تو ہے خاک کا پتلا

کہاں وہ بزم آرائی وفور شوق کی غافل
کہاں وہ ساز و ساماں جب طلسم زندگی ٹوٹا

اسے آب بقا سمجھی پلی دھوکے مطمئن پھر ہو
لگا ہی دامن دنیا پہ داغ اک بے ثباتی کا

اگر ہے عاقبت اندیش دیکھ آئینہ عبرت
کہ جسمیں عکس ہستی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا

مثال نیستی خود ہی ترے جسم مثالی میں
فنا ہی جسم ثابت کر رہے ہیں خود تیری اعضا

سکھا دی ہیئت فطرت تجھے رفتار معدومی
بنائی اس سے پرکار قدم تیری بشکل لا

حیات جاودانی کی اگر خواہش ہی اے غافل
اجل آنی سے پہلے چاہیے تجھکو فنا ہونا

خدا کو ڈھونڈتا ہے گرچہ ترک ماسوا اللہ کر
متی ما تلق من تھوی دع الدنیا و اھلھا

نہیں زائد ہی مشت خاک سے تیرا تن نازک
تجھے لازم ہی قلب ماہیت کی بھی خبر رکھنا

ہوئی ہی استطاعت تجھیں اب پیر کے آنیسے
اری اے بیخبر واجب ہے حج آخرت کرنا

مناسک کو ادا کر باندھ احرام کفن غافل
صدا لبیک کی دے اب حضور دوست ہی جانا

بنائے دلمیں کر اب خواہش دنیا کی قربانی
قدم سے سعی کر سوی صفا و مروہ عقبیٰ

یہ لازم ہی کہ نذر نقد جاں اس حج میں دی پہلے
تمتع کی جو خواہش ہی تجھے اے بندہ دنیا

اگر خواہش ہی ہو مقبول حج کر ترک آرائش
نہ دیکھ آئینہ تک مغرور خود بینی نہیں زیبا

یہ مانا ہمنے تو ہی بادشاہ ہفت کشور ہے
حضور دوست کام آئیگا کیا یہ تیرا استغنا

نظام عالم امکان سپرد موت ہی غافل
نکر نظم و نسق میں مملکت کی کوشش بیجا

تیرے قبضہ میں مانا مملکت ہی ربع مسکونکی
متاع آخرت کیا کی مہیا تونے یہ بتلا

خیالی مکان کیچھ کھد کچھ بنا ہے تجھکو
یہ قصر دلکشا بنوا کے کیا آرام پائیگا

لباس قاقم و خز کیا سمجھکے تو پہنتا ہے
کیا ہے کس لئے زیب بدن یہ خلعت دیبا

پہن لے کسوت الفقر فخری جسم خاکی پر
ارے او محو آرایش یہی ہی زینت عقبیٰ

بھلا دے سرگزشت عہد طفلی و جوانی کو
صدای الرحیل اب آگئی ہی ہوش میں آجا

بخاں اسکو ذریعہ امتداد زندگی کا تو
پیام موت پیہم دی رہا ہی ہر نفس تیرا

اندھیرا پاکہ ہے پہر چاندنی ہی چار ہی دنکی
عبث شام جوانی ہے تجھے یہ حسن پر عزا

اری او شوکت عہد جوانی دیکھنے والے
رہیگا محو زینت تا بکی اب رکھدی آئینا

سزا دشب سے لکھا عمر بھر غمنامہ ہجراں
سیاہ ہے اپنے اعمالونکا بھی تونے کبھی دیکھا

گذاری رات ساری کروٹیں لے کے فرقت میں
مگر تکلیف سمجھا تو نماز شب ادا کرنا

ہوا وقت ولادت گریۂ اطفال سے ظاہر
سیکھایا ہی تجھے فطرت نے آتی ہے یہاں رونا

جفا بردار دلبر کچھ تجھے خوف خدا بھی ہے
کسیصورت طواف بتکدہ سے جی نہیں بھرتا

کہاں تک واعظ و ناصح سے یہ ہرزہ سرائی ہے
کریگا ورد لب کب تک حدیث عاشقی بلا

سن ایغافل یہ سب نقش و نگار بے ثباتی ہیں
ہوا اس شوق سے تو محو لعبت خانہ دنیا

اگر زاہان تصدیق خیال بے ثباتی ہو
عزیز آو ذرا دیکھ آئیں گورستان عبرت نما

دیکھا لائیں تمہیں وہ منظر شہر خموشاں ہم
جہاں رہتے ہیں بزم آرائی گیتی ابتر تھا

اٹھو بہر خدا ان دوستونکا حال تو پوچھیں
کبھی حاصل تھی جنسی لذت دنیا و ما فیہا

الٰہی کسطرح ان بے بسونکو چین آتا ہے
مصیبت خیز ہے اس وادی غربت کا سناٹا

نگاہیں لے رہی ہیں درس عبرت ذرہ ذرہ سے
صدا اک سو سی ناگہ آئی۔ کیوں تجھکو ہو استا

نکہا ہیت وہی اس خاک کے پردے میں پنہاں ہیں
کہ جنکی ہمنشینی کا تجھے ارمان رہتا تھا

بہت ڈرتا ہی گر تو سورہ الحمد دم کرلے
یہی صورت سہی تھوڑا تو اب اپنے دست کا بھی

تری یہ سیرخی اُنسے خلاف شرط الفت ہے
سر بالیں تربت جا کے آنا تو ذرا پوچھ آ

نہیں تھمتے کسی صورت جو آنسو شمع تربت کے
بتا اے بیکسی گور غریباں پر یہ کیا دیکھا

بتا اے شمع کیا گذری ہے تیرے مرنیوالے پر
تجھے بے اختیار آتا ہے کیوں یہ شام سے رونا

نکلتے ہیں ترے سینہ سے پیہم کیلئے شعلے
بمشکل آہ ہے کسواسطے تیرا قد رعنا

غنیمت جان کہدے حال تو تھوڑی رات باقی ہے
کہ آنے ہی کو ہے دیکھ اب نسیم صبح کا جھونکا

زباں شمع لحد کی ہوگئی خاموش یہ کہکر
میں تیرے حال پر روتی ہوں سن اے بیدست کی شیدا

میں تیرے غم میں گھلتی ہوں کہ تو اسدرجہ غافل ہے
متاع خانہ تربت سے ہے اسدرجہ بے پروا

جلالے اب چراغ معرفت کو کعبۂ دل میں
قیامت سے کا ہوگا گوشۂ تربت میں اندیارا

غزل

دل نازک کی قدر ہی کب کی
بات غصہ سے اوسنے کی جب کی

تھا کرامات عشق کا منکر
معتقد ہوں جو بچ گیا اب کی

موت میری کھڑی ہے بالیں پر
منتظر ہے جنبش لب کی

سامنے اوسکے لاکھ کوشش کی
بات نکلی نہ منہ سے مطلب کی

میں تھا اور نا امیدیوں کا ہجوم
کیا کہوں تمسے کیفیت شب کی

کچھ فراغت سے جسمیں دم لیں
کاش اکدن نصیب ہو اب کی

وقت نظارہ اف ری حیرانی
میرے جانب نگاہ ہے سب کی

دل کبھی تھا ہمارے پہلو میں
یہ خدا جانے بات ہے کب کی

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

غزل جناب ضامن کنتوری

فروغ ماہ تمہاری جبیں سے ہے گلہ مند
چراغ صبح کا مہر مبیں سے ہے گلہ مند

کہاں کٹاتے ہیں پر تیغ ناز کے ہوتے
کہ ذوالفقار بھی روح الامیں سے ہے گلہ مند

غمِ فراق کی ایسی ہوئی ہے لذت گیر
کہ روح رابطہ مار و ملیں سے ہے گلہ مند

زلیکہ جرعہ کش جام نامرادی ہوں
مذاق تلخ مرا انگبیں سے ہے گلہ مند

رقیب قدر ستمہائے ناز کیا جانے
خدا کی شان وہ تیرے جبیں سے ہے گلہ مند

زمیں پہ آنکھ سے ٹپکے نہ خون دل کیونکر
یہ مے شکستگی ساتگیں سے ہے گلہ مند

گہن جو مہر کو لگ جائے کیوں نہ اندھیر
ہٹاؤ ہاتھ جبیں آستیں سے ہے گلہ مند

چھڑاؤ آئے کشاکش سے نزع کی ناقد
کہ شوق دیدم واپسیں سے ہے گلہ مند

نہ کہا ہو کریں ضامن تلاش مضمونیں
سمند فکر بہت اس زمیں سے ہے گلہ مند

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ جناب محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر قند پارسی

قدم اٹھتے ہی نہوں جب تو سفر کیا ہوگا
اور جو گھر میں نہیں دلدار تو گھر کیا ہوگا

گرمیٔ داغ سے اپنا تو جگر سو کہہ گیا
اس حرارت سے تری دیدۂ تر کیا ہوگا

تیری دیوار مگر اسکی خبر کو پہونچے
تیرے در کا ہوا سنگ تو سر کیا ہوگا

چشم طوفاں زدہ! اشکوں کی روانی کب تک
جگر خون شدہ! نالوں کا اثر کیا ہوگا

ہے ترے وصل کو درکار فنا کی تعلیم
قطرہ دریا سے گریزاں ہو گہر کیا ہوگا

حالِ حسرت زدگانِ اثرِ کم نظری
ای زیارت گہہ اربابِ نظر کیا ہوگا

پاس منظور ہے اُس پردہ نشیں کا ہمکو
تیری امداد سے ای روزن در کیا ہوگا

وسعتِ فہم سے یاروں کے ہو وحشت آگاہ
اس ستم دیدہ سے اظہارِ ہنر کیا ہوگا

غزل حسرت موہانی

عشق کی روح پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر

جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر

غمزۂ دلفریب کو اور بھی جانفزا بنا
پیکرِ نازِ حسن پر رنگِ حیا زیادہ کر

خرمی دو روزہ کو عشرتِ جاوداں جان
فکرِ معاش سے گزر حوصلہ معاد کر

قطعہ

ایکہ نجاتِ ہند کی دل سے ہو تجھکو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بعذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اسکو نہ پیشوا سمجھ اسپہ نہ اعتماد کر

مذہب و رنگ و قوم کا دل سے مٹا کے اختلاف
ہموطنانِ ملک میں کوششِ اتحاد کر

کسبِ علوم کے سوا کسبِ فنون کر شعار
اہلِ خرد کی رائے پر از سرِ صدق صاد کر

دولتِ قوم کو بڑھا دیس کی چیز کر خرید
غیر کے مال کے خلاف فیصلۂ جہاد کر

خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول نہ زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پہ تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

نوٹ

مسئلہ ہائیکورٹ | باشندگانِ الہ آباد نے ایک میموریل وائسرائے کی خدمت میں اس مضمون کا روانہ کیا ہے کہ مقام ہائیکورٹ کی تبدیلی سے باشندگانِ شہر الہ آباد کو نقصانِ عظیم برداشت کرنا پڑیگا اسلئے ہائیکورٹ بدستور الہ آباد ہی میں قائم رہے۔ اگر یہ امید ہوتی کہ اہلِ الہ آباد کی درخواست کے منظور ہونے پر لکھنؤ کی جو ڈیشلی پر کوئی اثر نہ پڑے گا تو ہمکو بھی الہ آباد سے ہمدردی ہو سکتی تھی لیکن جب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر الہ آباد میں ہائیکورٹ قائم رہی تو لکھنؤ کی عدالتِ عالیہ کا خاتمہ یقینی ہے تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ الہ آباد میموریل کے وجوہات کیونکر زوردار تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ کیا معنی کہ شہر کے تنزل اور باشندوں کے نقصان کا جیسا خوف اہلِ الہ آباد ہے ویسا ہی قدرتاً اہلِ لکھنؤ کو بھی ہے اور اسلئے اس قسم کی دلیل پر کسی شہر کو ترجیح دینا درست نہیں ہو سکتا۔

اب رہیں دوسری دلیلیں انکے متعلق ہمارے خیال میں تائید الہ آباد کی تقریباً تمام باتیں مصنوعی اور خیالی ہیں درانحالیکہ لکھنؤ کی حمایت میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اصلیت اور حقیقت کا زور رکھتا ہے۔

پس ہمارے نزدیک یا تو انتظام موجودہ کو برقرار رہنا چاہیے جسکی الہ آباد سیموریل بھی تائید کرتا ہے اور سند میں ہائیکورٹ بمبئی اور صدر عدالت سندھ کی مثال پیش کرتا ہے۔ لیکن اگر جوڈیشل اور ہائیکورٹ کا قیام علیحدہ علیحدہ نہیں رہسکتا تو بلاشبہ لکھنؤ کا حق مرجح ہے جس صوبے کے اکثر اضلاع سے قریب ہونیکے علاوہ ترقی اور اہمیت کے ایسے قدرتی اسباب موجود ہیں جو اس صوبے کے مصنوعی دارالحکومت یعنی الہ آباد کو کسیطرح نہیں نصیب ہو سکتے۔

اتحاد مسلمانان و ہنود ہفتہ گزشتہ میں آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی نے علیگڈھ پبلک لائبریری کے لان میں کثیر جماعت حاضرین کے سامنے قابل تعریف بلکہ لائق رشک فصاحت اور روانی کے ساتھ مضمون مندرجہ عنوان پر ایک پسندیدہ تقریر کی۔ ہمکو آپکے اس خیال سے کلیتاً اتفاق ہے کہ ہنود و اہل اسلام کی کشیدگی باہم کا افسانہ مبالغہ بیحد کے ساتھ بیان اور یقین کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام ہندوستان میں دو ایک مقاموں پر جہلا کے جھگڑوں کی مثال کو پیش نظر رکھکر کل ہندوستان کے ہندوں اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت رائے قائم کرنا شیوہ احتیاط و انصاف سے بعید ہے۔

قابل مقرر کا وہ حصہ تقریر بھی خصوصیت کیساتھ لائق ستائش تھا جسمیں انہوں نے یہ بیان کیا تھا "کہ مسلمانوں اور ہندوں کو تاریخ گزشتہ کے قابل اعتراض واقعات بھلا دینا چاہیے کیونکہ دونوں کے بادشاہوں اور راجاؤں سے قابل گرفت افعال سرزد ہو چکے ہیں اور اب انکی یاد تازہ کرنے سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ متصور نہیں ہے"۔

ماریب بعض مولفان فتنہ پرداز محقق نما کی مولفہ تاریخوں سے طالبعلمان اسکول کو جتنا نقصان پہونچتا ہے اسکا اندازہ مشکل ہے۔ امتحان مقابلہ کے بارے میں مالوی جی نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو اپنی قلت تعداد کے باعث سے اس طریق امتحان سے اعتراض ہے تو اسکا علاج یوں ہو سکتا ہے کہ مقابلہ تو قائم رہے لیکن مسلمانوں کے لئے ایک نسبتی تعداد مقرر کر دی جائے کہ اگر اس سے کم مسلمان مقابلہ میں کامیاب ہوں تو بقیہ تعداد اور دیگر پاس شدہ مسلمانوں سے پوری کی جائے البتہ اندر ہندی کے باب میں جو کچھ کہا گیا ہمکو اس سے قطعی اختلاف ہے جسپر ہم آئندہ اپنا خیال ظاہر کرینگے۔ فقط

البیان
ایک علمی تاریخی رسالہ

قیمت سالانہ پیشگی ... ... (للعہ)
مقام اشاعت ... ... دفتر البیان لکھنؤ
زبان ... ... عربی ترجمہ اُردو

(نوٹ) یہ رسالہ پہلے ماہوار شائع ہوتا تھا اور بے قیمت تھی سال جدید سے اب پندرہ روزہ شائع ہوتا ہے اور قیمت صرف للعہ رہی، ہر نمبر کی ضخامت معمولاً دو جز ہوتی ہے صفحہ میں عموماً دو کالم ہوتے ہیں۔ ایک میں فصیح عربی اور دوسرے میں بامحاورہ اُردو ترجمہ۔ مضامین تحقیق سے لکھے جاتے ہیں اور اسلامی خبریں بکثرت ہوتی ہیں (درخواستیں باجازت ویلو ویلو آنا چاہئیں)

عصر جدید

یہ ایک ماہانہ رسالہ تین جزو پر سوا تین برس سے شائع ہوتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بیکار اور فضول بحثوں میں پڑنے کی جگہ کام کی باتوں پر متوجہ ہوں۔ فضول خرچی۔ کاہلی۔ بیکاری کو ترک کریں۔ پیشہ ور کو اگری کو روکیں۔ محنت اور کام اور جائز ذرائع معاش کی طرف آمادہ ہوں۔ تعلیم معزز ملازمت بجائے فضول التقلید اہل فرنگ کے اتفاق و محنت کا سبق ہیں مذہب کا صحیح خیال اور خوف خدا لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو شادی و غمی کی فضولیات اور قرض لینے کا مرض دور ہو۔

اسکے آنریری اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے ایل ایل۔ بی وکیل ہائی کورٹ سکرٹری اصلاح تمدن (سابق چیف جج ریاست الیر کوٹلہ) ہیں اور اس رسالہ نے مسلمانوں کو ایک حد تک بیدار کیا ہے۔ قیمت نو ۲ر جواب طلب امور کے واسطے جوابی کارڈ۔

المشتہر
مینجر عصر جدید گولہ گنج لکھنؤ

ڈی رئیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بہاگلپور

حضرت تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بہاگلپور کے چند زمیندار و رؤسا کے مندرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہرگز یہ نیت نہیں کہ وہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ نشان اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس ایسی لٹھے کپڑے از قسم لنگی چادر و دھوتی و صافہ و رومال کرتی و سوتی لنگا و ساڑیاں ہر قسم ہر رنگ کے تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دوپٹہ چھاپ و سادہ و چک و دوپٹا یا و بافتہ وغیرہ لائق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ۔ انگریزی نمدے و ہیرون و ہندوستان ہر جگہ باسانی پہونچائے جاتے ہیں۔ نفاست و پائداری میں یہ خاص بہاگلپوری لٹھا اپنی ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ سے سمجھے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستانی و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں فرمائشیں ذیل کے پتہ سے آنی چاہئیں۔ المشتہر ڈاکٹر شرف مسیح کمپنی رئیس ٹریڈنگ کمپنی بہاگلپور (محلہ تاتارپور)۔

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اُردو (علی گڑھ) کا انتخاب اس احتیاط اور خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیگر مذکورہ بالا ضخیم دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع ۸×۲۲ حجم ۷ جزو قیمت صرف (۸ر) مع ڈاک المشتہر منیجر اردو علی گڑھ

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت شیخ العالم مخدوم عبد الحق ردولوی قدس اللہ سرہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قیمت ۸ر

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک ۱۵

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور بتیس چیزیں مفت

ناظرین کو خوب معلوم ہوا ہوگا کہ میں ریلوی گھڑی کی بھی کئی مرتبہ [illegible] سوداگر [illegible] ایک جب [illegible] سوداگر سے چالان خود منگایا [illegible] گھڑی [illegible] سوداگر سے بھوکر [illegible] کی [illegible] (بتیس چیزیں مفت دینا شروع کر دیں) [illegible] کی کوک کی اصل [illegible] سوندول ہے۔

[illegible] کانپور کے بونٹ جوتے

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

قسم کے [illegible]

کانپور کے

زین [illegible]	[illegible]
زین چالی دار	[illegible]
زین پولو	[illegible]
زین گھوڑ [illegible]	[illegible]
زین گھوڑ دار بچوں کے لیے	[illegible]

قسم کے ساز

کانپور کے

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
ساز فٹ دار [illegible]	[illegible]
ساز [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
ساز [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

سوا ان کے ہر قسم کی اشیاء دیسی ولایتی روانہ ہو سکتی ہیں

المشتہر

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور

چوک نمبر ۱۵

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کمیشنر اگزامر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسر نامور ڈاکٹروں اور ایان ریاست اور ولایت کے پروفیسروں کے شہادت دیدہ [illegible] بعد تجربہ اس [illegible] کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ امراض [illegible] لئے اکسیر ہے صنعت بصارت [illegible] پیتم [illegible] بالا پڑول پولا سیل سرخی ابتدائی سیاہ۔ ناخونہ پانی جالا [illegible] وغیرہ پندرہ روز کے استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی [illegible] ہے تک یہ سرمہ کیساں مفید ہے قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لیے کافی ہے بلغ دو روپیہ ممیرہ کا سفید اعلیٰ قیمت فی تولہ تین روپیہ خاص ممیرہ فی ماشہ بیس روپیہ مصری نہ رفی تو ہر محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر

[illegible] سنگھ [illegible] مقام بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب

ان سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

[illegible] ممیرے کا سرمہ جو کہ [illegible] سنگھ صاحب نے [illegible] استعمال کرتے دیکھا ہے [illegible] اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق [illegible] ہوں کہ یہ [illegible] ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کیواسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنے تجربہ میں آج تک کوئی [illegible] اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں دیکھا میں ان کو جنکی آنکھوں میں ذرا سی بھی کمی قسم کی شکایت ہو بڑی زور سے استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا پانی آنا۔ دُھند۔ خارش۔ سُرخی چشم کیواسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ اور سچ سچ آپنے اسقدر سستی دوا میں یہ سرمہ ایجاد کر کے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہے اسکا شکریہ الفاظ میں ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ آپکے سرمہ سے فیضیاب ہو کر فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔

راقم۔ پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور نواب صاحب بہادر بہاولپور

رجسٹرڈ نمبر ۱۰۱

اردوی معلی

علی گڑھ

نمبر ۲ | بابت ماہ اگست ۱۹۰۶ء | جلد ۷

مرتبہ سید فضیل الحسن حسرت موہانی بی اے

(فہرست مضامین)

(۱) شعر ..... سفلہ
(۲) سیرت حسین از سید صاحب بی اے ۲
(۳) طالب علم اور پالیٹکس از ۔۔۔ ۲۱
(۴) ۔۔۔ از ۔۔۔ ۲۸
(۵) آسان نکات مثنوی از ۔۔۔
(۶) مکتوبات ۔۔۔ (بنام حسرت موہانی) ۔۔۔
(۷) تنقید ۔۔۔ ۳۳
(۸) ۔۔۔ ۔۔۔

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علی گڑھ

احسن المطابع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت ۔۔۔

اردوی معلی

یعنی ایک وضع اردو کا اچھا اور قابل دید رسالہ جسکے مضامین بہت سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئے جاتے ہیں بلاقیمت قدر ناظرین ہوتے ہیں ہر ماہ ۵۲ صفحے کتابت طباعت کاغذ بنایت عمدہ نمونہ کا پرچہ ۲ر کے ٹکٹ بھیجنے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ دواوین اور رسالہ اصلاح محصول (۲) قیمت رسالہ سہ سالانہ ۲ محصول (۳) قیمت رسالہ (معری سفید کاغذ پر) ۲ سالانہ (برائے طلباء و مدرسے حضرات) مقاصد ضروری جملہ دیگر مقاصد دریافت کیجئے درخواست خریداری بنام منیجر اردوی معلی علیگڈھ ارسال کرو

ملہ چند پرشنٹ اندر میں (۱) رپورٹ اردو بھی کانگرس (۲ر) دیوان میر سوز (۲ر) اور دیوان قائم چاند پوری خالی ہوا (۳ر) شائع ہوئے اور ۱۹۰۷ء کی سشماہی کے آخر میں دیوان حضرت استاد حیرات نذر کیا گیا۔

اردوی معلی جلد پنجم

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع رپورٹ بھی کانگرس قیمت عاریہ محصول۔ دفتر اردوی معلی علیگڈھ سے طلب کرو

اردوی معلی جلد ششم مکمل

از جنوری ۱۹۰۶ء تا جون ۱۹۰۶ء
(نسخہ دوم قیمت صرف ۲ محصول)

المشتہر
منیجر اردوی معلی علیگڈھ

شرح اجرت اشتہار اردوی معلی

	صفحہ کالم	نصف کالم	ثلث کالم
سالانہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ششماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سہ ماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک بار	[illegible]	[illegible]	[illegible]

رسالہ اجتماع

منعقدہ پنڈت کرشنا اندر صاحب ریوا کے ہر دست کا ناظرین کو معلوم ہوگا ناظرین یہ وہ رسالہ ہے کہ جسکا مطالعہ کرکے ان لوگوں کے دل کانپ جاتے ہیں اور جو خود کو بڑا سمجھتے ہیں اور اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اور اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اور اپنے

بسم اللہ

"منتظر"

نام و تخلص | نور الاسلام نام منتظر تخلص خلف شاہ فیض علی عرف پیر غلام برادر زادہ شاہ بدر علی ابن شاہ محمد علی جو بقول مصحفی شاہ عاقل سبز پوش "خدایا و خود فراموش" کے پوتے تھے۔

لیاقت علمی | درسی کتب صرف و نحو عربی کے علاوہ نثر و نظم فارسی پر کافی عبور رکھتے تھے جیسا کہ انکے غزلوں کے انداز سے مترشح ہوتا ہے اور تذکرہ مصحفی سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

سیرت | منتظر کی طبیعت ابتدا ہی سے شاعرانہ واقع ہوئی تھی چنانچہ ۱۲ ہی سال کی عمر سے شعر و شاعری کے شوق نے انہیں اپنے ہم سنوں میں ممتاز بنا دیا تھا۔ اسپر طرہ یہ ہوا کہ آغاز شباب ہی میں کسی جگہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا جسنے انکی قدرتی شوریدسری اور وارستہ مزاجی کو اور بھی چمکا دیا اور ساتھ ہی انکی شاعری کو اثر اور درد کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ [illegible] اور وفاداری منتظر کے شریفانہ مزاج کا خاص جوہر تھا۔ ..... [illegible] منتظر کو بہت کچھ اعتبار اور ناز تھا۔ [illegible] باوجود کم ملاقاتی و فصل سال و ماہ مثل [illegible] رجوع بطرف دیگر نکرد۔ اگرچہ بعض اشخاص معنوی ذہانت طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ او را بہ طریقے بہ حلقہ تبعیت خویش کشند، ہرگز التفات بگفتن ایشاں نکرد تا آنکہ بمرگ [illegible] خویش بمقام والائے شاعری رسیدہ حالا برائے کلہ شکنی آنہا برابر موجود است"

اور اعتبار اسقدر کہ سید انشا کے ساتھ معرکہ آرائی ہجو کے آخر میں مرزا سلیمان شکوہ سادر کے نام قصیدہ معذرت کا ایک شعر یہ بھی ہے کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا ہوں پھر بھی جسے کوئی اگر منتظر کا ضمیر۔ یعنی یہ کہ میں انشا سے درگزر بھی کروں تو مگر منتظر کو [illegible]

منتظر کا پایہ شاعری | مصحفی نے جب اپنے تذکرہ شعرا کی پہلی جلد ۱۲۰۸ھ میں مرتب کی تھی اسوقت تک انکے صرف تین دیوان مرتب ہوئے تھے اور اسی نسبت سے انکے شاگردوں کا سلسلہ بھی بہت زیادہ وسیع نہیں ہوا تھا مثلاً آتش اسیر عیشی۔ ہوس۔ شہیدی و شعور وغیرہ کا ذکر اس تذکرے میں نہیں ہے۔ البتہ خلیق۔ تنہا۔ [illegible] منتظر میں سے منتظر کا پایہ سب سے بلند قرار دیکر مصحفی نے انکو اپنا شاگرد رشید کہا ہے اور انکے کلام کی نسبت ایسی رائے [illegible]

[illegible] معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "کلامش بہ لطف وصفا بیچ از کلام مولف (یعنی خود مصحفی اوڈیٹر) در پایہ کمی نیست" بہرحال منتظر کی استادی کا ثبوت مصحفی کی اس تحریر سے بڑھکر اور کیا ہوسکتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ یہ سند اُسوقت عطا کی گئی تھی جبکہ اُنکی عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کے کلام کی طرح منتظر کی شاعری بھی بعینہ مصحفی کی شاعری کا نمونہ ہے اسلئے اس موقع پر بھی ہم منتظر کے چند اشعار اور غزلوں کی نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔

چاہت مرے دل کی آزما دیکھ
ظالم کہیں تو بھی دل لگا دیکھ

آئے ہیں تیری گلی میں اک زمانہ چھوڑ کر
جاویں اب پیاری کہاں ہم یہ ٹھکانا چھوڑ کر

صدمہ جو شب ہجر کا یاد آئے ہے مجھکو
اک دو ہیں پہر ری سی کچھ آجائی ہے مجھکو

پیدا ہوئی کچھ اب کی نئی طرح کی وحشت
لے شہر نہ صحرا نہ چمن بھائے ہے مجھکو

تم پیار کرو گر نہ صنم اور کسیکو
سوگند لو پھر چاہیں جو ہم اور کسیکو

اغیار تو جھوٹے ہیں میں کب تمکو کہا کچھ
پوچھو تو بھلا دیکے قسم اور کسیکو

گہ پردہ فاش نالے نے گہ آہ نے کیا
رسوائے خلق ہمکو تری چاہ نے کیا

کبھی گر بعد ماہ و سال مکھ اپنا ماہ دکھلائی
تو پھر برسوں ہی مشتاقوں کو تو نے راہ دکھلائی

بروز وصل شادی مرگ ہو جانا ہی بہتر تھا
فلک نے یہ شب ہجراں ہمیں کیوں آہ دکھلائی

غصے میں اس جبیں پہ پڑیں جب شکن[1] کئی
دریائے قہر ان سے ہوئے موجزن کئی

آنکھیں کبھو لڑائیں کبھو دیکھ کر تنا
میلے میں ہمسے اُسنے کئی بانکپن کئی

امید ہے کہ مجھکو خدا آدمی کرے
پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے

بھائیں نہیں کچھ اسکے نکلتی ہی اپنی جان
کیا ایسے بیوفا سے وفا آدمی کرے

مارا ہی کوہکن نے سراپا بہ تیشہ آہ
دلکو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے

گر کچھ کہا بگڑ کے میں اُسنے ہنسدیا
کیا ایسے آدمی سے گلا آدمی کرے

گزرا میں ایسی چاہ سے تا چند ہمنشیں
بیٹھا کسیکے منہ کو تکا آدمی کرے

ہی عشق بد مرض کہ بچی جاتا ہے منتظر
کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

[1] "شکنین" کی جگہ صرف "شکن" لکھا ہے اور یہ پرانی زبان ہے۔ ۱۲

سیرت حسین

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جب معرکۂ کربلا کی دردناک خبر پہلی بار حجاز میں پہونچی تو وہ کچھ ایسی ناگہانی۔ غیر متوقع حسرت انگیز۔ اور عبرت خیز تھی کہ جس نے سُنا ہوش و حواس جاتے رہے۔ دل ہلگیا۔ نیرنگی عالم اور بے ثباتی دنیا کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور جس شخص کے دل میں ذرّہ برابر بھی جوہر انسانیت موجود تھا اُس نے شہید کربلا کے ساتھ ہمدردی اور اُنکے قاتلین سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا۔ حجاز دین اسلام کا سرچشمہ تھا وہاں سے جو درد و غم کی صدا بلند ہوئی تمام دنیائے اسلام نے لبیک کہا اور آئندہ نسلیں بھی برابر اسی خیال کی تائید کرتی رہیں حتیٰ کہ کربلا کے بہادر ہیرو کو بیحد مظلوم سمجھکر مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پولٹیکل جھگڑے کو جزو مذہب بنالیا۔

وہ چند نفوس تو قابل ذکر نہیں جنہوں نے اس شرمناک واقعہ پر اظہار مسرت کی برات کی ہو لیکن جماعت مسلمین میں سے چند ایسے نکتہ چیں غالباً ہر قرن اور ہر صدی میں موجود رہے ہیں جو اس واقعہ پر رنج و ملال ظاہر کرنے کے بعد یہ پرمعنی فقرہ اضافہ کردیتے تھے کہ "حسین اپنے نانا کی شریعت پر قتل کئے گئے"۔

یہ تو اپنے نبی کی قرابت اور مذہبی عظمت و اقتدار کا پاس کرکے صرف ایک مبہم جملہ پر قناعت کرتے تھے لیکن غیر قوموں کو اس رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی اُنکے بعض متعصب[1] مورخوں نے صاف الفاظ میں تحریر کرنا شروع کیا کہ "دین دار مسلمان شہادت حسین پر رنج و الم ظاہر کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ حسین نے تخت و سلطنت کے خلاف ایک

[1] مثلاً سر ولیم میور۔ دیکھو اُن کی کتاب "اینلس آف دی ارلی خلافت"

فضول اور لاحاصل کوشش کرکے ایسے سخت جرم کا ارتکاب کیا تھا جس سے سوسائٹی کے تمدن میں خلل پڑنیکا اندیشہ تھا اور ایسی سرکشی اور بغاوت کا فوراً فرو کر دینا لازمی تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک و قوم کی نئی تعلیم یافتہ نسل کا ایک معتد بہ حصہ انگریزی تعلیم اور مغربی اصول سیاست سے بہرہ اندوز ہو کر زبان سے نہیں تو دل سے ضرور اسی قول کی تصدیق کرتا ہے۔

مندرجہ بالا قول سے جناب شہید کے کیریکٹر پر تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں اوّل تو یہ کہ اُنہوں نے تخت و سلطنت کے لئے خروج کیا۔ دوسرے یہ کہ اُنہوں نے اپنی شوکت کا اندازہ غلط کیا اور اسوجہ سے اون کا خروج فضول ثابت ہوا۔ اور تیسرے یہ کہ وہ جرم بغاوت کے مرتکب ہوئے۔

ہم ان شکوک پر غور کرنے سے پہلے جناب حسین کی متبرک زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا۔ اسلام کی مذہبی اور نزاعی کتابوں کو بالائی طاق رکھکر صرف تاریخ کی مدد سے واقعہ کربلا کی تحقیق کرنا اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایک غیر مذہب کا انصاف پسند مورخ جبکہ تاریخ عرب سے پوری واقفیت حاصل ہو اگر شہید اکبر کی لائف پر ریویو کرے تو وہ کیا تنقید کریگا اور اُس تنقید سے شکوک مذکور کی صحت و خطا کس حد تک ثابت ہوگی۔

جناب حسین بقول مشہور شعبان ۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی کے چھ ابتدائی سال اُس محترم بزرگ کے سایۂ عاطفت میں بسر کئے جسکی قامت میں سایہ ہی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم اُنسے بہت مانوس تھے اور ایک عاصر الوقت کی شہادت ہے کہ اُسنے جناب حسنین کو ایک بار حبیب خدا کے گود میں بیٹھے دیکھا اور جناب رسالت مآب کو یہ فرماتے سُنا کہ "یہ دونوں (یعنی حسن اور حسین) میرے بیٹے اور میرے نواسے ہیں۔ الٰہی میں اُنسے محبت رکھتا ہوں تو بھی اُنسے محبت رکھ اور نیز اُنسے محبت رکھ جو انکو دوست رکھیں"

یہ اور اسی قسم کی بے شمار متواتر روایتیں جو آجتک کتب سیر و احادیث میں محفوظ

۱؎ - اسامہ بن زید - دیکھو تاریخ الخلفا سیوطی۔

ہیں ان دونوں بھائیوں کے فضایل اُس پاک گروہ کے دل پر نقش کرنیکے لئے کافی تھیں جسکا سچا اعتقاد تھا کہ ہمارے نبی کا ہر قول و فعل منجانب اللہ ہے۔ ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ اور غالباً یہی وجوہ تھے کہ جب مسلمانوں کے آفتاب اقبال کے سامنے قیصر و کسریٰ کو سر جھکانا پڑا اور جمشید و کیخسرو کی دولت مدینہ کی گلیوں میں تقسیم ہونے کو آئی تو خلیفۂ وقت نے مال غنیمت میں سب سے بڑا حصہ ان دونوں بھائیوں کو دیا اور جب اُس جلیل القدر فرمانروا کے عزیز فرزند نے ذبی زبان سے اسکا شکوہ کیا تو امیر المومنین کو مجمع عام میں کہنا پڑا کہ "اے میرے بیٹے انصاف کی راہ چل۔ میں تجھسے کہتا ہوں کہ اگر تیرا نانا مثل انکے جد امجد کے ہوتا۔ یا تیری ماں مثل ان کی والدہ کی ہوتی۔ یا تیرا باپ ان کے والد ماجد کے برابر ہوتا تو میں تجھکو راضی کر دیتا۔ اے میرے بیٹے یاد رکھ کہ قیامت کے دن تمام نسب مضمحل ہو جائینگے سوائے نسب بنت رسول اللہ کے۔"

جناب رسول کی وفات کے چھ مہینے بعد آپ کی صاحبزادی بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں اور اسطرح تخمیناً سات سال کی عمر میں جناب حسین یتیم ہوگئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت کیونکر ہوئی۔ کسی تاریخ سے مفصل پتہ نہیں چلتا لیکن قیاس ہے کہ انکے والد بزرگوار نے جو مصلحت خداوندی ہنوز بار خلافت سے سبکدوش تھے ان کو ادب و اخلاق۔ معانی و بلاغت۔ اور فنون سپاہگری اور شہسواری کی ضرور تعلیم دی ہوگی اور نیز وہ نکات و رموز و دقایق جو حضرت بوترابؑ نے اپنے عالی منزلت بھائی کے برسوں ساتھ رہکر حاصل کئے تھے سینہ بسینہ جناب حسین تک ضرور پہونچے ہونگے۔ لیکن یہ عجیب حیرت کا مقام ہے کہ وہ شخص جس سے زیادہ آج دنیائے اسلام میں کسی ہیرو کی شہرت نہیں ہے۔ تیس چالیس سال کی عمر تک ایسی گمنامی میں رہا کہ سوائے دو یا تین موقعوں پر ضمناً اونکا تذکرہ آجانیکے کسی معتبر اور صحیح تاریخ میں اُنکے اُس حصۂ عمر کے حالات بالکل معلوم نہیں ہوسکتے۔

اس گمنامی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا نہیں چاہئے کہ آپ میں کوئی غیر معمولی ذہانت و طباعی نہ تھی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ شعر و سخن میں مذاق سلیم رکھتے تھے اور آپ کے بعض بلیغ اشعار آجتک اہل مذاق کی زبانوں پر ہیں اور اس خیال کو تو ہرگز دل میں جگہ نہ دینا چاہئے

لہ لمعات واقعہ کربلا۔ دفتر سوم۔ فتح مصر و عراق

کہ آپ شجاعت و دلیری میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز نہ تھے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ۲۵ھ میں فتح افریقہ کے لئے جو جرار لشکر مدینہ سے بھیجا گیا تھا اُسمیں ارباب حل وعقد نے آپ کو بھی منتخب کیا تھا اور نیز محاصرۂ عثمان و جنگ صفین میں آپنے شجاعت و مردانگی کے خوب جوہر دکھلائے تھے۔ بلکہ اس عدم شہرت کی وجہ یہی کافی ہے کہ کہ جسوقت تک آپ کے والد بزرگ جناب اسد اللہ الغالب اور بڑے بھائی جناب حسن جو بمنزلہ آفتاب تھے زندہ رہے نور مہتاب زیادہ نمایاں نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ بڑوں کے ہوتے چھوٹے کا ذکر کیوں کیا جاتا۔

المختصر حضرت علی کی شہادت کے بعد آپنے معاملات میں دخل دینا شروع کیا اور ۵۰ھ یعنی اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد تو آپ ہی بنی ہاشم کے سردار ہوگئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ امیر شام اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت ولیعہدی لے رہے تھے اور تمام شام و عراق و حجاز نے باستثناء چار بزرگوں اور اُنکے توابع کے بزور حکومت یا رفع فساد کے لئے بیعت قبول کرلی تھی۔ ان چار بزرگوں میں سب سے زیادہ محترم جناب حسین تھے اور اُسیوقت سے گویا پالیٹکس میں اُنہوں نے علی الاعلان دخل دیا۔

اگرچہ جناب حسن علیہ السلام نے جنکی صلح پسند پالسی کی دنیائے اسلام ہمیشہ ممنون رہیگی اپنے آخری وقت میں نصیحت کی تھی کہ نبوت و خلافت ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہسکتی اسلئے سعناؤ کوفہ کی ابلہ فریبیوں سے بچنا اور امور مملکت سے الگ رہنا بہتر ہے۔ لیکن جناب حسین اسلام کے پولیٹکل عقاید میں یہ رخنہ اندازی کسطرح جائز نرکھ سکے کہ مسلمانوں میں بھی روم و ایران کی طرح سلطنت موروثی ہوجائے اور (بقول اونکے ایک ہزار بار کے) ہرقل کی جگہ ہرقل تخت نشین ہونے لگے۔ الغرض جناب حسین نے جو یزید کے فسق و فجور سے بھی آگاہ تھے اپنے نفس پر مصائب و تکالیف برداشت کرنا ایک فاسق کی بیعت کرنے اور مسلمانوں میں ایک بری رسم کی ابتدا کرنے سے افضل سمجھا اور باوجود سخت اصرار کے اُنہوں نے یزید کی بیعت نہ حضرت معاویہ کی زندگی میں کی اور نہ اونکے بعد۔

۴

کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کے انتقال کے بعد جب اہل شام نے یزید کی بیعت کرلی اور اُسنے حجاز سے بھی اُس وعدہ کا ایفا چاہا جو اُنکے والد کی حیات میں کیا گیا تھا تو اوسنے حاکم مدینہ کو جناب حسین سے بالجبر بیعت لینے کے لئے خاص طور پر تاکید کی دیکھو آپکا سب سے بڑا دشمن آپکی صداقت و راستبازی پر اسقدر اعتماد رکھتا تھا کہ اگر انہوں نے ایکبار برضا یا بالجبر کسی طرح بھی بیعت قبول کرلی تو ہرگز ہرگز دوبارہ سر نہ اُٹھائینگے۔ اور وہ آپکو ایسا ذی اثر بھی سمجھتا تھا کہ اگر اُنہوں نے اطاعت نہ کی تو سلطنت اسلام سے فتنہ و فساد دور نہیں ہو سکتا۔

یزید کی یہ پالیسی غلط تھی یا صحیح اُسکا آج تیرہ سو برس کے بعد کوئی ایسا تصفیہ نہیں کیا جاسکتا جسمیں شک و شبہ کی گنجائش ہو۔ اصول سلطنت و آئین جہانداری کو پیش نظر رکھکر ہر شخص یہ رائے دیگا کہ ایسی حالت میں یزید کو جناب حسین سے جبریہ بیعت لینا چاہئے تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر یزید اپنے باپ کی سنت پر عمل کرتا اور خود مدینہ میں حاضر ہو کر استمالت اور تملق سے کام لیتا اور بجائے ناجائز دباؤ ڈالنے اور شجاعت ہاشمی کو جوش دلانیکے وہ اُنسے عاجزانہ التماس کرتا کہ آپ کو اپنے جد امجد کی امت میں فتنہ و فساد ڈالنا مناسب نہیں ہے تو ممکن تھا کہ جناب سید وہی سکوت اختیار کرتے جو اُنہوں نے امیر معاویہ کے عہد میں کیا تھا یا اپنے دانشمند برادر بزرگ کی طرح تمام حقوق سے دستکش ہو جاتے اور آج اسلام کی تاریخ میں کچھ اور ہی حروف نظر آتے۔ افسوس ہے کہ یزید نے سلطنت کے زعم اور فوج کے گھمنڈ پر پولیٹیکل چالیں چلنے کی ضرورت نہ سمجھی اور بقول سر ولیم میور کے علویوں کے ہاتھ میں ایک ایسا تیز اور دو رخہ خنجر دیدیا جسنے صرف بنی امیہ کی جڑ نہیں کاٹی بلکہ اسلام میں ہمیشہ کے لئے ایک عظیم الشان تفرقہ پیدا کردیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ؎

خاکساری پیشہ کردن ہیچ میدانی کہ چیست
مشت خاشاکے بچشم دشمناں افگندن است

---

(۱) (صفحہ ۲) عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔ دیکھو کامل ابن اثیر جلد سوم

خیر۔ امور مملکت خویش خسرواں دانند۔ مختصر یہ ہے کہ حاکم مدینہ نے دمشق کی ہدایت کے موافق جناب حسینؑ سے بالجبر بیعت لینا چاہی اور آپ اُسکو بلطایف الحیل ٹالکر شبا شب مدینہ سے فرار ہوگئے اور سخت پریشانی کی حالت میں جبکہ ہر ہر قدم پر گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ مکہ معظمہ پہونچے اور وہاں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

کوئی قطعی شہادت اس امر کی نہیں ملتی کہ یزید نے حرم مقدس میں جگر گوشہ رسول کے ستانیکی کوشش کی ہو اسلئے قیاس ہوتا ہے کہ شاید یزید کی اُس پچھلی غلطی کا وہ دردناک انجام نہوتا جو ہوا اگر اُسوقت اہل عراق جنکے یہاں بغاوت کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی تھی جناب حسینؑ کو علم بغاوت بلند کرنیکے لئے اپنا سردار بنانا نہ چاہتے اور بیشمار خطوط و مکاتیب بھیجکر آپ کو اپنا دارالہجرۃ چھوڑنے اور کوفہ کی طرف آنے پر مجبور نکرتے جب سرداران عراق نے آپکے طلب کرنے میں اصرار کیا۔ خطوط کا تار باندھ دیا۔ یزید کے فسق و فجور کا اظہار کرکے صاف الفاظ میں تحریر کیا کہ اُنہوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہے اور وہ اُسکے قائم مقام کے ساتھ نماز جمعہ اور عید میں شریک نہیں ہوتے ہیں اور قراۃ العین رسول کو اُن دو چیزوں کا واسطہ دیکر جنسے زیادہ کوئی چیز اوسکو محبوب نہیں ہوسکتی تھی "یعنی دین و رسول" اس غرض سے کوفہ بلایا کہ وہ امت نبی امی کو اُس گمراہی و کجروی سے بچائیں جو بادشاہ اسلام کے علی الاعلان معاصی سے عالمگیر ہوا چاہتی ہے تو آپنے مجبوراً عزلت و گوشہ نشینی ترک کرکے خالصۃً لوجہ اللہ کوفہ کا قصد کیا اور اسطرح لفظ "سیر و" کے اُس قدیم مفہوم کے مصداق بنے کہ اپنے ملک و قوم کے فائدہ کے لئے بے خوف و خطر ایک امر خطیر کا بیڑہ اُٹھایا اور اپنے ابناء جنس کے نفع کے لئے خود مصیبت و تکلیف اُٹھانا قبول کیا۔

اس مقام پر چند باتیں قابل غور ہیں اول تو یہ کہ اُسوقت مکہ میں بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب رسول اللہ اور ہزاروں تابعین جنکے اقوال و افعال سے آج تمام دنیا کے مسلمان استناد کرتے ہیں موجود تھے اُنہوں نے اپنے نبی کے عزیز نواسہ کا ساتھ کیوں نہ دیا۔ دوسرے یہ کہ سید مظلوم اس سفر مصیبت میں جسکا انجام ابتدا ہی سے پُرخطر معلوم ہوسکتا تھا اپنے

اہل و عیال کو کیوں ساتھ لے گئے۔ اور تیسرے یہ کہ جناب شہید نے صرف ستر اسی آدمیوں کی مختصر جماعت ساتھ لیکر یزید کی باقاعدہ اور بے شمار فوج سے مقابلہ کے لئے نکلنے کی کیونکر جرأت کی۔

ان تینوں شبہوں کے متعلق کتب سیر و تواریخ میں کوئی صاف جواب موجود نہیں ہے۔ لیکن قیاس ہوتا ہے کہ شاید جناب حسین نے مصالح ملکی پر نظر کرکے اپنے قصد سفر کو مخفی رکھا اور روانگی کی صحیح تاریخ بھی کسیکو نہیں بتائی ورنہ ممکن نہ تھا کہ آپکے شورا غنتی پر ایک عالم اُمنڈ نہ آتا اور تمام عرب میں تہلکہ نہ مچ جاتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آپ کی روانگی از مکہ کی تاریخ میں مورخین کو اختلاف ہے اور اختلاف بھی ایسا عظیم کہ قریب قریب کل علما و مجتہدین متفق ہیں اس دعوی پر کہ آپ قبل حج کے مکہ سے رخصت[1] ہوگئے اور بعض مورخ بھی یہ کہکر کہ آپ مکہ سے اُسیدن روانہ ہوئے جسدن حضرت مسلم بن عقیل (جناب حسین کے چچا زاد بھائی جو بطور سفیر کے پیشتر سے کوفہ روانہ کئے گئے تھے اور جنہوں نے وہاں سے رپورٹ کی تھی کہ دس بارہ ہزار مسلمان آپکا ساتھ دینے کو تیار ہیں آپ یہاں تشریف لائیے) کوفیوں کی بیوفائی اور بدعہدی سے شہید ہوئے (اور جسکی تاریخ بقول مشہور ۲ ذالحجہ سنہ ۶۰ھ ہے) آپ کی تاریخ روانگی قبل حج کے بتاتے ہیں لیکن محقق اور عالم مورخ مثل ابن الاثیر اور جلال الدین سیوطی وغیرہ کے آپ کی تاریخ روانگی ۸ ذالحجہ یعنی حج کے دوسرے دن قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حج کے موقعہ پر جبکہ مکہ میں ہزاروں مسلمان دور دور سے آکر اکٹھا ہوئے ہونگے اور اُنمیں سے بیشتر زیارت جمال باکمال فرزند رسول اللہ کے ضرور مشتاق ہونگے اگر آپ گوشہ نشین اور عزلت گزیں ہوتے اور آپ کا قصد سفر بغرض دفع تسلط یزید بالکل مخفی ہوتا یا آپ بغیر اس خبر کو عام کئے دفعتہً بلا اطلاع عراق کی طرف راہی ہو چکے ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ آپ کی روانگی

[1] ہمارا ہیرو پوئیٹ کہتا ہے۔

اعدا نے گزرنے نہ دیئے حج کے بھی ایام	کھولا پسر فاطمہ نے باندھکے احرام
عازم طرف راہ الٰہی ہوئے حضرت	تھی ہشتم ذیحجہ کہ راہی ہوئے حضرت

کی صحیح تاریخ[1] تمام مسلمانوں کو معلوم ہو جاتی اور اسمیں کچھ بھی اختلاف پڑتا بلکہ گمان غالب ہے کہ اس راز کے افشا ہو جانے سے بہت سے بندگان خدا اور حلقہ بگوشان نبی اکرم کو جوش آجاتا اور وہ بھی انکی مدد کے لئے وہی راہ اختیار کرتے جو انہوں نے کی تھی اور اسطرح تاریخ کربلا کا ورق اُلٹ جاتا۔

البتہ یہ مسلم ہے کہ آپ نے سفر کا قصد اپنے عزیزوں اور احباب سے ضرور ظاہر کیا تھا اور وہ سب بالاتفاق اس رائے کے خلاف تھے بلکہ حضرت ابن عباس اور (بقول بعض) محمد ابن حنفیہ نے تو آپکے روکنے میں بیحد اصرار کیا اور عبد اللہ ابن عمر نے تو یہانتک کہا کہ خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا و آخرت کے اختیار کرنے میں مختار کیا تھا آپنے آخرت کو پسند فرمایا۔ آپ چونکہ رسول اللہ کے لخت جگر ہیں اسلئے آخرت ہی کو اختیار فرمائی مگر جناب حسین کے دلپر کوفہ والونکی تحریر کا ایسا اثر تھا کہ اُنہوں نے کسیکی بات نہ مانی اور اس قول پر عمل نہ کیا کہ

[1] ممکن ہے کہ جناب حسین نے مکہ سے اُسیدن سفر کیا ہو جسدن کہ مسلم بن عقیل کوفہ میں شہید ہوئے لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ہم اس واقعہ پر غور کرتے ہیں، تو ہمکو یہ روایت ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ بمقدار زیادہ اس حکایت کی تحقیق کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ شکوک اور اوہام میں گرفتار ہوتے ہیں۔ عجب تماشہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے سے محقق جنکو فلسفۂ تاریخ کی ایجاد کا فخر حاصل ہے حضرت مسلم کے کوفہ میں داخل ہونیکی تاریخ پہلی ذالحجہ ۶۰ھ بتاتے ہیں اور بعض مورخ اسنے بھی ایک نمبر اور بڑھا کر ایکی روانگی از مکہ جانب کوفہ کی تاریخ آٹھویں یا نویں ذیحجہ بتاتے ہیں اور اسطرح آپکے کوفہ پہونچنے کی تاریخ گویا کہ آخر ذالحجہ میں قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلم نے کوفہ پہونچکر ہزاروں مسلمانوں سے بیعت لی اور جناب حسین کی خدمت میں مفصل رپورٹ بھیجی اور جسکو پڑھکر سید شہید قبل حج کے پانچ کے دوسرے دن (!!) مکہ سے روانہ ہو گئے اور اسی عرصہ میں یہ واقعہ بھی گزر گیا کہ کوفہ سے یزید کے پاس مسلم کے آنے اور ایک گروہ کثیر کا اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی خبر پہونچی اور اوسنے حاکم کوفہ کو تبدیل کیا اور جدید حاکم نے مسلم کو اُسیدن شہید کیا جسدن کہ جناب حسین مکہ سے روانہ ہوئے تھے (!!)

طرہ یہ ہے کہ باوجود ان مختلف بیانوں کے حضرت مسلم کی تاریخ شہادت بقول مشہور ۹ ذالحجہ بتائی جاتی ہے۔ اور ہم آج یہ دریافت نہیں کر سکتے کہ ان تمام تاریخوں میں کون سی صحیح ہے اور کوئی بھی صحیح ہو یا نہیں ۱۲

(امیر احمد)

حضرت ابن عمر کے اس قول سے خیال ہوتا ہے کہ شاید بعض بزرگ اُسوقت بھی خروج فرزند رسول اللہ کو بشوق طلب مملکت و امارت خیال کرتے تھے اور اسکی تائید یوں ہوتی ہے کہ تاریخ طبری کا فارسی مترجم جو نشۂ الفت آل نبی سے خوب سرشار ہے (اور اسی ذوق شوق میں چند ایسے واقعات بھی داخل کتاب کر گیا ہے جنکو ابو جعفر طبری کے ہم مذہب آج تسلیم نہیں کرتے) اس موقع پر لکھتا ہے کہ "عبداللہ ابن عباس سوی او آمد گفت یا ابن رسول اللہ از مکہ مرو و حرم خدائے عزوجل را رہا مکن۔ پدرت کہ در مدینہ را رہا کرد و کوفہ را بر ہمہ راجا یہا گزید و ایشاں را دیدی کہ با او چہ کردند و آخر او را بکشتند۔ و برادرت حسن را زہر دادند و پیش از زہر او را خواستند کہ بکشند و غارت کنند۔ اکنوں تو بر ایشاں این مباش نہ بنامہ و نہ بہ بیعت و نہ بسوگند۔ حسین گفت اے پسر عم کار خیر آنست کہ تو دانی و نامۂ مسلم بن عقیل آمدہ است کہ دوازدہ ہزار مرد بیعت کردند و دہ رسول پیش آمدند و از کوفیان دویست نامہ پیش آمدہ است۔ عبداللہ گفت باری بیائی تا ماہ ذالحجہ بگزرد و سال نو اندر آید کہ اکنوں وقت حج است و ہمہ جہاں بمکہ آیند و تو ہی از مکہ بروی بطلب این جہاں و بطلب مملکت مردمان زشت گویند تا حج بکنی و حجاج باز گردند آنگاہ بروی نیکوست۔ حسین گفت این کار تاخیر ندارد۔"

اگر یہ خیال صحیح ہے تو اُس پہلی بات کا کافی جواب ہو گیا کہ مکہ سے نکلتے وقت جناب حسین کے ساتھ زیادہ جمعیت اسوجہ سے نہ تھی کہ اول تو وہ حج کا زمانہ تھا اور دوسرے یہ کہ بعض بزرگان دین جناب حسین کے اس خروج میں طلب امارت کا جزو شامل سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں کا یہ گمان صحیح تھا یا نہیں اسکا جواب میرے پاس ابھی کچھ نہیں ہے۔ جناب حسین کی آئندہ زندگی خود اس دعویٰ کو غلط یا صحیح بتا دیگی۔

رہی وہ دوسری بات کہ جناب حسین اپنے اہل و عیال کو کیوں ساتھ لے گئے اسکا جواب ناواقفوں کے لئے تو یہی کافی ہے کہ جناب حسین کو اندیشہ تھا کہ میرے غیبت میں یزید کے تابعین اہل و عیال کو ایذا پہونچائینگے جسکا انجام ممکن ہے کہ جدال و

قتال پر ہوا اور اُس سے حرم مکہ کی بے حرمتی ہو لیکن جنہوں نے کہ مسلمانوں کی تاریخ
تمدن کو غور سے پڑھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اُسوقت تک عرب میں وہ حضریت
پیدا نہیں ہوئی تھی جو آخر عہد بنی امیہ سے شروع ہوئی اور ہارون - مامون - اور معتصم کے
زمانہ میں کمال کو پہونچی بلکہ سنہ ۶۰ھ تک مسلمانوں میں عموماً اور خاندان نبوت میں خصوصاً
وہی بدویت کی سادگی باقی تھی جو تمام سچی ترقیوں کا اصلی ذریعہ ہوا کرتی ہے اور جسکا
تقاضا ہے کہ انسان ہر حالت میں اپنے اہل وعیال کو ساتھ رکھے اور میدان جنگ
میں تو ضرور ہی ساتھ لیجائے تاکہ اُنکی مصیبت و تکلیف کا خیال کرکے رگ شجاعت
کو حرکت ہو اور میدان جنگ سے قدم نہ ہٹے - دیکھو وہ بے سروسامان عرب
جو یرموک اور قادسیہ کی لڑائیوں میں شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے اُنکے ساتھ
بھی بیویوں اور بچوں کا بار موجود تھا اور اگر واقدی کا بیان صحیح ہے تو بعض موقعوں
پر صرف انہی بے زبان عورتوں کی مدد سے لڑائی کا پانسہ پلٹا تھا اور فتح کا سہرا عرب کی
بیم مہذب مخلوق کے سر رہا تھا - الغرض ماہرین فن سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اُسوقت
تک عورتوں کا میدان رزم اور سفر مصیبت میں ساتھ ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی
بلکہ جب تک مسلمانوں پر حضریت کا پورا غلبہ نہیں ہو گیا اور اُنہوں نے اپنی قدیم
پاکیزہ بدویت کو عراق و شام کے سبزہ زار دیکھکر بالکل فراموش نہیں کر دیا وہ ہمیشہ
مال عرب پیش عرب کے قیمتی اصول پر کاربند رہے -

وہ تیسرا وسوسہ کہ جناب حسین نے اسقدر قلیل جماعت ساتھ لیکر خروج کی کیونکر
جرأت کی بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے جب ہم اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ جناب
حسین کو یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ اہل عراق فوراً منحرف ہو جائینگے اور اسطرح راستہ ہی
میں جنگ وجدل کی نوبت آئیگی بلکہ وہ تو کوفہ کی نیت سے چلے تھے جہاں سے اُنکے
مخبر نے رپورٹ کی تھی کہ بارہ ہزار مسلمان آپکے لئے سر کٹانیکو تیار ہیں اور اسمیں کچھ شک
نہیں کہ اگر کوفی اپنے قول و قرار پر قائم رہتے تو عراق کا فتح ہو جانا کچھ دشوار نہ تھا
اور اُسکے بعد حجاز میں بھی بغاوت کی وہی آگ ضرور مشتعل ہو جاتی جسکو عبد اللہ بن

زبیر نے کچھ دنوں کے بعد اپنی ضرورت کے لئے بھڑکایا اور اسطرح یزید کا تسلط رفع ہو جاتا جو خروج حسین کا اصل مقصد تھا۔

القصہ جناب حسین ذی الحجہ ۶۰ھ میں مکہ سے مع اہل و عیال بقصد کوفہ روانہ ہوئے اور ادھر یزید کے یہاں یہ خبر گزری کہ حسین نے حرم مقدس کو چھوڑ کر عراق کا قصد کیا ہے اوس نے فوراً اپنے عامل عراق کو حکم دیا کہ فوج لیکر جنگل ہی میں انکا راستہ روکے اور انکو اطاعت پر مجبور کرے۔

حاکم عراق عبید اللہ ابن زیاد جو حضرت مسلم بن عقیل کو جنہوں نے ایک بہت بڑی جماعت اپنی تابعین کی کوفہ میں اکٹھا کر لی تھی پہلے ہی شہید کر چکا تھا اب شہادت حسین کے درپے ہوا اور اسنے صوبہ رے کے گورنر عمر ابن سعد کو تعینات کیا کہ فوج کے چار دستے لیکر بادیہ عراق میں حسینی گروہ سے مقابلہ کرے۔

کہتے ہیں کہ جناب حسین قادسیہ تک جو کوفہ سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر ہے پہونچنے تھے کہ انکو کوفیوں کے منحرف ہو جانے اور حضرت مسلم کی شہادت کا حال معلوم ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی خبر ملی کہ عمر بن سعد چار ہزار فوج لئے انکی تلاش میں چلا آتا ہے مجبوراً آپنے کوفہ کا قصد ترک کیا اور شاہراہ کو چھوڑ کر ۲ محرم کو مقام کربلا میں پہونچے جہاں دوسرے روز ابن سعد بھی مع لشکر کے پہونچ گیا اور اب یہاں سے رہائی دشوار ہو گئی۔

اسوقت حضرت حسین کو معلوم ہوا کہ انہوں نے کوفیوں کے قول و قرار پر اعتماد کرنے میں خطا کی اور انکو یقین ہو گیا کہ اس مختصر جمعیت کے بھروسے پر (جسکی تعداد ایک چالیس سوار و پیادہ سے زیادہ کسی روایت کے موافق نہیں ہے) کوفہ کی مدد کے بغیر یزید کی فوج سے مقابلہ کرنے میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لہذا آپنے بقول مورخین تین شرطیں پیش کیں کہ یا تو تم مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنے وطن کو واپس جاؤں اور بقیہ عمر بیاد خدای عز و جل میں بسر کروں یا مجھے اجازت دو کہ میں سرحدی ممالک میں جا کر کفار سے جہاد کروں اور وہیں درجۂ شہادت پاؤں یا میرا راستہ نہ روکو تاکہ میں خود یزید کے

پاس چلا جاؤں اور وہ میرے ساتھ جو معاملہ چاہے کرے۔ ابن سعد نے ان شرائط کو بجا سمجھا اور حاکم عراق سے نامہ و پیام شروع کیا لیکن عبید اللہ ابن زیاد نے جسکو ہم اس عبرت ناک ٹریجڈی کا اصلی مجرم سمجھتے ہیں۔ انمیں سے ایک شرط بھی قبول نکی اور حکم دیا کہ اگر حسین بیعت کریں تو خیر ورنہ اونکو قتل کرو۔ اور چونکہ اسکو ابن سعد کی وفاداری پر شک تھا اسلئے ایک اور جنرل بھی روانہ کیا جسکو حکم تھا کہ اگر ابن سعد جنگ میں اب بھی لیت و پیش کرے تو وہ لشکر کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیلے۔

جناب حسین کے لئے یہ بڑے سخت امتحان کا وقت تھا اور یہیں سے انکا اصلی کریکٹر ظاہر ہوتا ہے جو ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔

دیکھو اگر سید طلب ملکت کے شوق میں مکہ سے نکلے تھے تو آج اوسکی کیا آس باقی ہے وہ بارہ ہزار کوفی جنکے فریب میں آکر خدا کا گھر چھوڑا تھا آج اپنی تلواریں یزید ہی کیطرف سے نکالے ہوئے ہیں۔ وہ ہزاروں صحابہ اور بزرگان دین جو انکے اشارہ پر اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتے آج سیکڑوں کوس کے فاصلہ پر مکہ مدینہ میں پڑے ہوئے ہیں اور انکے درمیان ایک عظیم الشان ریگستان حایل ہے اور وہ شہر جسکو اپنا مستقر بنانے اور وہاں سے جنگ یزید کے لئے باہر نکلنے کا قصد تھا آج یہاں سے کئی منزل دور اپنے پھاٹک انکے لئے بند اور دشمنوں کے لئے کھولے ہوئے ہیں۔ ایک مختصر جمعیت انکے ساتھ ہے جنمیں سے بیشتر تو اپنے ہی بھائی بھتیجے اور بیٹے ہیں جنمیں سے ہر ایک کی زندگی اُس محترم بزرگ کو اپنی جان سے بدرجہا زیادہ عزیز ہے۔ اور علاوہ اسکے عورتوں اور بچوں کا بوجھ بھی ساتھ ہے جسکو کسی امن و عافیت کی جگہ پہونچانیکا اب کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا۔ دشمن کا ایک عظیم الشان لشکر انکے سامنے پڑا ہوا ہے اور ہر وقت اوسکی تعداد میں اضافہ ہو جانا ممکن ہے اور وہ لشکر اس جمعیت مختصر کو ضرور پامال کر ڈالیگا اگر جناب حسین یزید کی بیعت نہ کریں۔

بیسویں صدی کا کوئی اسٹیٹسمین وہاں موجود ہوتا تو ضرور صلاح دیتا کہ جناب اسوقت بیعت قبول کیجئے اور اپنی جان بچایئے۔ پھر جب موقع ہوگا دیکھا جائیگا۔ یہ تو سین اسٹیفانو کا

۱۲

جبریہ عہدنامہ یا زار روس کا اضطراری مینیفیسٹو ہے۔ مدبرین عالم کی نظر میں اسکی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے اور ہم بھی کہتے ہیں کہ اگر حسین کی غرض خروج سے حصول مملکت تھی تو اُنکو بیشک اطاعت قبول کر لینا چاہیے تھا کیونکہ اسوقت جنگ کرنا اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا تھا۔ چنانچہ خود سید مظلوم کو بھی فتح سے مایوسی اور موت کا یقین ہے دیکھو اس موقع پر وہ اپنے سب ہمراہیوں۔ نوکروں اور غلاموں کو بیعت سے آزاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "جو تمہارا حق تھا وہ تمنے کیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں مجھکو جنگ پیش آئیگی ہم تھوڑے ہیں اور وہ بہت ہیں اپنی طرف سے ناامید ہوں لیکن یہ لوگ تم سے کچھ تعرض نکرینگے۔ جہاں تم چاہو چلے جاؤ میں تمکو بخوشی اجازت دیتا ہوں"۔ مگر وہ سب بالاتفاق جواب دیتے ہیں کہ "ہم فرزندزادگان رسول خدا اور بہترین خلق کو کسیطرح نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر آج ہم اپنی جان بچالیں تو کل قیامت کے دن سیدالانبیا سے کسطرح کہینگے کہ ہم آپکے لڑکوں کو لائے اور دشمنوں کے درمیان چھوڑ کر خود چلے آئے۔ معاذاللہ یہ ہمسے ہرگز نہوگا"۔

اب غور کرو کہ ایسی مایوسی کے عالم میں جبکہ ہر طرف سوائے موت کے کچھ نظر نہیں آتا تھا اگر سید کی نظر میں حیات وممات کا مرتبہ بالکل یکساں نہوتا اور اُنکو اسبات کا یقین کُلی نہوتا کہ میں خالصۃً للہ ایک کار خیر کے لئے نکلا ہوں اور اگر اس کوشش میں میرا سر جائے تو وہ لاکھہ زندگیوں سے افضل ہے تو ممکن نہ تھا کہ اُنکا قدم ڈگمگا نہ جاتا اور وہ اطاعت نہ قبول کر لیتے۔ لیکن جناب حسین نے اسوقت اپنی سچی شجاعت اور یگانہ آفاق دلیری ابدالآباد کے لئے تاریخ عالم میں یادگار بنادی اور صبر وتحمل کی سخت آزمائش میں مستقل رہکر ایسی جبریہ بیعت سے صاف انکار کردیا جسکو اُنکا کانشنس قبول نہیں کرتا تھا اور جسکو وہ اپنے ملک قوم اور مذہب کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ سچ ہے ؎

عطر کی مٹی میں بھی مل کر مہک جاتی نہیں

ترجیح اسی روایت کو ہے کہ محرم کی نویں تاریخ اور جمعرات کا دن تھا جب انہوں نے یہ شجاعانہ جواب دیا۔ اب جنگ سے کیا پہلو تھا۔ صرف ایک شب کی اماں کسی مصلحت سے جناب مظلوم

۱۳

نے طلب کی تھی اور دوسرے روز موت یونہیں یقینی تھی کہ شام کو ابن سعد کے پاس عبید اللہ ابن زیاد کا قاصد یہ پیام لیکر آیا کہ اگر حسین سے جنگ کرنا ہے تو اُنکے دریائے فرات تک پہونچنے کا راستہ بند کردو تاکہ گرمی اور پیاس کی سخت تکلیف سے مضطرب ہوکر اُنکا باغی کوشیکا فرزند یا تو اطاعت کرلے یا اوسکی ہلاکت سہل ہو جائے۔

میدان جنگ میں دشمن کا دانہ پانی بند کرنا آج کے اصول جنگ کو دیکھتے کوئی غیر معمولی بزدلانہ۔ یا وحشیانہ حرکت نہیں ہے۔ اور تاریخ اسلام میں بھی اسکی بیسیوں نظیریں موجود ہیں بلکہ واقعہ کربلا سے پیشتر خود جناب حسین کے والد ماجد[1] پر اسی فرات کا پانی بند کیا جا چکا تھا لیکن غالباً جناب سید الشہدا کی جمعیت کو پیشتر سے خیال نہ تھا کہ آب فرات جس سے چرند پرند سب سیراب ہوتے ہیں "باعث خلقت کون و مکان" کے فرزند پر بند کردیا جائیگا لہذا اُنہوں نے پہلے سے پانی کا کافی ذخیرہ اپنے پاس فراہم نہیں کرلیا ورنہ اسقدر مختصر جمعیت کے لئے کافی پانی رکھ چھوڑنا کچھ دشوار نہ تھا۔ غرض رات ہی سے پانی کی طلب شروع ہوئی اور صبح ہوتے ہوتے تو سارے لشکر میں ایک قطرہ پانی بھی نہ تھا جس سے کوئی بچہ بہلا دیا جاتا مگر وہ جانباز اور مستقل مزاج بہادر جو راہ خدا میں اپنا سر کٹانیکے خود ہی مشتاق ہو رہے تھے ایسے شدائد اور مصائب کی کیا پروا کرسکتے تھے۔ اُنکے رضا و تسلیم میں ذرہ برابر بھی تنزل نہیں آیا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اگلے وقتوں کے مورخ ملکی معاملات کی تحقیق و تفتیش میں اسقدر محو رہتے تھے کہ اُنکی کتابوں سے کسی ہیرو کی پرائیوٹ لائف دریافت کرنا مشکل ہے لیکن کربلا کی یہ رات کچھ ایسی دردانگیز تھی کہ عرب کا ایک مورخ اپنے اصول کے خلاف اس موقع پر جناب حسین کی پرائیوٹ زندگی کی ایک نہایت ہلکی جھلک دکھاتا ہے۔ آؤ اسکی حکایت بھی سُن لیں۔

"شام کے وقت آپ خیمہ میں تشریف لے گئے۔ طبیعت پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دردناک

[1] دیکھو تاریخ ابن خلدون۔ کتاب ثانی۔ واقعہ صفین۔

اشعار پڑھنے لگے۔ آپ کی بہن نے ان اشعار کو سنا تو ضبط نہ ہو سکا۔ گھبرا کر یہ کہتی ہوئی دوڑ پڑیں کہ "ہائے افسوس! کاش آج میں زندہ نہ ہوتی۔ میری ماں مر گئیں۔ میرے باپ مجھ سے جدا ہو گئے۔ میرا بھائی جاتا رہا۔ اے خلیفۂ ماضی و حاضر پرست باقی یہ کیا فرما رہے ہو" آپ نے ہمشیر کو ایسی بے صبری کے کلمات سے منع فرمایا اور کہنے لگے کہ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اسکے حکم پر صابر و شاکر رہو اور یہ جان لو کہ زمین و آسمان سب کو فنا ہے اور بیشک سوائے اللہ تعالیٰ کے کل شے فنا ہونیوالی ہے۔ میرا باپ مجھ سے بہتر تھا۔ میری ماں مجھ سے افضل تھیں۔ میرا بھائی مجھ سے زیادہ نیکوکار تھا۔ رسول اللہ جنکے ہم سب پیروی کرتے ہیں۔ وہ بھی دنیا سے اٹھ گئے تو ہم کس شمار میں ہیں۔ اے میری بہن میں تمکو قسم دلاتا ہوں کہ کل اگر میں مارا جاؤں تو جامہ دری نکرنا۔ رونا۔ پیٹنا نہیں۔ بین نکرنا۔ نوحہ نہ پڑھنا۔ اے بہن یہی دن سب کو پیش آنے والا ہے۔ صبر کرنا صبر۔ صبر کا اجر اللہ دیگا۔"

القصہ دسویں محرم ۶۱ھ ہے اور جمعہ کا دن۔ بادیۂ عراق کی ایک ہولناک وادی میں دریائے فرات کے کنارے ابن سعد کا لشکر مسلح ہو کر صف آرا اور مستعد جنگ ہوا ہے اور اوسکے مقابلے کے لئے ایک خستہ حال سید اپنے چند بچوں اور خادموں کو ساتھ لیکر جو سفر کی صعوبتوں اور تشنگی کی شدائد سے سراسیمہ ہو رہے ہیں خیمہ سے نکلا ہے لیکن اس مختصر گروہ کی زبان سے نہ کوئی کلمہ شکوہ و شکایت کا نکلتا ہے اور نہ اپنی غریب الوطنی اور بیکسی کی موت پر انکو کچھ تاسف ہے بلکہ انکے چہروں سے صداقت خلوص۔ استقلال۔ اور ایمان کا نور تاباں ہے اور گویا کہ میر انیس کا یہ بند صادق الحال ہے

خیمہ تھا فلک آپ قمر دست ستارے	تارے بھی وہ تارے تھے فلک جنپر اتارے
خم ہو گیا تھا پیر فلک شرم کے مارے	کہتی تھی زمیں اوج ہے طالع کو ہمارے

خورشید ہے یا روشنی نیر دیں ہے
خود عرش کو دھوکا تھا یہ میں ہوں کہ زمیں ہے

۵ اس جنگ کے دردناک حالات مورخوں نے تفصیل کیساتھ بیان کئے ہیں لیکن میں اونکا

اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ ہے کہ دشمن کو مستعد بجنگ دیکھکر جناب حسین نے قلع
حجت کے لئے پہلے ایک دردناک خطبہ دیا جسمیں اپنے فضایل وحقوق بیان کئے اور آخر
میں یہ درخواست پیش کی کہ "ہم مجھے چھوڑ دو تاکہ میں کسی محفوظ سرزمین کی طرف چلا
جاؤں" لیکن جب فریق مخالف سوائے بیعت کے کسی شرط پر راضی نہوا تو آپ نے
فرمایا کہ "خدا کی قسم میں ذلیل وخوار ہو کر تمہارا مطیع نہونگا اور نہ میں غلاموں کی طرح مجبور
ہو کر یزید کی امارت کا اقرار کرونگا اے اللہ کے بندو! میں اپنے اور تمہارے
رب سے امن کا خواستگار ہوتا ہوں اور ہر متکبر اور اُس شخص سے جو آخرت پر ایمان
نہیں رکھتا۔ اللہ تعالی سے پناہ مانگتا ہوں" یہ کہکر آپنے گفتگو ختم کی اور اسکے تھوڑی
ہی عرصہ کے بعد تیر باری شروع ہو گئی جسکا انجام یہ ہوا کہ پہلے تو حسینی جمعیت کے
قریب قریب کل مرد یکے بعد دیگرے شہید ہوے اور اسطرح سرنوشت کا وہ لکھا پورا
ہوا کہ۔

"پہونچینگے یہ حسین سے پہلے بہشت میں"

اور بعد ازاں خود جناب حسین نے جام شہادت نوش فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہے عالم فانی کی عجب صبح عجب شام	گہہ غم کبھی شادی کبھی ایذا کبھی آرام
گودی ہے کبھی ماں کی کبھی قبر کا آغوش	گہہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسر دوش
اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ سُن کو	شب کو جو چھپر کھٹ پہ تو تابوت میں ذکو

کس باغ پہ آسیب خزاں آ نہیں جاتا
گل کونسا کہلتا ہے کہ مرجھا نہیں جاتا

جناب حسین کے بعد اُنکے وارثوں پر کیا گزری اور کارواں کربلا سے کوفہ اور دمشق میں
کیا سلوک کیا گیا ہمکو اُس سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہمارا مقصود تو جناب شہید کے کیریکٹر پر
ریویو کرنا تھا اور وہ اُنکی زندگی کے ساتھ تمام ہو گیا۔

ہمنے تحقیق کر لیا کہ جناب حسین جرم بغاوت کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ مسلمانوں میں
اُسوقت تک ہر قتل کے جگہ ہر قتل کے تخت نشین ہونیکا قاعدہ جسکو آج کل لاآف پریما

پیچیدہ قانون وراثت حاف اکبر سے تعبیر کرتے ہیں جاری نہیں ہو چکا تھا اور اسلئے یزید کو ہرگز حق نہیں حاصل تھا کہ وہ امیر معاویہ کے بعد مکہ اور مدینہ سے اجازت حاصل کئے بغیر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیلے۔ اگر امیر معاویہ کی وصیت اور اُس بیعت کا لحاظ کیا جائے جو اُنہوں نے اپنی زندگی میں یزید کیلئے حاصل کی تھی تب بھی جن بزرگوں نے کہ اُسوقت بیعت سے انحراف کیا تھا بیشک اختیار رکھتے تھے کہ اب بھی اطاعت سے انکار کریں اور اس امر پر مُصر ہوں کہ جو لوگ یزید سے زیادہ حکومت کے مستحق ہیں اُنمیں سے کوئی خلیفہ بنایا جائے۔ چونکہ جناب حسین نے امیر معاویہ کی حیات میں بیعت نہیں کی تھی اسلئے وہ ہرگز پابند نہ تھے کہ یزید کو حاکم جایز تصور کریں اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اُنکا خروج عرب کی تاریخ تمدن کو پیش نظر رکھکر بغاوت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علاوہ اسکے جناب حسین نے اگرچہ خود یزید کی بیعت سے گریز کیا اُنہوں نے کسی دوسرے کو اپنا ہمخیال بنانیکی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ بے شک بیعت یزید کی ذلت سے بچنے کے لئے مکہ چلے گئے لیکن وہاں وہ نہ تو اپنے تابعین کی کوئی جماعت اکٹھا کر رہے تھے اور نہ باغیانہ خیالات کی اشاعت میں اپنا وقت عزیز صرف کرتے تھے بلکہ اُنہوں نے عراق کا قصد بھی اُسوقت تک نہیں کیا جب تک کہ کوفہ کے معزز لوگوں نے یہ صاف صاف تحریر نہیں کیا کہ وہ یزید کی بیعت سے دستکش ہیں اور اُسکے نائب کے ساتھ نماز جمعہ اور عید میں شریک نہیں ہوتے ہیں جو اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ اُنہوں نے خود ہی یزید سے سرکشی کی ہے اور اب اپنا جتھا مضبوط کرنیکے لئے خاندان رسالت کی ایک معزز ممبر کو اپنا لیڈر بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی بجائے اسکے کہ جناب حسین پر بغاوت کا الزام لگایا جائے ہمکو تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اُنکو مسلمانوں کے ایک گروہ نے بہکا کر اپنا سردار بنانا چاہا اور وہ اُنکے فریب میں آکر کوفہ کی طرف راہی ہوئے تھے کہ اُن بزدل اور کم ہمت باغیوں نے وعدہ خلافی کی۔ خود الگ ہو گئے اور سارا الزام سید مظلوم کے سر تھوپ دیا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب جناب حسین نے کوفیوں کی اغوا سے خروج کیا تو اُنہوں نے اپنی حرکت کا اندازہ غلط نہیں کیا تھا اور اگر اُن کی خروج سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں ہوا تو اوسکی وجہ کوفیوں کی بدعہدی تھی جسکی مثال ایک حد تک یہ ہو سکتی ہے کہ بارہویں

صدی عیسوی میں شہنشاہ انگلستان اس نیت سے ایشیا آیا کہ یورپ کے چند مقتدر تاجداروں کی مدد سے اپنا مقدس مذہبی شہر دشمنوں کے پنجہ سے چھڑائے لیکن یہاں ایک ارمن کردکی شجاعت دیکھکر یکے بعد دیگرے کل تاجدار ہمت ہار گئے اور مجبوراً انگلستان کے شیردل بادشاہ کو قید کے مصائب برداشت کرنیکے لئے ناکام واپس جانا پڑا۔

ہمنے یہ بھی دریافت کرلیا ہے کہ جناب حسین کی نیت خروج سے حصول سلطنت نہ تھی بلکہ وہ ایک ظالم کا شر دور کرنا اور اپنے ملک کو مطلق العنان حاکموں کے ظلم وجور سے بچانا چاہتے تھے اور اسلئے انکا خروج ایک غیر مذہب کے مورخ کی نظر میں کم سے کم ویسا شریفانہ تو ضرور تھا جیسا کہ بروس یا کرامول کا۔

المختصر انگریزی مورخ کا وہ دلخراش فقرہ جو اس طویل مضمون کی تحریر کا باعث ہوا کسی طرح بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور جناب حسین کے مذہبی عظمت واقتدار اور انکی ذاتی محاسن وکمالات سے قطع نظر کرکے صرف وہی روایتیں جو واقعہ کربلا کے متعلق کتب تواریخ میں مندرج ہیں اس دعوے کے ثابت کرنیکے لئے کافی ہیں کہ جناب حسین کا مرتبہ اس سے بدرجہا اعلیٰ تھا کہ سر ولیم میور یا انکے معتقدوں کا وہم وخیال بھی وہاں تک پہونچ سکے اور اونکے اقوال وافعال اسقدر بلند پایہ رکھتے ہیں کہ آج دنیا جسکی آنکھوں پر مادی ترقیات نے غفلت کا تاریک پردہ ڈالدیا ہے ہرگز انکی کنہ وعلت دریافت نہیں کرسکتی۔

جو ان کی نظر میں حسن نما ہے آج نقص بتاتے ہیں اور جسکو وہ داخل عیب سمجھتے تھے وہ آج سرمایۂ تہذیب ہے!! تم کہوگے کہ انہوں نے مفت میں جان دی اور وہ کہتے ہیں کہ

ہر کس کہ جان نداد بجانان نمیرسد!!!

بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جناب حسین نے جو کچھ کیا وہ سچے دل اور پاک نیت سے تھا۔ انکا پاک دل صدق وخلوص سے لبریز تھا اور وہ اسقدر جرات وہمت رکھتے تھے کہ جو دل میں تھا اسے زبان پر لائے۔ جو انکا اعتقاد تھا اس سے جب تک دم میں دم رہا منحرف نہیں ہوئے۔ اور اگر اپنے کانشنس (نفس مطمئنہ) کے خلاف عمل نکرنے کی جرم میں وہ قتل کئے گئے تو ایسی معزز موت بے شک لاکھ زندگیوں سے افضل تھی۔

سرگشتہ برنیزہ میسزد نفس	غلط	کہ معراج مرداں ہمیں است وبس

طالبعلم اور پالیٹکس

مندرجہ بالا عنوان کے دیکھنے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ آیا طالبعلموں کو پولٹکل معاملات میں حصہ لینا چاہیئے کہ نہیں اور اگر حصہ لینا چاہیئے تو کس حد تک۔ ان سوالات کا صحیح جواب لفظ پالیٹکس کی تشریح پر منحصر ہے۔

پالیٹکس کا لفظ بہت وسیع ہے۔ لیکن اس خاص موقع پر ہم اسکا عام مفہوم ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ پالیٹکس وہ فن ہے جسے فرمانروا سے وقت اور رعایا کے تعلقات کی تفسیر سمجھنا چاہیئے یا حاکم و محکوم کے باہمی حقوق و فرائض کی تشریح۔ مثل دیگر فنون کے پالیٹکس کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کا تعلق محض پولٹیکل حقوق و فرائض اور مسائل ملکی کے مطالعہ سے ہے۔ دوسری شاخ سے عملی پالیٹکس مراد ہے۔ یعنی پولٹیکل بحث و تحریک میں عملی طور پر حصہ لینا۔

اس تشریح کے بعد یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا طالب علموں کے لئے محض پولٹیکل حقوق و فرائض و مسائل ملکی کا مطالعہ ضروری ہے۔ یا پولٹیکل بحث و تحریک (political agitation) میں انہیں عملی طور پر شریک ہونا چاہیئے۔ یا دونوں صورتوں سے قطعاً پرہیز کرنا چاہیئے۔

جہاں تک عملی بحث و تحریک کا تعلق ہے یہ کہنا نامناسب نہیں کہ عموماً طالبعلموں کو ان ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کش رہنا چاہیئے کیونکہ پولٹیکل ہنگاموں میں شریک ہونے سے انکی تعلیم کو نقصان پہونچیگا۔ اور سوسائٹی کی معمولی حالت میں وہ نقصان اس فائدہ سے زیادہ ہوگا جو کہ وہ اپنے ملک کو پولٹیکل بحث و تحریک میں شریک ہوکر پہونچا سکینگے۔ مگر قوموں کی زندگی میں اکثر ایسے موقع پیش آتے ہیں جبوقت کہ محض پولٹیکل فرائض کا ادا کرنا تمام فرائض سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اس حالت سے تعلیمی فرائض بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تحصیل علم بجائے خود کوئی اخلاقی فرض نہیں ہے۔ یہ ان اخلاقی فرائض کے ادا کرنے کا ایک ذریعہ ہے جنپر سوسائٹی یا قوم کی مجموعی قوت و صحت کا دارومدار ہے۔ پس واقعات کی رفتار میں اگر کوئی خاص انقلاب پیدا ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کی معمولی حالت کسی ایسی غیر معمولی حالت سے

بدل جائے جبکہ اسکی مجموعی صحت و قوت قائم رکھنے کا محض یہی ذریعہ ہے کہ اسکا ہر ایک فرد اپنی حیثیت و قابلیت کے مطابق عملی طور پر اسکی کچھ مدد کرے تو ایسے وقت میں طالبعلموں کو بھی عملی پالیٹکس میں شریک ہونے سے درگزر نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً روس میں جو کچھ پولیٹکل بحث و تحریک کا ذکر سنا جاتا ہے اسمیں ہمیشہ سے طالبعلموں کا بہت کچھ حصہ رہا ہے۔ سیکڑوں طالبعلم قید کرکے سائبیریا کے ویرانوں میں بھیجدیئے گئے ہیں۔ سیکڑوں کو پھانسی دیدی گئی ہے۔ اور آج یہ انہیں شہیدان وفا کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ روس میں ایک جمہوری جماعت یا پارلیمنٹ ڈیوما کے نام سے قائم ہوئی ہے۔ یا جنگ ٹرانسوال کے زمانہ میں بوروں کے چودہ پندرہ برس کے لڑکے بھی میدان کارزار میں آکر اپنی جانیں قومی عظمت پر نثار کر گئے۔ یا آج کل ایک حد تک بنگال میں وہ انقلابی حالت پیدا ہو گئی ہے جبکہ باخدا بحث و تحریک میں طالب علم ہی عملی طور پر شریک ہیں۔ اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ سرسر نہ ناتھ بنرجی کے جھنڈے کے تلے اپنی قومی یگانگت قائم رکھنے کے لئے پولیٹکل معرکے سر کر رہے ہیں۔ یا پنجاب میں سدیشی تحریک کو فروغ دینے کے لئے اسکول اور کالج کے طالبعلم لالہ لاجپت رائے کے زیر فرمان کام کر رہے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ غیر معمولی حالتیں ہیں۔ معمولی حالت میں طالبعلموں کو پولیٹکل بحث و تحریک میں عملاً شریک نہ ہونا چاہیے۔

اب رہا اس بحث کا رخ اسپہلو کہ طالب علموں کے لئے محض پولیٹکل حقوق و فرائض و مسائل ملکی کا مطالعہ کس حد تک جائز ہے؟ اسکی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ اوسط درجہ کی ذہانت کا ہر طالبعلم اپنے کورس کے کافی مطالعہ کے بعد دو چار گھنٹے کی فرصت بھی پیدا کر لیتا ہے۔ اس وقت کا کچھ حصہ اسکو پولیٹکل لٹریچر کے مطالعہ میں صرف کرنا چاہیئے۔ پولیٹکل لٹریچر کی نوعیت طالبعلم کی قابلیت و لیاقت پر منحصر ہے۔ مثلاً مڈل اور انٹرنس کلاس کے طالبعلموں کے لئے عموماً ان اخباروں کا مطالعہ ضروری ہے جنکا تعلق کہ زیادہ تر انکے صوبے کی پالیٹکس سے ہو۔ کالج کے طالبعلموں کے لئے علاوہ ان اخبار اور رسالوں کے انگلستان کے پولیٹکل اخبار اور رسالوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ نیز اس قسم کی کتابوں کا پڑھنا بھی ضروری ہے جو ہندوستان کی پولیٹکل حالت کے متعلق ہمدرد ان ملک نے لکھی ہیں۔ مثلاً سر ہنری کاٹن کی تصنیف موسوم بہ

نیو انڈیا (New India) اس لاجواب تصنیف میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے پولیٹکل ارادوں اور ولولوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پولیٹکل مذاق کا چراغ انکے دلمیں روشن رہیگا اور جب وہ تحصیل علم سے فارغ ہونگے تو عملی پالیٹکس میں شریک ہوکر اپنی قوم کی خدمت کرینگے۔ مگر کیا افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے صوبہ کے طالبعلم عموماً اس پولیٹکل تربیت سے بے خبر ہیں جو پولیٹکل اخبار اور رسالوں کے پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے علاوہ اگر کوئی کتاب انکے نظر سے گزرتی ہے تو وہ ادنیٰ درجے کے ناولوں کے قسم سے ہوتی ہے اور اگر کسی اخبار یا رسالے کی طرف توجہ ہوئی تو کبھی اسٹیشن پر کوئی ادنیٰ درجہ کا ولایتی میگزین خرید لیا جسمیں طفلانہ مذاق کی زیر مسلسل حکایتیں درج ہوتی ہیں کہ فلاں شخص کی عمر اسوقت ایکسو بیس برس کی ہے، فلاں کے فلاں صوبے میں ایک عورت کے تین بچے ہوئے۔ جاپان کا بادشاہ ایک سو بیس تاجداروں کا وارث ہے۔

افریقہ میں ایک جانور ہوتا ہے جسکا انڈا تین پاؤ کا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ جو اعلےٰ درجے کے میگزین یا رسالے ہیں اور جو کہ محققین فن اور مستند حضرات کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں اُنسے اس لئے تنفر ظاہر کیا جاتا ہے کہ اُن میں پالیٹکس بہت ہوتی ہے۔

طالبعلموں پر کیا منحصر اکثر سن رسیدہ حضرات کا یہ خیال ہے کہ زمانہ تعلیم میں مسائل ملکی اور پولیٹکل حقوق و فرائض کا محض مطالعہ بھی خلاف مصلحت ہے۔ اس خیال کے حضرات کے دو طبقے ہیں ایک طبقہ تو اُن بزرگوں کا ہے جنکا عام قول یہ ہے کہ پولیٹکل جد و جہد ہی اخلاقی گناہ ہے۔ جو ان میں مسلمان ہیں انکا تو شیخ سعدی کے مقولے پر عمل ہے کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

اور جو ہندو ہیں ان کی تلقین یہ ہے کہ فرمانروائے وقت خود اپنے کرموں کے لئے ذمہ دار ہے پس رعایا کا فرض ہے کہ وہ دنیا کے ان جھگڑوں سے اپنا دامن بچا کر عقبیٰ کی سلطنت کا انتظام کرے۔ ایسے حضرات کا جب عام اصول یہ ہے تو طالب علم بھی اس سے

مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ اس خیال کے بزرگوں کی شان میں صرف اسقدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انکا جواب دینا زیادہ ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں انکے خیالات کی طرح ان کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور جو کچھ پاک روحیں اس خیال کی باقی رہگئی ہیں انکے رُخ بھی عقبیٰ کی طرف پھر گئے ہیں۔

دوسرا طبقہ اُن بزرگوں کا ہے جو پولٹیکل جد وجہد کے خلاف تو نہیں ہیں مگر طالبعلموں کے حق میں پولٹیکل مسائل کا مطالعہ مضر خیال کرتے ہیں۔ ان حضرات کی دلائل کی تردید اس مضمون کا خاص منشا ہے۔ عام دلیل ان کی یہ ہے کہ پولٹیکل مسائل میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ رائگاں جاتا ہے۔ اگر وہی وقت طالبعلم اپنے کورس کے مطالعہ میں صرف کرے تو اسے زیادہ فائدہ پہونچیگا۔ فارغ التحصیل ہونیکے بعد انسان پولٹیکل مسائل پر غور کر سکتا ہے۔ بادی النظر میں یہ بزرگانہ صلاح واجب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اصل میں یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ پیشتر ہی عرض کر دیا گیا ہے کہ ہر طالب علم اپنے کورس کے مطالعہ کے علاوہ تھوڑا سا وقت فرصت کا نکال لیتا ہے۔ اس فرصت کے وقت کا ایک حصہ پولٹیکل لٹریچر کے مطالعہ کے لئے بھی آسانی سے وقف ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں کورس کے مطالعہ کو مطلق نقصان پہونچنے کا اندیشہ نہیں۔ نیز یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جس منطق سے طالبعلمی کے زمانہ میں پولٹیکل مضامین کے مطالعہ سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اسی منطق کے ذریعہ سے زیادہ زور کے ساتھ یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ انسان فارغ التحصیل ہونیکے بعد بھی پولٹیکل مسائل کے مطالعہ سے یکقلم پرہیز کرے۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہونے کے بعد عموماً دو ہی صیغے ہندوستانیوں کے لئے کھلے نظر آتے ہیں سرکاری نوکری یا وکالت۔ اگر سرکاری نوکری کر لی تو پھر کار منصبی سے فرصت کہاں کہ پالٹیکس پر بھی نظر عنایت رکھی جائے۔ نیز موجودہ قوانین بھی سرکاری نوکروں کو مجبور کئے رہتے ہیں کہ وہ پالٹیکس سے دلچسپی نہ ظاہر کریں۔

دوسرا راستہ قانون کا ہے۔ اگر کالج کی تعلیم کے بعد قانون کا مطالعہ شروع کیا تو پھر اسی منطق سے سامنا ہوتا ہے کہ جو وقت اخبار بینی میں صرف کیا جائے وہی مطالعہ

قانون میں کیوں نہ صرف کیا جاے اسکے بعد اگر قانون کے امتحان کا مرحلہ طے کرلیا تو پھر وکالت کو ترقی دینے کے لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ انسان قانون کا اعلیٰ لٹریچر پڑھنے میں ہمہ تن محو ہو جاے۔ نیز جسقدر وکالت ترقی کرتی جائیگی اسیقدر دیگر مشاغل کے لئے وقت کم ہوتا جائیگا۔ پس پولٹیکل لٹریچر کا مطالعہ ہمیشہ کے لئے ترک ہی کرنا مناسب معلوم ہوگا اس تشریح کے بعد یہ واضح ہو جائیگا کہ جو نیک نفس حضرات اسبات کی تلقین کرتے ہیں کہ بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد پولٹیکل مسائل کا مطالعہ شروع کرنا چاہیے وہ اس امر پر نہیں غور کرتے کہ انکے منطق کا سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔ اور جو اس سلسلہ میں اسیر ہوا وہ عمر بھر پالٹیکس کی طرف رخ نہیں کرسکتا۔ اس خیال کے حضرات کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر علم و فن کا مذاق رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ اگر طالبعلمی کے زمانہ میں پولیٹکل مسائل کے مطالعہ کا چسکا پڑ گیا ہے تو انسان فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اس مذاق کو قائم رکھ سکتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ کوئی ایسا وقت آئے گا جسوقت دنیا کے تمام بکھیڑوں سے فرصت ہوگی اور اسوقت پالٹیکس پر توجہ کیجائیگی محض بچپن ہے یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ اخباروں کے مباحثے بہت دلچسپ ہوتے ہیں لہذا یہ اندیشہ ہے کہ طالبعلم انہیں میں الجھکر نہ رہجائے اور بجائے گھنٹہ یا آدھ گھنٹے کے جو کہ اسنے مطالعہ اخبار کے لئے مقرر کرلیا ہو اپنا زیادہ ضروری وقت اسی خاص مد میں ضائع کردے لہذا مناسب یہ ہے کہ فرصت کے وقت وہ اعلےٰ درجے کے انگریزی مصنفین کی ایسی کتابیں پڑھے جن سے کہ اسکی انگریزی زبان سے واقفیت بڑھے۔ یہ اعتراض بھی بالکل بیمحل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ طالب علم فرصت کیوقت اسی قسم کا لٹریچر پڑھتے ہیں جسمیں زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے[1] اس قسم کے لٹریچر میں یا ناول شامل ہیں یا اخبار اور رسالے وغیرہ۔ ناولوں کی دلچسپی اخباروں کی دلچسپی سے بہت بڑھی ہوتی ہے۔ اور انکے مطالعہ میں محو ہوکر رہجانے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ نیز اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بوقت فرصت بھی طالب علم برک مکالے اور مل کی تصنیفات پڑھے۔ تب بھی وہی اندیشہ قائم

[1] یعنی (Light Literature)

رہتا ہے۔ کیونکہ ان زبردست انشا پردازوں کی تصانیف میں متعدد مقام ایسے موجود ہیں جو سخن فہم طالبعلم کے لبانیکے لئے جادو کا حکم رکھتے ہیں اور اسکو دو چار گھنٹے تک کسی دوسرے قسم کے مطالعہ سے باز رکھ سکتے ہیں پس خاص پولیٹیکل اخباروں اور رسالوں کے خلاف یہ اعتراض نہیں عاید ہو سکتا کہ انکے دلچسپ مباحث پابندی وقت کا شیرازہ درہم و برہم کر دینگے۔ فرصت کے وقت طالبعلم جو کتاب پڑھیگا وہ دلچسپی کے لحاظ سے پڑھیگا۔ پھر اخباروں نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ خاص طور سے پابندی وقت کے دشمن خیال کئے جائیں۔

ہمارے معترض اکثر یہ بھی فرماتے ہیں کہ چونکہ پولیٹیکل مسائل نہایت پیچیدہ اور بحث طلب ہوتے ہیں لہذا جب تک کہ انکے ہر پہلو پر غور کرنے کی قابلیت نہ پیدا ہو جائے اسوقت تک انکا مطالعہ غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مخدوش ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہر مسئلہ کے ہر پہلو پر خود کامل غور و فکر کرنے کے بعد رائے قائم کی ہو۔ اور نہ ہر شخص میں ایسی قابلیت ہوتی ہے۔ عام دستور یہ ہے کہ معمولی دماغ کے لوگ کسی فن کی نسبت جب رائے قائم کرتے ہیں تو اس فن کے کاملین اور محققین کو اپنا پیشوا مان لیتے ہیں۔ مثلاً طالبعلموں کو جب مذہبی تعلیم دیجاتی ہے تو اُن کو خاص انداز پرستش سکھایا جاتا ہے اور خاص قسم کے مذہبی فرائض ادا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انکی قابلیت و سن کے لحاظ سے بعض مسائل مذہبی بھی انکے ذہن نشین کر دیئے جاتے ہیں۔ اسبات کا انتظار نہیں کیا جاتا کہ جب ان کی تعلیم درجہ کمال پر پہونچ جائے اور جب وہ خوب فلسفیانہ تنقید کے اصولوں سے واقف ہو جائیں تو اسوقت انکے سامنے کوئی مذہبی عقیدہ پیش کیا جائے اور پھر کہا جائے کہ تم اسکو ہر پہلو سے جانچ لو اور اگر پورا اطمینان ہو جائے تو اسے قبول بھی کر لو۔ ظاہر ہے کہ مذہبی مسائل پولیٹیکل مسائل سے ہزار درجہ زیادہ پیچیدہ اور بحث طلب ہیں پس اسی اصول پر ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے پولیٹیکل مذہب کے پیمبروں کے اصول طالبعلموں کے ذہن نشین کرتے رہیں۔ اور یہ اس صورت پر ممکن ہے کہ جن بزرگوں نے اپنی عمر پولیٹیکل اور تمدنی مسائل کی تحقیق میں بسر کر دی ہے انکے مضامین یا انکے شاگردوں کے مضامین جو کہ اخبار اور رسالوں میں شائع ہوا

کیے ہیں، طالبعلموں کی نظرات گزرتے رہیں جسقدر طالبعلموں کی قابلیت اور عمر بڑھیگی اسیقدر وہ ان مسائل کی پیچیدگیاں سمجھتے جائینگے۔

اکثر فدائیانِ مذہب کا یہ قول ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم میں پولیٹکل تعلیم بھی شامل ہے پس اسکے لئے جداگانہ انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ان صوفیاں صافی طینت کا یہ قول ہے کہ پولیٹکل تعلیم حب الوطن "پرا اُپکار" یا (Patriotism) کی ایک شاخ ہے۔ اور "پرا اُپکار" کی تلقین ہندو مذہب میں خصوصاً اور دیگر مذاہب میں عموماً موجود ہے۔ ان خدا کے بندوں کی خدمت میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ مذہبی یا اخلاقی تعلیم چند قسم کے فرائض کی تلقین کا مجموعہ ہے۔ یہ فرائض اصولی حالت میں ضرور جامع ہیں مگر عملی حیثیت سے ہر وقت اور ہر زمانہ کے لئے یہ کارآمد نہیں ثابت ہو سکتے مانا کہ "پرا اُپکار" ہندو مذہب کا جزو اعظم ہے۔ اور ہندو تہذیب کی تاریخ میں اس قسم کے "پرا اُپکار" کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ فلاں شخص گھر بار چھوڑ کر جنگل کو نکل گیا یا فلاں شخص نے کثرت سے روپیہ خرچ کر کے شفاخانہ بنوا دیا مگر اس قسم کے "پرا اُپکار" کی ایک مثال بھی نہیں ملتی جسکا نام "حب وطن" [illegible] ہے اور جسکا نمونہ آج جاپان نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ پس اگر آپ [illegible] تعلیم کو ضروری سمجھینگے اور محض اس قسم کے "پرا اُپکار" کے نمونے طالبعلموں کے سامنے پیش کرینگے جنکا پتہ ہندو تہذیب کے کارناموں میں ملتا ہے تو انکے دلوں میں حب الوطن کا جوش ہرگز نہ پیدا ہوگا اس بحث سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمکو پولیٹکل تعلیم کے لئے ایک خاص در قائم کرنا چاہیے۔ یعنی علاوہ اخلاقی و دماغی تعلیم کے طالبعلموں کو پولیٹکل اخبار اور رسائل کے مطالعہ کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہیے۔ یہ خیال کرنا کہ کہیں پولیٹکل جوش [illegible] اعتدال سے نہ گذر جائے محض نادانی ہے۔ کیونکہ یہاں تو پولیٹکل جوش کے دبانیوالی اسقدر قوتیں موجود ہیں کہ انکے فنا کرنے کے لئے اک زمانہ درکار ہے۔ ایک تو سیکڑوں برس کی پولیٹکل غلامی کی وجہ سے اہل ہند میں قومی حمیت و غیرت کا احساس بے شکل سو باقی ہے۔ ذات کی تفریق اور ہندو مسلمانوں کا احمقانہ اختلاف قومی یگانگت اور حب الوطن کے جذبات کی نشوونما میں مانع ہے حکام وقت کا پولیٹکل تحریکوں سے اختلاف ظاہر

کرنا پولیٹیکل جوش کے زائل کرنیکے لئے ایک زبردست قوت ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم پولیٹیکل تعلیم کے فروغ لینے کے لئے غیر معمولی کوشش کریں۔ اور ایسی کوشش کریں۔ اور ایسی تدبیریں عمل میں لائیں کہ طالب علموں کے دل و دماغ پر پولیٹیکل زندگی کا بیر تو بھی پڑتا رہے۔ ایام طفولیت و شباب میں انسان کے تمام ترین جذبات کی تربیت بتدریج ہوا کرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حب الوطن کے جذبات عالیہ کی نشوونما کی فکر نہ کیجائے۔

فقط۔ ایک طالب علم۔

انتخاب بیاض جناب محمد علی آزاد مرتب رسالہ صبح بہار منڈی محلہ میسور

(شوکت بخاری)

مانی چو نقش آں بُتِ بدمست می کشد | چو می رسد بہ ساعدِ او دست می کشد

خواجہ آصفی ہروی

چنداں مپرس دہید کہ بیہوشی آورد | شاید کہ یاد ما بفراموشی آورد

انیسی شاملو

وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی | ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

امیر خسرو دہلوی

افتادہ بودم در رہش از ناز گفتا کیستی | گفتند بیمارِ غمت گفتا نخواہد زیستی

میرزا سید رضا اصفہانی

ہر کس کہ چشم مست ترا یاد می کند | خاموش می نشیند و فریاد می کند

رشید گاذرونی

ز فریاد سگت شبہا مرا خوں در جگر باشد | مبادا بر سر کوے تو غیری در گذر باشد

ملا شیدا

تو از تمکین من از حیرت نہ ایمائے نہ تقریرے | بداں ماند کہ ہم بزمست تصویرے بہ تصویرے

لا اعلم

صیاد کو جو یارب مجھ پر ترس نہ آئے | باغوں میں موسمِ گل لاکھوں برس نہ آئے

فقط

آسمانی کتب - اور شاعری

عام اصطلاح میں شعر مقفےٰ اور موزوں کلام کا نام ہے۔ لیکن دراصل یہ نظم کی تعریف ہے نظم میں اور شعر میں بہت فرق ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی میں نظم کا مادہ ہوتا ہے لیکن شعر جسکا نام ہے اُسکی نظم میں ایک بھی نہیں ملتا۔ اور کبھی انسان شاعر ہوتا ہے لیکن وہ ایک بیت بھی نظم نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ نظم سے شعر کی لطافت اور اُسکی تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے۔ گویا نظم ایک سانچا ہے جسمیں شعر ڈھالے جاتے ہیں۔

شعر کی حقیقی تعریف جو اُسکے تمام معانی کو شامل ہو مختصراً بیان کر دینا مشکل ہے کیونکہ اسکی تعریف میں بیان کے وہ تمام اسلوب شامل ہیں جنکی وجہ سے طبیعت پر ایک خاص اثر پڑتا ہے جو معمولی کلام سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ معمولی کلام صرف اُن باتوں کو شامل ہوتا ہے جنکو ہم دیکھتے بھالتے رہتے ہیں۔ یا اپنی زندگی کے معمولی قیاس اور دلائل سے نتائج نکالتے ہیں جو ہمارے روزمرہ کے معاملات میں کام آتے ہیں بخلاف اسکے شعر میں اُن باتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو ہمارے نفس کے اوپر اثرات اور جذبات واقع ہوتے ہیں۔ اسمیں نہ قیاس کی ضرورت ہے نہ دلائل کی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ معمولی کلام عقل کی زبان سے ہوتا ہے اور شعر اثر انداز طبیعت کے بیان کا نام ہے۔ بعضوں نے شعر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ طبیعت کے مخفی جذبات کی کھلی ہوئی تصویر ہے چونکہ جذبات طبائع کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اسلئے شاعری بھی قدیم سے رائج ہے اور دنیا کی کوئی قوم اس سے خالی نہیں۔

ہر قوم کی شاعری اُسکے آداب۔ اخلاق۔ جنگی وقائع اور مذہبی خیالات کا مرقع ہوتی ہے کسی قوم کے اصلی خیالات دیکھنے کے لئے اُسکی شاعری سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہر قوم کے خیالات اور تواریخ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ترقی کے قبل انکو

اندر شاعری کا رواج تھا اسکی وجہ یہ ہے کہ قبل اسکے کہ اُن کی عقل میں روشنی پیدا ہو اور وہ علم سے دلچسپی لیں اُنکی طبیعتوں میں ایک جوش اور تحریک پیدا ہوتی ہے - جو شاعری کی اصلی اسٹیم ہے - یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ذخیرہ ہر قوم متمدن کا شاعرانہ خیالات اور دواوین ہیں - جنمیں اُنکے مذہبی ادبی - اخلاقی حالت اور بہادری کے سچے جذبات کی اصلی تصویریں نظر آتی ہیں - ہندوؤں کی رامائن اور مہابھارت یونانیوں کی الیڈ اور اوڈیسی - اہل اٹلی کی اینیاڈ - فارس والوں کا شاہنامہ اور اہل عرب کے دواوین سے اُنکے خیالات معتقدات تاریخی حالات معبودوں کی پرستش کی کیفیت نہایت وضاحت سے معلوم ہوتی ہے - اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ شعر نفس کے تاثرات کا نام ہے - اسلئے ہر قوم کی شاعری اُسکے تاثرات نفس کا اصلی مرقع ہوتی ہے -

شعر کی حالتیں بھی مختلف ہیں - اکثر قوموں نے یہ قید لگادی ہے کہ وہ منظوم ہو لیکن نظم کی کیفیت میں بھی اختلاف کیا گیا ہے - بعضوں نے تو صرف اُسکے موزوں ہونے کی شرط لگائی ہے بعض صرف قافیہ ہی کو ضروری سمجھتے ہیں - وزن کی شرط نہیں لگاتے اہل عرب نے اپنی شاعری میں وزن اور قافیہ دونوں کو ضروری سمجھا ہے - اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو اُنکے نزدیک شعر ہی نہیں ہے - اہل فارس والوں کا ہے سریانی صرف وزن کو ضروری سمجھتے ہیں قافیہ کا التزام نہیں ہے - جیسا کہ اقوام سریانی اور اسحاق (اسحق) انطاکی کی نظمیں ہیں[1] انگریزی کی بلینک ورس بھی قریب قریب ایسی ہی ہے - کیونکہ اُس میں بھی قافیہ کی پابندی نہیں ہے - وزن مشروط ہے لیکن اُسکے مساوات کا لحاظ نہیں - عبرانیوں کے نزدیک نہ وزن مشروط ہے نہ قافیہ - اسلئے جب وہ قرآن شریف کی آیتوں کو سنتے جنمیں اسلوب بیان ہی دلیل اور برہان کا کام دیتا ہے تو کہتے کہ یہ اشعار ہیں - اور اپنی زبان کے اشعار پر اُسکی مقفیٰ اور غیر مقفیٰ آیتوں کو قیاس کرتے تھے -

اسمیں شک نہیں کہ وزن اور قافیہ سے شعر کی لطافت اور تاثیر بڑھ جاتی ہے مگر یہ اُمور شعر کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں - کیونکہ لکھر کا اثر طبیعت پر بہت پڑتا ہے اور بعض مرتبہ اُسکو سُنکر انسان جوش سے بے تاب ہو جاتا ہے حالانکہ وہ مقفیٰ اور موزوں نہیں ہوتا - صرف اُسکا اسلوب بیان شاعرانہ ہوتا ہے -

[1] شعراء السریان

عبرانی قومیں بہ نسبت دیگر اقوام عالم کے خیال میں زیادہ مستغرق تھیں۔ اسلئے توحید اختیار کرنے میں انکو بہت آسانی ہوئی۔ کیونکہ مذہبی معتقدات بھی ایسی ہی چیزیں ہیں جو حواس سے دریافت نہیں ہو سکتیں۔

وہ لوگ شاعرانہ خیال سے بہت مناسبت رکھتے تھے جسکی دلیل اُن آثار شعریہ سے ملتی ہے جنکو وہ دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ سب سے پہلا نمونہ انکی شاعری کا توراۃ ہے۔ جب اسمیں انکو شاعرانہ خیالات ملے جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھے تو انہوں نے اُس تمام کتاب ہی کو نظم کر ڈالا۔

توریت میں شاعرانہ تخیلات کی بہت سی مثالیں ہیں۔

حضرت موسیٰ و حضرت یوشع کے پہاڑ پر سے لوح شہادۃ لئے ہوئے اتر رہے ہیں یوشع کہتے ہیں کہ محلہ سے لڑائی کی آواز معلوم ہو رہی ہے حضرت موسیٰ جواب دیتے ہیں نہ یہ شور فتح کا ہے نہ شکست کا بلکہ ایک شیریں راگ ہے جسکو میں سُن رہا ہوں[1] غالباً یہ ایک ضرب المثل ہوگی جسکو موسیٰ نے اسموقع پر استعمال کیا۔

"خدا کے دریا میں ڈالنے کی کیفیت کس پُر زور الفاظ میں ہے" تو نے اپنی ہوا سے پھونک ماری۔ دریا نے اُنہیں چھپا لیا وے سیسے کی طرح زور کے پانی میں تلے بیٹھ گئے[2] یہ تشبیہ کی نہایت عمدہ ہے ہندوستان میں بھی ہماری چیز کی مثال اسی سے دیجاتی ہے۔

ایک جگہ خدا کے فرمان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اُن قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرے میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہو جیتا نہ چھوڑیو[3]" میراث وہ ہے جو ترکہ میں ملے یہاں میراث استعارۃً قبضہ کے لئے ہے دوسرے جملہ میں "جو سانس لیتی ہو" سے تاکید مزید کا کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس عموم میں ایک خاص جوش مضمر ہے۔

حنہ سموئیل کی ماں اداس بیٹھی ہوئی ہے۔ اُسکے صرف ہونٹ ہلتے ہیں آواز نہیں سُنائی دیتی علی اسکی یہ کیفیت دیکھکر پوچھنے لگتا ہے کہ کیا تو نشہ میں ہے۔ تو نے مے پی ہے۔ وہ جواب دیتی ہے "نہیں میرے خداوند میں تو دلگیر عورت ہوں میں نے نہ مے اور نہ کوئی نشہ پیا۔ پر خداوند کے آگے اپنا دل انڈیل دیا ہے[4]"

[1] ترجمۃ العصائف جلد ۱ [2] خروج ۱۵: ۱۰ [3] خروج ۱۵: ۳۵ [4] استثنا ۲۱: ۲۷ [5] سموئیل ۱: ۳۸

ے دلکو اُسنے ایک برتن سے استعارہ کرکے اُسکی اندرونی آرزونکے خدا کے سامنے
نے کو انڈیل دینے سے تعبیر کیا۔
نجوکہ بانجھ تھی۔ اور اپنی سوت کے طعنے سنتے سنتے اُسکا کلیجہ پک گیا تھا۔ جب اُس سے
پیدا ہوے۔ اور اُسکی کوکھ کھل گئی تو وہ جوش طرب میں خدا کی قدوسیت کا گیت گاتی
ئے ساتھ ہی ساتھ نصیحت بھی کرتی ہے جبکہ وے سخن سوت کی طرف ہے" غرور
نہ کہو اور بڑا بول تمہارے مُنہ سے نہ نکلے۔ کیونکہ خداوند دانش کا خدا ہے۔ اور اعمال
کے تولے جاتے ہیں"۔ اب وہ جوش میں بھر گئی اور اپنے سو آرزوؤں سے پائے ہوئے
بچے سموائیل کو سامنے غوں غوں کرتے ہوئے دیکھکر چھاتی سے لگا لیا سرور سے اُسکی
بند ہوگئیں۔ گریہ شادی سے دو چار قطرے آنسو کے رخساروں پر ٹپک پڑے
لگی" زور آورونکی کمانیں ٹوٹ گئیں۔ اور وے جو لڑکھڑاتے تھے اونکی کمریں مضبوط
وے جو پیٹ بھرے تھے روٹی کے لئے مزدور ہوگئے۔ اور وے جو بھوکے تھے
نے فراغت پائی۔ جو بانجھ تھی وہ سات جنی اور اولاد والی ناطاقت ہوگئی"۔ جو لوگ
کلام کے قدرداں ہیں وہ ان جملونکے فورس کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہر ایک قوم کا قاعدہ
اوسکی شاعری اُسی زمانہ میں چمکتی ہے جبکہ (سیمیں) دولتمندی اور عشرت کے اسباب
جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی شاعری کے عروج کا بھی یہی حال ہوا۔ یعنی حضرت داؤدؑ
میں ان کی شاعری چمکی۔ کیونکہ اُسوقت تمام اسباب عشرت کے مہیا ہوگئے تھے اور
حضرت سلیمان کے زمانہ میں معراج کمال پر پہونچگئی کیونکہ بنی اسرائیل کے لئے
زمانہ تھا۔ جیسے اہل عرب کے لئے اموں کا زمانہ یا اہل ہند کے لئے رامچندر جی کا۔ حضرت
حضرت سلیمان ؑ بادشاہ ہونیکے علاوہ بڑے جید شاعر بھی تھے۔ حضرت داؤد صرف
ور نصائح منظوم کرتے تھے کیونکہ بنی اسرائیل کا عام مذاق مذہبی رنگ میں شرابور
وہ دردناک اور روح فرسا اشعار کو پسند کرتے تھے۔ لیکن حضرت سلیمان نے صرف
ی اور اخلاقی شاعری ہی پر اکتفا نکر سبکے تغزل کی طرف بھی قدم بڑھایا جسکو آگے
لکھینگے۔

حضرت داود نہایت پرجوش آدمی تھے۔ اُنکے مواعظ اور اُنکی عام باتیں بھی جوش سے پُر ہیں شاعری کا تو کیا کہنا ہے۔ عمالیق جب جنگ کرنے گئے تو اُس لڑائی میں ساؤل جو بنی اسرائیل کا بادشاہ مشہور تھا کیونکہ بہت ہی خوبصورت تھا اور اوسکا نوجوان بیٹا یونتھن دونوں مارے گئے۔ یہ خبر سنکر حضرت داود کو نہایت رنج ہوا۔ اور اُنہوں نے ایک مرثیہ لکھا جسکو ہم کتاب الیاشر سے نقل کرتے ہیں

"اسرائیل کے غزال تو اپنے پہاڑوں پر مارا پڑا ـــ ہائے بہادر کیوں گر گئے

جاتے میں خبر نہ دو۔ اشقلوں کے بازار میں منادی مت کرو نہ ہو کہ فلسطیوں کی بیٹیاں خوش ہوں۔ نہ ہو کہ نامختونوں کی بیٹیاں شادیانہ بجائیں"

اے جلبوع کے پہاڑو۔ تم پر اوس نہ پڑے۔ تم پر مینہ نہ برسے۔ اور تمہارے دامنوں میں ہری کھیتیاں نہ اُگیں۔ کیونکہ وہاں بہادروں کی سپر پھینکی گئی۔ سپر ساؤل کی"

مقتولوں کے خون سے اور بہادروں کی چربی سے یونتھن کی کمان بھی کبھی ٹل نہ گئی اور ساؤل کی تلوار کبھی خالی نہ لوٹی۔

ساؤل اور یونتھن اپنے جیتے جی عزیز تھے۔ دلپسند تھے۔ اور وے اپنی موت میں بھی جدا نہ ہوئے۔ وے عقابوں سے زیادہ تیز بال تھے اور شیروں سے زیادہ قوی۔

اے اسرائیل کی بیٹیو ساؤل پر روؤ جسنے تمہیں ارغوانی اور قرمزی لباس پہنائے اور جس نے تمہاری پوشاک کو زیوروں سے زینت بخشی۔

ہائے وے بہادر لڑائی کے درمیان کیوں گر گئے۔ اے یونتھن تو اپنے بلند مکانوں پر مارا پڑا مجھے تیرے لئے اے میرے بھائی یونتھن بڑا دکھ پڑا۔

تو مجھے نہایت دلپسند تھا۔ مجھے تیری محبت عجیب تھی۔ بلکہ عورتوں کی محبت سے بھی زیادہ ہائے وے بہادر کیوں گر گئے۔ اور لڑائی کے ہتھیار نابود ہو گئے"

آج جبکہ دنیا اُس زمانہ سے جس زمانہ میں یہ مرثیہ کہا گیا ہے ڈھائی ہزار برس آگے نکل آئی ہے اور ہر چیز میں ترقی ہو گئی ہے لیکن اسوقت کے مرثیوں اور خاصکر اُردو شاعری کے مرثیوں سے اسے ملا کر دیکھو۔ اس مرثیہ میں وہی اصلی خیالات ہیں جو ایسے وقت میں

پیدا ہوا کرتے ہیں جیسا کہ ایک بہادر عزیز مارا جائے۔ پہاڑوں کو کوسنا۔ ثمانت کا خوف کس قدر دلچسپ پیرایہ میں ہے۔

حضرت داؤد کے تمام امثال مواعظ اور اقوال حکمیہ شاعری سے بھرے ہوئے ہیں کہاں تک نقل کروں مثلیں کے گیت میں سے جس میں وہ خدا کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں چند فقرے سنئے۔

"جس طرح سے کہ ہرنی پانی کے سوتوں کی نہایت پیاسی ہوتی ہے۔ ویسی ہی میری روح اے خدا تیری نہایت پیاسی ہے۔ زندہ خدا کے لئے میری روح ترستی ہے میرا آنسو رات دن میرا کھانا ہے۔"

"میرے دشمن اُس تلوار کے مانند طعنے دیتے ہیں جو میری ہڈیوں سے گذر جائے مجھے ملامت کرکے دکھہ دیتے ہیں۔"

"اے میرے جی تو کیوں گرا جاتا ہے۔ اور تو مجھ میں کیوں بے آرام ہے[1]"

دیکھو تلوار کی جو ہڈیوں سے گذر جائے طعنے کے ساتھ کیسی نئی تشبیہ ہے۔ اور جی کا گرنا یا بیٹھ جانا تمہارا خود محاورہ ہے۔

ایک جگہ خداوند کی نعمتوں کا شکر کرتے ہیں۔ اور اُنکو گناتے ہیں۔ اُس کلام کی طاقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہر نعمت کے بعد وہ کہتے ہیں (اللہ لایزال) (خداوند ابد تک) بعینہ ایسی جیسے کہ قرآن شریف میں سورۂ رحمان ہے جس میں خداوند عالم اپنی نعمتیں گنواتا ہے اور ہر ایک نعمت کے بیان کرنے کے بعد فبای آلاء ربکما تکذبان کہتا ہے۔ جس سے کلام کی طاقت برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔

خالق سے تمام مخلوقات کا سلسلہ شکر گذاری اسطرح قائم کرتے ہیں۔

"اے ساری سرزمینو! خداوند کے لئے خوشی کا نعرہ مارو۔ سمندر اور اسکی معموری شور مچاویں۔ ساری دنیا ہی اور وہ سب جو اسمیں بستے ہیں۔ نہریں تالی دیویں۔ پہاڑ ملکے خوشیاں کریں خداوند کے خوف سے آسمین کانپ رہی ہیں اور زمین لرز رہی ہیں۔ اوسکی جباریت کی تقدیس ہو[2]"

[1] زبور ۴۲ [2] زبور صفحہ ۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱

اب حضرت سلیمان کی غزلیں سنئے۔ غزل کے اصلی معنے۔ عورتوں سے گفتگو کرنے کے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ اظہار تعشق جس کلام میں کیا جاتا ہے اصطلاح میں اُسکا نام غزل رکھا گیا ہے۔ عام اقوام عالم میں غزل کا یہی طریقہ تھا کہ مرد عورت کو مخاطب بناتا تھا۔ فارس کے خلاف وضع فطری مذاق نے مردوں کو مخاطب کرنے کا نام غزل رکھدیا اور اُسی کا بگڑا ہوا خاکہ اُردو شاعری ہے۔ بہاشا کی شاعری بھی اگرچہ اُس اصطلاحی غزل کے تحت میں نہیں آتی لیکن اُسنے فطرت سے تجاوز نہیں کیا۔ بلکہ ایک عجیب لطافت پیدا کی کہ عورت مرد کو مخاطب کرے بحیثیت عاشقانہ مذاق کے بہاشا شاعری کا پلہ تمام دنیا کی شاعریوں سے بھاری ہے۔ لیکن شجاعت۔ استقلال خودداری جو بعض دوسرے اقوام کی شاعری میں ہیں اور جو انسان کے نہایت اعلیٰ وارفع مقاصد ہیں اُنسے یہ کسیقدر معرا رہی۔ اسلئے کہ عورتوں کو ان صفات سے کیا واسطہ۔ اگر آلہا اودن وغیرہ کے جنگی جوش وغیرہ کی نظمیں انہیں رائج نہ ہوتیں تو یہ اوصاف کبھی کے بہاشا سے رخصت ہو گئے ہوتے۔

شامی اقوام کا تغزل سریانی۔ کلدانی۔ عبرانی۔ تینوں زبانوں میں بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے۔ یعنی مرد عورت کو مخاطب کرتا ہے۔ اور کبھی عورت بھی مرد کو مخاطب کرتی ہے۔

حضرت سلیمان کی غزلوں میں یہ دونوں رنگ موجود ہیں۔ مثلاً کلیسے کے جمال کی تعریف کرتے ہیں۔

"اے میری جانی تو شکیل ہے۔ دیکھ۔ تو خوبصورت ہے۔ تیری آنکھیں تیرے چادر کے آڑ میں کبوتروں کی سی ہیں۔ تیرے لب قرمزی ڈورے ہیں۔ تیرے رخسار تیری چادر کے پیچھے آدھے انار کے مانند ہیں۔ ای میری پیاری تو سراسر جمال ہے تجھ میں کوئی عیب نہیں ہے[1]

رخسار و تلی تشبیہ میں آدھے انار کی قید بہت ہی دلچسپ ہے۔

"تیرا سر تجھ پر کنول کی مثل ہے۔ تیرے سر کے بال ارغوانی کے مانند ہیں۔ بادشاہ

[1] غزل الغزلات

تیری کا کھونسے اٹکا ہے؟ اے محبوبہ تو کیسی جمیلہ ہے۔ عیش کے لئے تو کیسی جان افزا ہے
تیری قامت تاڑ کی مثال ہے اور تیری چھاتیاں 'انگور کے گچھونکے مانند ہیں[1]"۔
انگور کے گچھوں سے تشبیہ دینا بہ نسبت اُن تشبیہوں کے جو ایشیائی شاعر سیب یا انار کے ساتھ دیتے ہیں بہتر ہے۔ مولانا جامی ایک سب سے مکرم نبی کی بیوی کی تعریف میں گل افشانی فرماتے ہیں ؎

دو پستان ہر یکے چوں قبہ نور　　حبابے خواستہ از عین کافور

حباب چشمہ کافور کے ساتھ وہی تشبیہ ہے۔ جو حسی کے مقابلہ میں کم درجہ کی ہے مولانا غنیمت کہتے ہیں ؎

بروے سینہ اش سیب دو پارہ　　علاج قوت ضعف نظارہ

دوسرا مصرعہ سراسر بھرتی کا ہے۔ اور یہ مولانا غنیمت کا خاص شیوہ ہے کہ وہ حشو سے پرہیز نہیں کرتے اور کرتے ہیں جامی کا مقابلہ جامی فرماتے ہیں ؎

پدر زین واقعہ چوں گشت آگاہ　　دوا جوشد ز دانا یان درگاہ

اور مولانا غنیمت صاحب کہتے ہیں ؎

پدر زیں حال چوں آگاہ گردید　　امیر فوجہائے آہ گردید

دونوں کا ایک ہی مضمون ہے۔ لیکن غور کرو اور انصاف سے کہو کہ غنیمت کا مصرع ثانی کسقدر لاطائل ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب سیب دو پارہ اور حباب چشمہ کافور۔ اور انگور کے گچھونکا مقابلہ کرو۔ اگر نہ سمجھو تو کسی ڈاکٹر سے پوچھو کہ ان تینوں میں سے کونسی تشبیہ اچھی ہے۔

اُردو کے شاعر کی زمزمہ سنجی سنئے یہاں تو جو بات ہے دنیا سے نرالی ہے۔ پستان گرز کی طرح ہیں لیکن پھر بھی معشوق مذکر ہی ہے۔ ؎

..... دو گرز تانے تنکے بیٹھے ہیں"

ہمارے یہاں دہن کی تشبیہ غنچہ کیساتھ دیجاتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی غزلوں میں ہمکو اسکی پانچ تشبیہیں ملی ہیں۔

[1] غزل الغزلات

"ایک مقفل باغیچہ ہے" شاید یہ خیال ہو کہ باغ وسعت رکھتا ہے اور معشوق کا دہن معدوم ہونا چاہیے لیکن یہ تشبیہ وسعت کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ خوشبو وجہ تشبیہ ہے۔

"آب حیات کا ایک چشمہ" "لبنان کا جھرنا" "سربمہر ایک چشمہ" "بند کیا ہوا ایک سوتا" انہیں سے چشمۂ آب حیات کی تشبیہ اب تک رائج ہے۔

کلیسیٰ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

"اے میری دلہن لبنان سے تو چلی آ۔ امانہ کی چوٹی پر سے سنیر اور حرمون کے قلہ پر سے شیروں کے مکانوں سے۔ چیتوں کے پہاڑوں پر سے نظر دوڑا۔ اے میری زوجہ تو نے میرا دل غارت کیا اپنی آنکھوں کی ایک نگاہ سے اپنے گلے کی ایک زنجیر سے تو نے میرا دل لوٹ لیا۔ اے میری دلہن تیرا عشق کیا خوب ہے تیری محبت مے سے کتنی زیادہ لذیذ ہے۔ تیرے عطروں کی ریح ساری خوشبوؤں سے خوب ہے۔ تیری پوشاک کی ریح لبنان کی سی ریح ہے۔ تیرے ہونٹوں سے شہد کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ شہد اور شیر تیری زبان کے تلے ہیں۔ تیرے گال خوشنما ہیں۔ کہ ان پر موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ اور ایسی ہی تیری گردن کہ اس پر سونے کی زنجیریں ہیں۔ ہم تیرے لئے سونے کے طوق بنائینگے اور انہیں چاندی کے پھول جڑینگے۔ میری جانی دیکھ تو خوش رو۔ تو کبوتر چشم ہے۔ ہاں تو مہندی کے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے[1]"

رشک رقابت عشاق اور شعرا کے لئے نار جہنم ہے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

"نگین کے مانند مجھے اپنے دل میں لگا رکھ۔ اور تعویذ کے مانند اپنے بازو پر کیونکہ عشق موت کے مانند زبردست ہے۔ اور غیرت گور کی سی بے مروت ہے۔ اوسکی لویں آگ کی لویں ہیں۔ اور یہوواہ کے شعلے کے مانند بڑا پانی عشق کو بجھا نہیں سکتا۔ اور نہ باڑھیں اُسے دبا سکتی ہیں[2]"

اب وہ راگ سنئے جو کلیسیا سلیمان ع کے عشق میں گاتی ہے۔ اسمیں کچھ کچھ بھاشا شاعری کا مزہ آتا ہے۔

"میرا محبوب سرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں میں وہ جھنڈے کے مانند کھڑا ہوتا ہے۔

[1] غزل الغزلات [2] غزل الغزلات

اسکی قامت لبنان کی سی ہے وہ خوبی میں رشک سرو ہے۔ اُسکا سر الیسا ہے جیسے چوکھا سونا اوسکی کاکلیں پیچ در پیچ ہیں۔ اور کوّے کیسی کالی ہیں۔ اوسکی آنکھیں اُن کبوتروں کے مانند ہیں جو لب دریا دودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھے ہوں۔ اُسکے رخسارے پھولوں کے چمن اور بلساں کی اُبھری ہوئی کیاریاں ہیں۔ اُسکے لب سوسن ہیں۔ جنسے بہتا ہوا مُر ٹپکتا ہے۔ اُسکا مُنہ شیریں ہے۔ اے یروسلم کی بیٹیو یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے" اُسکی آنکھوں کی تشبیہ دودھ میں نہائے کبوتروں کے ساتھ جو تمکنت سے بیٹھے ہوں کسقدر نفیس ہے۔ "جیسے کہ سیب کا درخت بن کے درختوں کے بیچ ویسے میرا محبوب بیٹوں کے بیچ ہے۔ انجیر کے قرصوں سے مجھ کو قرار دو۔ سیبوں سے مجھکو تازہ دم کرو۔ کیونکہ میں عشق کی بیمار ہوں۔ میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے۔ میری محبوب کی آواز ہے۔ جو کہ دروازے پر کھٹکھٹاتا ہے۔ میرے لئے کھول۔ میری جانی۔ میرے کبوتر۔ کہ میرا سر اوس سے تر ہے۔ اور میری زلفیں رات کے بوندوں سے بھری ہیں"

پھر سلیمان ع کی بادشاہی کی تعریف کرتی ہے۔

"سلیمان بادشاہ نے لبنان کے لکڑیوں کی ایک پالکی بنائی۔ اُسکے ڈنڈے روپے کے اور اُسکے تکیہ سونے کے اور اوسکی گدی ارغوانی ہے۔ اُسکے اندر کا فرش یروسلم کی بیٹیوں نے عشق سے مرصع کیا ہے۔ صیہوں کی بیٹیو۔ باہر نکلو سلیمان بادشاہ کو دیکھو۔ جسکے سر پر وہ تاج ہے جو اوسکی ماں نے بیاہ کے دن میں اور اوسکے دل کی شادی کے دن میں اوسکے سر پر رکھا"

اُن کی محبت کی تعریف کرتی ہے۔

"وہ میرے محبوب کی آواز۔! دیکھو وہ پہاڑوں پر سے کودتے۔ اور ٹیلوں پر سے پھاندتے ہوئے آتا ہے۔ دیکھو وہ ہماری دیوار کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ کھڑکیوں سے جھانکتا ہے۔ جنجریوں سے آپ کو دکھاتا ہے"

بہار کی سینری دیکھو۔

"جاڑا گذر گیا۔ اور موسم کا بھاری مینہ برس چکا۔ اور نکل گیا۔ زمین پر پھولوں کی بہار ہے

چڑیوں کے چہچہانے کا وقت آپہونچا۔ اور ہماری سرزمین میں قمریوں کی آواز سننے میں آتی ہے۔ انجیر کے درختوں میں ہرے انجیر پکنے لگے۔ اور تاکوں کے پھولوں سے خوشبو آتی ہے۔ اے اُتر کی ہوا جاگ۔ اور دکھن کی ہوا چل۔ میرے باغ پر بہہ۔ کہ اوسکی باس مہکے۔ میرا محبوب باغیچے میں آوے۔ اور اوسکے لذیذ میوے کھاوے۔

آہ میرا محبوب میرا ہے۔ میں اپنے محبوب کی ہوں۔ وہ سوسنوں کے پھولوں کو چنتا ہے[1]۔" اپنی چھوٹی بہن کے حسن وجمال کی تعریف کرکے اُسکے ساتھ محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتی ہے "ہمبدن اس (بہن) کی بات چلے کیا کریں۔ اگر وہ دیوار ہووے تو ہم اُسپر چاندی کا ایک قلعہ بناوینگے۔ اگر وہ دروازہ ہووے تو ہم اُسپر سرو کی تختیوں کا پشتہ دینگے[2]"

یرمیاہ نبی کا نوحہ کن پردرد الفاظ میں ہے۔ وہ اپنے قوم کی بربادی اور یروشلم کے لٹ جانے اور مفتوح ہوجانے کا کس غمناک طریقہ سے نقشہ کھینچتے ہیں۔ "وہ بستی کیونکر اکیلی بیٹھی ہے جو خلایق سے بھری تھی۔ وہ بیوہ ہوگئی۔ جو قوموں کے درمیان بزرگ اور صوبوں کے بیچ ملکہ تھی۔ سو خراج گذار ہوئی۔ وہ رات کو زار زار روتی ہے۔ صیہون کی راہیں ماتم کرتی ہیں۔ کہ کوئی مقررہ عیدوں کو نہیں آتا۔ اُسکے سارے پھاٹک سنسان ہیں۔ اوسکے کاہن۔ ٹھنڈا سانس بھرتے ہیں۔ اوسکی کنواریاں غمگین اور وہ آزردہ خاطر ہے۔ دیکھ اے خداوند میری انتڑیاں اُبلتی ہیں اور میرا دل مجھ میں پکارتا ہے۔"

آگے چلکر اپنی قوم کی مصیبت کا فوٹو کھینچتے ہیں۔

"صیہون کے بیٹے کو بزرگ زمین پر بیٹھے ہیں۔ وے چپ رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے سروں پر خاک اُڑائی۔ اپنی کمروں پر ٹاٹ باندھا۔ یروشلم کی کنواریاں اپنے سروں کو زمین تک جھکاتیاں ہیں۔"

اب اپنے رنج وغم کی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

"میری قوم کی شکستہ حالی کی بابت میری آنکھوں کی بینائی آنسوؤں سے گھٹ چلی۔ میری انتڑیوں میں مروڑ ہے۔ میرا کلیجہ بھکے زمین پر گرا۔ اسلئے کہ اطفال اور دودھ پیتے بچے

[1] غزل الغزلات [2] غزل الغزلات

شہر کے کوچوں میں غش کھاتے ہیں۔ دیکھ۔ کہ عورتیں اپنے پہل۔ اپنے بالشت بھر لینے بچونکو کھاتی ہیں۔ رحم دل عورتوں کے ہاتھوں نے اپنے بچونکو پکایا۔ میری قوم کی بیٹی کی ہلاکت میں وہی خوراک ہوئے"

آگے چلکر کن پُر درد الفاظ میں فرماتے ہیں۔

گیدڑ بھی چھاتیاں نکالتی ہیں۔ وے اپنے بچونکو دودھ چساتے ہیں۔ میری قوم کی بیٹی بیابان کے شتر مرغونکے مانند بے رحم ہے۔ دودھ پیتے بچے کی زبان تالو سے جالگی ہے تب بچے روٹی مانگتے ہیں۔ پر اُنکے لئے کوئی توڑتا نہیں۔ وے جو مزہ دار کھانے کھاتے تھے۔ سو گلیوں میں بے تاب پڑے ہیں۔ وے جو قرمزی پوشاک پہنے ہوئے پلے تھے مزبلے سے ہم آغوشی کرتے ہیں۔ وہ برف سے بھی صاف اور دودھ سے بھی سفید تھے۔ اُنکے بدن مونگے سے بھی زیادہ سُرخ تھے۔ اُنکا کالبد نیلم کا سا تھا اب اُنکا چہرہ سہور سے بھی زیادہ کالا ہے۔ وے گلیوں میں پہچانے نہیں [illegible] اُن کا چمڑا ہڈیوں سے لپٹا ہے۔ وے جو تلوار سے قتل کئے جاتے ہیں [illegible] جو بھوک سے مرتے ہیں"

آخر میں نہایت جوش میں کہتے ہیں۔

بزرگ لوگونکا پاٹکوں پر جمع ہونا موقوف ہوا۔ اور جوان اپنی نغمہ پردازی سے باز آئے۔ ہمارا ناچ ماتم سے مبدل ہوا۔ تاج ہمارے سر سے گر گیا۔ ہم پر افسوس کہ ہم نے گناہ کیا۔ اس باعث میرا دل ناتواں ہوا۔ ان باتونکے سبب میری آنکھیں دھندھلا گئیں"۔ اسکا ایک ایک جملہ غور سے دیکھو۔ ہر ایک میں دل کی حقیقی کیفیت اور اصلی رنج و غم کا اظہار ہے نہ تصنع ہے نہ تکلف۔ اور پھر کسقدر پر اثر ہے اسیکا نام شاعری ہے۔ کتاب مقدس میں زبور کے گیت سلیمان ع کی غزل الغزلات۔ اور یرمیاہ نبی کا نوحہ تو قطعاً شاعری ہے لیکن اسکے اور حصے گو وہ شاعرانہ لطیف جوش اور دلچسپی سے خالی نہیں ہے مگر شاعری سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ یہی حال قران کا بھی ہے اسکی بعض بعض آیتیں یا سورتیں مثلاً اذا الشمس کورت۔ گو شاعری کے اعلیٰ رتبہ میں شمار

ہوسکتی ہیں مگر اُنکا درجہ اُس سے بلند ہے وہ خطیب ہیں۔

شاعر اور خطیب میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے یعنی جسطرح شاعر اپنے کلام کو موثر اور دلکش بناتا ہے اسیطرح خطیب بھی لیکن اسقدر امتیاز خطیب کو حاصل ہے کہ شاعر تو اُسی اثر میں خود محو ہوجاتا ہے اور اُسکے اوپر وجد کی حالت طاری ہوجاتی ہے مگر خطیب اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا ہے کیونکہ اُسکو غیروں کا متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً انجیل کے یہ فقرے جو مختلف مقامات سے ہم نقل کرتے ہیں۔

"وہ چیز جو پاک ہو کتوں کو مت دو۔ اور اپنے موتی سوروں کے آگے مت پھینکو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اُنہیں پامال کریں"۔

"مانگو کہ تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو کہ تم پاؤ گے۔ کھٹکھٹاؤ کہ تمہارے واسطے کھولا جائیگا۔ ہوا کے پرندوں کے واسطے بسیرے ہیں۔ لومڑیوں کے لئے ماندیں۔ پر ابن آدم کے لئے نہیں۔ جہاں اپنا سر دھرے"

بالکل خطیبانہ ہیں۔ اور شاعر کی زبان سے ایسے پُرجوش جملے نہیں نکل سکتے۔

قلم جیرا چوری۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ

گلدستۂ خرد المعروف بہ کلام کلیم	یعنی دیوان مولانا محمد عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی شاگرد لطافت مرحوم لکھنوی حجم تقریباً ۱۹ اجزو تقطیع ۲۹×۲۰ بہت اچھا لکھا اور چھپا ہوا۔ قیمت صرف ۴ ہے حضرت مصنف سے لکھنؤ محلہ چاہ کنکر کے پتے سے ملیگا۔ اسموقع پر بطور نمونہ ایک غزل برای ملاحظہ ناظرین درج کیجاتی ہے

ناوک جو وہ لگائے پھر کوئی راہ نکلے
سینے سے دل جو نکلے تو دل سے آہ نکلے

روز شمار آخر میں بے حساب ٹھہرا
فرد گنہ میں میری اتنے گناہ نکلے

اُس شوخ بیگیں سے قاصد خط دیکے کچھ نہ کہنا
تیرے نہ لب سے میرا احوال تباہ نکلے

وہ باوفا ہوں ظالم تاثیر اگر دکھائے
دل اپنا تھام لوں میں جب دل سے آہ نکلے

سینۂ عدو میں خنجر ترا در آئے
ایسا سیاہ دل ہے وہ بھی سیاہ نکلے

تیر اگلا ستمگر اور پھر مری زباں سے
موقع جو آہ کا ہو تو منہ سے واہ نکلے

جلوہ کلیم اُسکا حیرت میں گر نہ ڈالے
پردے میں شب کے چھپکر ہرگز نہ ماہ نکلے

مکتوبات امیر مینائی

(مرتبہ ثاقب)

سید محمد نوح صاحب شہیر رئیس محلہ شہر کے نام

دلنواز امیر فقیر حضرت شہیر سلمکم اللہ القدیر۔

سلام مسنون اخلاص مشحون۔ شدائد مرض عسر بول وحبس بول سے اوقات میں سخت اختلال ہے۔ ضعف پیرانہ سالی کو خستہ حالی نے اور قوت دے رکھی ہے یہی سبب ہے کہ احباب سے بھی رسم وراہ خط وکتابت ترک ہوگئی۔ آپ کی محبت اور عنایت کا خیال تو اکثر رہتا ہے مگر خط لکھنے کا اتفاق مدت سے نہیں ہوا۔ آج محمد احمد سے آپ کی خیر وعافیت سنکر فی الجملہ تسکین ہوئی مگر جو حالات اپنی پریشانی کے اجمالاً آپ نے لکھے انہوں نے میرے دل دردمند کو بہت دکھایا علی الخصوص سرمایۂ نتائج افکار کا جو پور سے گم ہو جانا سنکر مجھے ایسا قلق ہوا کہ اسکے بیان کو لفظ نہیں ملتے۔ خدا جانے کس بیدرد نے یہ ظلم کیا۔ اتنے بڑے دیوان کا چوری جانا سمجھ میں نہیں آتا کچھ تفصیل تو لکھئے یہ کیا غضب ہوا۔ آپ سے نامور شاعر کا کلام کسی دوسرے کا کام کیونکر کا سکتا ہے یہ بھی لکھیے کہ خدانخواستہ اس کلام کے ملنے سے یاس ہوگئی یا احتمال باقی ہے اور درصورت نملنے کے کچھ مسودات ایسے ہیں جنسے پھر تسوید وتبییض ہو سکے یا نہیں۔ خدا کرے وہی دیوان ملجائے ورنہ آپ ہرگز ہمت نہ ہاریے اور مسودات سے جسقدر ممکن ہو پھر جمع کر لیجئے ایسے ریزہ ہائے جواہر کا تلف ہو جانا آپکے احباب پر نہایت شاق ہے۔ میرا دل تو یہ خبر سنکر بسمل ہوگیا۔ زیادہ اسوقت کیا لکھوں یہ چند سطریں طبیعت پر بہت جبر کرکے لکھی ہیں۔ میری کوتاہ قلمی پر نظر نفرما کر کبھی کبھی مجھے اپنی خیر وعافیت اور صحت وسلامت سے مسرور کیا کیجئے تو کمال احسان ہے

آپکا منت پذیر حسرت خمیر وپاس تصویر۔ امیر فقیر

تکملۂ التماس یہ ہے کہ غدر میں میرا بھی کلام جسقدر اس زمانے تک مرتب ہوا تھا اور میں نے اسکو خوشنویس سے لکھوا کر مطلا اور مذہب کروایا تھا سب تلف ہوگیا مگر کچھ اپنی یاد سے کام لیا اور کچھ پھر موزوں کیا کہ مراۃ الغیب کے صورت بند ہی اگرچہ ہزارہا شعر یاد نہ آیا اسکے لکھنے سے غرض یہ ہے کہ آپ بالکل اس دیوان سے قطع نظر نفرمائیں اور کوشش کریں کہ کچھ یادگار باقی رہے۔

تنقید

مخزن - مکتوبات آزاد | کئی ماہ سے رسالہ مخزن لاہور میں حضرت آزاد صاحب آبِ حیات کے خطوط شائع ہو رہے ہیں - ان خطوط کی دلچسپی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ جا بجا انہیں بعض ایسی غلطیاں نظر سے گزرتی ہیں جو مخصوص بہ محاورۂ پنجاب ہیں - مثلاً پرچہ جولائی کے صفحہ ۱۴ میں ہے کہ "میں نے کونسا پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے" - بلاشبہ یہ حضرت آزاد کو طویل قیام لاہور کا نتیجہ ہے -

فصیح الملک | غالباً مکتوبات امیر مینائی مرحوم کی اشاعت سے متاثر ہو کر حضرت احسن مارہروی نے فصیح الملک میں مکتوبات داغ کا بھی سلسلہ شروع کر دیا ہے - ہمارے خیال میں داغ مرحوم کی نثر نگاری اس قسم کی عزت افزائی کی مستحق نہیں ہے - لیکن اگر حضرت احسن کو اس قول کی صحت سے انکار ہو تو انکو کم از کم اتنا لحاظ ضرور رکھنا چاہئے کہ آئندہ سے "طوائف کے نام" کی خطوط اشاعت نہ پائیں اسی قسم کی ناگوار غلطی اڈیٹر مخزن سے بھی ہو چکی ہے جنہوں نے واجد علیشاہ مرحوم شاہ اودھ کے پرائیویٹ خطوط بلا امتیاز شائع کر دئے تھے -

اخبار گیلک امریکن نیویارک | آئرش باشندگان امریکا کے اس اخبار میں تقریباً ہر ہفتے اہل ہند کی دلچسپی کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہے - کیونکہ محکومی انگلستان کے لحاظ سے قدرتاً ایک حد تک دونوں ملکوں کی حالت یکساں ہے اور اسلئے ایک کو دوسرے کے ساتھ ہمدردی بھی ہے - ۳۰ جون کے پرچے میں اخبار پنجابی لاہور سے ایک مسلمان کا خط نقل کر کے اس اخبار نے ان چند ضمیر فروش مسلمانوں کی بہت بری طرح خبر لی ہے جنہوں نے خرخشۂ عقبہ کے موقع پر بعض آزاد خیال مسلمانان علیگڈھ کے تار کے جواب میں اخبار پانیر کے ذریعے سے گورنمنٹ کو یہ باور کرانا چاہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطان عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے - اس معاملے کے متعلق علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں نواب محسن الملک بہادر نے اس بات کا مکرر سہ کرر اعلان کیا ہے کہ علی گڈھ کالج کو شیخ عبداللہ اور قاضی عزیز الدین احمد کے خوشامدانہ تار اور تحریر سے کوئی سروکار نہیں ہے اور ساتھ ہی اس امر کی شکایت بھی کی ہے کہ لوگ بلاوجہ کالج کو بدنام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں - ہم بھی اس بات کو مانتے

کہ کالج کو شیخ عبد اللہ کے تار سے کوئی تعلق نہ تھا چنانچہ کالج کے ۹۰ فیصدی لڑکے اُن کی اس حرکت پر نفرین کرتے تھے۔ لیکن نواب صاحب کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے کیونکہ جب کالج کے ایک ٹرسٹی نے پہلے تار بھیجنے والوں میں دو ایک اہل کانگرس کی شرکت کے لحاظ سے اُس تار کو کانگرسی مسلمانوں کا تار بتلانے میں خوف خدا سے کام نہ لیا تو اگر عوام الناس نے کالج کے دو ٹرسٹیوں کی تحریر پر اُس تار کے افسوسناک جواب کو کالج سے منسوب کیا تو کچھ بیجا نہیں کیا۔

مسٹر برائن امریکن کے خیالات کچھ روز ہوئے کہ امریکہ کے مشہور اخبار "دی سن" میں مسٹر برائن نے، جو پریسیڈنٹی ممالک متحدہ امریکا کے امیدوار رہ چکے ہیں اور اب بھی ہیں، اپنے سفر ہندوستان کے نہایت دلچسپ حالات لکھے تھے چنانچہ شمالی ہندوستان کے شہروں میں علیگڈھ کا ذکر کالج کی تعریف کیساتھ کرکے آپنے نہایت دور اندیش رائے ظاہر کی تھی کہ عنقریب یہاں کی تعلیم یافتہ نوجوان، جو اب تک کانگرسی تحریک کے مخالف رہی ہیں، یقیناً تعلیم اور آزاد خیالی سے بہرہ ور ہوکر کانگرس میں شریک ہو جائینگے۔ پھر آگرہ کے روضہ تاج گنج کی بیحد تعریف کرنیکے بعد لکھا تھا کہ اس لاجواب عمارت کے بانی کی نسبت تحسین و عزت کے تمام خیالات رنج سے مبدل ہو جاتے ہیں جبکہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ جس خاتون کی ظاہری حرمت اسدرجہ کی گئی کہ اُسکا مقبرہ دنیا میں لاثانی قرار پایا اسکی حقیقی عزت صرف یہ کیجاتی تھی کہ وہ محلسرائے شاہی کی چاردیواری میں محدود و مقید رہا کرتی تھی۔ مسٹر برائن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی رسم پردہ اُنکو نہایت درجہ ناگوار معلوم ہوئی۔ ہندوستان میں انگریزی طرز حکومت کے عیوب پر صاحب موصوف نے حال ہی میں جو خیالات ظاہر فرمائے اُنکا مطالعہ ہر ہندوستانی اور انصاف پسند انگریز پر فرض ہے۔ آپنے انگریزی حکومت کو دوبا تو نہیں روسی حکومت سے بھی بدتر قرار دیا ہے اول اس لحاظ سے کہ روس میں شخصی اور جابرانہ حکومت ضرور ہے لیکن پھر بھی وہ خود روسیوں کی حکومت ہے حالانکہ ہندوستان پر دوسری قوم حکمراں ہے۔ دوم اس صورت سے کہ حکومت روس کو جو کچھ رعایا سے وصول ہوتا ہے وہ روس ہی میں صرف ہوتا ہے برخلاف اسکے ہندوستان کے محاصل کا بڑا حصہ ملک کے باہر چلا جاتا ہے۔ ہماری کرمفرما مولوی برکت اللہ صاحب کی بھی ایک تحریر اسی اخبار میں شائع ہوئی ہے جسمیں اُنہوں نے مسٹر برائن کی بے لاگ رائے کی تائید اور تعریف کی ہے۔ فقط

حصہ نظم

غزل از مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر قند پارسی

غم سے شب فراق میں وابستگی تو ہے
عشاق خستہ حال کا مونس یہی تو ہے

آوارہ وطن کا دیار غریب میں
کوئی اگر نہیں ہے نہو بیکسی تو ہے

گو دشت فتنہ خیز ہے گو چرخ حیلہ جو
خضر رہ مراد مری بیخودی تو ہے

ہے جاں گداز و تاب شکن گرچہ سوز ہجر
مرنے کی اپنے روز ہمیں اک خوشی تو ہے

ملجائیگی کبھی نہ کبھی دولت سرور
پیر مغاں سے نسبت رنداں قوی تو ہے

دل دو دیا کسیکو اگر ہمنے کیا گناہ
عہد شباب و عشق و ہوس مقتضی تو ہے

راہ وفا میں کوئی نہیں اس کا ہمقدم
ثاقب کے گو مزاج میں آشفتگی تو ہے

غزل از مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

درد دل ختم شب غم کی خبر دیتا ہے
رنگ بیمار کا پیغام سحر دیتا ہے

کچھ وہی واقف اسرار محبت ہوگا
زندگی وقف شب ہجر جو کر دیتا ہے

اسکی قدرت سے شب ہجر تعجب کیا ہے
زندگانی یوہیں دیتا ہے اگر دیتا ہے

اس تصور نے غم بے اثری دور کیا
کون ہے جو مرے نالوں میں اثر دیتا ہے

بیخودی کوچہ جاناں میں لئے جاتی ہے
دیکھئے کون مجھے میری خبر دیتا ہے

تمکو انگڑائی وہاں آئی یہاں دم ٹوٹا
یوں کوئی جذب محبت کی خبر دیتا ہے

انتظار اسکا خیال اسکا امید اسکی پوچھ
صبح سے شام ترے در پہ جو کر دیتا ہے

ہے یہی غفلت بیمار کی اب کچھ تدبیر
چارہ گر آپکے آنے کی خبر دیتا ہے

غزل جناب ضامن کنتوری

مخل معرفت نفس ہے حجاب نفس
کہ وجہ برہمی دل ہے پیچ و تاب نفس

رجوع قلب نہیں یاد یار کیا آئے
خرد شکار ہوس ہے تو دل خراب نفس

سمند عمر پہ غافل نہ بیٹھ اونا داں
نہ ٹوٹ جائے کہیں تسمہ رکاب نفس

ہیں کرتے بحر سے کیوں لوگ عمر کو تعبیر
خبر نہیں کہ یہ ہے موجہ سراب نفس

خیال بیرونی نفس ہر نفس ہے جنہیں — خدا کے سامنے کیا دینگے وہ حساب نفس
ملوں دل کو خرابات دہر میں کیا ہو — غم وجود میں ہے جوش زن شراب نفس
غزل میں گرچہ ہے ضامن تتبع صائب — پہ یاں ہی قید اضافت سے سد باب نفس

غزل جناب مولانا حکیم محمد عابد علی صاحب کوثر خیرآبادی شاگرد حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

میرے سینے میں چھپا رہنے دی پیکاں کوئی — دل بہلنے کے لئے چاہئے ساماں کوئی
یہی دہڑکا ہے کہ میرا دل شوریدہ نہو — آج نکلا ہے تری بزم سے نالاں کوئی
گوشۂ دل میں خیال رخ گلرنگ نہیں — ایک غنچے میں چھپائے ہے گلستاں کوئی
خاک کے ذرّوں میں ہے نور کا عالم پیدا — کبھی گزرا تھا ادھر سے مہ تاباں کوئی
منتیں کرتا ہوں اے عہد جوانی پھر آ — روٹھتا یوں نہیں اے عمر گریزاں کوئی
قید میں بھیجکے یوسف کو زلیخا نے کہا — کھینچے لیتا ہے مرا دل سوز نہاں کوئی
شرگیں آنکھوں میں کاجل جو لگانا چاہے — مانگ لے ہم سے سواد شب ہجراں کوئی
میں جو اٹھتا ہوں بناوٹ سے بگڑ کر کوثر — نیچے زانو کے دبا لیتا ہے داماں کوئی

غزل جناب نواب سید محمد رضا صاحب موج عظیم آبادی

تری جستجو میں سنتے تجھے یوں تلاش کرتے — اسی ایک دھن میں رہتے کبھی یوں بھی کاش کرتے
اسی کچھ عہد تو ناصح وہ جفا پہ ہوتے مائل — جو ہم اسطرح کے نالے نہ جگر خراش کرتے
کوئی پوچھے محتسب سے کبھی کچھ ترس بھی آیا — ہرے شیشۂ مے کدہ کے تجھے پاش پاش کرتے
کبھی بے نقاب اسکو نگہ رہتے ہمنے دیکھا — سر راہ عمر گزری ہمیں بود و باش کرتے
ہیں صدائے صور سنکر اسی سوز میں سے اٹھتا — مجھے دفن اسی گلی میں مرے دوست کاش کرتے
وہ ہزار بیخودی تھی پہ مجال کیا تھی ساقی — کہ ہم اور مے کدہ کا کوئی راز فاش کرتے
ہمیں اسکی جستجو کا یہ پڑا ہے موج لیکا — اسے ڈھونڈھ بھی جو پاتے تو نہیں تلاش کرتے

غزل جناب محمد احمد صاحب بیخود موہانی

کریں وہ من ترا نی مجھسے ایسا ہو نہیں سکتا — کبھی ہر طالب دیدار موسیٰ ہو نہیں سکتا
قیامت میں وہ محو ناز ہے ہم محو حیرت ہیں — نظارا ہو نہیں سکتا اشارا ہو نہیں سکتا

کرم ای خود فراموشی کہ کوئی جلوہ آرا ہے
قیامت ہے کہ میں محو تماشا ہو نہیں سکتا

کچھ اُسی کی شان ہی مجھ میں کچھ اپنی شان کچھ میں
تکلف برطرف وہ بت بھی مجھسا ہو نہیں سکتا

مری ایذا پرستی مجھکو یوں تسکین دیتی ہے
کہ تیرا ہو کے وہ ظالم کسیکا ہو نہیں سکتا

سلامت دم ہی جب تک آپکے حسرت پرستونکا
ہجوم یاس محروم تمنا ہو نہیں سکتا

جو خود بینی وہاں ہی یاں وہی ہی خود فراموشی
بیاں کچھ امتیاز قیس و لیلی ہو نہیں سکتا

کسیکا جلوہ بیتاب بھی پابند محشر ہو
فریب ناز ہے اے شوق ایسا ہو نہیں سکتا

ترے حسن خرد دشمن سے جب اک حال ہی سبکا
ہجوم حشر میں پھر کوئی رسوا ہو نہیں سکتا

ترے جلوہ کو ظالم انتظار روز محشر ہے
دل بیتاب سے یاں صبر اتنا ہو نہیں سکتا

عبث شوق تماشا شکوہ سنج بے نیازی ہی
وہ مست ناز ای بیخود کسیکا ہو نہیں سکتا

غزل جناب حکیم معشوق علی خانصاحب جوہر ساکن بھوپال

دل پہ داغ کو کیونکر بچاؤں چشم پرفن سے
زر مسکوک بچتا ہی نہیں ہی دست رہزن سے

مزہ دیوانہ پن کا وادی وحشت میں جب آئے
نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے

خدا جانے خزاں نے کیا ستم ڈھایا ہی پھولوں پر
صدای نالۂ بلبل چلی آتی ہے گلشن سے

رگ جاں پر وہ زناریں کرتی ہی کام اپنا
نیا رشتہ نکالا عشق نے طفل برہمن سے

زمانہ سے نرالا آپکا طرز ستم دیکھا
میرے منہ پر شکایت میری کرنا میرے دشمن سے

خزاں میں لطف کیا سیر گلستاں کا ہوا ای جوہر
بہار لالہ و گل جل بھی ہے صحن گلشن سے

شعلہ - سید محمد سلطان صاحب لکھنوی - شاگرد جناب مرزا کاظم حسین بخشر لکھنوی

بد نظر جفا ہے تو کیجے جفا ضرور
اچھا تو ہے کہ ہو ستم ناروا ضرور

کہتے ہوئے یہ ولولہ دل سے آئے ہیں
اُنسے کرینگے آج تو کچھ التجا ضرور

یارب غم فراق میں مرنا عبث نہو
آئیں لحد پہ میری وہ بعد فنا ضرور

ای شوق انتظار بس اب جان چھوڑ دے
ہم مرگئے تو یار کا آنا ہے کیا ضرور

وابستہ اس امید سے ہے اپنی زندگی
پوچھے گی ہمکو ہجر میں آکر قضا ضرور

کہتے ہیں آسماں سے شب غم مریض ہجر
کچھ ہو نہ ہو مگر ہو نزول بلا ضرور

ذکر وصال ہجر میں ناصح نہ چاہیے
جو خود ہی رو رہا ہو ہنسی اُس سے کیا ضرور

کیوں وہ چراغ پا ہوئے نام وصال پر
انسان ہی سے ہوتی ہے شعلہ خطا ضرور

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اعظم اجیگڑھ سنٹرل انڈیا

دیا ہے ساتھ اثر نے جو میری نالوں کا
تو حال دیدہ کے قابل ہے عرش والوں کا

رہ طلب میں جو تھکتے ہیں نالہ کرتے ہیں
عصائے راہ ہے یہ ہم شکستہ حالوں کا

اُسی کے طالب و خواہاں ہیں کافر و دیندار
جو مسجدوں کا ہے داتا وہی شوالوں کا

جو سامنا تیری زلف سیاہ کا ہو جائے
چراغ زیست سر شام گل ہو کالوں کا

وہ گلعذاروں کا مجمع ہے یاد اے اخگر
وہ سیر نہر کی میلا وہ پھول والوں کا

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر مدظلہ

مصاحب ظلم واں۔ مانوس شوق فتنہ گر ہمسے
لگاتے ہیں یہی کمبخت۔ اُدھر اُنسے ادھر ہمسے

ذرا کم ہو گیا تھا ضبط۔ پھر دریا اُمنڈ آیا
خدا جانے بھری بیٹھی تھی کب کی چشم تر ہمسے

کیا ہے ذکر ملنے وامق و فرہاد و مجنوں کا
کہانی خفتہ بختی کی کہی ہے رات بھر ہمسے

لحد میں آ گئے ہم۔ رہ گیا دل کوئی جانا نہیں
یہ منزل سخت تھی ایسی کہ چھوٹا ہمسفر ہمسے

نہ ہمکو تاب رونے کی۔ نہ اُنکو ضبط کی طاقت
خجل رہتے ہیں چشم تر سے ہم اور چشم تر ہمسے

نہیں کرتے احباب ذکر تک فرہاد و مجنوں کا
چھپائی جاتی ہے اُلفت کے کشتوں کی خبر ہمسے

بلا اے جذب دل کیونکر یقیں ہو اُنکے آنیکا
تصور نے کہی ہے بارہا جھوٹی خبر ہمسے

مبصر ہوں خبر رکھتا ہوں حال نرگس و گل سے
چھپی رہتی نہیں ابدوست دشمن کی نظر ہمسے

سمجھ لیں گے اگر منزل پہ ہم اے شاد جا پہنچے
خبر تک بھی نہ کی اور بڑھ گئے سب ہمسفر ہمسے

دل کو میل آتا ہے فرقت سے نہ ملنا آتا ہے
اور نہ کمبخت ترے عشق سے باز آتا ہے

کھل گیا ہے جو مرے شوق کا احوال تو اب
نالہ بھی سینے کرتا ہوا ناز آتا ہے

غم نے بے صبر کیا مجکو۔ جنوں نے رسوا
ہائے جو آتا ہے یاں دشمن راز آتا ہے

رک گئے کیوں در جاناں پہ قدم اے زاہد
اعتقاد میں اگر سوئے مجاز آتا ہے

دلکو بہلائے رہے شاد شب ہجر میں یوں
اب سحر ہوتی ہے اب وقت نماز آتا ہے

رجسٹری نمبر ۲۵۱

اردوی معلی

علی گڑھ

جلد	بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء	نمبر ۴

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی۔ اے

(فہرست مضامین)

(۱) قصہ بگلا ہی از اورنگ عالمگیر ... صفحہ
(۲) [illegible] اکبری از علامہ [illegible] ... ۱۵
(۳) [illegible] حسرت ... ۱۹
(۴) [illegible] از [illegible] ... ۱۷
(۵) غربت و وطن از یلدرم بغداد ... ۲۰
(۶) مکتوبات اسیر مالٹا از حضرت ثاقب ... ۲۳
(۷) تنقید ... ۲۵
(۸) [illegible] نظم ... ۲۸
(۹) [illegible] از [illegible] (صفحہ [illegible]) از ملا [illegible] الغنی صاحب حیدرآبادی (صفحہ [illegible] صفحہ [illegible])

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علیگڑھ

احسن المطابع واقع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ

(قسم اول [illegible]) [illegible] سالانہ [illegible]

البشیر اٹاوہ

اخبار البشیر ہفتہ وار اٹاوہ سے شائع ہوتا ہے۔ درخواست کرنے پر نمونہ مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ المشتہر۔ محمد بشیر الدین خلیفہ البشیر

اطلاع

ہندوستان میں کپڑا بننے کی صنعت کو ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ جسکو پورا کرنے کیلئے پنجاب ہینڈلوم کافی بھی گئی ہیں۔ مگر ان لوموں کے متعلق عام تکلیف یہ ہے کہ اچھی طرح کام کرنے والے کاریگر نہیں ملتے۔ جو ان لوموں پر کام کرنا جانتے ہوں۔ اس عام شکایت کو رفع کرنیکے لئے پنجاب ہینڈلوم سکول بیرون دروازہ شاہ عالمی متصل سیتلا استھان کھولا گیا ہے جس میں چھ روپیہ داخلہ لیکر امیدواران کو بغیر کسی قسم کی زائد فیس کے کام سکھایا جاتا ہے۔ باہمت نوجوان جو ایک عمدہ اور روزگار حاصل کرنیکے خواہاں ہوں اس اسکول میں آکر کام سیکھیں اور کلیں کپڑا بازی کی صنعت کو ترقی دیں۔ المشتہر کنور سنگھ منیجر پنجاب ہینڈلوم اسکول لاہور۔ شاہ عالمی دروازہ۔

اخبار الکیمیا لیڈر کوئٹہ

اس نام کا ایک طبی اور کیمیائی مضامین کا دلچسپ اخبار جس میں علم کیمیا شرقی اور مغربی کے متعلق محققانہ بحث ہونیکے علاوہ ہندوستان کے مسلم و مستند حکماء و اطباء کے مضامین اور اسلامی ہی درج ہوتے ہیں اور جسکا کام مایوس مریضوں کو مفت مشورہ دینے اور ہر ایک قسم کے طبی و کیمیائی سوالات کا جواب لکھنے کے علاوہ کیمیا کے وہ سربستہ و مخفی رازوں کا اظہار کرنا ہے کہ جنکے انکشاف اسکے جاننے والے پر شاق گذرتا ہے اور بڑے بڑے علماء و حکماء نے اسے ایک معزز اور قابل قدر اخبار مانا ہے۔ نمونہ مفت منگوا کر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت سالانہ عہ

درخواست بھیجنے کا پتہ۔ دوست محمد خان اڈیٹر اخبار الکیمیا لیڈر کوئٹہ

رسالہ الاخلاق آگرہ

ہندو مسلمانوں کو متحد بنانیوالا ہندوستانیوں میں اصلی تہذیب اخلاق پھیلانیوالا۔ اتفاق و اتحاد کا حامی تعصب و نفاق کا دشمن۔ غرضکہ ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانیوالا آگرہ کا باتصویر اخبار سال ۱۸ و ۱۹ کی تقطیع کے ڈیڑھ جزو پر تین سال سے ہر مہینہ کی ۲۵ تاریخ کو نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ کتابی چھپائی نہایت اعلیٰ کاغذ و لائق و جداول ہر ماہ کسی نہ کسی مشہور شخص کی تصویر بھی شائع ہوتی ہے۔ قیمت سالانہ بہت کم عوام سے ہے۔ طلباء سے بشرط تصدیق مدرسہ نصف قیمت سے۔ محصول ڈاک مقرر ہے۔ نمونہ کے لئے ۔ رکابکٹ ہمراہ ضروری ہے بلا ٹکٹ کوئی صاحب نمونہ طلب نہ فرمائیں۔ المشتہر

مینیجر رسالہ "الاخلاق" آگرہ

رسالہ اجماع

مصنفہ بنا ٹیکر رامانند صاحب پروپرائٹر و مینیجر نشر ۱۵۔ نجات مل بلڈنگ لاہور

ناظرین یہ وہ رسالہ ہے کہ جسکا رسالہ کرکے ان کے نور آنکھوں پر ٹپک پڑتے ہیں اور بیساختہ یہ کلمہ زبان سے نکلتا ہے کہ ہائے میں مارا گیا اور آئندہ کے لئے بچگیا۔ اب ایسے ایسے کام نکر دیگا۔ واقعی ایسی نادر کتاب آپ کے مطالعہ سے نہ گذری ہوگی۔

نوٹ۔ راجاؤں امیروں کبیروں، عالموں، فاضلوں اور عوام کو اطلاع کیجاتی ہے کہ اس اشتہار کے پڑھتے ہی لوگوں کو اکٹھا کرکے اور ان سے دریافت کرکے کہ اتنے آدمیوں کو کتنے رسالے درکار ہیں فوراً جناب جنرل میجر صاحب رائل مڈ ایکل ہال جگادھری ضلع انبالہ کو بذریعہ کارڈ اطلاع دیں۔ آپ کی تحریر کے بموجب اتنی ہی رسالے آپ کی خدمت میں بغیر قیمت بلکہ ٹکٹ ڈاک خانہ کیطرف سے چسپاں کرکے فوراً روانہ کردیئے جاوینگے تاکہ آپ ان سب لوگوں کو تقسیم کردیں۔ لیکن اطلاع آنے میں دیر نہ ہو کیونکہ رسالہ چار ہزار کی تعداد میں روزمرہ ہفت تقسیم ہو رہا ہے۔

از سکرٹری کارخانجات رائل مڈ ایکل ہال سیڈ آفس جگادھری ضلع انبالہ

ید بیضا

زبان اردو کا ایک ماہوار علمی رسالہ جس قسم کے ادبی تنقیدی تمدنی اخلاقی تاریخی اور فلسفیانہ مضامین اور تازہ غزلیات اور دلچسپ نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ حجم ۴۰ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰

مقاصد ضروری ۔ اردو علم ادب کی تنزیل و توسیع

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک

والیان ریاست ..... عطیہ مرضیہ

روسا و عظام ..... سے

عام ٹائیٹل سے (قسم اول عمدہ کاغذ پر) ..... ہے

(قسم دوم معمولی کاغذ پر) ..... عہ

خریداران ممالک غیر سے ..... ہے

درخواست خریداری بنام حکیم محمد سعید خیر سکندرآباد ضلع بلند شہر آنا چاہئے

جاپانی ریشم

بہت خوبصورت ارزاں اور چمکیلا۔ جو تھان ۱۲ گز کا ہے تھان ۵۰ گز کا عرض ۲۷ انچ سے ۳۶ انچ تک۔ رنگ بجلاتا ہے کے جسمیں انچی و نونہ۔ پھولدار چھوٹے پھول والا۔ بڑے پھول والا اور سادہ۔ قیمت بلحاظ عرض و پھول ۸ گز سے ۱۰ گز تک ایک چھوٹے تھان سے کم نہ روانہ ہوگا۔ تعمیل بصورت زر پیشگی یا بذریعہ وی۔ پی ہوگی۔

عبد السلام رفیقی اینڈ کمپنی رنگون

بسم اللہ

حضرت قدر بلگرامی

اودھ کے قصبوں میں بلحاظ شہرت اور علم و فضل و کمال کے جو شرف و اعزاز بلگرام کو حاصل ہے۔ وہ اور قصبوں کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔ سنہ ہجری کی تیرہویں صدی کے قبل بارہویں صدی تک کم و بیش انہیں فضل و کمال کا خوشنما جلوہ نظر آتا رہا۔

ایک طرف علما و فضلا کا گروہ عالم کی ہدایت اور انکی تعلیم میں مشغول۔ دوسری جانب مشائخ و کملا کا مجمع اپنے خداداد اور باطنی فیض کے پہونچانے میں مصروف تھا۔ حکما وہ موجود تھے جن کے کارنامے تاریخ کی سیر کرنے سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ہر فن کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ بڑی خوبی کے ساتھ جاری تھا۔ جسکو دیکھو حصول علم میں کوشاں تھا۔ تصنیف و تالیف میں گرانبہا ترقی ہو رہی تھی۔ امارت و ریاست نے اپنا وہ رنگ جما یا تھا کہ سب کے سب خوشحال نظر آتے تھے۔ سخاوت نے اپنی الگ دھومیں مچا رکھی تھیں ہر طرف بلگرام ہی کا ذکر بلگرام ہی کا تذکرہ سننے میں آتا تھا۔ سبحان اللہ وہ زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ باغ سخن کی بھی وہ وہ رنگینیں موجود تھیں جنکو بلبل شیراز شیریں مقالی کہتے تو زیبا، گل گلزار نازک خیالی کہتے تو بجا۔ خدائے سخن یا پیمبر فن کہتے تو صحیح، خلیل کعبۂ فصاحت یا کلیم سینای بلاغت کہتے تو درست تھا۔ شعرا باکمال منشی ناز خیال سبھی موجود تھے۔ گھر گھر شاعری کا چرچا شاعروں کی طیاریاں تھیں۔

علامی میر عبدالجلیل بلگرامی نور اللہ مرقدہ کیا خوب اور کس فخر کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اللہ اللہ چہ بلگرامے		کو شرمہ و آفتاب جامے	
آب گل من کہ فیض عام است		از خطۂ پاک بلگرام است	

غرض ایک عجیب سماں نظر آتا تھا۔ مگر افسوس فلک کج رفتار سے نہ دیکھا گیا۔ زمانے نے نیا پلو بدلا۔ اور یہ پر لطف سماں نظروں سے غائب ہو گیا اس مٹے ہوئے حال پر بھی اسی خطۂ پاک کے

دور نشنده گوہر شمس العلما سید علی بلگرامی اور عالیجناب نواب سید حسین بلگرامی اُس زمانے کی کچھ یادگار باقی ہیں جن سے باوجود اسکے کہ وہ بلگرام اور اہل بلگرام سے دور اور بالکل بے خبر ہیں بلگرام کا نام قایم ہے اور اب بھی انکا نام بڑی عزت اور قدر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ (خدا اُن دونوں کی عمر و اقبال میں برکت دے آمین) اسوقت ہم اسی نامی گرامی قصبہ بلگرام اور اسی بارہویں صدی کے اُس سخنور باکمال یعنی حضرت قدر بلگرامی کا دلچسپ تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں، جو بلگرام کے آخری دور دورے میں اپنا دور دورہ دکھا کر بہار شاعری بھی اپنے ساتھ لیتا ہوا ملک عدم کو راہی ہو گیا۔ اور بلگرام کے لئے اپنے آپکو خاتم الشعرا ٹھہرا گیا۔

حضرت قدر مرحوم بلگرامی کا نام نامی سید غلام حسنین اور والد ماجد کا نام سید خلف علی ہے آپ حسینی واسطی سید ہیں آپ اپنے وطن بلگرام ضلع ہردوئی محلہ سلطرہ میں ماہ جمادی آخر ۱۲۴۹ھ ہجری کو متولد ہوئے۔ آپکے عم مکرم مولوی سید سلطان علی مرحوم نے غلام حسنین آپکا تاریخی نام کہا حضرت قدر خود ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎ سو باشی ہیں خدا نے نام حسنین ✦ ہوئے دوئم جگر مقام حسنین ✦ ہم روز ولادت سی ہو نام آور ✦ تاریخی نام ہے۔ غلام حسنین۔ آپکے نسب کا سلسلہ حضرت زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین علیہما السلام سے ملتا ہے۔ پہلی پہل سید محمد صاحب الدعوۃ العلوی جد القبیلہ واسط وہ ہے (جہاں کا قلم مشہور ہے) بلگرام میں آکر متوطن ہوئے تھے۔ آپکا مذہب امامیہ تھا۔ جیسا کہ خود ہی اس شعر میں ایک خاص لطف کیساتھ فرماتے ہیں۔ ؎ خدا معلوم کیا گو گو ہے قدر کا مذہب ✦ کہ شیعہ ہے۔ نہ سُنی ہے۔ مسلمان ہے۔ نہ ہندو ہے۔ العاقل تکفیہ الاشارہ

بلگرام میں آپ نے فارسی حاصل کی اور جب آپ کو اُس میں پوری دستگاہ حاصل ہو گئی تو علوم عربیہ کی تحصیل کی غرض سے حضرت واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہد میں بلگرام سے لکھنؤ تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ تک انہیں مشغول رہے۔ عہد شاہی میں شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ بڑے بڑے اُستاد فن موجود تھے۔ آپ شیخ امان علی صاحب سحر کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور قدر تخلص پایا۔ اسکے بعد میرزا محمد رضا برق المخاطب بہ فتح الدولہ بہادر سے عروض و قافیہ پورے طور سے حاصل کیا۔ ابتدا میں آپ کی غزلیں سحر پھر برق دیکھتے تھے۔ اور آپ شاہ غازی الدین حیدر کی بیگم مخاطب بہ نواب سرفراز محل کی سرکار میں خدمت منشی گری پر مقرر تھے۔ اُسی زمانے میں حضرت سحر اور جناب برق نے انتقال فرمایا۔ مجبوراً آپ شیخ امداد علی صاحب بحر ارشد تلامذہ حضرت ناسخ مغفور کو اپنا کلام دکھانے لگے تھے۔ پھر زمانے کے

ا تھوں جب ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں بہار لکھنؤ پر خزاں آئی اور دفعتاً ۱۸۵۷ء میں غدر کا دور دورہ ہوا فوج انگریزی سرکار سے پھر گئی۔ دلّی لٹی لکھنؤ بے چراغ ہوا۔ حضرت قدر بھی لکھنؤ سے بلگرام چلے آئے۔ اتفاقات زمانہ سے حضرت غالب کے بھانجے میرزا عباس بیگ دہلوی اور نواب غلام حسین خاں شاہجہانپوری متخلص بہ حسین اور میرزا قادر بخش صابر دہلوی شاہزادۂ خاندان تیموریہ وغیرہم غدر کے مصائب اٹھاتے ہوئے وارد بلگرام ہوئے۔ اور حضرت قدر کی پر لطف صحبت کو مغتنم جانکر ایام غدر یہیں رہے۔ انہیں دنوں بلگرام کے کبیشروں سے آپ نے بہاشہ میں کامل مہارت پیدا کی اور بعد غدر تسلط سرکار انگلشیہ آپ تلاش معاش پنجاب کو چلے گئے۔ اور جب سے سرکاری فوج میں منشی رہے۔ پنجاب میں آپکی طبیعت نہ لگی آخر مستعفی ہوکر دہلی میں آئے۔ وہاں نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی سے نظم و نثر میں اصلاح لینے لگے اور تا حیات حضرت تجر لکھنوی و حضرت غالب دہلوی دونوں سے شعر و سخن میں مشورہ لیتے رہے۔ چنانچہ آپکے کلام میں دہلی کی سادگی لکھنؤ کی ادا دونوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ایک رباعی میں آپنے چاروں استادوں کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔ ؎

سیکھے سحر و برق سے بندش کی بند	پھر غالب و تجر نے بتائے پیوند
مجھسا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر	بدنام کنندۂ نکو نامے چند

دہلی سے تھوڑے زمانے کے بعد آپ پھر اپنے وطن یعنی بلگرام تشریف لے آئے اور بلگرام میں پہونچنے کی خوشی میں آپنے یہ رباعی کہی ؎

پھر شہر میں قدر سا سخنداں آیا	پھر باغ میں بلبل خوش الحاں آیا
کیونکر نہ جواں ہو پیر زلیخائے سخن	پھر مصر سے یوسف سوگنعاں آیا

انھیں دنوں میں صوبۂ اودھ کی ضلعبندی ہوئی اور بلگرام کا ہردوئی ضلع قرار پایا اور جابجا مدرسے قائم ہونے لگے تو میرزا عباس بیگ صاحب دہلوی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی نے صاحب ضلع سے سفارش کرکے آپکو ہائی اسکول ہردوئی کا مدرس فارسی مقرر کرادیا۔ یہاں بھی آپکی شاعری نے وہ رنگ جمایا کہ آپ کے ذوق و شوق اور انہماک کو دیکھکر اکثر طلبا بھی اسطرف

مائل ہوگئے۔ تعلیم مدرسہ میں اُنکا بڑا حرج ہونے لگا ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ حال دیکھکر آپکو اس سے روکنا چاہا لیکن حضرت قدر پر اُن کا کچھ اثر نہوا۔ اور یہ شغل ترقی پکڑتا گیا۔ آخر یہ نتیجہ ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی رپورٹ پر علم ریاضی کے حاصل کرنے کے لئے آپ نارمل اسکول لکھنؤ میں بھیجے گئے۔ وہاں رہکر تھوڑی بہت ریاضی میں لیاقت پیدا کرنیکے بعد آپ تحصیلی اسکول مہونا ضلع لکھنؤ کے افسر مدرس کردئے گئے وہاں سے کالن برونگ صاحب بہادر ڈائرکٹر نے ازراہ قدردانی آپ کو پھر ضلع اسکول ہردوئی کا مدرس فارسی مقرر کرکے ہردوئی بھیجدیا۔ ع آب رفتہ دگر بجوآمد۔

چنانچہ اس خدمت کا اظہار ذیل کی رباعی میں آپنے بڑے دلپسند پیرائے میں فرمایا ہے ملاحظہ ہو

درجے میں بڑا ہوا ہی جس تس سی قدر	دونا ہوا رتبہ یہ کہے کس سے قدر
اول تو مدرس بھی ہے ہردوئی کا	پھر اسپہ ہمعدد ہی مدرس سی قدر

ایک سال تک آپ ہردوئی میں اس عہدے پر ممتاز رہے۔ اسی زمانے میں استاذی حضرت محمد لکھنوی کے والد ماجد رفیق الدولہ دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر متخلص بہ ظہیر جو کیننگ کالج اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کے فارسی مدرسی کے عہدے پر ممتاز تھے اس دار فانی سے راہی ملک بقا ہوئے اُسوقت آپ کے قدیم قدردان اور دلسوز مربی میرزا عباس بیگ صاحب دہلوی نے (جو اُسی زمانے میں پنشن پاکر لکھنؤ میں کالج مزبور کے ممبر ہوگئے تھے) آپ کو ہردوئی سے بلاکر صاحب کمشنر بہادر کی منظوری سے منشی صاحب مرحوم کی جگہ پر مقرر کرادیا۔

آپنے سات برس چھ مہینے دسمبر ۱۸۸۳ء تک کیننگ کالج لکھنؤ میں اس عہدے کا کام بڑی سرگرمی اور جانفشانی سے انجام دیا اور فی الحقیقت آپنے وہ دلسوزی اور توجہ کی کہ اورنٹیل کلاس کے طلبہ آپکے فیض تعلیم کے باعث اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرکے برابر امتحانوں میں کامیاب ہوکر سند حاصل کرتے رہے۔

اسی زمانے میں آپنے بنگل یعنی ہندی کا عروض پنڈت جگناتھ پرشاد پانڈے بھٹ چارج بنارسی سے جو اُسی ڈپارٹمنٹ میں سنسکرت کے پروفیسر تھے حاصل کیا اور مدعہ اور قواعد العروض میں ترجمہ کرکے نئی بات عروضیوں کو بتائی۔

افسوس کہ مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ارادہ تھا کہ ایک مبسوط کتاب مثل قواعد العروض

کے فن قافیہ میں بھی لکھیں۔ ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

جنوری ۱۸۸۴ء میں نبسہ میرزا غالب نواب آغا میرزا بیگ خاں بہادر سرور جنگ
ستاد حضور پرنور کی تحریک سے بتقریب مسند نشینی حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ اثنائے سفر کلکتہ
ں بمقام بنارس شرفیاب حضوری اعلیحضرت ہوکر ایک قصیدہ تہنیت نظر انور سے گزرانا۔
یک ایک حرف اسکا آب زر سے لکھنے کے قابل تھا اسکے صلے میں ملبوس خاص عطا ہوا اور امیدوار ملازمت ہوکر
پ ہمرکاب بندگان عالی کلکتہ جاکر بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں تشریف لائے۔ دلخواہ
ادپائی۔ چارسو روپیہ ماہوار کے ملازم سرکار آصفیہ ہوئے۔

آپ ہمیشہ سے نہایت ضعیف الجثہ تھے اسپر مرض ضیق النفس اور ضعف معدہ اکثر آپکے
حق حال رہتا تھا۔ حیدرآباد پہونچکر اختلاف آب وہوا کی اور بھی مستولی ہوگیا۔ آخرکار جب
پنے عوارض کی شدت دیکھی تو مجبوراً معالجے کی غرض سے لکھنؤ تشریف لے آئے لیکن وہاں
ں کوئی تدبیر کارگر نہوئی اور باون برس کی عمر میں تیئیسویں ذیقعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۴ ستمبر ۱۸۸۴ء
اتوار کے روز لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ اور میر خدا بخش کی کربلا میں دفن کئے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

در مرحوم کے بہت سے لایق تلامذہ اور ذی قدر احباب نے کثرت سے آپ کی تاریخ وفات کے
لعات نظم کئے۔ یہاں پر صرف حضرت حمد کا وہ قطعہ درج کیا جاتا ہے جو مرحوم کی لوح مرقد پر کندہ
ا گیا تھا۔ ؎

زیکشنبہ بدولبست وسوم ذیقعدہ را	بر دو پہر روز سہ ساعت چو نازیبا بشد
خ از واژ دلی چسوخ و ژرآہنگ نژند	کان علم از دہر یعنی اوستاد ما بشد

زور قسم سال وفاتش حمد صوری معنوی
در ہزار و سہ صد و یک قدر از دنیا بشد
۱۳۰۱

لیفہ۔ قدر مرحوم کی ایک مشہور غزل کے ایک مقطع کے دوسرے مصرع سے بھی انکے
ات کے سن نکلتے ہیں وہ مقطع یہ ہے ؎

رآخر ہوئی ہے قدر کی تربت پہ میلا ہے	یہاں بیڑی بڑھائے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے

۱۳۰۱ھ

حضرت قدر کی ذات مجمع صفات وکمالات تھی۔ فن شعر میں آپ بڑے بلند پایہ اور عالی خیال تھے۔ عروض وقافیہ اور تحقیقات لغت میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ لکھنؤ سے شہر میں شعرا آپ کی تحقیقات کو مسلم الثبوت اور آپ کو کامل استاد تصور فرماتے تھے۔ آپکے کلام کا لطف آپکے دیوان کی سیر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ سادگی۔ شوخی۔ رنگینی۔ نزاکت۔ ادا۔ اور حسن بیان کا مزا لفظ لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ خصوصاً قصیدہ نگاری میں جو رتبہ حضرت قدر نے پایا تھا وہ اوروں کو بہت کم نصیب ہوا ہوگا اور اسکا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکو قدرت نے انصاف پسند طبیعت عطا فرمائی ہے۔

حضرت قدر کے دیوان میں ایک بات ضرور غیر مناسب پائی جاتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے تعصب مذہبی کو اپنے کلام میں بہت جگہ دی ہے۔ جسکی مثال دیگر شعرائے متقدمین ومتاخرین اور انکے ہم مذہب ہم عصر اساتذہ کے کلام میں کم ملے گی۔ مثلاً اُن کے دیوان کے الف کی ردیف میں ایک غزل اسی رنگ سے بھری ہوئی ہے اُسکا مطلع یہ ہے ؎

لکھتا ہے وصف غازی ولدل سوار کا	نیزہ بلند ہے قلم حق نگار کا

اسی غزل میں کہتے ہیں۔

کیا کیا کنوئیں جھکاتے ہیں دنیا میں آشنا	کیا کوئی اعتبار کرے یار غار کا

ہمارے خیال میں ہر فرقے والے کو اپنے دیوان کی ترتیب کے وقت اسکا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ کوئی لفظ کسی کی دلشکنی کا نہ آنے پائے۔ اور جو اشعار ایسے ہوں وہ داخل دیوان نہ کئے جائیں۔

خیر اس سے حضرت قدر کی لیاقت خداداد اور مسلم الثبوت استاد ہونے میں کسیطرح کی کمی نہیں آسکتی۔ بلکہ یہ بات اتفاقات سے تھی جو اُنکے قلم سے نکل گئی یا جن صاحب نے اُنکے دیوان کو مرتب فرمایا اور طبع کرایا ہے اُنہوں نے اسکا کچھ خیال نفرمایا اور ایسے اشعار داخل دیوان کر دیئے۔ آمدم برسر مطلب۔

قدر مرحوم نے عجیب یا مذاق طبیعت پائی تھی۔ ایک مرتبہ آپ کو کچھ بانسوں کی ضرورت پڑی بہت جگہ تلاش کرائے لیکن نہیں ملے۔ کسی نے کہدیا کہ تحصیل میں بانس موجود ہیں یہ حال

سُنکر آپنے منشی جواہر لال صاحب تحصیلدار کی خدمت میں یہ رقعہ نظم فرماکر بھیجا :-

جناب منشی عالی گہر جواہر لال	میں جس مکان میں رہتا ہوں سنئے اُنکا حال
جو دن کو دھوپ سے سر پر تو رات کو شبنم	یہ خشک و تر ہے مرے جان کو لئے جنجال
تمام بانسونکی خاطر کنوئیں بانس پڑے	مگر کسی نے نہ اک بانس کا کیا اقبال
سُنا ہے آپ کی تحصیل میں ہیں بانس بہت	جہاں سے گنج میں آئے وہاں ہے ٹال کی ٹال
مجھے بھی دیجئے اُنمیں سے اسّی نوّے بانس	جو حکم ہو ابھی کٹ آئیں کچھ نہیں ہے محال
جو کچھ پڑیگی کٹائی ڈھلائی میں حاضر	قرار برکف آزادگان نہ گیر دمال
بُرا جو مانو بُرا ماننے کی بات نہیں	نہ آپ ہونگے امیر اسمیں اور نہ میں کنگال

جواب دوگے نہ جبتک نہیں ہے قدر کو چین
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

اس رقعے کو پڑھکر تحصیلدار صاحب بانس کیا اپنے آپکو نذر کرنے کے لئے طیار ہوگئے اور کمال عزت اور قدردانی فرمائی۔

اسکے علاوہ اُنکی کلیات میں اس قسم کی بہت سی پر مذاق اور دلچسپ نظمیں موجود ہیں جیسے بحر طویل از رمل مضاعف الارکان جسکے ہر مصرع میں دو سو چھپن رکن ہیں اور دو مصرعوں میں ختم کیا گیا ہے۔ ایک اور نظم بھی تربھنگی چند کے نام سے موجود ہے جسکے ہر لفظ سے مذاق ہی مذاق پایا جاتا ہے۔ بخیال طوالت ان سب کو نظر انداز کیا جو صاحب ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ اُنکے کلیات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

آپنے ان نظموں اور قصائد وغیرہ کے علاوہ ایک علی بند تحریر فرمایا ہے۔ علی بند کیا ہے۔ فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہے جسکے ہر لفظ سے آپ کی خداداد لیاقت کا ثبوت ملتا ہے یہ بھی اپنی طرز میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ کلیات میں موجود ہے۔ قدر مرحوم کو بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اساتذہ کے یاد تھے اکثر شعرائے جب آپکو لوٹ کا نہایت ہی دندان شکن جواب پایا افسوس وہ سب مصرعے کسی طرح سے معلوم نہو سکے ورنہ یہاں اُنکا ذکر لطف اور فائدہ سے خالی نہوتا لیکن جو چند باتیں معلوم ہوئیں وہ درج ذیل کیجاتی ہیں۔

(۱) قدر۔ ؎

دل شرر تھا سوزش غم سے اُچھلکر رہگیا	میں جہاں بیٹھا برنگ شمع جل رہگیا

نواب غلام حسین خاں مخلص بہ حسین نے اعتراض فرمایا کہ شمع کے واسطے بیٹھنا نہیں آیا اُٹھنا البتہ مسموع ہے۔ حضرت قدر نے مصحفی کا مطلع سنداً پڑھ دیا ؎

شمع کی طرح سے چپ بیٹھے ہیں آسن مارے	گر ہلاتے ہیں زباں جاتے ہیں گردن مارے

(۲) قدر۔ ؎

قاصد یہ کہنا پاکے مرے یار کا مزاج +	پوچھا ہے اک غریب نے سرکار کا مزاج

سر مشاعرہ خواجہ وزیر کے ایک شاگرد نے اعتراض کیا کہ محبوب کو سرکار کہنا کہاروں کی بولی ہے حضرت قدر نے فرمایا توبہ کیجئے دیکھئے آپکے اُستاد کیا فرماتے ہیں۔ وزیر ؎

باغ کو جائیگا ابر سیہ مست اُٹھا	پیش خیمہ تو روانہ ہوا سرکار کا آج

اور میاں معروف دہلوی بھی فرماتے ہیں ؎

ان دنوں سرکار پر معروف نکھار تو گل	جن دنوں صاحب نئے پرتے تھے بلبل ہاتھ

معترض نے گردن جھکائی اور اہل مشاعرہ نے قہقہہ لگایا۔

(۳) قدر۔ ؎

کالی آنکھیں ہیں غضب۔ زلفیں بلا خال آفت	ایک سے ایک ہیں کلجگ کے زمانے والے

کالکا پرشاد موجد لکھنوی بولے کہ جگ خود بمعنی زمانہ ہے پھر زمانہ کیسا۔
حضرت قدر نے فرمایا کہ کال اور جگ ملکر ایک اسم ترکیبی ہو کر الگ ہو گیا اور جب یہ الگ ٹھہرا تو اوخال لفظ زمانہ جائز ہے جسطرح ناسخ مغفور فرماتے ہیں ؎

تین تربینی ہیں دو آنکھیں مری	اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

تربینی یعنی تین بینی۔ گنگا۔ جمنا۔ سرسوتی ہیں پس اوخال لفظ تین لفظ تر پر ایسا ہی ہے جیسے لفظ زمانہ جگ پر۔ موجد نہایت ہی خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ شاعری وہ کرے جسکے آپ سے مثل مثالیں یاد ہوں۔

(۴) مثنوی قضا و قدر کی تاریخ حضرت تجر نے یوں کہی ہے ؎

یہ مثنوی قدر ہے	مثنوی قدر مقدر ہے

ذکی بلگرامی شاگرد میرزا دبیر نے اعتراض کیا کہ مقدر کے معنی اگر قدر کا چاند ہے تو قافیہ مکرر ہوتا ہے اگر بجائے ماہ شب قدر ہے تو لفظ شب اسمیں نہیں حضرت قدر نے فرمایا کہ قدر بجائے شب قدر آیا ہے حضرت سعدی فرماتے ہیں ؎

دہل زن گو دو نوبت دہ بشارت	کہ دوشم قدر بود امروز نوروز

(۵) ایک دن عارف علی شاہ خراسانی نے کہا کہ خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مطلع میں ایسا پاپیچ کہا ہے کہ معاذ اللہ ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا	ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حضرت قدر نے فرمایا کہ ہاں ایک جگہ روی ساکن ہے اور دوسری جگہ متحرک۔ اس عیب کو غلو کہتے ہیں۔ مگر یہاں میرے ذہن میں ایک بات گزرتی ہے کہ جب شاعر کوئی عیب کر کے اُسپر اعتنام کر دے تو وہ اُس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے اور یہ نکتہ کتب فن قافیہ میں مبین ہے۔ حضرت حافظ علیہ الرحمۃ نے اس شعر میں دو مرتبہ عذر فرمایا اور خبر دی اول صلاح کار یعنی صحت کہاں اور میں خراب کہاں دوسرے کجا سے کجا تک راہ میں فرق پڑ گیا ہے یعنی روی متحرک ہو گئی ہے۔ عارف خراسانی یہ سُن کر پھڑک اُٹھے اور حضرت قدر نے اس قضیے کو ایک قطعے میں خاص دلچسپ پیرائے کے ساتھ نظم فرمایا۔ قطعہ ؎

نوشت مطلع پر نور خواجہ شمس الدین	بدیں فروغ گہر بار و از سحاب کجا
صلاح کار کجا و من خراب کجا	ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
فتاد عقدہ در اندیشہ خوردہ گیراں	ز لفظ تا بکجا و دگر خراب کجا
کہ یک روی متحرک دگر روی ساکن	خطا است بہر خطا حکم ارتکاب کجا
غلو اگر چہ بود عیب مر قوافی را	تراست پایہ ایں مایہ احتساب کجا
نخست گفت کہ اے صاحبان دانش و داد	صلاح کار کجا و من خراب کجا
سپس ز نفس خطا تا نہ کرد عذر خطا	ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
اشارہ چست و عبارت بلیغ و عذر لطیف	اگر خطا بود اینہا دگر صواب کجا

مباش رنجہ زغوغائے مدعی اے قدر
سخن بکے است جواب ترا جواب کجا

قدر مرحوم کثیر التلامذہ تھے منجملہ اُنکے جنکے نام اسوقت معلوم ہوسکے وہ یہ ہیں

(۱) استاذی منشی محمد محمود صاحب حمد لکھنوی مدظلہم العالی
(۲) فخر المورخین شیخ غلام حیدر صاحب ارشد بلگرامی
(۳) منشی خلیل احمد صاحب وجد مرحوم بلگرامی۔
(۴) سید نور الحسن صاحب بلگرامی (تخلص صحیح نہیں معلوم)
(۵) منشی شنکر پرشاد صاحب صبح بلگرامی۔
(۶) بابو ہزاری لال صاحب جوان بنارسی۔
(۷) معتبر ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر۔ اودھ پنچ لکھنؤ بھی اُنکے حلقۂ تلمذ میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم۔
(۸) نیز بابو گوری پرشاد صاحب تعظیم لکھنوی اور (۹) سید سرور حسین صاحب سرور مہولوی کے نام کے شاگرد قدر بلگرامی ہمنے کئی گلدستوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔

اِنکے علاوہ لکھنؤ وغیرہ میں کثرت سے شاگرد موجود تھے لیکن افسوس اُن سبکے نام معلوم نہوسکے ایک مقام پر حضرت قدر بلگرامی اپنے چار شاگردوں کا ذکر خود ہی فرماتے ہیں ؎

واہ وا وجد و جواں صل علی ارشد و صبح	انہیں لوگوں سے ہوئی ہے مری شہرت کیسی

اُن مرحوم کا لڑکا اُنکے سامنے مرچکا تھا لیکن اپنی یادگار اپنی تالیف و تصنیف کا ذخیرہ چھوڑا جسکی تفصیل یہ ہے

(۱) دیوان غزلیات و قصائد۔ (۲) مثنوی قضا و قدر (۳) داسوخت (۴) عطر مجموعہ۔ شرح مجموعۂ سخن جسپر سرکار انگلشیہ سے انعام بھی پایا تھا۔ اور وہ چھپ بھی چکا ہے۔ (۵) رسم عرفی شرح قصاید عرفی۔ (۶) نظم الارکان فی تقطیع ابیات گلستان (۷) قواعد العروض مع بنگلہ مروجہ بہ مارہرہ یہ بھی مطبع شام اودہ لکھنؤ میں منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ و مالک مطبع شام اودہ کے اہتمام سے چھپی ہے۔ (۸) مصطلحات اردو ناتمام۔ (۹) مثنوی ناتمام ترجمہ نثر کلیلہ و دمنہ۔

(۱۰) متفرقات۔

یہ مختصر سا مال تھا جو کلیات قدر وغیرہ سے منتخب کرکے لکھ دیا گیا۔ اب ہم ناظرین کو اُنکے کلام فصاحت التیام کا نمونہ دکھانا چاہتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

سنہ فتح ہو سحر بنکر جس سے شب امکاں کا
وہ مہر قیامت ہے مطلع مری دیواں کا

جب توڑ کے ہر تانکا پر دیئے جنوں جہانکا
چاک اپنے گریباں کا جادہ تھا بیاباں کا

اک طرفہ رقم میں تھا دونوں نے کیا سا جہا
الفت نے ہمیں پر کہا رحمت نے مجھے آنکا

ولہ

ہو گیا ابرو کی سفاکی سے شہرہ یار کا
کام کر جائے سپاہی نام ہو تلوار کا

شل عیسیٰ اُن کی خدمتیں رسائی ہو گئی
چڑھ گئے کوٹھے پہ ہم زینا لگا کردار کا

عید کو میخانے میں ہم رند پہونچے اسطرح
جسطرح پرہیز ٹوٹے مردم بیمار کا

قدر کیا اصلاح غالب سے مری شہرت ہوئی
وہ شل ہی باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا

عدم سے لائے ہیں مضمون ترے دہانیکا
ولہ
پتہ لگایا ہے عنقا کے آشیانیکا

منتیں کرکے بتو آپ سے حیراں ہوا
ولہ
اب نہ بولوگے تو لو قدر مسلماں ہوا

کہانتک کہوں بیوفا یاد رکھنا
ولہ
سبق ہو گیا روز کا یاد رکھنا

اوڑاسے لئے پھرتی ہے خاک میری
یہ اٹکھیلیاں اے صبا یاد رکھنا

خدا جانے کسنے سکھایا ہے تمکو
بہت بھول جانا ذرا یاد رکھنا

نہ آگے بڑھینگے قدم تیرے قاصد
یہی ہے وہاں کا پتا یاد رکھنا

رقیبوں کا مذکور رہتا ہے ہردم
کہاں سے یہ سیکھا نیا یاد رکھنا

یہ کہتے ہوئے پاس آئی ہیں میری
غضب ہے جو تمنے چھوا یاد رکھنا

کہا یاد رکھنا تو بولے بگڑ کر
چلو جاؤ آئے بڑا یاد رکھنا

خم سے جام شراب نکلا
ولہ
کہسار سے آفتاب نکلا

دوڑو دوڑو کلیم دوڑو
وہ بام پہ بے نقاب نکلا

آنکھوں میں کھپا تھا وہ گل تر
اشکوں کے عوض گلاب نکلا

لاکھوں میں چنا تھا اک وفادار — دلکو وہ بھی خراب نکلا
چہرا جب داغدار دلکو — اک مطلع آفتاب نکلا
آج آپ ملے نصیب جاگے — سچا مرا شب کا خواب نکلا
دل میں ہوا آبلہ نمودار — یا آئینے میں حباب نکلا
غش کھا کے گرا میں شعلہ طور — بارے تیرا حجاب نکلا
رسی تو جلی مگر رہا بل — کاکل سے نہ پیچ و تاب نکلا
ذکر شب وصل میں کب اٹھے — منہ سے جب آفتاب نکلا

اچھا ہوا آئینہ دیکھ
لے گھر میں تیرا جواب نکلا

ولہ

ہر صورت کسی پردے میں تجھکو یاد کرلینا
مگر ہاں اک نہ اک صورت سے تجھکو یاد کرلینا

ہے ورد اپنا سحر کو نالہ و فریاد کرلینا
نماز و روزہ و تسبیح و استغفار مشکل ہے

ولہ

چھوڑو چھوڑو ابھی ہم آتے ہیں
خود بھی جلتے ہیں جو جلاتے ہیں
وہ بھی آتے ہیں ہم بھی جاتے ہیں
قاصد آنسو سنکے جاتے ہیں
لاکھوں آتے ہیں لاکھوں جاتے ہیں

دامن اس فقر سے چھڑاتے ہیں
دیکھیے حال شمع و پروانہ
ان دنوں صاف ہی رہ الفت
یوسف دلکی جستجو میں آج
قدر ہمارا نہ ہے یہ دنیا

ولہ

صدق صادق اگر ہے دریکتا بھی ہو
فائدہ کیا ارے صاحب کوئی سنتا بھی ہو
تم خدا ہو تو کوئی عالم بالا بھی ہو
کیا عجب ناقہ بھی ہو ناقے پہ لیلا بھی ہو
اسکا جب لطف ہے انسان کو سودا بھی ہو
قدر کیا جانیں کبھی آنکھ سے دیکھا بھی ہو

چشم حق بیں ہو تو اللہ کا جلوا بھی ہو
کیجیے ناموں سے اٹھالوں میں زمانہ سر پر
ہو خودی اتنی تو کوئی ہوا لو
دیکھ تو دوڑ کے لے قیس بگولو پہ نہ جا
ذکر نہ سب پہ اچھی ہو طبیعت اپنی
کرتے دہرتے نہ بنی حضرت موسیٰ سے بھی کچھ

ولہ

خوب زد پر مری جاں آنے دو

دلکو تم آنے دو وہاں آنے دو

کچھ میں سایہ ہوں کہ چڑھ جاؤنگا
زیر دیوار مکاں آنے دو

پھر مجھے روک لیں دربان تو سلام
اتنا کہہ دیجئے ہاں آنے دو

تیغ کھینچے ہوئے فرماتے ہیں
قدر کو آج یہاں آنے دو

میں دیکھوں یہ چوٹی ہے کیا کالی کالی
کہ پیچھے پڑی ہے بلا کالی کالی

بہت ایسے کالے ہرن ہمنے دیکھے
دکھاتے ہیں آنکھیں وہ کیا کالی کالی

شب ماہ میں وہ پھرے بال کھولے
ہوئی چاندنی جابجا کالی کالی

مرے کعبہ دلکے ملنے کا غم ہے
جو اوڑھے ہے کعبہ عبا کالی کالی

میں دیکھوں گا منہ اُن کا دیکر یہ فقرہ
تری شکل ہے مہ لقا کالی کالی

سیہ نامہ قدر محشر میں نکلا
اُٹھی دھوپ میں اک گھٹا کالی کالی

پاس آؤ مضائقہ کیا ہے
یوں تو پھر وہم کی دوا کیا ہے

ہم نے مانا کہ تو نہیں کوئی شے
پھر یہ مشہور جابجا کیا ہے

روز عشاق قتل ہوتے ہیں
کوئی کہتا نہیں خطا کیا ہے

آدمی آدمی پہ مرتا ہے
نہیں معلوم یہ بلا کیا ہے

آرزو ہے کہ پونچھ بیٹھے یار
آرزو تیرے دل میں کیا کیا ہے

لیچلی دل نگاہ دزدیدہ
دوڑائے قدر دیکھتا کیا ہے

زلف کا دھیان رہا کرتا ہے
جی پریشان رہا کرتا ہے

آئینہ دل ہے کسی عاشق کا
جب تو حیران رہا کرتا ہے

ایک ارمان بھی دل میں نہ رہے
یہی ارمان رہا کرتا ہے

یاد ہے ہمکو تمہاری صورت
حفظ قرآن رہا کرتا ہے

منکر ہوتے ہیں ہنر والے
نقل جھک جاتے ہیں غرور والے

ہمنے گھورا تو ہنسکے فرمایا
اچھے آئے بُری نظر والے

ہندی ملکر وہ شوخ کہتا ہے
سینک لیں آنکھیں چشم تر والے

صبر تو یار ہمسے مشکل ہے
اور جو چاہے کام کر والے

ہے سلامت جو سنگ در اونکا — سیکڑوں سے مجھے درد سر والے
قدر کیا اپنے پاس دل کی سوا — اوڑیں پر والے پولیں زر والے

جب آنکھ بند ہوگی دیدار دیکھ لینگے — ولہ — کب تک چھپوگے ہمسے اے یار دیکھ لینگے
بولیں گے رقص اپنا اے سرو باغ خوبی — طاؤس باغ جسدم رفتار دیکھ لینگے
واعظ نہ میکدے میں شیخی بگھار آکر — ساقی الگ رہیگا میخوار دیکھ لینگے
مرنے کے بعد کوئی ساتھی نہیں کسیکا — سب لوگ اپنی اپنی کردار دیکھ لینگے
غیروں سے دل لگایا عاشق نہ چھپایا — اب ہم بھی اور کوئی اے یار دیکھ لینگے

کوچے میں اب بتوں کے اے قدر پہرا کر
ہم قدرت خدا کے اسرار دیکھ لینگے

حضرت قدر کی رباعیاں

لازم ہے بشر بجز نکوئی نکرے — وہ بات کرے کہ شکوہ کوئی نکرے
ہوتا نہیں استخوان زبانیں اے قدر — نکتہ یہ ہے کہ سخت گوئی کرے

اللہ پر شاکر ہوں خدا اسکا گواہ — ولہ — دیتا ہے وہی رزق وہی عزت وجاہ
بندہ بندوں سے کیا توقع رکھے — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

جس روز دم شمار اٹھوں گا میں — ولہ — کیا قبر سے بیقرار اٹھوں گا میں
جب امتی امتی سنونگا اے قدر — احمد احمد پکار اٹھوں گا میں

ہیں موج کی مثل خط کی سطریں بیتاب — ولہ — چکر میں ہے ہر دائرہ شکل گرداب
ڈوبا ہے سفینۂ حواس خمسہ — فقط — القاب نہ یاد ہے نہ مجکو آداب

وصل بلگرامی اڈیٹر عالمگیر - پھر دوئی

اخبار نصیر (انبالہ) صوبہ مدراس میں وانبالہ کی مسلمانوں کی کثرت آبادی کے لحاظ سے مشہور ہے اسلئے وہاں سے اس اسلامی اخبار کے نکلنے سے ہمکو خوشی ہوئی خصوصاً اس لحاظ سے کہ موجب ضوابط مندرجہ سرورق، یہ اخبار خوشامد و تعصب سے حلفاً بری رہیگا حجم ۱۶ صفحے قیمت ۲ سالانہ مع محصول

شعرائے عہد اکبری نمبر (۱)

(۱) غزالی مشہدی

ہم اس مضمون میں شعرا کے خصوصیات بیان کرتے ہوئے اُنکا کلام ہی پیش کرینگے جس سے اُنکی اصل حقیقت کا اندازہ ہوجائیگا

جب غزالی کے الحاد نے اسدرجہ ترقی کی کہ اہل عراق اسکے قتل پر آمادہ ہوگئے تو اُسے بربنائے آزادی طبیعت عراق کے چھوڑنے میں ذرا بھی تامل نہوا۔ اور وہ عراق کو چھوڑکر دکن ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا۔ یہاں اُسکی عمر کا مختصر حصہ خان زمان کی صحبت میں گذرا لیکن بعد خان زمان کے مقتول ہونیکے اسکو اکبر کے درباری ہونیکا فخر حاصل ہوا باوجود کم عمر فوت ہونیکے اُسنے پچاس ہزار اشعار لکھے چنانچہ اسکی تصنیف سے ایک مثنوی اور دو دیوان یادگار ہیں۔ اسکا انتقال ۱۰ رجب ۹۸۰ھ کو بمقام احمد آباد ہوا اور وہ شاہی فرمان کے بموجب سرکھیج میں جو اگلے بادشاہوں کا مدفن تھا دفن کیا گیا اسکا یہ مطلع مشہور ہے۔ ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم	دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

اسی ردیف قافیے میں اُسنے رات بھر میں ایک سو ایک اشعار کہے تھے۔

	رباعی	
در کعبہ اگر دل سو غیر ست ترا		طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر ست ترا
در دل بحق ست و ساکن میکدہ		می نوش کہ عاقبت بخیر ست ترا
بحریست ضمیر من کہ گوہر دارد	رباعی	تیغی ست زبان من کہ جوہر دارد
صور قلم نفخۂ محشر دارد		مرغے ملکوتم سخنم پر دارد

(۲) قاسم کاہی

یہ کابلی تھے۔ میاں کالے انکا نام تھا گو اُنکے کلام میں پختگی نہ تھی اور مضامین اکثر پامال باندھا کرتے تھے لیکن اُنکی ہیئت مجموعی بہت اچھی ہوجاتی تھی علم تفسیر ہیئت و کلام میں اُنکو اچھی مہارت تھی تصوف میں بھی بہت کچھ دخل تھا علم موسیقی میں بہت سی کتابیں انکی تصنیف سے ہیں۔ معما و تاریخ گوئی میں بھی فرد تھے۔ اگرچہ اُنہوں نے ملا جامی کا زمانہ پایا تھا لیکن تمام عمر انکی الحاد میں گذری

این نصیحت بشنو از کاہی	قطعہ	تا ہمہ عمر ترا بس باشد
شعر خوب و پسر زیبا را		معتقد باش زہر کس باشد
چوں سایہ ہمرہیم بہ ہر سو رواں شوی	ولہ	باشد کہ رفتہ رفتہ بمہرباں شوی
ای پیر عشق صحبت یوسف رخ طلب		نبود عجب کہ ہمچو زلیخا جواں شوی
کاہی تو بلبل چمن آرائے کابلی		زاغ و زغن نہ کہ بہندوستان شوی
مرغ تا بر فرق مجنوں پر زدن انگیز کرد	مطلع	آتش سودائے لیلی بر سرا تیز کرد
چوں ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود	دیگر	گرد راں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

انکی تصنیف سے ایک دیوان کے علاوہ ایک مثنوی بھی گل افشاں نام بوستان کی جواب میں ہے

بناز گشت جانے بت ستمگر من	ہ	ہنوز بر سر ناز ست نازپرور من
ریخت باران بلا بر تن غم پرور ما	ولہ	چہ بلا ہا کہ نیاورد فلک بر سر ما
نہ نرگس ست عیاں بر سر مزار مرا		سفید رشد بر ہت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کی لڑکی پر اسے برجستہ یہ مطلع کہا ہ

آتشیں رویت بہ خاکستر چو نیلوفر شدہ		یا نقاب از آتشیں روئے تو خاکستر شدہ

عبدالعزیز متعلم دارالعلوم ندوہ

انتخاب بیاض حسرت

پنداں میش دہند کہ بیہوشی آورد	آصفی	باشد کہ یاد ما بفراموشی آورد
برگفت و گوست مرحلہ غم اجل کجاست		تا رخت ما بوادی خاموشی آورد
صبرے کہ بر جفائے بتاں کرد آصفی		اہل زمانہ را بہ وفا کوشی آورد
خیز و بجلوہ آ سب وہ سرو چمن طراز را	عرفی	آب و ہوا زیادہ کن باغچہ نیاز را
ہر ایک دل و جاں کو مرغوب نظر آئے	میر حسن	میں خوب تمہیں دیکھا تم خوب نظر آئے
کیا جانے اسکے جی پر کیا کچھ خیال گزرا	ولہ	کچھ ابھی آپ اپنے دلپر ملال گزرا
ایسی ہی آہ باتیں اس بیوفا نے چھیڑیں		روتے ہی روتے جمیں روز و سال گزرا
کن تلخ کامیوں سے راتیں حسن نے کاٹیں	فقط	پر تو نہ اس تکلم اک دن شیریں مقال گزرا

بلجیم کے دلفریب نظارے

(۱)

سنہ ۱۹۰۶ء کے اگست کا آخری زمانہ ہے۔ لندن میں اس سال غیر معمولی گرمی ہے اکثر لوگ سمندر کے سواحل پر چلے گئے ہیں اس لئے اس عظیم الشان شہر میں ایک خموشی کا عالم ہے۔ میرا دل بھی جو اس غیر معمولی سکوت سے گھبرا گیا تھا شاہ لیوپولڈ کے خوبصورت دارالسلطنت کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہونے لگا۔ اس لئے اس موقعہ کو غنیمت جانکر میں نے بھی عزم سفر لیا اور ہلکا سا سامان پورٹمنٹو میں رکھکر چارنگ کراس کے اسٹیشن پر رات کی ٹرین کے انتظار میں جا پہونچا۔

اس خوبصورت اور عظیم الشان اسٹیشن پر اسوقت براعظم یورپ کی طرف جانیوالوں کا نہایت مجمع تھا۔ مجمع کیا بلکہ ایک بیڑ بھاڑ تھی۔ اگست کا مہینہ کیا آیا گویا کسی دشمن نے شہر پر چڑھائی کی اور سب لوگ گھر بار چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ جبکہ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اپنے اپنے چل چلاؤ میں مصروف تھے تو میں اک دور افتادہ ہندوستان جنت نشان کا نام لیواسات سمندر پار یہاں تن تنہا کیا کرتا۔

غرضکہ چارنگ کراس سے ڈوور تک پہونچنے میں کچھ دیر نہ لگی۔ وہاں ٹرین کے پلیٹ فارم سے نزدیک ہی اک چھوٹا سا اگبوٹ ہمارا منتظر تھا۔ اسمیں داخل ہوئے اور گویا دوسری دنیا میں آگئے۔ کہاں لندن کی اُمس اور اوسکی عظیم الشان عمارتیں اور کہاں یہ نیلگوں سمندر تاروں بھرا اور مہتاب سے جگمگاتا آسمان۔ ایک آسمان اوپر ایک آسمان نیچے۔ اسپر ہوا کی روح افزا جھونکے میں کیا کہوں کہ کیا عالم تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام فکریں دماغ سے نکل گئیں اور سب کے دل سرور و انبساط سے لبریز ہو گئے۔ جہاز پر غیر ممالک کے لوگ بکثرت تھے۔ انگریزوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی اور ہر طرف گویا سارۂ بابل کی طرح مختلف زبانیں سنائی دیتی تھیں۔ ملاح بھی جو اکثر بلجین تھے کئی کئی

زبانوں سے آشنا تھے۔ اگر ہم سے انگریزی میں گفتگو کرتے تو کپتان سے فرنچ میں باتیں کرتے اور آپس میں ٹیٹ فلیش زبان بولتے تھے۔ میں کچھ تھک گیا تھا اور نیند کا اتنا ہی تھا۔ آرام کرسی ایک پر بچھا کر اور اسباب قریب رکھکر دراز ہو گیا اور سوچنے لگا کہ صبح دیکھئے نئی سرزمین کیا کیا عجائبات دکھاتی ہے۔ اسی خیال میں آنکھ لگ گئی مگر جب کھلی تو بلجیم کے سواحل نظر آنے لگے تھے ایک بجے رات کا وقت تھا اور آسٹنڈ کے خوبصورت کنارے عمارات کی برقی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔

میرا ارادہ پہلے برسلس جانیکا تھا۔ اسلئے جہاز سے اتر کر سیدھا ٹرین پر سوار ہو گیا۔ اس ٹرین کی گاڑیاں بہت بڑی بڑی اور بھدی سی معلوم ہوتی تھیں اور آرام کے لحاظ سے بھی انگلستان کی گاڑیوں سے بہت ادنیٰ درجہ پر تھیں۔ مگر کاریڈار ہر گاڑی میں تھی جو لوگوں کی حفاظت کے لحاظ سے بہت ضروری معلوم ہوتے تھے۔ تعجب ہے کہ اس ملک میں ابھی تک انکا رواج باقی ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ چلتی ہوئی گاڑی میں آدمی کو تھوڑی ہی عرصہ میں ملک کے سرسبزی اور دیہاتیوں کے نمونہ زندگی دیکھنے کا ایسا اچھا موقع ملتا ہے کہ شاید کسی اور طرح ممکن نہیں صبح صادق کا وقت تھا اور عجائبات عالم کے مرقعے نظر کے سامنے سے گذرتے جاتے تھے۔ ایک طرف نیا لباس پہنے ہوئے چھوٹے قد کے فلیش کسان آہستہ آہستہ گھوڑوں کے ہلوں کو کھیتوں میں چلا رہے تھے۔ دوسری طرف اُن کی عورتیں اپنے ڈھیلے ڈھالے دیہاتی لباس میں گھاس اور اناج کے پولے جمع کر رہی تھیں۔ کہیں مویشیوں کے گلے کے گلے چر رہے تھے اور کہیں کوئی چھوٹا سا قریہ اور اوسکے کھپریل کے چھائے ہوئے مکانات تیزی کے ساتھ سامنے سے گذرتے جاتے تھے۔ اور کسی غریب کا ایک گھر سامنے آجاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ کھڑی رومال ہلاتی نظر آتی تھیں۔ یہاں کے زراعت پیشہ لوگ فرانس کے مقابلہ میں مجھے زیادہ غریب نظر آئے سرزمین ایسی کوہستانی اور زرخیز نہیں جیسی کہ جنوبی فرانس کی ہے مگر سرسبزی اور شادابی کی کسیطرف کمی نہیں تھی اور عسرت اور بدوباری کا رنگ جیسی کہ ہندوستان میں پائی جاتی ہے کہیں نشان بھی نہ تھا۔

ہمارے کمرے میں چند خوشمزاج لیڈیاں تھیں جو بظاہر فرانسیسی معلوم ہوتی تھیں اور ایک جرمن اور چند فلیش خلیفین تھے۔ فرنچ لیڈی کے چہرے پر سفر کی تکان کے آثار پائے

جاتے تھے مگر اُسکے لباس سے اسبات کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس نے کوئی لمبا سفر بھی کپڑے پہنے پہنے کیا ہے معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی بدلکر آئی ہے۔ سفر میں ان فرانسیسی لیڈیوں کی سلیقہ شعاری مشہور ہے۔ بخلاف انگلستان کی عورتوں کے کہ رات گذرنے کے بعد اُن کی ایک عجیب ہیئت کذائی نظر آتی ہے۔

ہمارے ہمسفر اجنبی وغیر اجنبی سب بلا تکلف ایک دوسرے سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ جرمن نے جو خوب موٹا تازہ آدمی تھا انگریزی میں ہمسے باتیں کرنا شروع کردیں۔ اسکو تجارت کی وجہ سے ہندوستان سے دلچسپی تھی۔ مجھکو ایک آلے کا طول طویل نقشہ دکھانے لگا جو اونچی عمارات کے کمروں کے ناپنے کے لئے ایجاد کیا تھا۔ اسکے متعلق جو کچھ اُسے معلوم تھا حتی المقدور سب کچھ مجھ سے بیان کردیا ایسے ہی مزے مزے کی باتیں کرتے کرتے یکایک اوسکی آنکھیں بند ہوگئیں اور فوراً ہمارا موٹا دوست خراٹے لینے لگا۔ دوسرے لوگوں میں اکثر ایسے تھے جو چند روز کے لئے (La Mer) لامیر (یعنی سمندر) کی سیر کرنے آئے تھے اور اب بادل ناخواستہ اپنے اپنے کام پر واپس جارہے تھے۔

پانچ بجے کے قریب گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھیری۔ یہاں چار والے بسکٹ والے اور اخبار بیچنے والوں کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ گارڈ نے آکر ٹکٹ لئے اور آدھ گھنٹے بعد ہماری ٹرین آہستہ آہستہ بلجیم کی دارالسلطنت میں داخل ہوئی۔ برسلس۔ برسلس کے آوازیں سنائی دینے لگیں اور ہر طرف قلیوں کی دوڑ دھوپ اور اسباب کی کھینچا کھینچ شروع ہوگئی۔ اسٹیشن کچھ زیادہ بڑا نہ تھا اور اندر سے بھی کچھ خوبصورت نہ تھا۔ ریل سے اُتر کر میں نے ایک ہوٹل کا رُخ کیا جو اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ اور سفر کی ماندگی کی وجہ سے جاتے ہی سو گیا

"مانی"

اخبار نیر اعظم مراد آباد | صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کا یہ پرانا اخبار کچھ دنوں سے اپنے اڈیٹوریل مضامین کی آزادی اور دلچسپی کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ پسندیدہ ہوگیا ہے۔ لوکل معاملات پر بحث کرنا اخبار کا پہلا فرض ہے۔ اس فرض کو بھی یہ اخبار خوبی اور بیباکی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ قیمت فی سالانہ مع محصول کے صرف زیادہ ہے۔ نمونے کا پرچہ مینجر نیر اعظم سے بلا قیمت ملسکتا ہے۔

غربت و وطن

رشید، لکھنے کی میز پر، داہنا ہاتھ، اور ہاتھ پر سر رکھے ہوئے خیال میں مستغرق بیٹھا ہے۔ لیمپ کی روشنی اسکے آدھے چہرے پر پڑ رہی ہے، اور بتا رہی ہے کہ گو شہر میں — اُس شہر میں جہاں رشید، غربت کے دن، اُنس و اضطراب کی کچھ عجیب آمیزش کے ساتھ کاٹ رہا ہے — گو اس شہر میں اسوقت خاموشی چھائی ہوئی ہے، لیکن اُسکے دل میں خیالات کا طوفان موجزن ہے۔

چار طرف سناٹا ہے، اور تاریکی، صرف کمرے میں گھڑی کھٹ .. کھٹ .. کھٹ .. کر رہی ہے، گلی کا کتا بھونکتا ہے، قریب کے کمرے میں نوکر، دن کا کام ختم کرکے گہری نیند (حیات سا عیاذ کالانعام) سو رہا ہے، اور اوسکی خرخراہٹ کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔ رشید اپنے خیالات سے عاجز آکر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور بہت مضطرب حالت میں، کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے، اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا ہے:۔

غربت اچھی کہ نئی دنیا، نیا آسمان نئے مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔ نہیں، وطن اچھا، کہ پرانے دوست پرانے رفیق، جانی پہچانی آوازیں جانی پہچانی صورتیں، سنائی دیتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔

نہیں غربت اچھی جہاں ہر تجربہ نیا، ہر بات نئی۔ جو دو آدمی ملتے ہیں، گویا دو دریا ہیں، کہ پہلے جدا جدا بہہ رہے تھے، اب سنگم ہوا۔

نہیں، وطن اچھا، جہاں پرانے دوست گویا دو پودے ہیں کہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اُگے اور بڑھے ہیں۔

نہیں، غربت اچھی جہاں دوست نما دشمن اور آشنا صورت اغیار تو نہیں ہوتے جنکی مدارات کرنی پڑے۔ جہاں غیر بیصاف کہہ کے ملتا ہے کہ میں غیر ہوں، اور دوست، آہ! دوست نہیں، تو شناسا بھی جدا ہوتا ہے۔

"نہیں، وطن اچھا، جہاں وہ آدمی نہیں ملتے جنسے دلمیں نہ حسِ محبت پیدا ہو، نہ یاد ایام گذشتہ۔

نہیں، نہیں، بے یار، نہ غربت اچھی، نہ وطن اچھا، اور با یار ——— یہ اُن خوش نصیبوں سے پوچھئے جو یار رکھتے ہیں۔"

رشید، ایک آرام کرسی میں گر پڑتا ہے، اور پھر خاموش خیالات میں محو ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کاغذ کے ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھتا جاتا ہے۔

یہ ایک زائدہ اضطراب، غزل تھی، جسے وہ تسکین خاطر کے لئے کونے میں رکھے ہوئے ہارمونیم پر جاکر بجاتا ہے۔

غزل

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کے لئے
ہے سینہ وقف مرا سوزِ شعلہ جاں کے لئے

کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے
ہمارے سارے گلے اپنے مہرباں کے لئے

ہلاک کرکے رہیگا مجھے تغافل دوست
ہے اک نگاہ کا اعماز نیمجاں کے لئے

ہو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے سب مجھ شوخ ای احباب
ہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ہوئے جو طعنۂ اعدا، کبھی ذرا کو بند
زباں سے کام اعزا نے خودستاں کے لئے

کڑک، چمک تو نہ اے برق! اتنی تھی لازم
شرارہ ایک تھا کافی، اس آشیاں کے لئے

مرا جو حصہ ہے، وہ مجھکو اے مصیبت دے
ہوا کرے ہے اگر عیش کل جہاں کے لئے

چمن میں بلبلِ مہجور کی نہیں کچھ یاد
تڑپ رہی ہے قفس میں وہ پوستاں کے لئے

بھلا دے یادِ وطن جب میں جانوں ای غربت
وطن کا عشق ہے اک روگ، میری جان کے لئے

مقابل کے مکان کی کھڑکی کھلتی ہے، اور رشید کا پڑوسی، اس شہر کی زبان میں پوچھتا ہے:

"مسٹر رشید! شاید آج آپکے وطن سے کوئی بڑی خوشخبری آئی ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے، لیکن میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، (اور ذرا معترضانہ تبسم سے) مگر آدھی رات کو تو خوشی نہ منانی چاہیئے۔"

(یلدرم) از بغداد

مکتوبات امیر مینائی

(مرتبہ ثاقب)

قاضی محمد خلیل صاحب حیراں تخلص رئیس بریلی کے نام

سید سرمد قاضی محمد خلیل صاحب سلمہ اللہ الجلیل۔ سلام شوق۔ کارڈ آیا ممنون باد یاوری کیا۔ آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری یہ رائے ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی وغیرہ اوڑھنے کی چیزوں میں آنچل کہنا چاہیے اور قبا عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں میں دامن کہنا چاہیے مگر شعر مبحوث عنہ کی تصحیح یوں ہو سکتی ہے کہ شعرائے گوشۂ دامن کو بھی آنچل کہا ہے چنانچہ انکو مینے امیر اللغات میں کسیقدر تفصیل سے لکھا ہے اور یہ دو شعر سند کے بھی آنچل کے لغت میں درج کئے ہیں۔ میرے آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں + میرے دریا کا سا انکا پھیر ہے۔ نسیم ؎ دہان دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ + صبح نے منہ پہ لیا دامن شب کا آنچل + ساعت اور گھڑی ساعت کے قافیے میں احتیاط تو مقتضی اسکی ہے کہ شاعر بلا ضرورت شدید وہم التباس سے بھی بچے مگر جواز ثابت کرنیکے لئے بہت سے اشعار شعرائے فارسی و اردو کے ملینگے جن میں انہوں نے ..... جائز کر لیا ہے۔ قاضی صاحب کی خدمت میں میرا طرف سے تسلیم۔ امیر احمد عفی عنہ۔

مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب حسرت شروانی رئیس ہبکن پور کے نام

دلنواز ا۔ رومی خدا کے۔ محبت نامہ آیا ممنون و مسرور کیا۔ الفاظ انگریزی کی نسبت یہی رائے میری بھی ہے۔ اور یہی مشرب میرے موجود مشیروں کا ہے۔ کمیٹی میں بھی یہی امر طے ہوا ہے۔ یہ بہت خوش ہوا کہ آپ بھی ہمراہی نکلے۔ سلامت فہم آپ کی ہر بات سے پیدا ہے اللہ عمر دراز کرے اور اقبال بڑھائے۔ چند اشعار بھیجتا ہوں اگر آپکے التفات سے اس لواح میں بہت سے خریدار پیدا ہوں تو احسان ہے۔ فہرست کتب دیکھی یہ سب کتابیں اس دفتر میں موجود ہیں اور ان سب سے زیادہ میرا ذخیرہ دس سال سے کہ وقتاً فوقتاً جمع ہوتا گیا ہے

آپ کی لیاقتوں سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اب تو رمضان المبارک آئے۔ زندگی باقی ہے تو عید میں دیکھا جائیگا۔ سفر کی فرصت مطلق نہیں ملتی۔ اور آپکا سفر کرنا علوم نہیں آسان ہے یا مشکل۔ دیکھا چاہیئے۔ حسرت ملاقات کیونکر بر آتی ہے۔ امیر فقیر۔
۳۰ اپریل ۸۹ء۔ غزل کی خیال سے خط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ رسید ضرور ملے۔

بنام صاحب موصوف

روحی فداک۔ سلام و دعا۔ عین انتظار میں محبت نامہ آیا۔
اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔ صنیع فرصت سے جان چھڑا کر غزلیں دیکھ لیں سب شعر اچھے ہیں۔ ایک آدھ جگہ دخل دیا۔ باقی ضرورت اصلاح کی نہ تھی۔ میں بھی آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں۔ دیکھا چاہیئے کب آرزو بر آتی ہے۔ آپ اپنے مفصل کیفیات و مشاغل سے تو آگاہ کیجئے کہ سفر اور سفر میں چندے اقامت ممکن ہے یا غیر ممکن اور دشوار ہے یا آسان۔ امیر احمد بقلم محمد احمد۔ ۱۲ جون ۸۹ء۔

بنام نعیم الحق صاحب آزاد شیخپوری

محبی۔ غزلیں آئیں۔ بیماری اور بیماروں کی پرستاری کی حالت میں دیکھیں۔ ماشاء اللہ طبیعت آپ کی لاجھی ہے۔ خدا عمر میں برکت دے۔ رشک مرحوم نے کس کتاب میں تانیث و تذکیر حروف تہجی کا ذکر کیا ہے اُس کتاب کا نام و نشان ضرور لکھئے اور اگر آپکے پاس ہو تو چند روز کو مستعار مجھے دیجئے۔ میرے نزدیک سیم مذکر ہے اور میں نے مذکر ہی کہا ہے۔ سن بمعنی سال کہیں نہیں نکلتا فارسی میں بہت تلاش کیا کوئی سند قابل اعتبار نہ ملی۔ ان معنی میں سنہ ہے۔ اردو میں بغیر ترکیب اگر سن یعنی سال کوئی کہے تو تاویل ہو سکتی ہے۔ محققین اسکی جگہ سال کہتے ہیں۔ مردم دیدہ مذکر ہے۔ ولایتی کاغذ پر امیر اللغات کے حصہ اول کی قیمت سات روپیہ اور دیسی کاغذ پر چھ روپے ہیں۔ امید کہ غزلوں اور خط کی رسید سے مطمئن کیجئے۔ داغ کی کیفیت کامیابی دکن مجھے بخوبی معلوم ہے اُنکے خطوط اکثر آتے رہتے

ہیں۔ امیر فقیر ۱۲ نومبر ۹۱ء۔

بنام ثاقب کے نام

مخدوم گرامی مناقب مکرمی حضرت ثاقب۔ سلام و نیاز کے بعد التماس ہے کہ مدت کے بعد اسوقت بھی ہوئی آگ بھڑکی یعنی آپنے یاد فرماکر پھر ولولۂ شوق و ذوق بڑھایا۔ میرے تغافل کی شکایت گو بجا ہو مگر میں اسی شکایت کا شکر گذار ہوں ؎

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

مثنوی نشتر تیز کی تاریخ کہنے کی فرصت اور لیاقت مجھکو کہاں مگر تعمیلاً حکم سرد ست جو خاطر فاتر میں آیا ہے وہ قطعہ دوبیتی ذیل میں لکھتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مروۃ الغیب کے سونسنے بقیمت مجھکو بھی لینے پڑے تھے اطلاعاً عرض پرداز ہوا۔ تحریر مطبع واپس پہنچتی ہے۔ امید ہے کہ ہمیشہ یاد فرماتے رہیے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں اور کس شغل میں ہیں۔ میں اپنی اسقام جسمانی اور آلام روحانی کا حال اگر لکھوں تو نامہ ایک دفتر ہو جائے دوست کامل درد مند ہو کیا حاصل اپنے والد صاحب کی جناب میں بشرط گنجایش والتفات نیازمند کی طرف سے تسلیم کہدیجئے۔ امیر فقیر۔

۷ محرم ۱۳۰۰ ہجری۔

البیت یعنی اول درجے کے آبوری فنش کاغذ اور ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۱۰۰ صفحوں کا ایک نہایت خوشخط اور پاکیزہ چھپا ہوا ضروری رسالہ جسمیں حضرت اسلم جیراجپوری اسسٹنٹ اڈیٹر رسالہ خاتون علی گڑھ نے سلیس عبارت میں فاضل دلدوز کوشش و کاوش کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کے صحیح اور معتبر تاریخی حالات عربی کی مستند کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ لڑکیوں اور عورتوں کو یہ رسالہ خصوصیت کے ساتھ سودمند ثابت ہوگا۔ قیمت فی جلد ۱۰ ر ہے۔ اور موقعہ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ دو ایک موقع پر مولف نے بعض مختلف فیہ مسائل مثلاً مدد کو ایصال ثواب اور زیارت قبور پر اسے اخذ فیض کے خلاف ذاتی رائے ظاہر کی ہے۔ ہماری خیال میں یہ طرز عمل مناسب نہ تھا۔ خصوصاً اس کتاب میں۔

تنقید

(محمڈن ڈیپوٹیشن)

مسلمانوں کے اس وقیع ڈیپوٹیشن کا اڈریس بجز اُن چند کمزوریوں کے جنکا ذکر آیندہ ہوگا، کیا بلحاظ کم آزاری دیگر اقوام اور کیا بلحاظ معقولیت مطالب و ادائے مطالب ایسا ہے جسکو مسلمانوں کا ابتدائی پولیٹکل کارنامہ ہونے کی حیثیت سے ہم بلا تامل قابل اطمینان کہہ سکتے ہیں۔ اس اڈریس میں مسلمانوں نے اپنی مندرجہ ذیل درخواستوں کو بتاریخ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء عمر کی ہمراہ وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا کہ:-

(۱) میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لیکر۔ سنٹ۔ سنڈیکیٹ۔ صوبے کی کونسلوں اور وائسرائے کی کونسل تک غرضکہ ان تمام موقعوں پر جہاں نیابت کا طریقہ رائج ہو سکتا ہو، مسلمان ممبروں کی تعداد معین کر دیجائے اور ایگزیکٹو کونسل وائسرائے میں بھی ایک مسلمان ممبر مقرر ہو (۲) یہ تعداد صرف اُن کی نسبت آبادی کے لحاظ سے نہو بلکہ اُن کی قومی اہمیت کا بھی خاطر خواہ خیال کر لیا جاوے۔ (۳) طریق نامزدگی کے بجائے طریق انتخاب اختیار کیا جائے۔ (۴) اور مسلمانوں کے انتخاب کا اختیار صرف مسلمانوں تک محدود ہو دوسری قوموں کو اسمیں دخل نہو۔ (۵) اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر ہوا کرے۔ (۶) ہر ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج واقف شرع محمدی کا ہونا ضروری سمجھا جائے۔ اور (۷) محمڈن یونیورسٹی کی تجویز کی گورنمنٹ تائید کرے۔

البتہ لارڈ منٹو نے اس اڈریس کا جو جواب دیا ہے وہ ہمارے خیال میں مسلمانوں کی جانب سے کسی غیر معمولی شکریے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ جہانتک ہم نے غور کیا ہمکو یہی معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب نے صرف اُن باتوں کا جواب دیا ہے جو اُنکے خیال میں انگریزوں کے مفید مطلب ہیں اور اڈریس کے بقیہ حصے کو اسطرح نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا اُنہوں نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

اڈریس کے شروع میں گورنمنٹ کی کسیقدر بجا لیکن زیادہ تر بیجا ستائش کی گئی تھی (جو آجکل کے اڈریسوں کا عموماً اور حد سے زیادہ وفادار مسلمانوں کی عرضداشتوں کا خصوصاً اسٹیلو پر ایک بیمعنی و بیمحل لیکن ضروری حصہ قرار پا گیا ہے جیسے کہ موسم خزاں میں اکثر مقلد شعرا کے قصائد میں بہاریہ تشبیب ہوا کرتی ہے) لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اپنے جواب کا بڑا حصہ بیمعنی مفید مطلب الفاظ تعریف کے دُھرانے میں صرف کر دیا ہے۔ حالانکہ نگاہ غور سے دیکھئے

تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ اڈریس کا یہ تعریفی حصہ محض برائے بیت تھا مثلاً اڈریس کے یہ فقرے کہ:-

(۱) "انگریزی حکومت کے طرز عمل کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ..... ان معاملات میں جنکا اثر انکی فلاح پر پڑتا ہو اس ملک کے لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کا لحاظ کیا جاتا ہے" (۲) "رفتہ رفتہ مسلمہ پولیٹکل یا تجارتی انجمنوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اہم معاملات پر اپنی رائے اور خیالات سے حکام کو مطلع کریں"

ہماری خیال میں یہ جو ملیح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ انگلو انڈین حضرات کے نزدیک اس ملک کے لوگوں سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جن کی رائے ان سے متفق ہو یا انکی کوئی رائے ہی نہو۔ اور مسلمہ پولیٹکل اور تجارتی انجمنیں صرف وہ انجمنیں ہیں جنکے ممبر یا تو سب یورپین ہوں یا اُن کی ہاں میں ہاں ملانیوالے۔ مثلاً کلکتے کی چیمبر آف کامرس مسلمہ انجمن ہے۔ اور اسکے یورپین ممبر ہر طرح سے وائسرائے کی ہمانی کے قابل ہیں لیکن نیشنل کانگرس کا مسلمہ جلسہ ہونا تو درکنار اسکی تجویزیں اس قابل بھی نہیں ہیں کہ لارڈ کرزن بہادر کے سے وائسرائے انکو صرف سن ہی لیں اگرچہ اس کان سنکر اُس کان اُڑا دیں۔

ہمکو ممدن ڈیپوٹیشن کے ریپریزنٹیٹو ہونے سے ہرگز انکار نہیں ہے لیکن اتنا تعجب ضرور ہے کہ جو انگلو انڈین اخبار اور حضرات اسکے ریپریزنٹیٹو ہونیکا بزور و شور اظہار کر رہے ہیں وہی نیشنل کانگرس کو ہمیشہ ناقابل تسلیم جلسہ قرار دینے میں اس بنا پر بیباک رہے ہیں کہ وہ صرف چند تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا مجمع ہے حالانکہ یہی اعتراض ممدن ڈیپوٹیشن پر بھی عائد ہوتا ہے اور کانگرس سے بڑھکر عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ کانگرس اکیس برس سے قائم ہے اور ڈیپوٹیشن کو صرف ایک مہینے کی مہلت ملی۔

اس بیان سے ہمارا مقصد ڈیپوٹیشن پر اعتراض کرنا نہیں ہے کیونکہ ہمارے نزدیک کم از کم ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کی رائے عام اس سے وہ ہندو ہوں یا مسلمان ہمیشہ عوام الناس کی رائے کے موافق ہوتی ہے اسلئے کہ وہ ہمیشہ انکے مفید مطلب ہوتی ہے۔ ہمکو بیان پر صرف یہ دکھانا ہے کہ کسی جلسے یا ڈیپوٹیشن کا تسلیم کرنا یا نہ کرنا محض برٹش حکومت کی پالیسی پر منحصر ہے۔ جو انکے مفید مطلب ہے وہ مسلم و محمود ہے ورنہ بقاعدہ و مردود۔

مثلاً اڈریس زیر بحث ہی کو ملاحظہ فرمائیے کہ باوجود ادعائے ہمدردی مسلمانان لارڈ منٹو نے

عدن یونیورسٹی، اعلیٰ عہدہ داروں اور مسلمان ججوں کے مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں کی کیونکہ وہ انگریزوں کے مفید مطلب نہ تھے کیا معنی کہ اعلیٰ تعلیم شاید گورنمنٹ کے مقاصد کے خلاف ہے اور اعلیٰ عہدے زیادہ تر یورپین لوگوں کے قبضے میں ہے۔ رہا کونسل کے غیر سرکاری ممبروں کا قضیہ اسمیں چونکہ یورپین ممبروں کا تعلق ہی نہیں اسلئے مسلمانوں سے ہمدردی ظاہر کی گئی ہے اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تعداد معین کر دیجائیگی اور کیا عجب ہے کہ حسب خواہش ڈیپوٹیشن انکی نسبت آبادی کے لحاظ سے زیادہ ہی مقرر کر دیجائے۔ لیکن یہ درخواست کہ انتخاب مسلمانان کا اختیار صرف مسلمانوں کو حاصل ہو قابل منظوری نہیں ہے اور بہتر ہے کہ منظور نہ کی جائے کیونکہ ہمارے نزدیک اہل ہند کی فلاح کا دارومدار تمام اقوام ہند کے اتحاد پر منحصر ہے۔ اور جب مذہبی اور معاشرتی اتحاد ناممکن معلوم ہوتا ہے تو اتحاد باہمی کی ایک بقیہ صورت یعنی پولیٹیکل اتحاد کی راہ میں بھی روڑے اٹکانا ملکی ہمدردی کے یکقلم منافی ہے۔ اس تجویز کے منظور ہونیکا نتیجہ سوا اسکے اور کچھ نہ ہوگا کہ پولیٹیکل حیثیت سے ہندوستانیوں کی ایک متحدہ قومیت کی دلفریب امید ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگی۔ اور اکثر ایسے متعصب لوگ منتخب ہوا کرینگے جنکے باہمی اختلاف سے خوف ہے کہ ملک کو بجائے فائدے کے نقصان پہونچے۔ چنانچہ ہمارا خیال تو یہ ہے، خدا کرے کہ یہ خیال غلط ہو، کہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کے ساتھ جو ہمدردی ظاہر کی ہے اسمیں بھی ہمارے بیان کردہ قاعدہ کلیہ کے مطابق انکی یہ غرض پنہاں ہے کہ مسلمان ممبروں کے بڑھنے سے سٹرمارلے کی توسیع کونسل کی تجویز سے انگلو انڈین ممبروں کے خلاف ہندوستانی ممبروں کی زیادتی کا جو خوف پیدا ہو گیا ہے وہ بہت کچھ زائل ہو جائیگا اسلئے کہ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مسلمان ممبر زیادہ تر گورنمنٹ کی تائید ہی پر رہا کرتے ہیں۔

یہاں پر ہم اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ نے مسلمانوں سے سٹرمارلے کی تجویز کو بے اثر کر دینے کے خیال سے ہمدردی ظاہر کی ہے تو شاید اُسکو اپنی خواہشوں میں کامیابی نہ ہوگی کیونکہ تعلیم یافتہ و منتخب شدہ مسلمان ممبروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ نواب عماد الملک بلگرامی کی طرح مسلمانوں کے مقاصد کے خلاف اعلیٰ تعلیم کے اخراجات بڑھا دینے کی سی تجویزوں پر بھی بلا چون چرا دستخط کر دیا کرینگے سراسر عبث ہے۔

خیر کسی صورت سے ہو اور کسی خیال سے ہو اس ڈیپوٹیشن سے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہونچے

کی بیشک امید ہے۔ اور حق یہ ہے کہ بہت کچھ نفع پہونچ بھی چکا ہے یعنی اسطور پر کہ اس واقعۂ ڈیپوٹیشن سے انہیں پولیٹکل تحریک کے نشو و نما کی بہت کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جسکی اگر باقاعدہ نگہداشت کی گئی تو کیا عجب ہے کہ وہ آیندہ مسلمانوں کے علاوہ تمام ملک کے لئے بھی مفید ثابت ہو کیونکہ میدان پالیٹکس میں در آنے کے بعد ہمکو مسلمانوں کی موجودہ محدود نگاہی، تنگ حوصلگی و مصلحت کوشی وغیرہ عیوب کے رفع ہو جانے اور دیگر اقوام ملک سے ملکر کام کرنے کی بہت کچھ امید ہے اللہ تعالی اس آرزو کو پورا کرے فقط

حصہ نظم

غزل علامہ شبلی نعمانی

روش کان دلدار با من ہم وفاق افتادہ بود
عقلے در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود

حالیا من ہم چو زاہد پارسائی پیشہ ام
بادہ خوردن، در شبا ہم اتفاق افتادہ بود

گو بیاد دشمن ہم از فدقش نصیبے بردہ است
بادہ و ملش چشیدم، از مذاق افتادہ بود

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی
ورنہ عمرے ہر دو را با ہم نفاق افتادہ بود

گرچہ من مرد ہوسبازی و رندی نیستم
گاہ گاہم ایں چنیں ہم اتفاق افتادہ بود

زاہدا ردم ز آدمیت ہی دندبس خیرگی ست
کو ہم از روز ازل نا اہل وعاق افتادہ بود

بودہ ام در بزم می با محتسب ہم ہمنشیں
گرچہ ایں صحبت را بسیار شاق افتادہ بود

از دل صد پارہ ات آگہ نیم شبلی ولے
شیشۂ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

صفی۔ جناب مولوی سید علی نقی صاحب لکھنوی

بن پڑی چرخ فتنہ جو تیری
چال چلتی ہیں خو بروں تیری

ضعف میں جان سے برابر تھی
ایک اک بوند اے لہو تیری

سنتے ہیں طور جلکے خاک ہوا
حد کی تھی گرم گفتگو تیری

خار و گل کا جدا جدا ہے رنگ
اسمیں خو ہے تو اوسمیں بو تیری

کوئی خنجر بکف ہے غیر نہیں
بخدا اے رگ گلو تیری

دل میں یہ کون شے کھٹکتی ہے
پھانس کوئی کہ آرزو تیری

کلک قدرت نے نقش دل کھینچا
رکھ کے تصویر روبرو تیری

ارے او تک کے بیٹھنے والے
کیا ہوئی اب وہ جستجو تیری

سچے موتی سے کم نہیں ہے صفی
یہ خدا داد آبرو تیری

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب متوطن کلکتہ

نوائے بلبلاں ہے یا ہوئی ہے لالہ کار آتش
گل آتش غنچہ آتش گلستاں آتش بہار آتش

اگر دریائے اشک آنکھوں سے بہتے بہتے رک جائے
لگا دے پیکر عشاق میں روئے نگار آتش

ستم کرنا کسی پر باعث اندوہ خاطر ہے
سپند مضطر کے درد سے ہے بیقرار آتش

ہمارے آبلوں کا خلق پر احساں رہ جاتا
بیاباں میں اگر ہوتی بجائے نوک خار آتش

نہ پہونچائے طراوت قطرۂ شبنم اگر گل کو
گلستاں میں لگا دے تابش رخسار یار آتش

وہ شوخ سنگدل اظہار یاری مجھ سے کرتا ہے
ہوئی پروانۂ آتش بجان کی غمگسار آتش

ہمیں بیجا ہے وحشت شکوۂ آتش کی بد داغی کا
کہ ہوں عاشق بہت پیدا ہو گر خوی یار آتش

ولہٗ رباعی

بے سمجھے نہ جام غم پیا تھا میں نے
یہ کام تو جانکر کیا تھا میں نے

انجام پہ تھی نظر جو رویا تھا بہت
جس روز کہ تجھکو دل دیا تھا میں نے

غزل حضرت ضامن کنتوری

تیرے زخمی کچھ تڑپتے کچھ سسکتے ہیں کہیں
پھول کھلتے ہیں کہیں غنچے چٹکتے ہیں کہیں

فرش تھا نور نظر کنعاں سے تا زندان مصر
گو دل محبوب کی یوں راہ تکتے ہیں کہیں

عاشقوں کے دل بنے ہیں غم کی خاطر ای فلک
لاکھ بھر جائیں یہ پیمانے چھلکتے ہیں کہیں

ساقیا واعظ کے دن کرنیکی باتیں ہیں یہ سب
ظرف والے اتنی سی پیکر بہکتے ہیں کہیں

ایک مدت سے نہیں معلوم ہمکو دل کا حال
ہاں مگر کچھ خار حسرت کے کھٹکتے ہیں کہیں

مرد میدان تھے جبھی تو عشق کی زد پر گئے
معرکے سے یہ قدم پیچھے سرکتے ہیں کہیں

دل پکارا تا ہے سینے میں ذرا کہو تو ہاتھ
دیکھو یوں مجھ میں انگارے دہکتے ہیں کہیں

شوق ناقص تھا نہ لائے جب تو موسیٰ بے دید
ناظرہ پڑھنے میں حافظ بھی اٹکتے ہیں کہیں

تجھیں انہیں ضامن انساں اور حیوانکا ہی فرق
کہنے کی باتیں بلبل یوں چہکتے ہیں کہیں

غزل از مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب مدیر قند پارسی

حال تباہ ہے دل مضطر نہو چہیے
بہتر یہی ہے آپ مکرر نہو چہیے

اس مہر وش کے عہد وفا پر نجائیے
جہری وفائے ستمگر نہو چہیے

مہر و وفا کا ذکر یہاں کچھ نچیڑیے
قصہ یہ آپ بر سر محشر نہو چہیے

دل دیدیجیے کسیکو کہیں زہر کھائیے
انداز و ناز و عشوۂ دلبر نہو چہیے

ہے خار زار عشق یہاں خواب ہے حرام
اس رہگزر میں بالش و بستر نہو چہیے

جس بزم کے چراغ ہیں یہ اسکو دیکھیے
حیرت طراز مہر و اختر نہو چہیے

جاتے ہیں لکھنؤ دل پہ آرزو لیے
شوق لقائے حضرت محشر نہو چہیے

جو دلفریب ہوا اسے کیونکر نہ ہو نہ دیے
جو جاں شکیب ہوا اسے کیونکر نہو چہیے

ہنگام ذبح ثاقب آشفتہ حال سے
ذوق روائی دم خنجر نہو چہیے

ولہ رباعی

دل طالب ذوق ہمزبانی کب تک
کانوں میں صدائے من ترانی کب تک

اب وقت ہے اور آنکھ کہو لو ثاقب
ایام وصال کی کہانی کب تک

غزل جناب حکیم محمد عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی شاگرد امیر مرحوم لکھنوی

عیش و آرام مجھے گردش دوراں میں نہیں
آرزو اسکی ہے جو عالم امکاں میں نہیں

توڑنے پر مجھے توبہ کے عجب ہے ساقی
تیری وعدوں میں نہیں کچھ تیری پیماں میں نہیں

جوش سودا میں بنا لیتے گلے کی پھانسی
ہاتھ ملتے ہیں کوئی تار گریباں میں نہیں

پیہم آتی ہے مرے زخم جگر سے آواز
جو مزہ درد میں ہے وہ کبھی درماں میں نہیں

کچھ بھی عبرت کے لئے حال عدم کا کہدے
ہائے آتا بھی کوئی شہر خموشاں میں نہیں

اسکو امید وفا مجھکو تمنائے جفا
آرزو غیر کی شامل مرے ارماں میں نہیں

وصل میں ہاں جو نکلتی ہے کبھی بولے سے
مسکراتی ہے تمہارے لب خنداں میں نہیں

پانو پھیلائے ہوئے چین سے سب سوتے ہیں
ایک کو ایک کا غم شہر خموشاں میں نہیں

شمع تربت کے سوا اشک بہانے والا
بیکسی دیکھ کوئی گور غریباں میں نہیں

کیوں گلا شام سے گھٹتا ہے ہمارا کوثر
غیر کے ہاتھ اگر گردن جاناں میں نہیں

غزل جناب محشر لکھنوی

رخصت اے صبر اُس ستمگر کو عتاب آہی گیا
مژدہ باد اے نالہ وقت اضطراب آہی گیا

لیکے دلکو یوں ہوئی خواہاں وہ جان زار کے
چارہ ناچار اپنی آنکھوں کو حجاب آہی گیا

مرگیا بیمار غم کروٹ جو بدلی ضعف سے
عالم ہستی میں آخر انقلاب آہی گیا

میکدے میں دیکھکر واعظ کو رندوں نے کہا
آشنائے لذت درد شراب آہی گیا

قصد مینوشی پے تمہید وصل دوست تھا
کھینچ کے ہونٹوں تک میرے جام شراب آہی گیا

جاتے جاتے تیغ سے گیسو تک نظر ہوش اُڑ گئے
شام بھی ہونے نہ پائی تھی کہ خواب آہی گیا

چشم بد دور اس ادا پر دیکھنے والا نثار
بنکے یوں لیٹے ہیں گویا ان کو خواب آہی گیا

کسقدر نظارہ نازک مزاجی سہل ہے
جب ذرا سی چھیڑ کی اُن کو عتاب آہی گیا

جاتے تھے توبہ کو محشر کرکے ترک انتظار
ناگہاں وہ مست صہبائے شباب آہی گیا

غزل جناب حکیم باقر صاحب راز لکھنوی

روز ازل سے وصل کی صورت نہیں کہیں
دیکھا تو آسماں کہیں ہے زمیں کہیں

اے نیند ایک چشم زدنکو تو آ کبھی
شاید کہ آئے خواب میں وہ نازنین کہیں

پردیس دلکے دیکھ لے گر آفتاب داغ
دکھلائی دے نہ خلق میں ہرسیں کہیں

پہنے ہوئے ہوں خار در یار کا کفن ٭ مجھسے لپٹ نہ جائیو دیکھ اے زمیں کہیں
دیکھے چلے ہیں اشک بجھانیکے واسطے ٭ سوز جگر سے آگ لگی بالیقیں کہیں
پوچھا جو میں نے دلکا پتا کچھ بتائے ٭ بولے مجھے خبر نہیں ہوگا یہیں کہیں
سودائی نسرا ان کا دیکھا شکست حال ٭ دامن ہے تار تار کہیں آستیں کہیں
ہر جا پہ بحر عشق میں طوفان ہے نیا ٭ اے راز ڈوب جائے نہ ایماں وہیں کہیں

قطعہ تاریخ وفات جسٹس بدرالدین طیب جی مرحوم از محمد یوسف صاحب ناظم انصاری متوطن بمبئی

وا دریغا حیف و وا ویلاہ و صد فریاد و وای ٭ مغز ما را خلک از چشم ما پنہاں نمود
رفت بدرالدین طیب جی ز دنیا آہ آہ ٭ مردنش آرام و مغز و راحت از ما در ربود
نت از ما جوہر قابل کہ اندر روزگار ٭ ثانیش گر بود کس خود خویش را ثانی نبود
خیر خواہ مسلمین بود و عزیز المسلمین ٭ زیں سبب از مرگ وے اسلام را غم ہا فزود
شد جہاں پر داہ آتش بار اہل درد و غم ٭ نیست ایں تار شعاع مہر بر چرخ کبود
شد مراحل طے چو از عمر شریفش شصت و چار ٭ مرد و گر انصاف پرسی مردنش بودست زود
مصرعہ تاریخ فوتش ناظم دل خستہ گفت ٭ فخر اہل ہند بدرالدین طیب جی بود

کتب برائے ریویو | مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے پاس پہونچی ہیں۔ ماہ آیندہ میں ان پر ریویو کیا جائیگا
اس پرچے میں ملا عبدالقیوم صاحب کے مضمون (حصہ سوم) کے سبب سے گنجایش نہ نکل سکی۔ (۱) سوانح عمری
مولانا روم از علامہ شبلی۔ (۲) نیرنگ افغان از حضرت اغلب موانی۔ (۳) دیوان شاکی و سخن پاکی کلام
احمد حسن مرحوم نقاش مرحوم دہلی میرٹھ۔ (۴) ذوالفقار حیدری از بابو رام گوپال صاحب۔

مفت بلکہ ٹکٹ بھی کارخانہ کیطرف سے

(رسالہ گوہر نادر)

دنیا بھر میں نایاب کتاب۔ نہایت جلد بذریعہ کارڈ اطلاع بھیجنے پر جسقدر آپکے لئے ضرور ہو نشان ذیل سے مفت ملیگی۔

جنرل منیجر کارخانہ جات رائل مڈکل ہال جگادھری ضلع انبالہ

(۳) حصۂ دافع اوہام

ہم شرعاً و عقلاً ثابت کر چکے ہیں کہ اجتماع تمدنی، اور تالف باہمی، انسان کے لئے ضروری، اور لازمی چیز ہے، اور اسمیں اختلاف آراء، اور تباین عقاید و عصبیۃ، کا کچھ لحاظ نہیں اور نہ یہ مانع اتفاق و الفت ہیں۔ اور فرق مختلفہ، و اشخاص متباین الطبع، میں اتفاق و الفت ایسی مفید، ضروری چیز ہے کہ اس سے کسیکو اختلاف ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسکی ضرورت عقل و نقل دونوں متفق ہیں۔ کہ ؎

دولت ہمہ ز اتفاق خیزد — بیدولتی از نفاق خیزد

حشمت باتفاق ملاحت جہاں گرفت ؎ آرے! باتفاق جہاں می تواں گرفت

مور چگاں راچو بود اتفاق ؎ شیر ژیاں را بدر آرند پوست

ہر قسم کی لذت، راحت، قوت، شوکت، دولت، ثروت، رفعت، منزلت، منفعت اور سعادت دنیا و آخرت سبکا دار و مدار اسی پر ہے، اسی لئے فتنہ و فساد کو شرع میں قتل سے زیادہ تر اشد بتایا ہے کہ "الفتنۃ اشد من القتل" کیونکہ قتل تو ہیئت مجتمعہ شخصیہ کے فساد کا موجب ہے۔ اور فتنہ و فساد اجتماع بنی نوع، اور ہیئت اجتماعیہ مدنیہ کے انحلال کا باعث ہے جس سے عام نقصان قومی، و ملکی، و مالی و دولی، متصور ہے۔ پس اگر تمام شرکاء کا نگریس ہندو ہی ہوتے، تب بھی اسکی شرکت بروئے شریعت و سیاست مسلمانوں کے لئے ممنوع تھی۔ چہ جائیکہ اسمیں اہل کتاب، عیسائی، یہود، مجوس، اور اہل اسلام بھی شریک ہیں۔ تو اب کسی قسم کا معذور شرعی و عقلی نہیں پایا جاتا۔ پس اب ہم اُن عام اوہام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو عموماً زبان زد خاص و عام، اور تکیہ کلام عوام کالانعام ہو رہے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ وان ارید الا الاصلاح۔

چونکہ ان تمام اوہام کے مشیع اور بانی مبانی، سرسید مرحوم ہیں۔ اور انہیں نے اس اختلاف کو تمام مسلمانان ہندوستان میں تعلیم یافتہ گروہ اور اپنی ذاتی رائے کے خلاف

اغراض و مصالح وقتیہ و ذاتیہ کی وجہ سے پھیلایا تھا۔ اس لئے اُن کے پیش کردہ
ہات کا دفع کر دینا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ سرسید نے اپنی لکھنؤ اور میرٹھ والی اسپیچوں
اُن کو ظاہر فرمایا تھا۔ اور لوگوں کو اپنی ابلہ فریب تقریر سے ان اوہام دور از کار میں
دیا تھا اور دوسرے بر آوردہ گروہ ہند۔ یعنی ہندو مسلمانوں میں جنکے تمدنی علاقات، اور
اشرتی روابط، مستحیل الانفکاک ہیں تفرقہ ڈالدیا۔ اور ایک عام شورش پھیلادی۔ سرسید
ان دونوں اسپیچوں میں محض دعاوی کے سوائے استدلال، یا واقعات واقعی سے بحث
میں کی گئی ہے۔ اُنہوں نے اپنے مخترعات و مزعومات، کو مسلمات و واقعات قرار دے
ہے۔ چنانچہ لکھنؤ والی اسپیچ کا جواب پنڈت اجودھیا ناتھ سرگباشی نے ایسا معقول،
مدلل، مفصل، اور شرح، دیا ہے کہ درحقیقت وہ لاجواب ہے، مگر ہم بھی سرسید کے مزعومات
اور توہمات کو جو ان دونوں اسپیچوں میں مذکور و مسطور ہیں، ملخصاً درج ذیل کر کے پھر پنڈت
جی اور سرسید کی یاد تازہ کئے دیتے ہیں، اور سب پر ثابت کرتے ہیں کہ یہ اوہام "اوھن
من بیت العنکبوت" ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد، صرف دفعیہ اغلاط و اوہام اہل اسلام
ہے اور اس سے صرف سرسید کی تغلیط رائے اور اپنے سادہ دل بھائیوں کو اس مغلطے
سے کالنا مقصود ہے۔

(۱) سرسید زعم میں کانگریس کے بانی مبانی، بنگالی ہیں، جنہوں نے اپنی ذاتی غرض کے
لئے گورنمنٹ کے برخلاف اس کا انعقاد کیا ہے۔ اور چونکہ وہ مشرک ہیں، لہذا ہمکو گورنمنٹ
سے جو اہل کتاب ہیں، اور ہم پر حاکم، اور جنکی مودت و اطاعت، ہمپر واجب ہے، علیحدہ
ہو کر اُن کے شریک ہونا چاہئے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسکے بانی مبانی، دیوان رگھوناتھ، مرہٹہ برہمن ہیں۔ اور
اسکا انعقاد و اجلاس پہلے پہل بمبئی میں ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ جمعیت کل ممبر (۷۲) تھے۔ جنکے
منجملہ صرف دو مسلمان اور تین بنگالی تھے۔ دوسرا اجلاس کلکتہ میں ۱۸۸۶ء میں ہوا۔
جس میں (۴۳۶) ممبر مختلف مقامات سے مختلف حرفے، پیشے، حیثیت، وجاہت، اور لیاقت
کے شریک ہوئے تھے۔ (۱۰۱) ممبر سے (۳۳) مسلمان تھے۔ تیسرا اجلاس مدراس میں ۱۸۸۷ء

میں ہوا۔ جسمیں منجملہ (۶۰۴) ممبروں کے (۸۳) مسلمان تھے، اور جنکے پریسیڈنٹ آنریبل بدرالدین طیب جی مرحوم، اور مدراس کے معزز ترین نوبل، سر ہمایوں جاہ بہادر مرحوم و مغفور بھی شریک تھے۔

دوسرا زعم سید کا کہ بنگالیوں نے اپنے فائدہ ذاتی کے لئے یہ جلسہ کیا ہے، یہ بھی سراسر غلط، خلاف واقع، خلاف روئداد و رزولیوشن، اور خلاف غرض و غایت بینہ و مصرحہ کانگرس ہے۔ جیسا کہ خود ہماری تحریر مندرجہ عنوان مضمون ہذا سے ثابت اور متحقق ہے کہ اسمیں عامہ رعایا کا فائدہ بلا امتیاز قومی و مذہبی و ملکی ملحوظ و مرعی ہے۔ نہ کسی خاص قوم و فرقے کا۔

تیسرا زعم سید کا کہ یہ جلسہ خلاف گورنمنٹ ہے۔ یہ بھی سراسر افترا و بہتان ہے۔ اور خود اُن کے اقرار و بیان کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ:۔ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے۔ اور اُنہوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور ناواجب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے۔ مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چین۔ جسقدر گورنمنٹ انگریزی کے قدردان ہیں، شاید کوئی دوسرا نہوگا" ملاحظہ ہو۔ حصہ دوم سیات جاوید صفحہ (۱۱۸)

اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس جلسے کے خلاف گورنمنٹ ہونیکے کیا معنے؟ آیا قانون نافذہ وقت کے خلاف ہے؟ یا کسی خاص حکم کے خلاف ہے؟ یا طرز حکومت کے خلاف ہے؟ یا تنگدل حکام قوم فاتح کی ذاتی خواہشوں کے برخلاف ہے؟ جو محض مبنی بخود غرضی و نفع ذاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ قانون نافذہ وقت یا کسی سرکلر یا طرز حکومت برطانیہ کے ہرگز برخلاف نہیں ہے اور نہ کوئی اسکو ثابت کر سکتا ہے۔ کیونکہ حکومت برطانیہ۔ کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ ہے، مشورت اور اتفاق آراے عامہ رعایا و برایا پر اُسکے آئین و قوانین سلطنت جاری ہوا کرتے ہیں، شخصی حکومت نہیں ہے۔ اب رہی بعض تنگدل و خود غرض حکام قوم فاتح کی خواہش، سو جب وہ صرف رعایا ہی کے حق میں نہیں۔ بلکہ سرکار اور رعایا دونوں کے حق میں مضر ہے۔ تو بجا دباؤ کے خوف سے یا اپنے ذاتی منافع، و شخصی مضار کے خیال سے

اُسکا اتباع کرنا۔ ہمپر کچھ ضروری نہیں ہے۔ بلکہ نہایت ناجائز ہے، چنانچہ خود سرسید کے فتوی اور قول پر اور اُنکے تعامل کی رو سے بھی، اس کی مزاحمت و مخالفت ضرور ہے، جیسا کہ وہ اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ادھر ہم کو اپنی قوم کے تعصب و جہالت سے مقابلہ کرنا ہے، اور اُدھر اپنی قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے۔ جو ہمارے سوشل اور پولیٹیکل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں اور ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن، جنٹلمین کے سے اخلاق، یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں، اور چشم خشم آلود سے ہمکو دیکھتے ہیں، جیسے کوئی نہایت نیک دل حاکم بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہمکو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیئے، اور جو تکالیف و مشکلات ہمکو پیش آئیں، نہایت تحمل و بخشندہ مزاجی سے برداشت کرنا چاہیئے۔ ہم اسبات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ گریٹ رفارمر یعنی زمانہ ان باتوں کو ضرور نہ ہونے دیگا، اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی، و خفگی، اُسکو نہ روک سکیگی۔ لیکن بیشک یہ تنگدلی کے خیالات، مراضی کو ترقی دینے والے اور فاتح و مفتوح کی ہمدردی و محبت کو توڑ دیتے ہیں" ملاحظہ ہو حصہ دوم حیات جاوید ۱۸ و ۱۹۔

سرسید کا ہمیشہ یہ تعامل رہا ہے اور وہ اپنے پبلک لکچروں اور اسپیچوں میں بار بار بآواز بلند پکار پکار کر بتاکید تمام یہ کہا کئے کہ:۔ "اگر گورنمنٹ کی پالسی ہمارے مصالح و منافع اور اغراض قومی و ملکی کے برخلاف و مضر ہو تو ہمکو باستقلال تمام اسکی مقاومت کرنی چاہیئے۔ اور پوری ہمت و صبر و استقلال سے کام لینا چاہیئے۔ اور اس کی کچھ پروانہ کرنی چاہیئے کہ گورنمنٹ اُس سے خوش اور راضی ہوگی یا ناراض۔ اور گورنمنٹ کو دکھلا دینا چاہیئے کہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے۔ مگر لوگوں کے دلوں پر نہیں ہے"

چوتھا وہم و زعم کہ مسلمانوں کو مشرکین کی مخالطت و مشارکت، خلاف اہل کتاب و حکام، و قرآن کے ممنوع ہے نظائر الطالب ہے۔ حیسا کہ ہمیں سیاست و شریعت و نوا

مفصلاً اُس کا ابطال بوجہ کمال کردیا ہے اور بتادیا ہے کہ کانگریس کے مطالب بعوض خلاف ہونے کے
عین موافق اصولِ سلطنت و مبنی بخیر خواہی دولت، و خیر اندیشی و خیر طلبی رعیت ہیں۔ چنانچہ خود
سرسید اسکے قائل ہیں اور لکھتے ہیں کہ:-

"میں نے مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ، صدق دل سے دوستی اور میل جول اور
کھانا پینا دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں؟ مذہب نے جواب دیا کہ موافق
ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے، کیونکہ اسلام، نفاق سے بتر اور رذیل تر خصلت کوئی نہیں
بتلاتا۔ اس لئے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اُسی صداقت و خلوص
کے ساتھ میل جول رکھا، جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہئے۔" ملاحظہ ہو حیاتِ جاوید صفحہ
حصہ دوم

ایک دوسرے مقام پر یعنی بجواب اڈریس انجمن پنجاب وہ یوں فرماتے ہیں:-

"میری تمام تر آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق
ہوں مذہب بے شک سب کا علیحدہ علیحدہ ہے۔ مگر اُسکے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے،
فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف کھانے موجود ہیں۔ اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند
کرتا ہے، کوئی کسی کو مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اُس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم
کچھ رنج نہیں ہوتا، اسی طرح اس دُنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے، مختلف مذہب والوں میں، کوئی وجہ
باہم رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی، ہر شخص اپنے ایمان کا مختار، بلکہ میری رائے میں اُسپر مجبور ہے
اس لئے کہ جس چیز کا یقین اُسکے جی میں ہے، اسی کو وہ اختیار کرے گا۔ وہ یقین دوسرے کے
دل میں اثر نہیں کرتا، اچھا ہے تو اُس کے لئے اور بُرا ہے تو اُس کے لئے، لیکن آپس کی
محبت میں، جو انسان کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا۔"

ایک دوسرے موقع کی اسپیچ میں فرماتے ہیں:- کہ "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں
ایسی آباد ہیں، کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے
ایک آب و ہوا میں، دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے
کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو

معاشرت سے تعلق رکھتی ہو۔ ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا، دونوں کو برباد کرنا ہے۔ قوم کا لفظ، ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا، اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے؟ یا اسی زمین کے کھانے پر تم جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو، اسی پر جیتے ہو، تو یاد رکھو کہ ہندو مسلمان، ایک مذہبی الفاظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان، عیسائی، بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

ایک اور موقع پر آپ نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی ہے کہ "میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ کہ ہندو، مسلمانوں، کا مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ کیونکہ ہم اُس کو کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں، یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں ہم کی تعلقات جو باہم ہیں، انکی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہندو یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔"

ایک اور اسپیچ میں اُنکے الفاظ یہ تھے: "اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، اسی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا۔ جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرنے میں جینے میں، ہم دونوں کا ساتھ ہی ہندوستان میں رہتے رہتے، دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں، ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدلکر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے ہندوستان کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں یہانتک ہم دونوں آپس میں ملے، کہ ہم نے ملکر ایک نئی زبان اُردو۔ پیدا کر لی، جو نہ ہماری زبان تھی، نہ اُن کی، اسی میرے دوست میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں، کہ ہندوستان ایک دلہن کے مانند ہے جسکی خوبصورت آنکھیں، ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھینگے تو پیاری دُلہن

ہنگی ہو جائیگی، اگر ایک دوسرے کو برباد کر دینگے تو وہ کانٹری بجائیگی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو! اب تمکو اختیار ہے کہ چاہو اُس دُلہن کو بیٹھکا بناؤ۔ چاہو کانٹرا۔"

ہم ان تمام اقتباسات کے بعد کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتے۔ عیاں راچہ بیاں، صرف اسقدر عرض کرتے ہیں کہ: "اعوذ باللہ من قول بلا عمل۔ لما تقولون مالا تفعلون"

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند	چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس۔ باز پرس	توبہ فرمایان، چرا خود توبہ کمتر می کنند
گویا باور نمی دارند روز داوری	کیں ہمہ قلب و دغل در کار داوری می کنند

(۲) سید فرماتے ہیں کہ کونسل والیسرائے، اور دیگر ہندی مجالس قانونی کی اصلاح کا کانگریس چاہتی ہے، اُس کی کچھ ضرورت نہیں ہے، وہ اپنے فرائض، بطور کافی و وافی ادا کرتی ہے، اسمیں کوئی نقص نہیں ہے۔ جب کانگریس اُسکے ناقص کو باوجود ثابت کرتی ہے جسکا کوئی جواب کسی سے نہیں بنتا۔ اور بجز توہمات و تعللات کے کوئی تشفی بخش اور معقول بات نہیں کہی جاتی تو سرسید کا دعویٰ بلا دلیل قابل التفات نہیں ہے۔

ہر ایک شائستہ اور مہذب قوم، و ملک، و دولت، نے یہ اُصول تسلیم کر لیا ہے کہ منجملہ طرق حکومت کے وہی طریقہ عمدہ اور پسندیدہ ہے۔ جو اپنی رعایا کی قوت علمی و عملی و اخلاقی کو قوی کرے اور ترقی دے۔ اور اُن کو شریک نظم مملکت و انتظام دولت کرے، اور دولت کے دو ہی معیار قرار دیے گئے ہیں۔ ایک تو وہ، جس سے یہ جانچا جائے کہ من حیث المجموع اور فرادی فرادی، رعایا کے ملکات علمی، و عملی و اخلاقی، کو زیادہ کرنے اور ترقی دینے کی وہ دولت کسقدر صلاحیت و قابلیت رکھتی ہے، اور اُسنے کیا کیا اور کیسے کیسے ذرائع مہیا کئے ہیں! کیونکہ قطع نظر اس امر کے کہ حکومت کی غرض اصلی، خود رعایا کی بہبودی و رفاہیت ہے، رعایا کے قوائے علمی، و عملی، و اخلاقی، خود دولت کی کل کو چلانے کے لئے قوت محرکہ کا کام دیتے ہیں۔ دوسرا معیار وہ ہے جس سے یہ جانچ پڑتال کی جائے کہ حکومت کہاں تک رعایا کے علم و لیاقت سے بہرہ مند و متمتع ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر رعایا کی لیاقت سے خود دولت منتفع و متمتع نہو۔ اور اُن سے دولت کا کام و انتظام نہ لیا جائے تو وہ بے سود

دیکھا ہے۔

رعایا کی لیاقت علمی و عملی بمنزلہ بخار اور اسٹیم کے ہے۔ اور دولت بمنزلہ انجن کے۔ گو اسٹیم کتنا ہی قوی اور زیادہ ہو، اگر انجن اور آلات اُسکے مساعد نہوں، تو وہ محض بیکار ہے۔ اور آلات بدون اسٹیم کے معطل اور بے صرفہ محض رہتے ہیں۔ بہرحال جہاں اسٹیم بے انجن، اور انجن بے اسٹیم کے بے صرفہ، وغیرہ مفید و بیکار ہیں، اور علاً نافع نہیں۔ اسی طرح اقلیم یافتہ رعیت بے دخیل گورنمنٹ ہونے کے، اور گورنمنٹ بے تعلیم یافتہ رعایا سے مستفید ہونے کے بیکار آمد اور مفید نہیں ہوسکتے۔ الحاصل جو خوبی کسی آئین سلطنت، و قوانین سیاست میں خواہ وہ کسی قسم کی ہو۔ پائی جاسکتی ہے وہ دو قسم کی ہے۔

ایک یہ کہ اُس کے آئین سلطنت و سیاست سے گروہ محکوم کی عام علمی و عملی و نظری و اخلاقی قوت میں ترقی ہو۔ دوسری یہ کہ جتنی لیاقت علمی و عملی و نظری و اخلاقی، اس گروہ میں بالفعل موجود ہے۔ وہ کس درجے تک ایسے طور پر مرتب کرلی گئی ہے کہ امور سلطنت پر بدرجۂ غایت، موثر ہوسکے۔

انسان کے معاملات کا اسلوب ہی۔ بدو خلقت ایسا واقع ہوا ہے۔ کہ آدمی کی نیت اوروں کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں گو کیسی ہی خالص کیوں نہو۔ مگر اوروں کو یہ ہرگز مناسب و مفید نہیں۔ کہ وہ ہات پر ہات رکھے خاموش بیٹھے رہیں۔ اور کچھ ہل چل نہ کریں۔ اور اُصول "الحرکۃ برکۃ" پر عمل پیرا نہوں۔ ؎

تا نہ گرید ابر کے خنداں چمن — تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن
تا نہ گرید طفلکِ حلوا فروش — دیگِ حلوائی کجا آید بہ جوش

لیس للانسان الا ما سعی

اور یہ بھی نہایت سچی اور واقعی بات ہے کہ آدمی اپنی اصلی اور دائمی اصلاح اپنی ہی ہات سے کرسکتا ہے۔

نخارد کسے در جہاں پشت من — بغمخوارگی جز سر انگشت من

لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت

پس جو حکومت کہ رعایا کو تعلیم دے۔ اور نہ اُس کے علم و تہذیب سے انتظام حکومت میں تمتع اُٹھائے اور نفع حاصل کرے اُسکی رعایا روز بروز کاہلی پستی کی حالت میں تنزل کرتے کرتے پہلے حالت غلامی میں پھر درجہ حیوانات بہائم و بہائم میں پہونچ جائیگی، اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مثل حیوانات کے وہ اپنے حقوق و معاملات کے آپ مالک و مختار نہیں رہتی۔ اُن کی پرداخت و پرورش، واقتدار و اختیار کی باگ دوسرے کے ہاتھ ہوا کرتی ہے، جدھر چاہا پھیرا، اور جسطرح چاہا، تصرف کیا۔

جب ہر قسم کی دولت کی خوبی کا یہ اصول مسلم ہو چکا، تو اب ہم اس لحاظ سے دیسرائے اور دوسری آئینی کونسلوں کو جانچتے ہیں۔ کہ وہ کہانتک اس کے موافق و مطابق ہیں؟ اور کسقدر مخالف و مباین۔

قاعدہ حال کی رو سے سرکار ہی کی طرف سے غیر سرکاری ممبر منتخب و مقرر ہوتے ہیں، اور اُن کی تعداد سرکاری ممبروں سے کم ہوتی ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بالاتفاق آ جائیں اور رائے دیں۔ تو اُنکا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ اور حالت یہ ہے کہ چونکہ وہ اکثر سرکار کے زیر اثر اور ہاں میں ہاں ملانیوالے ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کو رعایا کی ہمدردی و حقوق سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ اور سنئے کہ سکرٹری آف اسٹیٹ نے یہ قاعدہ جاری کر دیا ہے کہ اگر کسی ممبر کو کوئی قانون پیش کرنا ہو تو اول بذریعہ گورنمنٹ آف انڈیا اُسکی اطلاع اُن کو دے۔ اگر وہ نامنظور کر دیں تو وہ پیش نہیں ہو سکتا۔ اگر دو مہینے کے اندر وہ منظور کریں۔ یا اپنی منظوری و نامنظوری کی اطلاع نہ دیں تو وہ پیش ہو سکتا ہے۔ مگر پیش اور پاس ہونے کے باوجود بھی اُس کے نامنظور کر دینے کا اختیار، نواب گورنر جنرل و سکرٹری آف اسٹیٹ کو بدستور حاصل رہتا ہے۔ اور بعض حالتوں میں سرکاری دباؤ سے موافق رائے لینے کی ناجائز کوشش بھی معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ پس اب انصاف کیجئے کہ یہ حالت کہانتک رعایا، اور ملک، کی اصلاح و فلاح کے مناسب حال ہے! اور کون شخص اُسکو معقول خیال کر سکتا ہے۔ گو خوشامد سے کتنا ہی سراہئے، اور باتیں بنائے، مگر حقیقت نہیں بدل سکتی، اگر اس کی برائیاں اور عملی خرابیاں

کلاں ہی جائیں تو ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس لئے ہم اُس سے درگزرتے ہیں۔

کانگریس کے مجوزہ طریقے میں دو خوبیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرکاری ممبر من مانے تجاویز بے دھڑک نہ پیش کر سکینگے، سوچ بچار کر پیش کرنا ہوگا، کیونکہ اُن کو معترضین کی جوابدہی ضرور ہوگی۔ اور وکلاء رعایا کی تشفی کرنی پڑیگی، دوسری رعایا کی بیگانی و غلط فہمی ہی سرکاری کارروائی سے مرتفع ہو جائیگی، اور جانبین کی لاعلمی و جہالت سے جو بُرے نتائج پیدا ہونے کا خدشہ و اندیشہ رہتا ہے وہ دور ہو جائیگا۔ یعنی رعایا کی حالت و خواہش، سرکار سے پوشیدہ، اور سرکاری مصالح رعایا کو نامعلوم رہنے سے جو خرابیاں، انتظام میں پیدا ہوتی ہیں، اور جو کشاکشی باہمی واقع رہتی ہے، وہ جاتی رہیگی۔ اور رعایا و دولت کا اتحاد و اتفاق استحکام دولت کا موجب ہوگا۔ علاوہ برآں مشورت کا طریقہ، برابر ہندوں اور مسلمانوں میں، بطور شعار مذہبی کے جاری رہا ہے۔ بلکہ اب تک جاری ہے۔ اور اگر دنیا میں قدیم سے قدیم اقوام کی تاریخ دیکھی جائے۔ تو اُس میں اس طریقہ کا رائج و شائع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ پس اس مفید و معمول بہ طریقہ کا خلاف، باوجود اس کے کہ مصالح ملکی کے خلاف ہے اور بالکل پر خطر و پر ضرر معلوم ہوتا ہے کیوں کیا جاتا ہے؟

(۳) سرسید کا اپنی اسپیچ میں یہ ڈینگ لینا کہ وہ گورنر جنرل کے مشورہ دینے کے لئے شرافت، وجاہت، وتعت، اور دولت، وغیرہ امور کے لحاظ سے ممبروں کا لائق و فائق ہونا ضرور ہے صرف اُن کی ابلہ فریب اور دلخوش کن چال تھی۔ ورنہ سب پر روشن ہے کہ سرکار ... سوائے اشرفی کے اشراف متصور نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ اکثر ارذل ناس، سرکاری خدمات پر مامور و ممتاز، اور خطابات شاہی سے سرفراز پائے جاتے ہیں۔ سرسید کا یہ عذر کہ انگریز ہماری آنکھوں سے دور ہیں، اس لئے ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولایت میں کس پیشے، حرفے، اور حیثیت کے لوگ ہیں۔ مگر یہاں کے لوگ اس قسم کے ہوں تو ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے" یہ بھی محض ایک دل خوش کن دفع الوقتی ہے۔ کیا سرکاری دربار میں اور سرکاری اعلیٰ خدمات پر کوبڑے، بہیارے، جولاہے، قصائی، درزی، اور خانساماں خدمت نہیں ہیں؟ کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے؟ مگر جھوٹی شیخی اور ہے، اور واقعات پر

کسی رائے کا مبنی کرنا اور ہے، اس سے قطع نظر کرکے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا سرسید بحیثیت ایک مسلمان ہونیکے سرورِ کائنات کے اس فرمانِ واجب الاذعان سے سرتابی کرسکتے ہیں۔

"اطیعوا امیرکم ولو کان عبداً حبشیاً ورأسہ کالزبیبۃ"

کیا کسی مسلمان کا ایمان "انا اکرمکم عند اللہ اتقاکم" پر نہیں ہوسکتا؟ اور کوئی مسلمان اس عقیدے سے علیحدہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا یہ آیت حضرت بلالؓ کی شان میں، بمقابلہ اہل قریش نہیں وارد ہوئی ہے؟ پھر ان فضول شیخیوں اور تفاخر بیجا سے جو خلافِ عقل و نقل ہے فائدہ ہی کیا ہے؟ اسلام نے اور ہماری گورنمنٹ نے بھی بہ پیروی اسلام، ان چیزوں کو ساقط الاعتبار کردیا ہے۔ اور صرف کمالِ انسانیت، و تساوی، و حریت و علم و عدالت کے اعلیٰ اصولِ مدنیت کو محفوظ و منظور رکھا ہے۔ تفاخر نسبی۔ بمقابلہ فضائل و مفاخر کسبی، کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اسلام میں ممنوع اور شعارِ جاہلیت سے ہے۔

شرف المرأ بالعلم والادب لا بالمال والنسب

حضرت علی کا قول ہے:۔ انا ابن نفسی وکنتی ادبی ٭ من عجم کنت او من العرب

ان الفتی من یقول ہا انا ذا ٭ لیس الفتی من یقول کان ابی

سرسید بنگالیوں سے نہایت ناراض ہیں۔ معلوم نہیں کہ اُن کی لیاقت کے حسد سے، یا جاہل بہادروں کی خوشامد کے خیال سے، یا محض اُن کی تقلید کے لئے جو اُن کی (سرسید) طبیعت ثانیہ ہوگئی تھی غرض جس وجہ سے بھی ہو بنگالیوں پر لعن طعن کرتے، اور پھبتیاں اُڑاتے ہیں۔ کبھی اُن پر کالے ہونیکا الزام لگاتے ہیں کبھی بزدلی کا، مگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ سرسید بمقابلہ بنگالیوں کے خود اپنے کالے ہونے اور بزدل یا خوشامدی رہنے کا ثبوت دیتے ہیں، صرف آبائی تفاخر کیا کام آسکتا ہے؟ جبکہ خود ہم میں جوہر ذاتی نہو ؎

پسرانِ وزیر ناقص عقل		بگدائی بروستا رفتند
روستازادگانِ دانشمند		بوزیری بہ پادشا رفتند
گیرم کہ پدر تراست فاضل	؎	از فضلِ پدر ترا چہ حاصل
ناخوش بود آں عروس و بد	؎	کو ناز کند بحسنِ مادر

(۴) ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اہلِ اسلام کی تعداد ہندوستان میں بہ نسبت ہندوؤں کے کم ہے۔ لہذا کونسلِ واضع قوانین و آئین کے واسطے منجانب رعایا اگر منتخب ہوں تو تعداد ہنود کی زیادہ ہوگی، اور وہ باعتبار دولت و لیاقت کے بھی اُن سے بڑھے ہوئے ہیں، اور چونکہ ان دونوں میں نااتفاقی ہے۔ لہذا کثرتِ رائے ہمیشہ مسلمانوں کے برخلاف رہیگی، اور مسلمانوں کو مضرت پہونچیگی۔ اور اُن کے حقوق کی حفاظت نہوسکیگی۔!

اگرچہ یہ اعتراض بھی مثل سابق کے بے بنیاد ہے۔ مگر بظاہر اسکا اثر، خواص و عوام اہلِ اسلام پر زیادہ ہوا ہے۔ لہذا سب سے اول اس قاعدہ پر جو کانگریس نے انتخاب کے لئے مقرر کیا ہے نظر ڈالنی چاہئے، اور اُسکو بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ اُسکی رو سے کمی تعداد مسلمانان کا خوف کسقدر ہے؟ اور اُس کمی تعداد کا نتیجہ و اثر کیا مترتب ہوسکتا ہے؟

کانگریس نے انتخاب کا قاعدہ یہ مقرر کیا ہے کہ فی دس لاکھ، تین شخص قائم مقام رعایا منتخب ہوں، جنکو ڈیلیگیٹ کہتے ہیں، اور جسقدر ڈیلیگیٹ کسی صوبہ کے منتخب ہوں اُسکے ثلث سرکار مقرر کرے، اور یہ رعایا و سرکار کے منتخب شدہ ممبر ملکر اپنا دسواں حصہ کونسل کے ممبروں کے لئے منتخب و مقرر کریں۔ جنکے ساتھ ایگزکٹیو (یعنی سرکاری ممبر) بھی شریک ہونگے، مثلاً فرض کیجئے کہ کسی صوبہ کی رعایا تین کروڑ دس لاکھ ہے تو منجانب رعایا ۳۱ ڈیلیگیٹ بحق انتخاب ممبران کونسل مقرر ہونگے، اور منجانب سرکار ۳۱۔ ان دونوں کا مجموعہ ۱۲۴ یہ ۱۲۴ ڈیلیگیٹ کونسل کے لئے بارہ ممبر انتخاب کرینگے۔ جنکے ساتھ ایگزکٹیو ممبر بھی شامل ہونگے پس اگر بارہ ممبروں میں نصف سے زیادہ بھی ہندو ہوئے تو باقی ممبروں کی تعداد جن میں مسلمان اور دوسری قومیں، اور ممبران ایگزکٹیو ہونگے، ہندوؤں کی تعداد سے یقینی زائد ہوگی لہذا موافق ہنود۔ اور مخالف اہل اسلام کثرت رائے کا ہونا بعید از قیاس ہے۔ علاوہ اسکے گورنمنٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ سوائے ممبران منتخب شدہ کے بعض ممبر اپنی طرف سے بھی کونسل میں نامزد کرے۔ پس سرکار کو دو اختیار حاصل رہینگے۔ ایک فیصدی ۳۳ ڈیلیگیٹ کونسل کے ممبروں کے انتخاب کے لئے منتخب کریگی۔ دوسری کونسل میں خود چند ممبروں کو نامزد کریگی یعنی اپنے ڈیلیگیٹوں کے منتخب شدہ ممبروں کے بذات خود بھی ممبر منتخب کرسکیگی۔ تو ہر گز

اسکا خوف نہیں ہو سکتا کہ شرارت سے ایک فرقہ دوسرے فرقے کے آدمیوں کو منتخب نہ ہونے دیگا کیونکہ اگر کسی فرقے کے آدمیوں کی تعداد، اشخاص منتخب شدہ میں کم ہو تو سرکار اسی فرقے کے آدمیونکو کونسل میں مقرر کر سکتی ہے، اور اس نقص دکمی کی تلافی ہو سکتی ہے۔ پس جس قدر کمی تعداد کے لحاظ سے اُن کی مضرت کا احتمال خیال کیا جاتا ہے۔ وہ سب مفقود ہے۔ علاوہ اسکے لاہور کے جلسۂ کانگرس میں نسبت عددی بھی ملحوظ رکھنے کا تصفیہ ہو چکا ہے۔ جس سے مزیت کا اندیشہ وخدشہ بالکلیہ مرتفع ہو گیا ہے۔

چونکہ معاملات وحقوق ملکی وسیاسی میں ہندو مسلمان یکساں متحد ہیں، لہذا اسمیں بدگمانی کا محل وموقع ہی نہیں کہ ایک فریق خواہی نخواہی دوسرے فریق کی بدخواہی اور مضرت رسانی کریگا۔ کیونکہ بوجہ اتحاد واتحاد حقوق کے وہ میں اُسی کی بدخواہی اور مضرت رسانی ہوگی، اس لئے کہ دونوں فرقے ایک ہی ملک کے باشندے ہیں، اور انتظام ملک کی نسبت دونوں کے حقوق یکساں اور مساوی ہیں۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسے قواعد جاری ہوں جو ایک کو مفید اور دوسرے کو مضر ہوں۔ آخر عیسائی، پارسی، یہودی وغیرہ فرقوں کی تعداد بھی تو مسلمانوں سے کم ہے، پھر اُن کو اسکا خوف کیوں نہیں؟ کیا ہندو کہدینگے کہ مسلمان ٹیکس دیں اور ہندو نہ دیں؟ کیا ہندو کہدینگے کہ سوائے مسلمانوں کے اور لوگ ہتھیار باندھیں، یہ نہ باندھیں؟ اور لوگ الیکشن ہوں یہ نہ ہوں؟ دوسرے لوگوں کی مقبوضہ اراضی پر دوبارہ کی تشخیص ہو۔ ان کی اراضی پر نہ ہو؟ ایسا دوامی بندوبست ہو، ان کا نہ ہو؟ یہ ناممکن ہے! رہے مذہبی امور۔ اُن کا بھی وہی حال ہے۔ اگر ہندو خلاف میں بھی ہوئے تو دوسری طرف میں کیونکر اُن سے متفق ہو کر مسلمانوں سے خلاف کرینگی؟ اور یہ خلاف سوائے ممالک مغربی وشمالی و پنجاب کے اور علاقہ جات ہند میں نہیں پایا جاتا، سب جگہ میل جول اور اتحاد ہے۔ اور غالباً زمانہ خود اس کی اصلاح کر دیگا، اور اختلاف کی مضرتوں کو یہاں کے ہندو مسلمان بھی سمجھ جائینگے، اور یہ تعصب جو آج کل ان میں پایا جاتا ہے باقی نہ رہیگا، بہت جلد مرتفع ہو جائیگا۔

اصل یہ ہے کہ یہ احتمال بھی صرف مسلمانوں کی شرکت ہی سے رفع ہو سکتا ہے۔ نہ اُن کے علیحدہ رہنے سے۔ اس قسم کی غلطی اگر عمداً یا سہواً واقع ہو تو مسلمان شریک ہو کر اسکو مرتفع کریں

اور باہمی سل جول سے ان شکوک و احتمالات اور بدگمانیوں کو جو آپس میں پیدا ہو گئی ہیں یا عمداً ڈالی گئی ہیں دور کریں۔ وہ لوگ ہرگز مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ جو اُن کو علیحدہ رہنے اور ہمیشہ اس خدشے اور خطرے میں بوجہ اختلاف مبتلا ہونے کی صلاح دیتے ہیں۔ اور وہ ہندو بھی بدخواہ ملک و قوم ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ آپس میں اتفاق نہو۔ ہمیشہ نفاق رہے۔ دراصل ملکی فوائد ہدوں ان دونوں کے اتفاق و اتحاد کے ہرگز نہیں حاصل ہو سکتے۔ اور نہ اس نفاق و شقاق سے ایک دوسرے کو معدوم ہی کر سکتے ہیں۔ بہر حال ملک کی بہبودی اور بہبودی اور دونوں کی صلاح و فلاح کا دارومدار اُن کے اتفاق و اتحاد پر ہے۔ لہذا دونوں کو جد و جہد تمام اسکی سعی کرنی ضرور ہے۔ اور اس قسم کے امور کو جو اِن دونوں کے رشتۂ اتحاد کو توڑنے والے ہوں، طرفین سے ظہور میں نہ آنے دینا چاہئے۔ جب ہم مذہب و قومیت میں متحد نہیں ہو سکتے تو اتحاد کی جو جہت سیاسی باقی رہگئی ہے۔ اگر اُسکو بھی چھوڑ دیں تو پھر وہ کون ذریعہ ہے جو ہمکو متحد کرے؟ اور جس سے ہم باہم تمدنی منافع حاصل کریں اور مدنیت کے برکات سے متمتع و منتفع ہوں۔؟

(۵) ایک اور خدشہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بنگالی یا ہندو عموماً بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ انگریزی داں ہیں لہذا تمام سرکاری عہدے بنگالیوں یا ہندوؤں ہی کا مقرر ہو جائیگا۔

یہ خدشہ بھی پوچ و لچر ہے۔ اول تو خود گورنمنٹ کے مصالح کے خلاف ہے کہ تساوی بین الاقوام کی مصلحت سے چشم پوشی کرے، پھر مسلمان کیا ایسے کم ہمت و نالائق ہیں کہ دوسروں سے مسابقت نہ کرینگے اور پیچھے رہجاوینگے۔ اور اب تک وہ کہاں پیچھے رہے ہیں؟ زمانہ اُن کو مسابقت پر مجبور کرے گا اور وہ خود مجبور ہونگے۔ کیونکہ:-

"الدھر خیر مودب"

بعض اُن کی ہمت بڑھانیکے اُن کو تمام دنیا میں ذلیل و بدنام کرنا، اُن کو بددل اور بیٹا بنا دینا اُن کی ہمتوں، جذبوں، ارادوں، کو پست و سست کر دینا، کوئی خیر خواہی و حب قومی نہیں ہے بہر حال اب چونکہ مسلمان، انگریزی کی تعلیم، تحصیل، اور تکمیل کی طرف بھی متوجہ و راغب ہیں اور روز بروز انگریزی تعلیم یافتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، لہذا یہ خوف و خدشہ بھی بیجا ہے محل،

اور عملی ہے اور خود سرسید کے ذاتی خیالات اور بیانات کے بھی مخالف ہے، چنانچہ وہ ایلبرٹ بل کی تائید میں اسپیچ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "جس دلیل پر قومی امتیازات کا لحاظ کیا گیا ہے، میرے نزدیک اُسمیں بڑی غلطی ہے۔ شائستہ گورنمنٹوں میں خاص شخصوں کی اطاعت نہیں کی جاتی بلکہ قانون کی جس چیز کی تعظیم اور ادب و اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے نہ خاص خاص شخصوں کی، اُن شخصوں کی قومیت، جو قانون کی تعمیل کریں قابلِ لحاظ نہونی چاہیے، آزادی انصاف، وانسانیت کے اعلیٰ اصول اُس قوم کی طبیعت میں جتنے زیادہ متمکن ہیں۔ جس نے غلاموں کو آزاد کیا اور ہندوستان کو اس امر سے مطلع کیا کہ کانسٹیٹیوشنل حقوق کے معاملے میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں ہوسکتی، تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کو برباد کرنیوالی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے، کہ حاکم و محکوم کے درمیان قومی تفوق کا رکھا جائے۔ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گزر جانے سے ہم شائستگی کے اُس درجہ تک پہونچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہرکیف ملک کے عام قانون کے معاملہ میں کم کرنا، ہر ایک وجہ سے مناسب ہے" (ملخصاً) اسکے علاوہ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے اور ہمیشہ سے میں اس پر زور دیتا رہا ہوں کہ قوم کو اس کمینہ خیال سے کہ غیر قوم کی غلامی کریں اور اسی کو اپنا ذریعۂ فخر و مباہات و اکتسابِ دولت و ثروت و عزت سمجھیں، نکالنا اور دور کرنا چاہیے، اور اُن کو اس بندگی و بیچارگی سے آزاد کرانا اور رہائی دلانا ضرور ہے۔ خدمت و نوکری کا خیال، اسقدر عالمگیر ہو رہا ہے کہ جسکی کوئی حد باقی نہیں رہی، اور تمام قوم اسی طرف جھکی اور گری ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے روز بروز اسکا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے، اور قومی افلاس و فقر و مسکنت کا احاطہ نہایت وسیع ہوگیا ہے۔ اور روز بروز ہوتا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری عہدے کس کسکو اور کہاں تک مکتفی ہوسکتے ہیں۔ اور قوم و ملک، صرف غیر اقوام کی نوکری اور غلامی سے کیونکر مترفہ، متمول اور دولتمند ہوسکتے ہیں جب تک کہ اس غیر طبعی ذریعۂ معیشت کو چھوڑ کر طبعی ذرائع معیشت جو نہایت وسیع ہیں، حاصل اور پیدا نہ کئے جائیں۔ اس لئے قوم کو اس ذلیل و رذیل خیال و خبط سے پھیر کر تجارت، صناعت، حرفت، زراعت، اور فلاحت، کے وسیع و مکتفی و کافی ذرائع کی طرف لگانا چاہیے

جو اصلی طبعی ذرائع ترقی و تمول ملک و قوم کے ہیں، اور جو ملک و قوم کو غلامی سے رہائی دلانے والے اور جو مسلمانوں کے قومی، مذہبی، اصلی، ملکی ذرائع ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں اعلیٰ و اشرف قوم، قوم قریش ہے۔ جتنے ائمہ منتخب و مامور ہوتے تھے بالاتفاق خلافت و امامت پر سب قوموں سے زیادہ تھا وہ قریشی ہوتے تھے، قریش کو قریش اسی لئے کہتے تھے کہ وہ کاسب و تاجر قوم تھی، عربی زبان میں قرش کے معنی کسب تجارت کے ہیں۔ چنانچہ کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی قومی پیشہ کی وجہ سے قبل نبوت تجارت کرتے تھے، اور خلفائے راشدین میں سے ابوبکر، عمر، اور عثمان غنی بھی سب تاجر تھے اور اسی طرح عشرہ مبشرہ کا حال ہے ہمارے اسلاف و ائمہ دین سب کے سب کاسب و محترف تھے چنانچہ امام اعظم علیہ الرحمۃ بزازی کرتے تھے، قریش کی تجارت، اور سنت صیف کے اس تجارتی سفر کی وہ وقعت و عزت تھی کہ خدا تعالیٰ نے سورۂ لایلاف میں اس کی قسم کھائی ہے:۔

"لایلاف قریش ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف"

چونکہ یمن گرم اور شام سرد ملک تھا۔ اس لئے شتاء میں یمن کا اور صیف میں شام کا سفر کرتے تھے وہاں کے اجناس یہاں اور یہاں کے اجناس وہاں لیجاتے تھے، خدا تعالیٰ نے جہاں کہیں تجارت کا ذکر کیا ہے۔ اسکو فضل اللہ سے تعبیر کیا ہے چنانچہ سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے۔

"اذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ" (اسی طرح دوسرے مقام پر کہا ہے)۔

"وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ"

نیز احادیث میں اسکے فضائل بے انتہا وارد ہوئے ہیں:

(۱) "التاجر الصدوق یحشر یوم القیامۃ مع النبیین والصدیقین والشہداء"

(۲) "الکاسب حبیب اللہ"

اور یہ ارشاد ہوا ہے کہ ۹۹ حصے رزق تجارت میں ہے۔ اور ما بقی دوسرے ذرائع میں ہمارے علماء اور ائمہ دین نے کبھی نوکری پسند نہ کی۔ یہانتک کہ بعضوں نے موت کو اسپر

ترجیح دی۔ امام اعظم کا وہ قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے موت اور زہر خوری کو منصب قضا کی قبول پر ترجیح دی تھی، علمائے متقدمین جب تک کسی کو شرف و مکتسب نہ کر لیتے تھے تو خود نہ سکتے تھے کہ کہیں علم کو اپنا ذریعہ معاش بنا کے ذلیل نہ کریں، اور خود دنیا داروں کی نظروں میں لتاجی کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو، بہر حال سرکاری نوکریوں پر زور دینا، اور قوم کو اس پر لگا دینا گویا قوم کو برباد، اور مبتلائے افلاس، و تنگ و عارِ غلامیِ قوم غیر میں پھنسا دینا ہے۔ قوم کی حریت و آزادی کو چھنوا دینا ہے، اور اس کی قسمت کا چند داموں پر بکوا دینا ہے۔ قوم کو ذلیل و رذیل کرنے کی تجویز اس سے بدتر کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم کو نوکریوں کی طرف مائل کریں۔

اسلام میں دو باتوں پر بہت کچھ زور دیا گیا ہے۔ ایک صدق مقال، دوسرا اکل حلال بدوں ان کے کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ نوکری میں یہ دونوں مفقود و غیر موجود ہیں۔ نوکری کی کمائی کبھی خالی از شبہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علمائے اسلام نے اس سے نہایت احتراز کیا ہے۔ اور اس سے اپنے آپ کو جہاں تک ہو سکا بچایا ہے۔ ہمارے آج کل کے قومی رفارمروں نے اسی کو شرف و عزت، ثروت و دولت، مکنت اور موجب نجاتِ آخرت قرار دے لیا ہے۔ اور قوم کو دن رات اسی کی تعلیم و تلقین کرتے رہتے ہیں۔

لا یفلح القوم فوضی لا راۃ لھم ۔ ولا سراۃ اذا جھالھم سادوا
اذا کان الغراب دلیل قوم ۔ فما یھدیھم الا الضلالا

الحاصل میری نصیحت و وصیت تمام مسلمانوں کو یہی ہے کہ وہ ہرگز غیر اقوام کی غلامی کا عار اپنے اوپر روا نہ رکھیں۔ بلکہ آزاد و احرار رہیں۔ اپنی قومی، ملکی، مذہبی، پیشہ تجارت کو فروغ دیں، اور اسی کو اپنا ذریعہ معیشت قرار دیں، اس کے بعد زراعت، فلاحت، صنعت اور حرفت کو اپنا پیشہ کریں، ہمارے ہندوستان میں کئی ہزار سال سے یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے:۔ "اتم کھیتی۔ مدھم بان۔ چاکری نکشٹ۔ بھیک ندان" عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان چونکہ زراعتی ملک ہے۔ اس لئے زراعت کو تجارت پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس ضرب المثل کے یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ "اعلیٰ کھیتی، مدھم بیپار، کے برابر ہے اور چاکری نکشٹ، بھکاری پن، کے مساوی۔ کیونکہ دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور منہ پسارنا ہے۔

(۶) سرسید کا یہ اعتراض کہ مسلمان لالچ اور طمع دیکر یا اور کسی دباؤ سے، شریک کانگریس کئے گئے ہیں، محض لاحاصل و بے حقیقت ہے، بلکہ جہاں تک میرا علم ہے۔ البتہ کانگریس کی مخالفت کے اظہار میں اس سے کام لیا گیا ہے۔ اور حیدرآباد کی نسبت تو میں یقیناً اس کی شہادت دے سکتا ہوں۔ کیا کوئی گمان کر سکتا ہے کہ سر ہمایوں جاہ بہادر، آنریبل سید محمد، آنریبل بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ سیالی، مسٹر قاضی کبیرالدین احمد بیرسٹر، سید شرف الدین بیرسٹر وغیرہم تجار، زمیندار، و افسران پنشن خوار، ایسے لوگ ہیں کہ کسی لالچ، طمع، یا دباؤ سے شریک کانگریس ہوئے ہیں؟ معاذ اللہ! استغفر اللہ! یقولون بافواہہم ما لیس فی قلوبہم،،

از قول سید کردیم توبہ ؎ وز فعل او ہم استغفر اللہ
مارا برندی افسانہ کردند پیران جاہل، شیخان گمراہ

ہماری نسبت بھی بعض ناواقف پنجابی بھائی، اور ممالک مغربی و شمالی کے حضرات یہی گمان کرتے ہیں کہ ہم کسی لالچ یا طمع شہرت کی وجہ سے آج شریک کانگریس ہوئے ہیں۔ مگر ہم نواب محسن الملک بہادر نواب وقار الملک بہادر۔ نواب عماد الملک بہادر، اور مولانا شبلی کو اپنی شہادت و گواہی میں پیش کر سکتے ہیں کہ ہم ابتدا سے اسکے شریک اور ہمدرد اور موافق اور متفق ہیں۔ اور سرسید کی پالیسی کو قوم و ملک کے مضر خیال کرتے رہے ہیں۔ بلکہ ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ سرسید کے اظہار مخالفت کے پیشتر سے ہم اسکے ممد و معاون رہے ہیں۔ جو شخص ڈیلیگیٹوں کی فہرست کو کانگریس کی سالانہ رپورٹوں میں دیکھے گا۔ اور انکی ذاتی حالات و حیثیت سے بھی واقف ہوگا وہ کبھی اس قول کو نظر اعتبار سے نہ دیکھے گا۔ اور ایک لحظہ کے لئے بھی باور نہ کریگا۔ بلکہ بچشم عبرت اسپر نظر ڈالیگا۔

(۷) ایک اور توہم یہ ہے کہ اس ایجیٹیشن سے مسلمان، پٹھان، راجپوت۔ مرہٹہ، اور سکھ آمادہ بغاوت ہو جائینگے۔ اور برٹش گورنمنٹ سے برسر پرخاش و فتنہ و فساد ہونگے یہ بھی ایک لاحاصل، مغویانہ، مفسدانہ خیال ہے۔ البتہ وہ لوگ جو بنائے دولت سلطنت کو عدم مساوات و حریت، عدالت، پر مبنی رکھنا چاہتے ہیں وہ اسکے بانی مبانی اور محرک ہیں اور ہو سکتے ہیں، درحقیقت جو لوگ براہ خوشامد و چاپلوسی، ایسے تنگ و تاریک خیالات کی اشاعت کرتے ہیں

وہ گورنمنٹ و رعایا دونوں کے بدخواہ اور دونوں کے خائن ہیں۔ اور یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ اس حکومت کو روز بروز ضعیف اور بودا کردیں۔ اور سرکار و رعایا کے اتحاد کو مٹائیں، سرکار کے ترحم، اور رعایا کی وفاداری کو صدمہ پہونچائیں۔ اور مخدوش حالت میں ہٹ آئیں۔ مگر وہ لوگ انجام اور مآل کار کو نہیں سوچتے سمجھتے۔ اُنکے ذاتی اغراض، اور اخلاقی کمزوری ان کو اس غور و فکر سے باز رکھتی ہے۔ صاحبو! کیا کوئی خیال کرسکتا ہے کہ پٹھان، راجپوت، سکھ، مرہٹہ، ایسے نادان ہیں کہ اپنے مصالح کو خیرباد کہہ کر اس مہلکہ میں جا پڑینگے۔ کیا وہ اس بات کو بخوبی نہیں جانتے اور دل سے باور نہیں کرتے کہ اُن کو یہ راحت، یہ رفاہیت، یہ آزادی اور ترقی و تعلیم و ترفہ و تمول کے یہ ذرائع و وسائل، جو برٹش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں حاصل و متواصل ہیں۔ نہ کبھی میسر تھے اور نہ ہوسکتے ہیں۔ کیا پٹھان، راجپوت، سکھ، اور مرہٹہ، جسطرح غدر کے قبل، ناواقف و جاہل تھے، آج بھی باوجود اسکے کہ سرکار نے ان کی تربیت و تعلیم پر، اسقدر صرف کیا اور محنت اُٹھائی ہے۔ اور اُن کے مہذب و شائستہ بنانے کی تدابیر کام میں لائی گئی ہیں، اُسی طرح اکھڑ، جاہل، اور بے خبر ہیں؟ اور کیا اُن کے حالات و خیالات میں اب تک کچھ فرق و تبدیلی واقع نہیں ہوئی؟ اور دنیا و مافیہا پر اُن کو کچھ اطلاع بہم نہیں پہونچی؟ کیا وہ اپنی دولت کی خوبیوں سے واقف، اور دوسری دولت کی بُرائیوں اور مظالم سے آگاہ نہیں ہوئے؟ یہ تو گویا درحقیقت سرکار پر ایک بھاری الزام و اعتراض ہے۔ کہ اُس نے باوجود اسقدر مدت تک انتظام ملک اپنے ہاتھ میں رکھنے کے، اپنی رعایا کو اُسی طرح بے خبر و جاہل رکھا ہے، اور اُن کو کچھ تربیت و تعلیم نہیں دی اور اُن کی معلومات و طرز تمدن میں کچھ تبدیلی و ترقی ہونے دی جسکو سرسید نے اپنے ایک سے زیادہ آرٹیکل میں بے پردہ صاف صاف ذکر کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کی تجاویز پر اعتراض کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا ہے۔

تجویز ٹکنیکل ایڈوکیشن کی مخالفت بھی اسی بدگمانی پر گورنمنٹ کی گئی تھی، جسکی مخالفت پر آج پبلک و گورنمنٹ دونوں متفق القول اور متفق الرائے ہیں، بہرحال مخالفین کانگریس کے برخلاف ہم سرکار کو اس الزام سے بری کرتے ہیں اور اُسکے تمام احسانات کو مانتے ہیں

بس تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری سرکار ابد قرار ایسی بیوقوف، ناسمجھ نہیں ہے کہ مخالفین کانگریس کی ایسی ذلیل و رذیل، خوشامد و پالیسی ہے۔ وہ ایسی معزز و سرکار وفادار لائق و فائق، مجمع کانگریس کی طرف سے جو نہایت متدین، صادق، وفادار، اور خیر خواہ، عاقبت اندیش سرکار ہے۔ بدگمان ہو جائے یا اُسکو ضرر پہنچائے، یا اُسکے بیحد قیمتی مشوروں کی قدر و منزلت نہ کرے۔ گو یہ لوگ براہِ جہالت و نادانی، یا اخلاقی کمزوری و بزدلی کے سبب سے ہمارا ساتھ نہ دیں مگر ہم اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو بھی اپنی عالی ظرفی سے [illegible] محروم و بے نصیب نہ رہنے دینگے جو ہماری تجاویز اور درخواستوں پر اب تک [illegible] ہیں یا آئندہ ہونگے اور یقیناً ہونے والے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہ پروا خصوصاً از مادل [illegible] ایشان نمیتواں پرداخت۔ کانگریس اور اُسکے مخالفوں کی مثال اس تتے و تلخ [illegible] مثل شیر اور لومڑی کے ہے۔ اُن کی توفیق و توافق کے لئے بارگاہِ رب العزت میں ہماری یہی دعا رہی ہے، اور رہیگی کہ۔

"رب اھد قومی انھم لا یعلمون"

سرسید کے اختلاف کی وجہ ہمانتک ہم خیال کرتے ہیں یہ تھی کہ اُن کی قوم اُن کے مقاصد کے اہتمام و سرانجام میں اُن کی ممد و معاون نہ تھی۔ بلکہ سراسر مخالفت کرتی تھی۔ اس لئے اُن کو بجز اسکے کہ گورنمنٹ سے تائید لیکر اُنہیں پورا کرتے اور کوئی گزر و چارہ نہ تھا۔ [illegible] کی مخالفت و منافقت، اور نیز نفع حاصل کو خواہ آجائے یا ترجیح دینے کے متعلق، سرسید ایک حد تک معذور رکھے جا سکتے ہیں، مگر اُن کے پیرو اور مقلدین، جو

بدنام کنندۂ نکو نامے چند

کے مصداق ہیں۔ کسیطرح قابلِ استعذار و معافی نہیں خیال کئے جا سکتے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سرسید کے زمانہ کا مقتضی و مصلحت یہی تھی، تب بھی اس امتدادِ زمانہ کی وجہ سے وہ اب کہاں باقی رہ سکتی ہے؟ اختلافِ زمانہ کی وجہ سے جب مسائلِ شرعیہ و احکامِ فقہیہ بدل جاتے ہیں۔ تو سرسید کے قول کی عدم تبدیل کی کیا معنے؟ بڑا زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کمی ہے۔ کیا اب اکیس برس کے بعد بھی وہی

(بقیہ اختلافِ سرسید)

حالت باقی ہے؟ اور کالج کے تین چار سو گریجوایٹ اور دوسری یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتوں کی تعداد نے اس کمی کی تلافی نہیں کی ہے؟ جو لوگ اس بدیہی امر سے انکار کریں اُن کو بجز اسکے کہ یونیورسٹیوں کے کیلنڈروں کے مطالعہ کی ہدایت کیجائے۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور مسٹر گلیڈ اسٹون نے نواب محسن الملک بہادر سے یہی کہا تھا کہ یونیورسٹیوں کے کیلنڈر اسکی تکذیب کرتے ہیں۔ بہر حال نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ مصلحت۔ اور نہ سرسید۔ اب جو چند لکیر کے فقیر اُسی کو رکورانہ تقلید کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کی مثال بعینہٖ اُس طبیب حاذق اور اُسکے تلمیذ نالائق کی سی ہے جسنے قرائن حال سے مریض کے چنے کھانے پر استدلال کیا تھا اور بظاہر نبض دیکھکر کہا تھا کہ درد شکم کی وجہ مریض کا چنے کھانا ہے۔ شاگرد رشید جو ہمراہ اُستاد تھا اُستاد سے اس قاعدہ نباضی کی عدم تعلیم کا گلہ و شکوہ کرکے طالب تعلیم ہوئے اُستاد نے کہا یہ کوئی علمی قاعدہ نہیں ہے صرف تفرس اور محض حدس صائب سے علاقہ رکھتا ہے۔ چونکہ میں نے مریض کے آس پاس چنوں کے چھلکے دیکھے یہ خیال کیا کہ ضرور چنے کھائے ہونگے اور اُنکل سے کہدیا۔ شاگرد نے اسکو قاعدہ کلیہ قرار دے لیا اور اپنے ایک مریض زیر علاج کو جو بوجہ درد شکم نمدے سے سیکا گیا تھا اور اُسکے بستر کے ارد گرد نمدے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ رات کو تو نے نمدہ کھایا ہے اسلئے درد شکم میں اشتداد رہا۔ اب مریض و تیمارہ اور ہر چند حکیم صاحب کو سناتے ہیں کہ حضرت نمدہ بھی کوئی کھاتا ہے اور یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے مگر حکیم صاحب ہیں کہ ایک نہیں مانتے اور اپنے ہی کہے پر اصرار کئے جاتے اور بگڑ بگڑ کر کہے چلے جاتے ہیں کہ ناممکن ہے کہ نمدہ نہ کھایا ہو۔ یہی حال ہے سرسید کے ان مقلدان بے معنی کا مخالفت کانگرس و شرکاء کانگرس میں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خیر! مخالفین کے یہ شبہات و شکوک، اعتراضات و خدشات، تخیلات و توہمات، قرار سر پوچ اور باد ہوا ہیں۔ اور انیاب اغوال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ جیسا کہ ہمنے ثابت کردیا ہے۔ لیکن ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ کانگرس کی خواہشوں اور درخواستوں کی منظوری اور پوری ہونے کی توقع کہاں تک ہے؟ اور اُسکی کوشش ٹھکانے لگ سکتی ہے۔ یا یہ صرف ایک بیہودہ شور و شغب اور ناسودمند کوشش ہے؟ اور کسبات پر اُس کی کامیابی موقوف و منحصر ہے۔

ہر ایک امر میں انسان کی کامیابی، اُسکے استقلال و ہمت، اور مساعی جمیلہ پر منحصر ہے۔

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق ٭ باشد بقدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

ہمت بلند دار کہ مردانِ روزگار ٭ از ہمتِ بلند بجائے رسیدہ اند

"ان اللہ یحب معالی الھمم ویبغض سافلھا"

ذاتی ہمت، استقلال، اور سعی کے علاوہ سرکار و اہلِ ولایت کی توجہ، مہربانی، اور التفات پر ہی کانگریس کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ سو الحمد للہ کہ ممبران کانگریس، اکیس بائیس سال سے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں، اور روز بروز شرکائے کانگریس کے حوصلے اور اُن کی تعداد میں برابر ترقی ہو رہی ہے، اب تک باوجود پوری مخالفت و مزاحمت کے اُن کے ارادوں اور ہمتوں میں کسی قسم کی کاستگی و پستی نہیں واقع ہوئی اور باوجود سخت ترین معارضوں کے پوری مقاومت ہر ایک مزاحمت کے مقابلہ میں کی گئی ہے۔ چنانچہ اب مخالفوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے، اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں، اور تعلیم یافتہ روشن دماغ مسلمانوں کی شرکت، روبہ ترقی ہے۔ اور علیگڈھ کے لیڈر بھی اُسکو دیکھ کر دلگرمگار ہے ہیں۔ کبھی کانفرنس کو اہلِ اسلام کے سیاسی مقاصد کا مرجع کرنا چاہتے ہیں، کبھی جدید مجلس کی اقامت کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، اور کبھی اسی میں شرکت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور سرکار کا التفات بھی اس پر یوماً فیوماً زیادہ ہو رہا ہے، اور ولایت کے لوگ بھی مائل و متوجہ ہو چلے ہیں۔ مسٹر ڈبلیو سی بنرجی۔ نوروزجی، اور آنریبل مسٹر گوکھلے کی لگاتار کوششیں اور پیہم اسفارِ ولایت اور پرزور تقریروں نے لنڈن کی پبلک اور سرکاری حلقوں میں اور باآخر لوگوں میں بہت کچھ اثر پیدا کر دیا، اور ہلچل ڈالدی ہے، اور لندن کے معتبر اخبارات بھی ہم صفیر ہو گئے ہیں، جنکا بہت بڑا اثر پبلک اور سرکار کے خیالات و انتظامات پر پڑتا ہے۔ اور بہت سے معزز نامور انگریز و ممبران پارلیمنٹ آمادۂ تائید و مساعدت ہو گئے ہیں، جیسے مسٹر خواجہ سر ولیم وڈربرن، سر ہنری کاٹن، سر چارلس ٹرنر وغیرہم، اور گورنران مدراس و بمبئی، اور گورنر جنرلانِ ہند، اس سے بمراعات و تواضع پیش آئے ہیں اور ولایت میں بھی کانگریس کے اغراض سے اتفاق و ہمدردی روز افزوں ہو رہی ہے۔ خصوصاً مسٹر مارلے وزیر اعظم حال کی اسپیچ نے کانگریس کے مقاصد و اغراض میں جان ڈالدی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، لوگ کانگریس کی تمناؤں اور آرزوؤں سے کیوں وحشت زدہ ہیں

کہا جاتا ہے کہ ہمدردی کی زیادہ ضرورت ہے، اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف زبانی جمع خرچ تک کفایت کی جائے۔ بلکہ اسکے معنی ایک مردانہ خواہش کے ہیں۔ جس سے اُن لوگوں کی طبائع اور خیالات سمجھنے کی کوشش کیجائے۔ جن کے اوپر حکومت کرنے کا ہم کو حق دیا گیا ہے۔ . . .

میں خوش ہوں کہ گورنمنٹ ہند، برٹش انسٹی ٹیوشن رائج کرنے کی دل سے کوشش کر رہی ہے۔ مگر عجلت کی اُسکو ضرورت نہیں . . . . . تجربہ کار اور ہوشیار ہندوستانیوں کو اعلیٰ ترین عہدے جو انگریزوں کو دئے جاتے ہیں، دینے کے واسطے کارروائی کرنی چاہیئے"۔

ان سب امور سے یہی گمان ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن کانگریس ضرور کامیاب ہوگی اور یہ مخالفتیں کچھ پیش رفت نہ جائینگی۔ بہر حال کسی قوم کو، گو وہ حکومت کے ہم ملک، وہم مذہب، وہم ملت، وہم زبان، ہی کیوں نہو، بدوں جد وجہد کے حقوق ملکی نہیں ملے تو ہم کو بااین ہمہ فقدان اسباب، وبااین آرائے اصحاب، کیونکر اور کسطرح اسقدر جلد حقوق ملکی واختیارات انتظامی ملجائینگے؟ ہمکو نہایت صبر، تحمل، بردباری، استقلال، ہمت، اور جرأت، سے کام لینا چاہیئے اور اپنے ارادوں میں بہت ثابت قدم وراسخ دم رہنا ضرور ہے، ہم کبھی نہ کبھی کامیاب ہوجائینگے ورنہ چپ چاپ ہات پر ہات رکھکر بیٹھ رہنے سے تو عالم اسباب میں کوئی کام نہ بنا ہے نہ بنیگا من جد وجد۔ من لج ولج۔

آخر میں تمام مسلمانوں سے میری وصیت، والتماس، والتجا، واستدعا، یہ ہے کہ:۔

"یا ایہا الذین آمنوا۔ ادخلوا فی السلم کافہ ولا تتبعوا خطوات الشیطان۔ انہ لکم عدو مبین ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔ کونوا عباد اللہ اخوانا۔ ولا تفرقوا۔ اصبحوا بنعمۃ اخوانا۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم"۔

اور ارکان کانگریس سے یہ ہے کہ جسطرح وہ آجتک ثابت قدم وراسخ دم رہکر داعی وساعی خیر رہے ہیں۔ بدستور رہیں۔ اور تمام مخالفتوں کا باستقلال تمام۔ مقابلہ ومقاومت کریں۔ بھائیو! جبتک اپنے حقوق کے حاصل کرنے میں بذل نفس رجال، اور نفیس مال نہ کرو ہرگز کامیابی کی توقع نہ رکھو۔ گو تمہارے سامنے پہاڑ حائل ہوں۔ لیکن ہم الرجال تقلع الجبال

وانی ختمت ہذہ الرسالۃ بحمد اللہ المتعال ومن اللہ الاستعانۃ وعلیہ الاتکال وہو الموفق

الی الھدایت من الضلال ولنعم ما قال - ؎

تا نپاشی تہم طاعت، دغلی کیش	برنگیری، رنج بیں، گنج بیاب
چشمۂ حیواں بتاریکی درست	لولو اندر بحر و گنج اندر خراب
ہر کہ دائم حلقہ بر در، می زند	ناگہش روزے بیاشد فتح باب

رفت باید تا بکام دل رسید
شب نشستن تا برآید آفتاب

تتمہ

تقطیع ۲۰×۳۶ حجم ۵۲ صفحے **اردوی معلی عالی گڑھ** کاغذ آبوری نفیس کمالی چھپائی بیشتر
یعنی میم اور نفیس اردو کا ایک نادر دیدہ ہوا رسالہ

جسکے ساتھ

ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین میں سے کسی دیوان مع دیباچہ و مقدمہ دیوان غالب

بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں

چنانچہ دو سال میں دیوان حسرت رپورٹ بمبئی کانگریس دیوان سوز - دیوان قائم اور دیوان شیفتہ نذر ہو چکے
مقاصد ضروری منجملہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالیٹکس

قیمت لائف ممبری سرت رسالہ
(۱) رسالہ مع دواوین اول درجے کے کاغذ پر .... للعہ رسالہ مع محصول
(۲) " " دوم درجے کے کاغذ پر " " "

دنیا ہم کیا کہتے ہیں

[illegible] ۱۹۰۸ء کا ہوا رسالہ ہندی تقلید کے [illegible] ہے
بہ نہایت [illegible] سے جاری ہوا ہے جو بالکل دلچسپ رسالہ
بات کے ڈیٹنگ پر ہے۔ ہندوستان کے نامی اور مشہور اہل
قلم اصحاب کے سلسلہ مضامین کے علاوہ اور بھی کئی ایڈیٹری

ایک تجربہ کار اخبار نویس کے ہاتھ میں ہے

ہر مہینہ خصوصاً ملکی۔ اسلامی۔ تمدنی جیسے ضروری معاملات
پر آزادی مگر کمال متانت کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔
کہ انکے ایک درجن تصاویر اور کئی دلچسپ کارٹون ماہوار
درج ہوتے ہیں۔ علاوہ اسکے انگریزی رسالہ جات اور
صحائف کے ترجمے مہینوں سے اپنی جدت سے۔

یورپ بھر میں دھوم مچا رکھی ہے

ہر مہینہ درج ہوتے ہیں۔ ایک باتصویر تاریخ کا سلسلہ جاری ہے
دنیا کے مشہور لوگوں کی باتصویر سوانح [illegible] درج ہوتی
ہیں۔ غرضیکہ بلحاظ لکھائی چھپائی وغیرہ [illegible] دیدہ۔

ایک ہزار صفحہ کی انعامی [illegible] ساتھ

رسالہ کی سالانہ قیمت [illegible] صرف رسالہ کی قیمت [illegible] ہزار کے
ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔ درخواست [illegible] منیجر
اعزیز مطبع عزیزی آگرہ ہونا چاہیئے۔

اردوی معلی جلد پنجم

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۶ء مع رپورٹ کمیٹی کانگریس
قیمت عاریہ مصول۔ دفتر اردوی معلی علیگڈھ سے طلب کرو

اردوی معلی جلد ششم مکمل

از جنوری ۱۹۰۷ء تا جون ۱۹۰۸ء قسم دوم قیمت مرکب عہ
(منیجر اردوی معلی علیگڈھ) مع محصول ڈاک

شرح اجرت اشتہار اردوی معلی

	صفحہ یا ۲ کالم	نصف صفحہ یا ۱ کالم	نصف کالم
سالانہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ششماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سہ ماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک بار	[illegible]	[illegible]	فی سطر ۲

دی رہلس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے
کہ فی الحال بھاگلپور کے چند زمیندار روسا نے مندرجہ بالا نام
کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہر چیز میں کہ صرف بالذات ہی
اس سے مستفید نہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت
ہو کر رہے۔ مثلاً اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز
کے سستے پائدار نفیس دیسی ٹسری کپڑے از قسم لنگی چادرہ
دھوتی و صافہ و رومال دستی و سوتی لنگا و ساڑیاں ہر قسم
ہر رنگ کے تان ہر قسم و ہر رنگ کا دھوپ چھاں و سادہ و
چک دوز و زیادہ بافتہ وغیرہ لائق تیاری شیروانی اچکن و
پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون و ہندوستان ہر جگہ
بآسانی بھیجائے جاتے ہیں نفاست و پائداری میں خاص
بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر
خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت
نہیں رہی۔ فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت
جلد مناسب قیمت پر تیار کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرات پیشگی کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی
ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں
فرمائشیں ذیل کے پتے سے آنی چاہئیں۔ المشتہر
ڈاکٹر [illegible] حسین سکرٹری رہلس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور علاقہ
[illegible]

الرفیق

یہ اردو کا ماہوار رسالہ ملک کے مشہور مضمون نگار
مولوی عبدالسلام صاحب صاحبقی کے زیر ایڈیٹری
رنگوں سے شائع ہوتا ہے۔ بڑی تقطیع کے چار سو
صفحے سالانہ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجے کی۔
عموماً مضامین نگاروں کو ایک اشرفی سے لیکر سو روپیہ
تک انعام دیا جاتا ہے۔ قیمت سالانہ صرف عہ روپیہ
مع محصول ڈاک جو لاگت سے بھی کم ہے۔ نمونہ کے
لئے ۲ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ اشتہارات کا نصف بذریعہ
خط ہو سکتا ہے۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام
منیجر ہونی چاہیئے۔

شاہد حسن۔ ایم۔ منیجر

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک ۱۵

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور بیتیس چیزیں مفت

ناظرین کو تعجب خیال ہوگا کہ ہمی ریلوی ایشن کی جیبی گھڑی کسیوقت میں دوسرے سوداگر سات روپیہ کو بیچا کرتے ہیں لیکن ہم نے وساوسی جالان خود منگا اور قیمت ہمنے گھٹادی تب اور سوداگر حسد سے بھوکر کہنے لگے مگر کیا تو کیا ہمنے اب اسکے ہمراہ بیتیس چیزیں مفت دینا کردیں یہ گھڑی ۴ برس تک کی کوک اصلی ڈال سکتا ہے اک خانہ ریلوی اور تار گھر کے لئے موزوں ہے۔

[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ جوتے

[illegible]

قسم کے زین

[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے ساز

[illegible]

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک ۱۵

تمیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں اور میڈیکل کالج کے پروفیسروں اور نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کے یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں [illegible] بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سنسنی اور اعضاء [illegible] کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت و تاریکی چشم (ہند جالا) نزول [illegible] سیل سرخی ابتدائی موتیا نافخہ۔ پانی آنا خارش وغیرہ [illegible] استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی [illegible] لیکر بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ [illegible] کے لئے کافی ہے بلغ دو روپیہ تمیرہ کا سفید یا علی قسم فی تولہ [illegible] ہے خالص تمیرہ فی ماشہ چھ روپیہ مصری سرمہ فی تولہ [illegible] محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر

[illegible] اہلو والیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب

[illegible] کیا شہادت ہوتی ہے

(۱) [illegible] تمیرے کا شربت کہ صرف [illegible] صاحب نے خود بنایا [illegible] اور بہت سے مریضوں پر استعمال کرکے دیکھا ہے اور [illegible] کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ [illegible] تمیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھ [illegible] کے واسطے اکسیر [illegible] میں نے اپنی تجربہ میں آج تک کوئی سرمہ اس سے زیادہ [illegible] دیکھا ہے۔ اس کو جن کی آنکھوں میں ذرا سی بھی کسی قسم کی [illegible] ہے ہر روز اس کو استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح پر مضر اور فائدہ [illegible] ثابت ہوگا پانی آنا۔ دھند۔ خارش۔ سرخی چشم کے واسطے انگریزی [illegible] زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ اور سچ آپ نے اس سرمہ سے [illegible] سرمہ ایجاد کرکے ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے اسکا [illegible] میں ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ آپکے سرمہ سے [illegible] ہوکر فائدہ ہو جائے اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔

راقم

پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور نواب صاحب بہادر بھوپال

رجسٹرڈ نمبر (۲۵۱)

اردوئے معلی

(علی گڑھ)

نمبر ۹ | بابت ماہ نومبر ۱۹۰۶ء | جلد ۷

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے

فہرست مضامین

(۱) غزل لکھنوی ... صفحہ ۱
(۲) مکتوبات اسیر مالٹا ... ۳
(۳) بیانِ حسرت ... ۴
(۴) تذکرہ گلشن از عبدالحق بیتابی اندوری
(۵) حصہ نظم (۱) غزلیات حسرت (۲) غزل لکھنوی ... ۲۰
(۶) فیشنل بوٹانیکل (رسالہ) از ملا عبدالقیوم مرحوم حیدرآبادی (حصہ ۱ ... صفحہ ۱)

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلی علی گڑھ

المطابع واقع علی گڑھ میں طبع ہوا

قسم اول مع دو دوین ... للعہ رسالانہ مع محصول
قسم دوم (معمولی سفید کاغذ) عہ ایضاً

اُردوی معلے

یعنی صحیح اور فصیح اردو کا ایک قابل دید ماہوار رسالہ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۵۲ صفحے کاغذ آبوری نقش لکھائی چھپائی بنایت پسندیدہ

جسکے ساتھ

ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین میں سے کئی دیوان مع دیباچہ و مقدمہ

بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں

چنانچہ دو سال میں دیوان حسرت - رپورٹ بمبئی کانگرس - دیوان سوز - دیوان قائم اور دیوان شیفتہ نذر ہو چکے ہیں

مقاصد ضروری منجملہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالیٹکس

قیمت سالانہ
(۱) رسالہ مع دواوین اول درجے کے کاغذ پر ... ... للعہ سالانہ مع محصول
(۲) صرف رسالہ " " " " " " نمونہ قسم اول ۰۲ر
(۳) " دوم درجے کے کاغذ پر " " " " مفت بلا قیمت

درخواست خریداری بنام سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اردوی معلے

---

(۱) **دیوان غالب** (طبع ثانی)

مع شرح دیوان

تقطیع ۲۰×۲۶ حجم تقریباً ۱۴ جزو - کاغذ معمولی سفید صرف عہ مع محصول ڈاک و خرچ ویلو میں منجر اردوی معلے سے ملکتا ہے۔

فہرست مضامین :- (۱) دیباچہ (۲) مقدمہ (الف) غالب کے حالات (ب) غالب کی شاعری (۳) دیوان مع شرح (۴) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

نوٹ - طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کر دیگئی ہے۔ اور مطالب اشعار میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ مفید ترمیم بھی کر دیگئی ہے۔

(۱) دیوان مصحفی | ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم تقطیع ۱۸×۲۲ حجم ۱۰ جزو قیمت ۸ر مع محصول۔

(۲) دیوان شیفتہ | مع مقدمہ مفید و ضمیمہ شامل غزلیات فارسی شیفتہ تقطیع ۱۹×۲۲ حجم ۶ جزو قیمت ۸ مع محصول

(۴) دیوان حسرت | آثار و جرات مع مقدمہ مرتبہ حسرت ۴ر

(۵) دیوان پیر سوز | استاد مشہور مع مقدمہ " ۳ر

(۶) دیوان قائم - | چاند پوری شاگرد سعید سودا " ۴ر

۷ - رپورٹ اردو بمبئی کانگرس ۳ مکمل مرتبہ " ۸ر

۸ - اردوی معلے جلد پنجم قسم اول از جولائی تا دسمبر ۱۸ء عہ

۹ " " جلد ششم قسم دوم از جنوری تا جون ۱۸ء عہ

۱۰ - انوار العیون ملفوظات مخدوم احمد عبد الحق ردولوی ۸ر

اخبار الکیمیا مالیر کوٹلہ

اس نام کا ایک طبی اور کیمیائی مضامین کا دلچسپ اخبار جس میں علم کیمیا مشرقی اور مغربی کے متعلق محققانہ بحث ہو چکے علاوہ ہندوستان کے مسلم و مستند حکماء و اطبا کے مضامین و مراسلات بھی درج ہوتے ہیں اور جسکا کام مایوس مریضوں کو مفت مشورہ دینے اور ہر ایک قسم کے طبی و علمی سوالات کا جواب دینے کے علاوہ کیمیا کے وہ سربستہ و مخفی رازوں کا اظہار کرتا ہے کہ جنکا انکشاف انکے جاننے والے برسوں گذرتا ہے اور بڑے بڑے علماء و حکماء نے دے ایک معزز اور قابل قدر اخبار مانا ہے۔ نمونہ مفت منگوا کر ملاحظہ فرماویں۔ قیمت سالانہ عا۔ درخواست بھیجنے کا پتہ۔

دوست محمد خاں اڈیٹر اخبار الکیمیا مالیر کوٹلہ

رسالہ الاخلاق آگرہ

ہندو مسلمانوں کو متحد بنانیوالا ہندوستانیوں میں اصلی تہذیب اخلاق پھیلانے والا - اتفاق و اتحاد کا حامی تعصب و نفاق کا دشمن - غرضکہ جل ہند کو ایک قوم بنانے والا آگرہ کا باتصویر ماہوار رسالہ ۱۸×۲۲ کی تقطیع کے ڈیڑھ جزو پر تین سال سے ہر مہینے کی ۲۰ تاریخ کو نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ کاغذ دوسری درجہ اول ہر ماہ کسی نہ کسی مشہور شخص کی تصویر بھی شائع ہوتی ہے قیمت سالانہ بہت کم عوام کو عہ طلباء کو عہ بشرط تصدیق عہ ممالک غیر سے عہ مع محصول ڈاک مقرر ہے۔ نمونہ کے لئے ۱ر کا ٹکٹ آنا ضروری ہے بلا ٹکٹ کوئی صاحب نمونہ نہ فرمائیں المشتہر

منیجر رسالہ "الاخلاق" آگرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم آغا حسن ازل لکھنوی

(از ۱۲۲۴ تا ۱۳۱۴ھ)

نام و خاندان | میرزا آغا حسن نام ازل تخلص خلف میرزا عباس لکھنوی نواب مرزا شوق صاحب زہر عشق کے داماد اور صبا کے شاگرد تھے استاد کے حکم سے کبھی کبھی خواجہ آتش کو بھی اپنا کلام دکھاتے تھے۔

لیاقت و مشاغل | حضرت ازل کا زمانہ طالب علمی و شباب لکھنؤ میں بسر ہوا تھا۔ فارغ التحصیل نہ تھے تاہم عربیت اچھی تھی اور تجربہ کار خاندانی طبیب تھے چنانچہ آخر میں تخمیناً تیس سال عظیم آباد و بہار میں باوقات مختلف بشغل طبابت قیام رہا اور وہیں سے بیمار ہو کر لکھنؤ گئے اور اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

وضع و خصائل | خوشرو، وضعدار۔ لکھنؤ کی قدیم وضع، دو پلی ٹوپی، چنا ہوا انگرکھا، گیتا جوتا، بالوں میں خضاب نہایت منکسر مزاج اور اول درجے کے خلیق تھے۔ کبھی تنہا رہنا پسند نہ کرتے تھے اور ہر وقت چائے حقہ پان کا دور اور دس بیس لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شیعہ مذہب تھے لیکن قیام بہار کے زمانے میں کسی مصلحت سے بظاہر تبدیل مذہب کر کے سنی ہو گئے تھے اور حضرت شاہ امین احمد فردوس مرحوم کے ہاتھ پر، جو اسوقت حضرت مخدوم بہاری کے سجادہ نشین تھے، بیعت بھی کر لی تھی مگر آخر وقت میں اپنی تقیہ و مذہب امامیہ کا اعلان کر کے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

تصانیف | آپکا دیوان ضیائے تمنا عرف پرکالۂ آتش ۷۳ صفحوں میں چھپکر شرف پریس بہار سے شائع ہوا۔ ایک قومی مسدس عظیم آباد میں چھپا اور ایک مثنوی سحر عشق نام مرحوم کے نواسوں یعنی حکیم واجد حسین نظر اور مہدی حسن احسن کے اہتمام سے لکھنؤ میں چھپی۔ یہ مثنوی زہر عشق کے طرز پر لکھی گئی ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

کلام کی بربادی | جسطرح مصحفی کی حکایتیں مشہور ہیں، مرحوم کی بھی غزلیں فروخت ہوا کرتی تھیں اور جب بعض شاگرد اس بے پروائی پر اعتراض اور ترتیب دیوان پر اصرار کرتے تھے تو آپ کہتے تھے کہ "بھائی مجھے روپے ملتے ہیں۔ شعر ہر وقت کہتا ہوں۔ دیوان مرتب کرنا اختیار میں ہے۔ روپے تو نہیں ڈھال سکتا" آخر عمر میں آپکے ایک شاگرد رشید نے قسم لی کہ جو غزل داخل دیوان ہو جائے پھر کسیکو نہ دیجائے اور اسطور پر بڑی محنت سے ایک ضخیم کلیات مرتب ہوا اور چھپنے کیلئے مطبع بھیجا گیا لیکن

افسوس کہ حیات نے وفا نہ کی۔ مرحوم نے لکھنؤ جاکر سفر آخرت اختیار کیا اور ادھر یاروں کو موقع ملا اور چوری سے یا بزرگوں کا تبرک سمجھکر آپکا کلام تقسیم کرلیا۔ جس مختصر دیوان کا ذکر ہے اس مضمون میں کیا ہے وہ اُسی کلیات کے بعض ابتر اجزا سے مرتب کیا گیا اور آپکے بعد شائع ہوا۔ اس دیوان کی زیادہ اشاعت نہوئی اور ہوتی کیونکر۔ اچھا کلام تو ضائع ہوگیا اور معمولی کلام نے دیوان میں جگہ پائی اور حضرت ازل کو "اپنی جگہ سے بہت نیچے دکھایا"

ازل کی شاعری | سادگی اور صفائی حضرت ازل کی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ اور یہ وہ مسلک ہی جسے عہد آخر کے بعض شاعروں نے اسقدر پسند کیا اور کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ترکیب فارسی سے کلام پاک ہونا اردو شاعری کا خاص حسن سمجھا جاتا ہی۔ ملاحظہ ہو۔

غیر کی آنکھوں میں جب سرمہ لگایا جائیگا
ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں ہمسے دیکھا جائیگا

میں تو جاؤں کوچۂ دلدار میں آنکھوں کے بل
ضعف کہتا ہے کہ بیٹھو بھی نہ جایا جائیگا

کیا گھٹا چھائی ہوئی ہے میکدے پر آج کل
ہو خفا زاہد بلا سے اب تو بندا جائیگا

دل دیا ہی آپنے اک بت کو سنتے ہیں ازل
یہ تو کہیے نماز بھی اسکا اٹھایا جائیگا

کیوں شب وصل میں آتی نہیں گھنگھور گھٹا
چھپتی پھرتی ہے پہاڑوں میں کہاں چور گھٹا

کعبۂ دل میں بتوں کو نہ ازل جا دینا
راہ پر بھی جو یہ آئیں تو نہ رستا دینا

آئینہ لیکے ذرا چاند سی صورت دیکھو
ایسی آنکھوں میں تو اندھیر ہے سرما دینا

اب ملا ہے مجھے محبوب وہ نایاب حضور
آپ کیا حضرت یوسف کو بھی آداب حضور

پیجیے پیجیے برسات میں توبہ کیسی
کیا گھٹا آئی ہی منگواؤں مے ناب حضور

لائیے گور غریباں پہ نہ غیروں کو مدام
سوتے سوتے کہیں مردے ہوں بدخواب حضور

پیر ہوں میں نہ دستگیر ہوں میں
خانہ بردوش اک فقیر ہوں میں

حال گلشن نہ پوچھ اے بلبل
ایک مدت ہوئی اسیر ہوں میں

منہ ازل عشق سے موڑو تو سہی
ہوگی راحت اسے چھوڑو تو سہی

یہ نہیں ہیں کہ نہیں کچھ کہتے
دل کسی اور کا توڑو تو سہی

پھر تمہارا میں وہی عاشق ہوں	ساتھ تم غیر کا چھوڑو تو سہی
کہتے ہیں وہ نہ انگوٹھی دونگا	اب مرا ہاتھ مروڑو تو سہی
ہنس پڑینگے وہ ازل سوتے ہیں	گدگداؤ تو جھنجھوڑو تو سہی
تجھکو ظالم مری پروا ہی نہیں	اسلئے دل تجھے دیتا ہی نہیں
اور سے بھی تو رہے راز و نیاز	ایک عاشق ترا بندا ہی نہیں
زیر خنجر تجھے کیونکر دیکھوں	ہاتھ قاتل ترا رکتا ہی نہیں
شب فرقت میں خدا خیر کرے	دل سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں
یونہی رہتی تھی دریار پہ بھیڑ	آج سنتے ہیں کہ رستا ہی نہیں
قبر سے آتی صدائے لبیک	تمنے تربت پہ پکارا ہی نہیں
کسطرح وصل کو اس سے میں کہوں	بات مطلب کی تو سنتا ہی نہیں

اس زمین میں حضرت ازل کا ۲۰ شعر کا ایک غزل ہے جسکے مندرجہ بالا سات منتخب اشعار کو مشتری طوائف معروف لکھنوی نے آخر شعر میں مشتری تخلص ڈالکر اپنا کر لیا اور پٹنے ہی کے ایک گلدستے (مانند عثمان) میں چھپنے کے لئے بھیجدیا۔ طرفہ تر یہ کہ جب مشتری کے استاد آغا علی شمس مالک گلدستہ سے شکایت کی تو انہوں نے بجائے اپنی شاگردہ کیطرف سے توارد کا عجیب و غریب عذر پیش کیا اور مدت تک اخباروں میں بحث جاری رہی آخر کار شمس نے معافی مانگی اور حضرت داغ کی سفارش کے خطوط آئے۔ حضرت ازل فیاض تو تھے ہی کہنے لگے "چھوڑو بھی ان اشعار کو" دیوان سے لیکن صفیر بلگرامی شاغل دہلوی فریاد عظیم آبادی فسون دہلوی۔ وحید الہ آبادی وغیرہ نے یہ امر سے اختلاف کیا ترتیب دیوان کیوقت بھی سید شاہ مدد الرحمن حفیظ عظیم آبادی شاگرد رشید حضرت ازل اور مہدی حسن احسن سلمہ اللہ تعالیٰ کے اصرار سے یہ اشعار دیوان میں قائم رکھے گئے۔ فقط

مکتوبات امیر مینائی - (حضرت کوثر خیر آبادی کے نام)

گرامی گوہرا - امروز نسخۂ زحمت دست داد تا نظر بریں گہر ریزہ ہا افگندم و دریں نظر ہر چہ از دلم بزبان آمد بقلم سپردم ہجوم کار و مکروہات رخصت نوشتن وجوہ محو و اثبات نمیدہد و نیز بر استعداد و سلامت و رسائی ذہن سامی اعتماد ہاست البتہ جائیکہ فکر کار نکند و خلجانے بماند

بازش باید پرسید حق تعالیٰ در عمر و جمعیت خاطر گرامی بیفزاید - امیر فقیر عفی عنہ - یکم فروری ۱۸۸۳ء
(۲) جناب سامی کو شرسلامت - کل محبت نامہ آیا ممنوں کیا جو شبہات آپ نے لکھے ہیں انہیں
سے بعض تو میں رفع کئے دیتا ہوں اور بعض اسپر موقوف ہیں کہ پورا شعر اپنا اور اصلاح
میری لکھئے واضح ہو کہ "کہاں ہے پہرتے اودہار ہم بھی ہیں" محاورہ فصحا کا نہیں ہے اور
بندش بھی تعقید سے خالی نہیں کہاں ہے پہرتے اِدہر اور ہیں اُدہر اور بیچ میں اُدہار ہم بھی
خوشنما نہیں صحیح ہونے میں شک نہیں - چاہو رہنے دو - "سیہ بختی میں عدیم المثل" سیہ
بختی میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہئے ترکیب فارسی ہے اگرچہ بعض اساتذہ اُردو کے کلام
میں سند ملتی ہے مگر کیا ضرور ہے - نباشد جز بتو اے شوخ عیار - اسمیں اگر جز بتو پسند نہیں
تو غیر تو رکھئے کچھ مضائقہ نہیں - منشی ریاض احمد صاحب کا دیوان جسقدر مجھے پہنچا تھا اُتار لیا
مگر لیا مابقی ابھی آیا نہیں بلکہ سوا مہینے سے کوئی خط ہی نہیں آیا - اخبار ادیب ہندوستان کے
اپنے ہونے میں شک نہیں مگر بغیر جمع ہوئے درخواستوں کی محض اس امید پر کہ اشاعت کے
بعد رونق ہوگی، جرات نہیں پڑتی ایک بار بہت نقصان اُٹھا چکا ہوں - سب احباب کو مادب -
جناب برادر صاحب قبلہ سلام و شوق اور استادی منشی صاحب قبلہ بہ سلام و دعا فرماتے ہیں - امیر فقیر

بیاض حسرت

(ماخوذ از تذکرہ مصحفی) شیخ ولی اللہ محب شاہجہاں آبادی (شعر را بمتانت و پختگی تمام میگفت)

اسی ذبح کرنے دیجو تو نہ منہ سی آہ کیجو
جو یہ رسم عاشقی ہی تو محب نباہ کیجو
یہ امید وار کبتک جیئے اتنی آرزو میں
کبھی مڑکے اسطرف بھی تو ذرا نگاہ کیجو

ظہور اللہ خاں نواب دانوی - از حضور جہاندار شاہ خطاب خوش فکر خانی یافتہ فقیر را عمو گوید (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

اب اشک تو کہاں ہے جو جاہوں ٹپک پڑے
آنکھوں سے وقت گریہ مگر خوں ٹپک پڑے

محمد امان نثار شاگرد شاہ حاتم (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

خنجر نہ کمر میں نہ وہ تلوار رکھی ہے
نظروں ہی میں چاہے ہی جسے مار رکھی ہے

نواب محبت خاں محبت (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

تجھکو چھوڑا اے بت مغرور نہیں جانیکا
نقط
جاؤں تو پر مجھے مقدور نہیں جانیکا

گلشن ہند

مقدمہ و ریویو

یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر تذکرہ ہے اور نایاب ہے جسکا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں اور ایک انڈیا آفس کی لائبریری میں ہے اور ہندوستان بھر میں ایک یہی نسخہ ہے جو اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں خود بے بضاعت تاہم اس فرمائش کو جو انہوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد اور امیر الممالک لارڈ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے زمانہ میں علی ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند فارسی میں لکھا تھا۔ اور اسکا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں سنہ ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کی بڑی قدردان اور محسن مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا انہوں نے مولف تذکرہ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اسکا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ انکا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور ان میں اردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اسطرح یہ کتاب اردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اسمیں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ حالات میں بھی اور کلام میں بھی جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے۔

یہ تالیف اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دلی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علیخان رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بیکسی کی حالت میں تھے اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلی کے اہل کمال اپنے وطن سے منہ موڑ اسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے جب سے

حلہ مولوی عبداللہ غالب صاحب۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو انہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علیخاں جیسا عالی دماغ متین منتظم اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اسکے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار پھکڑ بازیاں ایک پھکڑ تھا آخر انہیں اپنے گوں نہ دیکھا کہہ ہی دیا۔

میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہی مقطع تیرا میرا پیل نہیں

کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک۔ لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جسکے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی عروج تو اسلئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی اور صاف و شستہ ہوتی جاتی تھی اور زوال اس خیال سے کہ فن شاعری میں صرف فارسی اہل کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص اسکے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے شاعری بس اسیکا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہو۔ قافیہ کو اپنی طرح نبھا دیا ایک آدھ محاورہ آگیا کسی نئی یا استکلاخ زمین میں غزل کہدی۔ کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارہ کا استعمال ہو گیا۔ رہا مضمون سو خدا کے فضل سے اسمیں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقرر ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے کیونکہ ہمارے نکتہ سنج شعراء اسکے لئے سند طلب کرتے ہیں جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اسمیں شک نہیں کہ یوں شعرا کی محنت سے زبان صاف ہو گئی لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھہر کے رہ گئی اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اسکے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکے۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعوے ہے اردو کے استاد ہیں مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں۔ دیوان اردو ہے مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں۔ کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے مکتبوں میں تعلیم فارسی۔ یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر کہے جاتے ہیں تو فارسی۔ اب اردو کی وسعت ہو تو کیونکر ہو۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جسکا تسلط اسوقت ہندوستان پر اسطرح بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔ اس نے اردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی۔ جان جہاں اسوقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے اسیکا دور دورہ تھا علاوہ اسکے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لئے انہوں نے اسکی سرپرستی کی۔ انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے۔ جس نے اسکا ایک محکمہ قائم کیا جسکا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں انکی تعلیم کے لئے اردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالباً یہ اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کے کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی اور دوسرے دور میں اردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اسوقت کے قابل قابل لوگ بہم پہونچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اسیوقت سے شروع ہوا اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا اس سے زیادہ نہیں تو اسیقدر احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔

چونکہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا۔ لہذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اسکی نگرانی میں یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا اور اردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا نامناسب نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۱ء میں توتا کہانی لکھی جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانہ میں دکھنی زبان میں لکھا تھا۔ مگر ماخذ اسکا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرائش محفل یعنی مشہور قصہ حاتم بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے

انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا وہ خلیق مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے جسکا نام گلزار دانش ہے ایک اور کتاب تاریخ بادری اردو میں لکھی یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اردو نثر میں لکھا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے اور ایک اور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۰ء میں لکھی گئیں۔

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ درانی کے زمانہ میں جو دلی پر آفت آئی تو وطن کو چھوڑ کر پٹنہ آرہے یہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اسکا اعلیٰ نمونہ ہے اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی لکھنؤ اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام نوطرز مرصع رکھا تھا میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانہ میں لکھی حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا اور خرد افروز اسکا نام رکھا اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور عربی میں کلیلہ ودمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی اس سلسلہ میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر انکے بیٹے میر نوازش علیخاں کے ہاں ملازم رہے اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیاں میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے مگر جب شاہزادہ عالم کا کوچ شاہجہاں آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے تلمذ ان کو میر حیدر علی حیراں سے ہے اور بعض کا قول

ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد بھی ہیں۔ اتنے میں صاحب عالیشان بارلو صاحب نے گورنر گورنمنٹ کے مشورے سے زبان دانان ریختہ لکھنؤ سے طلب فرمائے چنانچہ رزیڈنٹ لکھنؤ مسٹر انگلاس نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کرکے پانسو روپیہ سفر خرچ دیا اور کلکتہ روانہ کیا سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے ایک قابل قدر کتاب آرائش محفل لکھی جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے۔ اور مرنے سے سال بھر پہلے (یعنی سنہ ۱۸۰۹ء) سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے اردو زبان میں کیا۔

سدا سکھ چند نے سنہ ۱۸۰۴ء میں مثنوی گل بکاؤلی کو اردو نثر میں لکھا اور نام اسکا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج آئے انہوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اردو میں لکھا۔ نواز کیشور نے جو برج بھاکا میں (سنہ ۱۷۶۱ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی اسکا یہ ترجمہ ہے انہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی کہا ہے اور اسمیں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے جسکا نام بسنت رسنت ہے اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں اخوان الصفا کے ایک رسالہ کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا۔ جسمیں شاہ اجنہ کے سامنے انسان وحیوان کا جھگڑا پیش ہے۔ کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے

سری لال گجرات کا برہمن تھا جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر و راج نیتی و لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں سنگھاسن بتیسی سری لال اور جوان نے ملکر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی جو آدھی اردو اور آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے اور نیز ولا کے مدد سے قصہ مادھو نال کو برج بھاکا سے اردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اسکے خود گلکرسٹ نے (۱۷۹۸ء میں) اردو کی لغت لکھی۔ زبان کے بعض قواعد لکھے اور مختلف طرح سے اردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول ہی ایک شخص فرگس نامی نے اردو کی ایک لغت لکھی تھی جو ہندی میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی جنرل ولیم کرک پیٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا۔ جسکے انہوں نے تین حصے کئے۔ مگر اسکا ایک ہی حصہ طبع ہو پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنیکے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظام تھا وہ جلد تیار نہو سکا اور کتاب ناقص رہ گئی۔

یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ بھی اسیکام میں لگے ہوئے ہیں۔ تو پہلے دونوں ملکر اسے انجام دیں مگر چونکہ انہیں بہت سے کام کرنے تھے اسلئے تھوڑے دنوں بعد وہ الگ ہوئے اور ڈاکٹر گلکرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ "انگریزی ہندوستانی" لغت کا تیار کرکے ۱۷۹۸ء میں چھاپ دیا۔ مگر دوسری جلد "ہندوستانی انگریزی" لغت ختم نہ کرسکے۔

علاوہ ان تمام دقتوں کے جنسے وہ گھبرا گئے تھے۔ ایک وقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے صرف ۷۰ صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت افسوس و حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اسکے بعد میجر ڈیوڈ طامس رجرڈس سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری اکیڈمی نے اردو لغت لکھنی شروع کی مگر افسوس کہ اسکا بھی وہی حشر ہوا اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اسکے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی آدمیوں کی امداد سے نظر ثانی کرکے چھپوایا۔ گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شکسپیر نے ایک اردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی۔ یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت ہی ماخوذ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی بیرنیڈ نے

بھی ایک لغت لکھی جو پیرس میں ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی ہرآئس کی لغت ۱۸۶۲ء میں لندن میں چھپی پیٹ نے بھی ایک لغت لکھی سب جسکے طبع ہونے کا سن معلوم نہیں۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھے انکی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے یہانتک کہ اہل زبان نے بھی جو ایک دو لغات لکھے ہیں ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمہ میں جو انگریزوں کے اس احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی اور اسکے ترقی دینے میں انہوں نے حتی الامکان کوشش کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اور وہ ہمنے اسی تذکرہ سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے " جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالیشان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانان نومشق مرہلی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حامی ہے" غالباً اسی جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا۔ کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا! چونکہ انکی نظم میں انتہا درجہ کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے اسلئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زباں انکی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے اور اردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت خلف الرشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی ذکر میں لکھا ہے کہ انہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسن کی فرمائش سے قصہ سسی پنو کا اردو میں نظم کیا اور نام اسکا اسرار محبت رکھا۔

میر قمر الدین منت کے حال میں درج ہے کہ انہوں نے میر محمد حسین فرنگی لقب کے

توسل سے سر ممتاز الدولہ مسٹر جانسن کے سرکار میں توسل حاصل کیا اور انکی فاقت
میں کلکتے آکر حماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹنگز (ہسٹنگز) بلادت جنگ بہادر کی اعانت سے
پیشکار و نظامت صوبہ بنگالہ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔

اس زمانہ میں علاوہ ڈاکٹر فالن کے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کرنل ہالرائڈ سابق
ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بہت بڑی بہادردی سلسلہ تعلیم
کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں۔ انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں اور اسمیں مفید
اور نیک مشورہ دیا کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا اور اسمیں کارآمد اصلاحیں کیں
اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جسمیں نیچرل مضامین پر عمدہ نظمیں لکھوائیں
شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض
نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائڈ کا یہ کام بہت قابل قدر
اور قابل تعریف ہے۔ اسی لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر کی طرح اردو نیچرل شاعری
کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آجکل مسٹر بل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن
پنجاب نے جو انجمن ترقی اردو کی صدارت قبول فرما کر اردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم
قابل شکریہ نہیں ہے

اسی سلسلہ میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھ سے ہوا اور جسکا ذکر میں
یہاں مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ

سب سے اول اردو کتابیں بھی انہوں نے چھپوائیں۔ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے
پریس میں اردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ اور اسکی جانشینوں
کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں۔ اسکے بعد لیتھو گراف پریس سب سے
پہلے دلی میں ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا۔ اور اسکے بعد سے روز بروز کتابوں کے
چھپنے میں ترقی ہوتی رہی۔

وہ انگریز حاکم جسنے اس ملک میں بیٹھکر جو اردو کا تیم ہم اور وطن مالوفہ ہے،
اسی دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہا تھا سخت غلطی پر تھا۔ وہ اگر اس زبان کی تاریخ سے واقف

ہوتا اور یہ بات کہ اُسکے واجب التعظیم بزرگوں نے اسکے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں اور اس عجیب و غریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے۔ اسپر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے۔ ہندو اس کی ماں ہیں مسلمان اسکے باوا ہیں اور انگریز اسکے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اسکی مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اُس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں جو تینوں کی اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں جب تک ہندو مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں کم سے کم اُسوقت تک یہ زبان ضرور قائم رہیگی۔

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے دیباچہ میں تو ذکر ہی نہیں شعرا کے سلسلہ میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلہ میں بالکل کم اور ناکافی ہے۔ البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھکر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہذا ہمنے کچھ اُنکے کلام ہی سے کچھ اِدھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے۔

نام میرزا علی تخلص لطف تھا۔ انکے والد کاظم بیگ خان اسطرآباد کے رہنے والے تھے ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد تشریف لائے۔ اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا مگر چونکہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھسے اس تذکرہ کے لکھنے کی فرمائش کی لہذا میں نے بسر و چشم قبول کیا۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے ہیں عہد سلطنت قائم ہے اُسی بادشاہ روشندل خدا پرست سے" پھر اسکے بعد نواب سعادت علیخاں بہادر کا ذکر کیا ہے اور بعد ازاں مارکوئس آف ولزلی گورنر جنرل ہند کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ موافق حکم اس صاحب والا مناقب کہ نام نامی اور اسم گرامی اسکا اوپر مذکور ہوا ہے اس بیچارے نے یہ تذکرہ لکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مولف

---

۵۱ ڈاکٹر جان گلکرسٹ۔

نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا۔ مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی ؎

حیراں پھرے ہیں بے سر و پا بہمن اور دے	
تاریخ اسکی جب ہے کہ رشک بہشت ہے	

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمائش کے بعد نہیں تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے کیونکہ انکے کلام میں وہ قصائد درج ہیں جو انہوں نے امیر الاعظم ارسطوجاہ اور میر عالم کی مدح میں کہے تھے۔ امیر الاعظم مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۰ء میں وزیر مقرر ہوئے۔ اور مئی ۱۸۰۲ء میں انتقال کر گئے ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے اور ۱۸۰۵ء میں وفات پائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ چونکہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا یا اہل حیدرآباد سے اسلئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ؎

ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے	دکن کے سالاروں نے مارا یا انگلش کو گورے نے

جو قصیدہ انہوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ کی مدح میں کہا ہے اس سے معلوم ہوتا کہ پہلے بھی وہ فراغبال اور خوشحال تھے اور دکن میں جاکر ارسطوجاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے اضافہ کی درخواست کرتے ہیں اور بڑی زور سے کہتے ہیں۔ ؎

کل ہی کی بات ہے یہ مسافر وطن میں تھا	سو وہ سوا آشنا کا حق بندگی گزار
شکر خدا کہ آج بیک بینی و دو گوش	گرچہ دکن میں ہے نہیں ہر در پہ خوار زار
ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون	لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار
.....	.....
اس سامو خراشی سے مجھکو جو ہے غرض	سو یہ ہے اے امیر فلک قدر و کے بتار
سرکار سے تری جو زراہ تفضلات	ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند بارے شکر ہے پر عرض کیا کروں
جس طرح اسمیں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

بے گفتگو بچاس تو ان ڈیرہ سو میں سے
ہو کر سوار چاہتی ہے لیجاتے ہیں کہار

خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو رہے کئی دن میں زباں پہ پھر
مثل مجردات فقط اُن کا ہے شمار

تجھ سا ہو قدر دان نکات اور یہ نکتہ سنج
یوں ہوا اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہو وہ سب بیکطرف
اور قدر دانیاں ہی ترے سب بیک کنار

ہے ہمت بلند کا تیرے جو اقتضا
اس امر میں تو ہے تجھے آیندہ اختیار

اور بسکہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے
بالفعل تو اضافہ کا ہوں گا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہو سے برائے نام
کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشود کار

تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف
کیونکر یہ بیجا بی نہیں ہوتی بار بار

غالب ہے تجھ پہ شاق نہوں سیر ہی تین سو
چھ سو جب اتیونکو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے معلوم ہوتا ہے وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے اور اب تک باقی ہے۔

اسی قصیدہ میں شاعر نے تعلی کی لی ہے اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ لکھا اور صرف اسکے اس مطلع پر ؎

اے شان حیدری ز جبیں تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

امیر الامرا نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اسمیں کیا رکھا ہے۔

جز لفظ ذوالفقار نہیں اسمیں کوئی بات
ایسی کہ ڈال دیوے سپر جسکے آگے یار

آئین قدر دانی میں لیکن برائے نام
لازم یہی ہے کر گیا جو خان باوقار

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے۔

کہتی ہے فارسی میں مجھے طبع "مطلعے"
ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار"

اے ذوالفقار نام تو خود شیعہ اعتبار
تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اسمیں بھی سوائے لفظ اعظم اور کیا رکھا ہے مگر افسوس ہے کہ باوجود اسکے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی یہی رونا رویا ہے۔

پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہو تجھسے	کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ مایحتاج کی رُو سے	نہوں محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنی تذکرہ شعرا (گلشن بیخار) میں لکھتے ہیں کہ مرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں۔ اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔ لیکن خود مرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں "اور شورہ ریختہ کا فقط اپنی طبع ناصواب سے ہے" اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہ انکی شاگردی سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں۔ غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو اُردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چونکہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے زبان صاف اور سادہ ہے تاہم قافیہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

اول تو سو برس پہلے کی زبان ہے جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتا لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں اس تذکرہ میں بھی جابجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں "شورش تخلص متوطن عظیم آباد کے مشہور میر ہوتا کرکے تھے"

اسی طرح میر قمرالدین منت کے حال میں لکھا ہے "چنانچہ شکرستان کر کے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستان کے مشہور ہے"۔ دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کے جگہ "بعد از" بولتے ہیں۔ سوز کے ایک شعر میں بھی لفظ لکھا ہے۔ ؎

ہے جیتی جی تو تجھے کوئی یار میں رونا رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا	

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہی ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں مثلاً فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے "دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے"۔ فقیر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں "بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے۔ اور اکثر مقاموں میں سیر کے وضع پر پہرے"۔ "میں کہا" دکن میں عام طور پر بولتے ہیں۔ قائم کہتے ہیں۔

میں کہا عہد کیا کیا تھا رات		ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

دوسری۔ علاوہ اسکے مولف ایسے زمانہ میں تھا جب کہ اردو زبان عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے مولف اُن کا ہم عصر تھا اور انمیں سے اکثر سے اسکی شناسائی اور دوستی تھی اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں کہ کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف وتصنیف کے لئے طلب کرنا اور بوجہ پیرانسالی منتخب نہونا یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جسکا دل پر بہت اثر ہوتا ہے اور جو صرف اس تذکرہ کا مولف ہی لکھ سکتا تھا کیونکہ وہ اُن کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اسکے اس سے میر صاحب کی خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو انہوں نے عمر بھر نبھائی وہ لکھتا ہے "نا قدر دانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کا سرد ہے اور ہوا سے

شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر ہو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کو کوئی نہیں پوچھتا اسکی آج ہے" شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آب حیات میں لکھتے ہیں کہ جب میر صاحب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینا کر دیا۔ مگر چونکہ بد مزاج انتہا درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا اور گھر بیٹھ رہے اور زندگی فقر و فاقہ میں گزار دی۔

مگر اس تذکرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اسمیں لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپیہ ماہرہ مقرر کر کے تحسین علیخاں ناظر کے سپرد کر دیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے اُن کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا اور نواب سعادت علیخاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہیں وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا" مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ کہنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے یا یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ بعض باتیں اسمیں نئی نظر آتی ہیں۔

۲۔ صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت جسقدر تعلق سلطنت سے رہا ہے اُن کے تذکرہ میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حالات میں اُن کا بزمانہ ولیعہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا۔ باپ کا دہوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا۔ اور انکا ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا۔ رام نراین سے جنگ۔ ونیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری۔ فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتفصیل لکھا اور آخر میں کور نمک سنگدل غلام قادر خاں رہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے جسمیں یہ واقعہ منظوم ہے۔ خود اُردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے اسلئے کہ تذکرہ اُردو کا ہے اور اصل غزل حاشیہ پر لکھدی ہے البتہ اتنا تکلف

کیا ہے۔ اسی طرح آصف الدولہ۔ تانا شاہ۔ میرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات و قصص لکھے ہیں خصوصاً مرزا محمد رضا امید کے تذکرہ میں امیر الامرا حسین علیخاں اور انکے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ اس کتاب سے اُس زمانہ کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجب بیفکرا تھا۔ جسکو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی اخیر میں جب ہمارے بادشاہ نواب و امرا اس طرف جھکے تو وہ بھی ویسے ہی ہوگئے! اور ان لوگوں نے رہا سہا انہیں اور کھو دیا۔ ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی اسلئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اسکے ساتھ ہی رخصت ہوگئی جسمانی اور دماغی قوے میں انحطاط پیدا ہوگیا تھا۔ ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں عارضی خوشحالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی شعر شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کردیا "دیوانہ را ہوس است ان شاعروں کی بن آئی وہ اس شغل میں رہے اور یہاں کا خاتمہ ہوگیا

اس زمانہ کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے انکے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے۔ اسکے خاص خاص آداب تھے۔ بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے باکمال سخنوروں کو دل کھول کے داد دیجاتی تھی کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہوجاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان جوان شاعروں میں شریک ہوتے تھے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفریں کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے شاگرد ہوگئے اور شعر کہنا شروع کردیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہوجانا کافی ہے یہ شاعرے درحقیقت "شاعرگر" تھے۔ میں ان شاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو اُس سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی۔

علاوہ اس عام حالت کے تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کردی ہیں۔ وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ایک واقعہ جسکا بچہ بھی اثر ہوا یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانہ میں

جب کہ اُنکا عروج و اقبال تہا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تہے، شاہان دہلی اور اُن کے گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے اور تعظیم بہی ایسی کہ آجکل کے نوجوانوں کو خیال میں بہی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکہا ہے کہ وہ ۱۹۸۰ھ میں دلی سے لکہنؤ چلے آئے تہے "نواب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب آداب خدمت گزاری کے تہے سب ادا کئے۔ خواصی میں بیٹہنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندہے سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس نازپروری کے کہ پیادہ قدم کا ہیکو چلے تہے۔ پانچوں ہتیار باندہے ہوے ایک الائچی اور گلوری کے بخشش پر دس دس مرتبہ مجرہ گاہ پر سے جاکر آداب بجا لاتے تہے۔"

۵۔ بعض ایسے لوگوں کا حال بہی دیا ہے جن کی نسبت اُردو شاعری کا گمان بہی نہیں ہوسکتا مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے اور اُنکا تخلص اشتیاق تہا۔ یا عبدالقادر بیدل بہی اُردو میں شعر کہتے تہے۔ یا تاناشاہ سے بہی ایک شعر منسوب ہے جو آدہا اُردو آدہا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بہی کلام دیں ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکہتے ہیں کہ "ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چہڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈہالا ہے اسمیں فیض آباد کی تعریف اور لکہنؤ کی ہجو ہے۔ اس سے یہ بہی معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تہی اور چہڑیوں والوں کی جزئیات رسوم کیا کیا تہے۔ مینے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکہی تہی اب نہیں ملتی۔ لوگ بہت تعریف لکہتے ہیں" حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ جسمیں فیض آباد کی تعریف اور لکہنؤ کی ہجو ہے میر حسن کے حالات میں نقل کردیا ہے۔ ناظرین کو لکہنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکہکر بہت تعجب ہوگا۔

زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے	اگر شیعہ کہے نیک اسکو بد ہے

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تہا۔

لہ تعجب ہے کہ اس مثنوی کا نام قصہ حیات (مولفہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد) گلشن بیخار (مولفہ نواب صدیق حسن خان صاحب) شیفتہ نیز اس تذکرہ میں کہیں نہیں لکہا۔

میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے۔ درحقیقت کلام بہت اچھا ہے مگر افسوس آجکل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی میاں سید محمد میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اب تک سنی ہی سنی تھی۔ اسکے چند شعر اثر کے حالات میں دیئے تھے شمس العلما مولوی شبلی نے اسپر فیصلہ ذیل نوٹ لکھا ہے۔ جو اس کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر درج ہے۔

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن چونکہ انکے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اسلئے اسکی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اسکا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اس مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"۔

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا ہے حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے۔ سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اسقدر توصیف و ثنا کی ہے، کہ اس سے بڑھکر ممکن نہیں یہانتک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی اپنے موازنہ دبیر و انیس میں انیس اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے۔ حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشو و نما اور اسکے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا جو ذکر آگیا ہے (اور اسمیں دلی لکھنؤ والے دونوں ہی ہیں) اسپر شاید لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ میں کوئی خاص لحاظ اسکا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب اور کلام پر تقریظ سننے کے شائق ہیں۔ تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف اُن کے

دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے اسمیں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل ہوئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اسپر خواہ مخواہ اسلئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے بلکہ درحقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے نا سمجھی سے اسے دے رکھا ہے۔ ہمیں تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا۔ صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اسقدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اسکی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ مولانا کا اگر اسمیں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے۔ "مثنوی ایشان شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است و ازیں جہت مرغوب عام"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں "ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے اور بہت اچھی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اسمیں درجۂ زبان کی صفائی شستگی اور لطافت بدرجہ کمال موجود ہے اور یہ سب باتیں مثنوی کی لئے خاص طور پر مناسب ہیں مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا جس سے کسیطرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سراپا کا مضمون اسقدر مبتذل ہے کہ اسمیں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا یا اسمیں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے اور چونکہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے اسلئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی

ایک اوہ جگہ دیا ہے۔ مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا مگر انتخاب کے اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسیطرح مصحفی کی تعریف کی ہے لیکن انتخاب اسقدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا شاعر ہے لیکن اسکا کیا جواب ہے کہ جو شعر خواجہ اثر کا بتبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے (یعنی اثر ہ ہاتا پائی میں ہانپتے جانا، کھلتے جاتے میں ڈہانپتے جانا + شوق ہ ہاتا پائی میں ہانپتے جانا + چھوٹے کپڑوں کو ڈہانپتے جانا + مولانا فرماتے ہیں کہ "خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں" یہ ایک مزید ثبوت ہے) اس سے صاف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا اُن کے بعد نواب مرزا شوق۔ اگر یہ شعر اُن کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہی تو اس طرز کا اثر ضرور اسپر پڑا ہوگا۔ دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مثنوی اس زمانہ میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اسکے مولانا حالی نے صاف لکھدیا ہے "اسمیں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب و خیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہوسکتی"

خیر اسمیں تو ظاہرا ایک حد تک کسی جگہ گنجائش بھی نظر آتی ہے مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھکر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھدیا تھا جسے پنڈت برجنت صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اسکے کہ اسمیں زبان کا لطف عام کو نہیں سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اسموقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے۔ اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں موقع آپڑا تھا اسلئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جنمیں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً مولانا شاہ ولی اللہ کی نسبت لکھا ہے

"قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسنین" اور "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ" ان کی تصنیف سے ہیں حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں نہ شہادۃ حسنین کا ابطال کیا ہے نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے۔ یہ محض اتہام ہے۔ اسکے بعد یہ کہکر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے خوب بجو ملیح کی ہے۔ اور آخر میں یہ لکھا ہے "کیوں نہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار بقول شاعر کے ؎

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزود ہے
بھونک میں کتے کی بلی کی سگی موجود ہے

یا مظہر جانجاناں کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "سنہ گیارہ سو چورانوے ہجری تھی کہ اس روشن ساز سائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریق پر کیا"

یا تانا شاہ کے حالات میں مولف عالمگیر کے نسبت یوں گہر فشانی کرتا ہے کہ "خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور مکہ مسجد کھدوا کے وہ کچھ مظلہ اپنی گردن پر لیا خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے" مکہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مولف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے اس کذب کا لکھنا کیونکر گوارا کیا ہمیں ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے اور ابتک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگزر نہیں کرتا۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں اُن کی داد و دہش فیاضی اور مروت کی بے انتہا بھٹی کی ہے لیکن آخر میں صاف لکھدیا ہے "افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر اور شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا اسواسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا" یا سراج الدین علی خاں آرزو نے جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے اسکی نسبت کہتے ہیں کہ "عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں

سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"

اس تذکرہ کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اُردو نے اسمیں جنم لیا۔ وہاں اسکا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں۔ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے۔ زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلائق رہا۔ کبھی راجاؤں یا مہاراجاؤں کی راجدھانی ہے۔ کبھی سلاطین اسلام کا دارالخلافت۔ کبھی طغیانی کی بادولت بھکر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا۔ کبھی معرکۂ جنگ و جدل و قتل عام ہے اور کبھی گھر گھر عید رات شب برات ہے۔ کبھی تختگاہ شاہان اور مرجع کمال ہے۔ اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لنک سے خاصا کھنڈر ہے۔ کبھی مورد بلیات و آفات ہے اور کبھی منزل حسنات و برکات غرض یہ نگری یوں ہی اُجڑتی اور بستی بگڑتی اور بنتی رہی۔ مگر باوجود اسکے حسن عالم افروز میں ہمیشہ نئی ادا پیدا ہوتی رہی۔ اور ہر حادثہ کے بعد فوراً سنبھل گئی۔ لیکن اخیر زمانے میں سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامتیں پیدا ہو گئیں تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔ سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا کہ اس نے بھنبھوڑ دیا۔ اسکے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی پھر مرہٹوں نے وہ اُدھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا اب تک جو باکمال دلی میں پڑے دھنعداری بنا رہے تھے، ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے جنکی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ "جن ایام میں شاہجہاں آباد کا اور ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمور یہ شہر کے عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے تنگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے اور ہر ایک جابر زاویہ گزین نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے فرار کو

غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اسکا خواجہ میر تھا
اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا۔ متحمل بلاؤں کے اور حامل
جفاؤں کے ہوئے، اور شاہجہاں آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔"
ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں
کی ٹیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ
دنوں اسکا ساتھ دیا۔ اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانہ اور آسرا مسلمانوں کا
رہ گیا تھا۔ آصف الدولہ سا کلمہ لٹ نواب تھا۔ اہل کمال کی قدر ہونے لگی۔ پھر تو جو اُٹھا
وہیں پہنچا اور پہنچکر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین
علیخاں آرزو پہونچے۔ اسکے بعد سودا تشریف لے گئے۔ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی
نے ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی
اور میر حسن۔ میر سوز۔ جرات سب لکھنؤ میں جا بسے۔ اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی۔ اس
طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اُردو زبان اور اردو شاعری
پر کیا اثر ہوا۔ اسوقت ہماری بحث سے خارج ہے۔

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرہ سے میر انشاء اللہ خاں کے حالات کے متعلق کوئی نئی بات معلوم
ہو گی۔ اور کم سے کم اس قصہ کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد
نے اُن کی اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا اور ۱۲۱۵ھ تک
میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے یا اُسی سال نواب سعادت علیخاں
کے ہاں رسائی ہوئی۔ کیونکہ مرزا سلیمان شکوہ اس سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے
گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی نقل کیا ہے صرف یہ لکھکر تمام واقعہ بیان
کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم کس سے کہتے تھے۔ اور
آزاد نے کس سے سُنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ "مجالس رنگین" کا حوالہ دیتے ہیں
مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ھ ہجری
میں لکھی گئی۔ میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں

ملازم تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اسلئے یوں بھی اسمیں نہیں ہوسکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب مینے دو حصوں میں لکھی ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے جسمیں سلاطین نامدار امرائے عالیمقدار اور شعرائے اصاحب وقار کے حالات لکھے گئے ہیں دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا۔ اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ کبھی لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اسمیں ہمنے اتنا تصرف ضرور کیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں، اُنکے انتخابی کلام کو کم کر دیا ہے صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں۔ مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا۔ اُن کے کلام کو بجنسہ ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دئے ہیں۔ اپنی چیز اور خصوصاً اپنا کلام ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے۔ خود اُن سے انتخاب کیونکر ہوتا لہذا ہمنے اسکا انتخاب کر دیا ہے۔ صرف تھوڑے سے اشعار رکھے ہیں اور باقی سب نکالڈالے ہیں۔

اب مجھے اس تذکرہ کے متعلق اسقدر کہنا اور باقی ہے کہ اسکے طبع ہونے سے اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اور جو لوگ اُردو کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اسکی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔ یہ کام دراصل انجمن ترقی اُردو کا تھا۔ مگر یہ انجمن اب برائے نام رہگئی ہے جسکا ہونا نہونا برابر ہے۔ ہمیں اس باہمت شخص کا ممنون چاہیے جس نے باوجود بے بضاعتی کے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور اُردو خواں پبلک پر احسان کیا۔

عبدالحق۔ حیدرآباد دکن

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر مدظلہ

نگاہیاں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز اونکے
کہ بچتے جانتے ہیں لغزش سے پاکباز اونکے

خدا کی شان کہاں میکدہ۔ کہاں واعظ
کدھر ہیں آج وہ رندوں سے احتراز اونکے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز اُن کے

جنہیں نصیب ہوئی ہے تمہاری ہم بزمی
زمانے بھر میں ہیں مشہور امتیاز اُنکے

نظر اُٹھانے میں ہوتا ہے بازپرس کا ڈر
جھکائے رہتے ہیں گردن کو سرفراز اُنکے

اجل کے غمزہ بیجا سمائیں کیا دل میں
تمام عمر اُٹھائے ہوئے ہوں ناز اُنکے

مرے کلام کا جنکو مزا نہیں ارشاد
یقین ہے کہ دل ہی نہیں گداز اُنکے

بلا منظور ہوا اپنا تو خدمت کر فقیروں کی
قضا کو روکدیتی ہے دعا درشن غریبوں کی

جہاں میں ہر طرف حسن جمال یار کا غل ہے
جھکائے سر رہے کیونکر طبیعت گوشہ گیروں کی

گذرگاہ جہاں میں راہ رو سب ایک سے کب ہیں
رہے جاؤ کبھی تو کوئی سر لے گا فقیروں کی

قضا پھٹنے نہ دے اسکا تو کچھ چارہ نہیں لیکن
ہلا دیتی ہیں دل صیاد کا آہیں اسیروں کی

میں ویرانی کو اپنی جانتا ہوں تخت طاؤسی
خدا آباد رکھے تا ڈھیر ہو ڈھیری ان امیروں کی

غزل جناب احسن مرزا صاحب شرر لکھنوی

دل کو خطوط سرا کیا سینے
جلوہ گاہ حیا کیا سینے

دل میں تیرا گلا کیا سینے
ہاں خلاف وفا کیا سینے

کیا ہوئے ہائے وہ مزے اوقات
تجھکو اے عمر کیا کیا سینے

نام اپنا ڈبو دیا صد حیف
خود بقا کو فنا کیا سینے

[illegible]
چشم کو حق نما کیا سینے

قبل از وقت [illegible]
تجھکو عبرت سرا کیا سینے

سجدہ کر کے مثال جبہ ذلیل
ان بتوں کو خدا کیا سینے

حال وہ پوچھیں ہیں ہوں خاموش
اب تاسف ہے کیا کیا سینے

دلمیں کی عشق کی کشش پیدا
گناہ کو کیمیا کیا سینے

فکر اوس [illegible] کی سینے
جسکو خود لا دوا کیا سینے

نظر آیا شرر عجب طالع
قطعہ
عقدہ دل جو وا کیا سینے

مفت بلکہ ٹکٹ بھی کارخانے کیطرف سے

رسالہ گوہر نادرہ دنیا بھر میں نایاب کتاب۔ نہایت جلد بذریعہ کارڈ اطلاع بھیجنے پر جسقدر آپکے اور دوستوں کے لئے ضرورت ہو ان دنوں سے مفت ملیگی۔

جنرل منیجر کارخانجات رائل ٹڈبکل ہال جگادھری ضلع انبالہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اُردوئے مُعلّیٰ

علی گڑھ

نمبر ۵	بابت ماہ مئی ۱۹۱۱ء	جلد ۱۲

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

۱۔ شاگردان مائل و شوق
۲۔ بیاض حسرت موہانی
۳۔ مکتوبات امیر مینائی نمبر ۲
تنقید از حسرت موہانی
۴۔ تنقید رسائل و کتب
۵۔ غزلیات شمشاد لکھنوی۔ حضرت بخت
شفق عماد پوری۔ اخگر جیگڑہی۔ اعجاز لکھنوی
تسبل موہانی۔ حسرت موہانی وغیرہ

ضمیمہ اردوئے معلیٰ غزلیات عشاق علیگڑھ

اُردو پریس علی گڑھ میں چھپا

علم فلسفہ

معیار الخیالات

اس عالمانہ کتاب کا مطالعہ کرنے ہی سے پتہ لگ سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے مضامین مفصلہ ذیل مثلاً روحانی پیر۔ خدا۔ فعل خدائی۔ عبادت۔ پرستش یعنی پوجا۔ خیرات مذہب جیو آتما بھرا در روح انسانی۔ تعلیم۔ دولت۔ عشق۔ ادب دوستی۔ رحم حمل میں آنے سے تا موت قواعد حفاظت جسم۔ نشہ بازی۔ استفراغ موت۔ حیات مابعد الموت کے اوپر کن عالمانہ دلایل سے بحث کی ہے۔ اور ہر ایک مذہب وملت کے انسان کو کتاب ہذا کا مطالعہ کرنا کن کن معلومات کا ذخیرہ پیدا کرتا ہے

چونکہ فاضل مصنف نے اس کتاب کو کئی ہزار کی لاگت سے باعلم سہائی میں بالکل مفت بلکہ محصول ڈاک بھی اپنی طرف سے چسپاں کر کے تقسیم کیا ہے۔ اس لیے نوٹس ہذا کا مطالعہ فرماتے ہی بذریعہ کارڈ نہایت جلد اطلاع دیں۔ کیونکہ یہ رسالہ روزمرہ ہزارہا کی تعداد میں معززین وعالمان کی خدمت میں روانہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے تاکہ جلدی ختم نہ ہو جائے۔ اور پھر جناب کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکے

اور رسالہ پلیگ بھی چھپ گیا ہے جو کہ بغیر قیمت اسی رسالہ کے ہمراہ روانہ ہوگا۔

سکرٹری لائبریری رسالہ معیار الخیالات

جگادھری ضلع انبالہ (پنجاب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاگردان مائل و شوق

آشفتہ دہلوی

عظیم الدین خان نام عرف جوئے خاں قوم افغان شاگرد میر محمدی مائل یہ شخص ایک مرد[1] تھا لائق۔ آشفتہ طبع وارستہ مزاج سپاہی پیشہ۔ مولد ان کا دہلی وہ لکھنؤ میں بیچ سنہ ۱۷۹۳ء کے فارسی اور ریختہ دونوں کہتا تھا۔ صاحب دیوان ہے فارسی میں فرزند علی مضمون سے اصلاح لیتے تھے سنہ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ "آخر کو[2] بسبب اکتساب[3] باطن مائل بخدا ہوا اور توبہ شعر کہنے سے کی۔ وجہ تجارت سے ایام بسر کرتا تھا۔ اور ہر غزل کے مقطع میں مضمون زلف کا باندھتا تھا"

صاحب آب حیات نے تذکرہ معروف میں ضمناً آشفتہ کا بھی کچھ ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ معروف کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جسمیں ردیف وار اول مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں اس رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا ... جن دنوں اس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمایش تھی کہ کوئی مثل کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ ... جوئے خاں آشفتہ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور ان کے مرید تھے صرف وظیفہ ہی پاتے تھے انکے شعر میں ہری چگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا ؎

آج یہاں کل وہاں گذرے یونہیں جگ میں ہیں — کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ میں ہیں

نہیں سو روپے ایک رومال میں باندھکر دیدئے کہ تمہاری کاوش کیوں خالی جائے" ان سب تعلقات کے باوجود آخر میں معلوم نہیں کس وجہ سے انہوں نے معروف اور ان کے عزیز دوست نواب حسام الدین حیدر خاں نامی کی ہجو کہی نتیجہ یہ ہوا کہ پھر باوجود معذرت معروف نے جیتے جی ان کی صورت نہ دیکھی شاعری انکی معمولی ہے ؎

جام گدائی ہاتھ میں لے نت شام سویرے پھرتے ہیں — شمس و قمر ہیں دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں

[1] ترجمہ تذکرہ ڈی ٹاسی بحوالہ تذکرہ مصحفی [2] سراپا سخن محسن [3] ڈی ٹاسی گرچہ نوازہ جاوید سے معلوم ہوا کہ کسب باطن کی طرف متوجہ ہو کر مولانا فخر الدین کے مریدوں میں شامل ہو گئے

بندٹ پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کہلاؤ کوئے پر — بخت جو ہوں برگشتہ اپنے کسکے پیر پھرتے ہیں
عقل ہوئی سلب ہماری آہ جنوں رواہ جنوں — کوچہ بکوچہ اب تو ہم کو لڑکے گھیر پھرتے ہیں
یوں کاندھے پر زلفیں اسکی بل کھاتی ہیں قیامت — مارسیہ کو ڈالے گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں
جوگ لیا آشفتہ ہمنے دیکھ لنگ ان زلفوں کی — گلیوں گلیوں حال پریشاں ان کے پھرتے ہیں

ناخواندہ مرے خط کو الٹا ہی پھرا لایا — قاصد کا گلا کیا ہے قسمت کا لکھا لایا
عین بیرنگی ہے آشفتہ برنگ مختلف — آفت جاں اس گل رعنا کی رعنائی ہوئی
برگشتہ بخت ہم سے دیکھے ہیں کم کسی نے — جب ہم ہوئے مقابل وہ منہ کو موڑ بیٹھے
ہوتا ہے تازہ آہ سے جوں گل ایاغ دل — کھلتا ہے اہر نسیم سے اپنا تو باغ دل
آشفتہ کرکے کوچہ زلف بتاں میں گم — بھٹکا بہت ولیک نہ پایا سراغ دل

کرم رامپوری [۱۲۲۰ھ تا ۱۲۵۳ھ] میر زا کھوف کرم خاں مرد معصوم صفت تیز طبیعت صاحب ذوق شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق اپنے عہد کے بڑے نامور تھے دور دور تک مشتہر تھے انکے بھانجے احمد خاں غفلت نے انکی وفات کی جو تاریخ موزوں کی تھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں اس سے انکا مختصر حال بھی معلوم ہو جائیگا

شاعر کامل و ذی حوصلہ مولنا صاحب — جن کو استاد کرم خاں کہے اعلیٰ اونے
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں — مجمع خوبی و اہل ہنر و شرم و حیا
ایک استاد کے شاگرد تھے ہم وہ دونوں — تھا اس آفاق میں دونوں کا برابر شہرا
مرض ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال — شصت و یکسال تلک کھائی ہوا سے دنیا
آخر اسکو بھی خوش آیا نکی اقامت آئی — تا ابد کوئی جہاں میں نہ رہا گا نہ رہا
سوے اقلیم بقا ملک فنا سے جسدم — وہ سخن فہم جہاں رخت سفر باندھ انہا
ظہر دیکشنبہ و ہفتم مہ ذی الحجہ کی تھی — کتنی پیاری تھے لئے ہند میں پیر و برنا
طلب اس خسرو ثانی نے کیا سال وصال — آئی ہاتف کی بھ آواز کہ خوش فکر موا ۱۲۵۳

صاحب دیوان تھے چنانچہ امیر مینائی مرحوم نے ان کے دیوان سے منتخب کرکے یہ چند شعر اپنے تذکرے میں لکھے ہیں ۔

آنکھیں ذرا اُٹھائیے اوپر کو اے کرم — شب جسجگہ کہ آپ تھے کیا میں وہاں نہ تھا
مرتے تو ہیں پر ایک نظر دیکھ لیں اسکو — اے زندگی ہم سے کوئی دم اور وفا کر
یار نے آکے دم نزع جو کی پرسش حال — بات بھی منہ سے نہ نکلی کہ زباں بند ہوئی
چرخ کجباز کے حق میں یہ مثل سیدھی ہے — اونٹ سے اونٹ تری کونسی کل سیدھی ہے

استعار در ہجو آب کوٹہ

پئیں گر خضر آکر یہاں کا پانی — تو پھر آخر ہے عمر جاودانی
بہشتی یہاں کے کرتے ہیں بڑا قہر — کہ پانی بیچتے ہیں گھول کر زہر
بجھائیں یہاں کے پانی میں جو تلوار — نہ ننگے اس کا مارا آب زنہار

ان اشعار میں ان کی شاعری کی کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی تاہم انکے استاد ہونے میں کوئی شک نہیں ریاست رامپور کے اکثر صاحبزادے ان کے شاگرد تھے جنمیں سے صاحبزادہ کرامت علی خاں کرامت نبیرہ نواب فیض اللہ خاں اور صاحبزادہ غلام حضرت خاں زخمی نبیرہ نواب محمد یار خاں امیر قابل ذکر ہیں آخر ان کے دو شعر قابل ملاحظہ ہیں۔

نظم ابرو نثر خط پڑھتا ہے فرق آئینہ — سب رسالہ حسن کا رکھتا ہے از بر آئینہ
جبر کی کا ہی اندیشہ ہی بوسے کی ہی امید — گویا لب جاناں ہے محل خوف و رجا کا

غفلت رامپوری اخوند زادے احمد خاں ولد برہان الدین خاں شاگرد رشید مولوی قدرت اللہ شوق بقول امیر مینائی مرحوم بڑے مضمون آفریں اور بڑے صاحب ذوق تھے بعلی مضامین سے سرزمین سخن کو آسمان بنایا۔ مدح و قدح دونوں میں شعرائے سلف کا رنگ دکھایا۔ اکثر وطن میں رہے چندے لکھنؤ شریف لیگئے تھے۔ وہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے تھے شیخ غلام ہمدانی مصحفی مغفور نے بھی اپنے تذکرہ میں انکی مدح لکھی ہے ..... مسودہ دیوان کا انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ "وقت مطالعہ ہر رنگ میں انکی طبع رسا کو قادر پایا" ان کے قصاید کا زور قطعات کی پختگی ہجویہ مثنویوں کی بے تکلفی یہ سب چیزیں ان کی قادر الکلامی اور

استادی پر دلالت کرتی ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوں وہ روشن طبع گر ہو تجھسے رشک آفتاب — چرخ نظروں سے گرا وے صورت نیر شہاب
گرم جولاں ہے جہاں میرا سمند فکر وہاں — اوڑتی ہی گرد شکست رنگ ماہ و آفتاب
حسن و خوبی اسکے ہاتھی کی بیاں کیا کیجئے — مائل رفتار ہو جسوقت وہ رفعت مآب
دیکھکر مستوں کو آئے ابتریہ کا خیال — گوشہ مغرب میں جائے شب سمجھکر آفتاب

جہاں میں ہو نہ تنگ مایہ کامیاب کبھی — کرے نہ دانہ شبنم کو سبز ابر مطیر
اگر وہ جانب دریا نگاہ فیض کرے — ہوا سے پائے ترقی حباب کی تعمیر

برد سے گم ہیں سماعت کے بھی ہوش — دیکھئے اب جسکو ہی پنبہ بگوش
اپنے اپنے گھر میں اب پیر و جواں — آگ روشن کرکے بیٹھے غنچہ ساں
شمع سے ہے انس پروانہ غلط — سیکنے کو ہاتھ آتا ہے فقط
بسکہ ہے آتش سے ہر طائر کو ساز — پٹ اور جگنو میں کب ہو امتیاز
آگ پر گرتا ہے عالم اس طرح — شمع پر دوڑے پتنگا جس طرح

ترے چہرے کے آگے شمع کشتہ کب نہیں جاتی — یہ حیرت ہے کہ آئینے کی چھاتی پھٹ نہیں جاتی
سوزن سے ہو سکا نہ رفو اپنے زخم کا — پایا ہی کسنے فائدہ اپنے کمال سے

اسی میں دل ہے وہی اس دل حزیں میں ہی — مکاں میں ہے مکیں اور مکاں مکیں میں ہے
آیا سواد نجد سے جو کوئی اس طرف — میں نے کہا کہ قیس کی کیا کیا نشاں ملی
کہنے لگا کہ پلٹے ہوئے برگ بید سے — جوں تار عنکبوت کئی استخواں ملے

رامپور اور نواح رامپور میں جتنے شاگرد مفلت کو ملے اتنے ان کے کسی ہمعصر کو نصیب نہیں ہوئے مثلاً اخوندزادے محمد سعد الدین خاں شعور مولوی قیام الدین فرقت محمد ضیا خاں یاس نبیرہ حافظ رحمت خاں والی بریلی صاحبزادہ عبد القادر خاں قادر و صاحبزادہ امداد اللہ خاں تائب خلف صاحبزادہ کفایت اللہ خاں نبیرہ نواب عبد اللہ خاں۔ صاحبزادہ احمد یار خاں افسر[1] خلف نواب

[1] نواب علی محمد خاں بانی ریاست رامپور کے بیٹوں میں نواب محمد یار خاں امیر سب سے زیادہ علم دوست اور شاعری کے قدردان تھے۔ جنکا ذکر شاگردان قائم کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ سرپرستی شعرا کا یہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہا چنانچہ ان کے صاحبزادے افسر اور افسر کے سب بیٹے مثل زکی۔ افکار حزیں غلام مرشد خاں مرشد اور غلام حسین خاں حسین شاگرد آتش خود شاعر اور شاعروں کے قدردان گزرے ہیں

محمد یار خاں امیر کے تین بیٹے۔ اصغر علیخاں افکار۔ غلام محی الدین خاں حزیں اور غلام حضرت خاں زخمی صاحبزادہ امداد علیخاں امداد نبیرہ نواب فیض اللہ خاں۔ ان سب کا مفصل حال و کلام لکھنا طوالت سے خالی نہوگا اسلیے ہم صرف چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

اشعور (۱۱۶۵ھ تا ۱۲۰۰ھ) ولد محمد اسلم خاں فارسی اردو دونوں کے شاعر تھے دہلی شاہد تھے

گراں ہے اپنی خاطر پر یہ بار زندگانی ہی پوچھو ہم سے تم عالم ہماری ناتوانی کا

۲۔ **فرقت** مولوی برہان الدین عالم مشہور کے پرپوتے تھے۔ فارسی میں مولوی تاج الدین اور شیخ امام علی سے مشورہ تھا۔ ۱۲۹۱ھ میں ساٹھ سال کی عمر تھی۔

مزاج میں اپنے بدگمانی زبسکہ رکھتے ہیں یاد یہی دعا ہے کہ تا بہ محشر نہ دیکھئے بے نقاب مجھکو

۳۔ **یاس** (۱۲۱۷ھ تا ۱۲۶۰ھ) کلام بہت تھا تلف ہوگیا۔

حال دل اسکو سنانے کو تو بیٹھا ہوں ولے منہ سے کیا نکلے دم گفتار دیکھا چاہیے

۴۔ **قادر** (۱۲۲۳ھ تا ۱۲۶۳ھ) خط نسخ کے خوشنویس تھے۔ بانک پٹے وغیرہ فنون سپہگری کا بھی شوق تھا۔

خاک تربت سے ہی اپنے گل موسن پیدا داغ ماتم ہے ہمارا پس مردن پیدا

۵۔ **ادب** (۱۲۱۸ھ تا ۱۲۷۹ھ) فنون متداولہ میں کمتر کوئی فن ایسا ہوگا جسمیں دخل تام نہ تھا جوانی میں بہت صاحب حسن و جمال تھے زبان بھاکا اور اردو دونوں میں کہتے تھے چنانچہ تذکرہ انتخاب یادگار میں انکے کئی لاجواب کبت درج ہیں۔

جو تو برسوں شکم میں صدف کے رہا تو میں بطن میں خم کے بنا ہی قطرہ مے ذی گہر سے کہا تو اوبنیں میں اوسنیں

۶۔ **افکار** غفلت کے علاوہ آتش ذوق اور بیماری سے بھی اصلاح لی تھی ۱۲۹۱ھ میں اٹھاون سال کی عمر تھی۔

دیدیا طاق سے آئینہ اٹھا کر انکو حال مجھسے دل حیراں کا دکھایا نہ گیا

۷۔ **حزیں** ؎ گنگ بہتر ہی زباں اس نالہ شبگیر سے * ناک میں دم آگیا ہی آہ بے تاثیر سے

۸۔ **امداد** (۱۲۱۷ھ تا ۱۲۸۲ھ) صاحب دیوان مرد خوش اوقات حمیدہ صفات مشغلہ ذکر و درد کہتے تھے

؎ کر دے شب تار میری روشن جب جا میں تجھے کہ مہ لقا ہے

طالب رامپوری مولوی الٰہ داد عرف حافظ شبراتی عالم باعمل تقوی اور پرہیزگاری میں ضرب المثل تھے۔ تہجد گزار۔ شب بیدار لڑکپن میں چیچک سے آنکھیں جاتی رہی تھیں اسی عالم نابینائی میں سب درسیہ کتابیں پڑھیں۔ ملا حسن مرحوم کے شاگرد نہیں نامور ہوئے ... خوش فکری ہر شعر سے ہویدا ہے اس فن میں مولوی قدرت اللہ شوق سے مشورہ تھا۔ یہ چند شعر ان کے دیوان سے انتخاب کر کے درج تذکرہ کئے گئے۔

ہر چند رو سیہ میں بلے نور و بے بصر تھا — لیکن برنگ سرمہ منظور نظر تھا

چیرئیے سینے کو شق کیجیے دل دیگر کو — یہ بھی دو جا گئے ہیں اور کہا گیا میں تیر کو

اتنی یہ عزت ملی اس نالہ پر شور سے — دیکھکر مجکو اٹھا شور قیامت دور سے

کچھ ضبط نہیں ہے مجھے وسواس نہیں ہے — وحشت کا یہ باعث ہے کہ تو پاس نہیں ہے

جا بجا بنگئے تکئے ترے دیوانوں کے — خاک اوڑاؤں میں کہاں نام کو صحرا نہ رہا

جائے خوں سرخی گل تھی اس میں — چیر کر جب دل بلبل دیکھا

سب ہمصفیر اوڑ گئے صیاد دام سے — پر ہم تھے اور ڈھب کے گرفتار رہگئے

میں تو ہوں محو ہجوم آرزو فرمائیے — آپ سے ہر دم بلا کیا کیا اجازت چاہیئے

اک حسرت جدائی اک شوق وصل جاناں — دو چیزیں لے چلے ہم امید ہستو جاں سے

ہجر کے صدمے وہ ترے وصل کے وعدے — جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے

جنت ہی نہیں ملک خدا حضرت ناصح — آخر تو کہیں ہم بھی گنہگار رہیں گے

مر کے بھی ہم نے سب کو دیکھ لیا — کوئی مرنا نہیں کسی کے لیے

رات بھر نالے کئے ہم نے تو دن بھر روئے — جسقدر شام سے گرجے تھے سحر ہی برسے

اے مظہر رحمت الٰہی — اے عین عنایت الٰہی

اے نور فزائے چشم آدم — اے باعث ہستی دو عالم

اے ختم رسل شفیع محشر — اے مالک آب حوض کوثر

اے قبلۂ دین و شاہ کونین — اے صدر نشیں قاب قوسین

اے ابر کرم سحاب احساں — اے لطف خدا حبیب یزداں

لہ انتخاب یادگار

اے عذر پذیر اے خطا پوش — با خلق کریم در کرم کوش
اے گوش نہ نداے طالب — مقبول ہو یہ دعاے طالب

افسر رامپوری (۱۲۶۷ھ تا ۱۲۶۸ھ) طالب کے شاگردوں میں صاحبزادہ احمد یار خاں افسر بجاے خود استاد اور دو دواوین اردو کے مالک تھے ابھی گیارہ ہی سال کا سن تھا کہ انکے والد نواب محمد یار خاں امیر نے انتقال کیا اور نواب فیض اللہ خاں والی رامپور نے کہ انکے چچا تھے انکا ۱۶۰۰۰ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ بہادر[1] بے بدل۔ فنون سپاہگری خصوصاً علی مدد لکڑی پھینکنے میں ضرب المثل تھے شعر کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ابتدا میں قائم چاند پوری سے تلمذ تھا

قاصد اتو ہی بتا کونسا پیغام لکھوں — ہوں ہیں گمنام سر نامہ پہ کیا نام لکھوں
برقع جو رات منہ سے ترے دور ہو گیا — خجلت سے ماہ چرخ پہ بے نور ہو گیا
جوں گل یہ حسن ہوئے ہی اک آن میں ہوا — وہ چیز کیا ہے جسپہ تو مغرور ہو گیا
قدرت پہ یاں کی بھول نہ افسر کہ پیش ازیں — کیا کیا جہاں میں خلق کو مقدور ہو گیا
سن لیجیو آنسوؤں نے فلک سے گزر کیا — جسدم کہ وقف گریہ میں خون جگر کیا
مستی کی اس نگاہ کے کچھ کیفیت نہ پوچھ — گردش نے جس کی ایک جہاں بیخبر کیا

صنعت رامپوری (۱۲۶۵ھ تا ۱۲۶۸ھ) شیخ کریم الدین ولد شیخ منتہو صنائع زرگری میں کامل اور ساتھ اسکے مشاغل کے عابد و زاہد و ذاکر و شاغل تھے۔ شاعر رنگین طبیعت و صاحب ذوق مولوی قدرت اللہ شوق کے صاحب دیوان اور مشہور شاگرد تھے۔ کلام کا نمونہ

دم تو کب کا نکل گیا ہوتا — ضعف سے تاب لب نہیں آتا
اور صنعت تو یاد ہے لیکن — اسکے ملنے کا ڈھب نہیں آتا
ہجر و وصال دونوں میں کٹتی ہے جب دلے — یارب یہ کیسی شب ہے کہ جس کی سحر نہیں
مجکو بلایا غیر کے گھر جا کر آپنے — اسکو ستم کہوں کہ مدارات کیا کہوں
فریاد کو محشر میں سند کچھ نہیں دکار — گل کھانے سے ہاتھ اپنے ہیں مخصر زیادہ

رسید کتب برائے ریویو (۱) جام سرور (۲) کلام فیروز (۳) کلام فوق (۴) دیوان آزاد بلگرامی (۵) کتاب المعارف (۶) برقابی (۷) گلدستہ سحر (۸) مسدس میلاد (۹) الجزیاں (۱۰) دیوان بہار (۱۱) م

[1] انتخاب یادگار [2] ایضاً

بیاض حسرت موہانی

شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ

جانم بلب از لب خموش تو رسید — وز لعل خموش بادہ نوش تو رسید
گوش تو شنیدہ ام کہ درد ے دارد — درد دل من مگر بگوش تو رسید

مرزا جلال اسیر

گداخت بر لب حسرت ترانۂ دل ما — تبسمے کن و بشکن بہانۂ دل ما

مولانائے روم

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست — بنمائے رخ کہ باغ گلستانم آرزوست
یکدست جام بادہ و یکدست زلف یار — رقصے چنیں میانۂ مستانم آرزوست

میر ضیاء الدین ضیا شاگرد میر حسن (ماخوذ از تذکرہ میر حسن)

آہستہ پانوں رکھیو اے بوئے گل چمن پر — سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے
تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے ہیں — آئے نظر مجھے واں روشن چراغ کتنے
جا کر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص — اک دل جلے ہی اس میں حسرت کے داغ کتنے

ق

برعکس وضعیں آئیں اسکے نباہنے کی — شاید یہی ہے تاثیر اس دل کے چاہنے کی
جلدی ضیا خبر لے آتی ہے تجھ جگر سے — آوازنا تواں سی دل کے کراہنے کی

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے — کیا ناز و نیاز جاودانی کرتے
گر بار کے میں جیتے ہوتا تو ہم — کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے
نے کھلنے کی امید ہے نے بو کی آس ہے — غنچہ ہوں دل کا مجھ میں فقط داغ یاس ہے

ملا کا بید مسرز محمد یار خاں اینڈ سنز بسٹی ہیوز دکس سیالکوٹ سٹی نے ہمارے پاس ایک نہایت خوبصورت ملا کا بید بطور نمونہ بغرض ریویو روانہ کیا ہے۔ اس بید پر چاندی کی منقش نام کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت (۴ روپے) بہت مناسب ہے۔ بہت سے دوستوں نے اس بید کو دیکھا اسکی قیمت (۷ روپے) سے زیادہ ہی تجویز کی۔ کارخانہ ذیرہ سال تک اسکی ذمہ داری کا نوٹس دیتا ہے۔ ہر خریدار کا نام اردو میں بلا قیمت اور انگریزی میں بلا اجرت لکھ سکتا ہے اور مفصل پرائس لسٹ مفت بھیجتا ہے۔

مکتوبات امیر مینائی

نمبر ۲

پہلے نمبر میں جو کچھ لکھا گیا وہ دیباچہ مکتوبات سے متعلق تھا۔

اصل کتاب کی نسبت ہم کو صرف اسقدر اور کہنا ہے کہ ان مکتوبات کو جمع کر کے حضرت ثاقب نے اپنے واجب التعظیم استاد کا حق شاگردی ادا کرنے کے علاوہ اردو زبان کی بھی ایک نمایاں خدمت انجام دی ہے۔

اول اس لحاظ سے کہ بقول مولانا حالی "کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اسکی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلمبند کر دینا ہے کیونکہ انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا اسکی بے تکلفانہ خط کتابت سے ہو سکتا ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا اسی واسطے مکتوبات کو نصف ملاقات قرار دیا[1] گیا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا اب اس کی ملاقات محض اس کی خط کتابت پر منحصر ہے اور بس"

دوسرے اس لیے کہ بقول حضرت ثاقب "جو لوگ طالبان فن انشا ہیں ان کے واسطے یہ خطوط استاد شفیق کا کام دیں گے زبان کی فصاحت و متانت معاملہ نگاری مختصر نویسی ہر بات کی تحقیق صحت و خطا کی احتیاط یہ تمام باتیں اور غور کرنیوالوں کو ان سے زیادہ یہ تحریریں تعلیم دیں گی۔

ان امور کے علاوہ احباب سے اخلاص تلامذہ کے ساتھ شفقت عزیزوں سے محبت تقوی صبر و رضا استقلال اور دوسری پاکیزہ صفات کا سبق بھی حاصل ہوگا"

مثال کے طور پر ہم مکتوبات امیر سے چند فقرے اور عبارتیں نقل کر کے اس طویل تفریظ کو ختم کرتے ہیں ملاحظہ ہو:-

حکیم برہم کے نام "میں اکثر اوقات دعائے صحت دلخواہ میں مصروف رہتا ہوں

[1] قرار دیا ہے یا قرار دیتے ہیں چاہیے تھا کہ..... قرار دیا گیا ہے صحیح نہیں ہے ۱۲ حسرت

مجیب الدعوات مستجاب فرمائے" "تم سا سا آدمی اور اب تک اس باب میں حسن کارگزاری کا پتا نہیں" "اب[1] جو تم نے اپنی ملاقات سے مسرور کرنے کا وعدہ کیا ہے خدا تمہارے وعدہ کو پورا کرے جو تمہارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے اور اپنی تمنا کو پورا ہوتے میں نے بہت کم دیکھا ہے اس لیے اس وعدے سے دل کو پوری خوشی نہیں ہو سکتی۔"

مایقرء کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہی جیسے کہیں فلاں شخص کا خط مایقرء ہے خوشنویس نہیں اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں نے نہیں سنا"

بحر نے جو ایک شعر میں ؎

اب مجھ سے التیام کی باتیں نہ کیجئے　　دل تم سے پھٹ گیا جگر افگار ہو گیا

مصرع اول میں کیجئے کے ساتھ خطاب کیا ہے اور دوسرے میں تم سے" یہ بحر پر موقوف نہیں بلکہ اس زمانے تک اکثر معاصرین بحر جنکا شمار اساتذہ میں ہے اس کے تارک تھے" ان کے بعد متاخرین نے اس اختلاف خطابات سے احتراز کیا" میں ہی انہیں تارکین میں ہوں "یہاں برہم اب خط لکھا ہے تو لکھتے رہو پھر ایسا خوطہ نہ لگانا کہ مہینوں کی خبر نہ لو" خدا کرے اس خط کے پہنچنے تک تمہاری طبیعت صاف ہو گئی ہو اور مژدہ صحت و نخواہ جلد سامعہ نوازی کرے" "خداوند تعالیٰ ہر جگہ آپ کو رسا اور کامروا رکھے میں بھی حسن یاد آوری کا شکر گزار ہوں" "بارش یہاں بھی دسویں صفر سے جو شاجوش ہے" "صنمخانۂ عشق کو قطرۂ ثانی سے مکمل و مہذب کر لیا ہے کچھ کسر باقی ہے۔۔۔۔۔ یہ دیوان دیوان اول سے بدرجہا اولے تر ہے باعتبار زبان اور مزے کے اور باعتبار بلاغت کے بھی"۔

حکیم عابد علی کوشکے نام "مدفن بکسر فا لغتہ صحیح" پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے اچھا نہ معلوم ہو نہ کیئے میں نے بھی کہیں نہیں کہا خلد آشیاں نے موزوں کیا تھا" بہت چرچا رہا" مگر بہت نہیں کی تھی کہ لفظ صحیح ہے چقماش بمعنی جنگ شمشیر غیاث میں بفتح لام ہے" اور اردو میں بکسر لام انبوہ کے معنی میں ہے۔ خانۂ کعبہ کا ترجمہ کعبے کا گھر بالکل مستعمل نہیں اور نہایت برا معلوم ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ ترکیب اضافی نہیں ہے ترکیب توصیفی یا بدل مبدل منہ ہے پھر کعبے کا گھر کیونکر درست ہوگا" آپ کسی سے تو لڑئے نہیں اور سمجھیے

[1] شاعرانہ نثر کی یہ پسندیدہ مثال ملاحظہ طلب ہے۔ حسرت۔

کہ غلط ہی یاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر اگر کوئی آپ سے پوچھتا ہے تو سمجھا دیجئے کہ میرا تو یہ خیال ہے پھر وہ تاویلات کرے تو چپ ہو رہیئے۔

"گڑہنا" اور "گڑہنا" دونوں صحیح ہیں مگر گڑہنا شعرا کے کلام میں نہیں پایا جاتا فصحائے لکھنو گڑہنا کو ترجیح دیتے ہیں "بہانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے" اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے" "مہیں" میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں ابتک نظر سے نہیں گزرا حکم اس کو استعمال کا نہیں دیا جا سکتا حضرت اسیر مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہ گیا اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے انکھڑیاں چشم معشوق کے لیے مخصوص ہی اور یہ لفظ مجھے پسند ہی بدنا لفظ نہیں ہے بوہنا ہی اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہی صبا ؎

شور جسکا ہی وہ ہے عشق جنوں زا دل میں ۔ بدہ گیا ہے کہیں حسن کا سودا دل میں

حضرت زاہد سہارنپوری کے نام "عین الانسان وانسان العین پیارے زاہد حسین صانکم اللہ عن کل شین" ۹ ستمبر کی تحریر سعادت خمیر نور افروز نظر منظر ہوئی "دمل لفظ عربی ہے دمامیل اس کی جمع ہے۔ دنبل صحیح نہیں آپ کے قلم سے کسی جگہ یونہی نکلا لہذا اطلاعاً لکھا گیا ہی" اب بتانے کی یہ بات رہی کہ مشتری ستارہ مذکر ہے یا مونث واضح ہو کہ یہ ستارہ مونث ہی اور جہاں کہیں سخندانوں اور سخنوروں نے استعمال تذکیر کیا ہے وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے جیسے ناسخ کے اس مطلع پر ؎

بلبل ہوں بوستاں جناب امیر کا ۔ روح القدس ہے نام میرے ہمصفیر کا

ان کے شاگرد رشید مرزا محمد رضا برق نے جو مصرعے لگائے ہیں اس میں قمری کو جس کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں تذکیر استعمال کیا ہے تو بات یہ ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود نہیں ہے وہ تضمین یہ ہی۔ ؎ پروانہ ہوں ازل سے سراج منیر کا + قمری ہوں سرو باغ علی کبیر کا + میں نغمہ سنج ہوں چمن بے نظیر کا + بلبل ہوں بوستاں الخ۔

جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا۔ وہاں مشتری سے دولہا ہی مقصود ہوگا جیسے قمری سے برق کے شعر میں عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہی"

جامع مکتوبات حضرت ثاقب کے نام "اگر اردو زبان میں کچھ موزوں کرنے کا اتفاق ہوتا ہو تو طرح دامن گلچیں میں طبع آزمائی ضرور فرمائی جائے کہ اس کی رونق بڑھے اور ترتیب حرف تہجی میں آپ کے تخلص سے تاے مثلثہ کا گھر آباد ہو کہ وہ ویران پڑا ہے"

تذکرہ انتخاب یادگار حسب فرمایش سرکار مرتب ہوا اور چھپکر سرکار میں داخل ہوا میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیہ احباب کروں علی الخصوص یہ تذکرہ جس میں مجھکو حالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں اپنی مداخلت ہے یہ قلم کو دست کاتب میں"

فصیح الملک مرزا داغ کے نام "میاں کبھی کسی مزار پر انوار پر جانا ہو تو ذرا اس سیہ کار کے حق میں بھی دعاے حسن ختام کرنا ہر نفس نفس واپسیں ہے دیکھا چاہیے کیا معاملہ پیش آتا ہے پیارے داغ! افسوس کہ میں نے جمعہ سے کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف متوجہ کی سنی" اے میرے اللہ مجھ ناصح بے معنی کو جو خود فضیحت ہے اور اوروں کو نصیحت کر رہا ہے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے مرضیات میں کوشش کی توفیق دے اور میرے عزیز دوستوں کی عمر و بقا مرا نہ ہی اپنے انوار رحمت سے بھر دے آمین"

مولوی نور الحسن خلف حضرت محسن کاکوروی کے نام "مسالا معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کا مفرد ہے جو عربی میں مصلحت کی جمع ہے اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی محل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے جیسے عمارت کے لیے چونا، سرخی وغیرہ تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے، کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لیے گوٹا، پٹھا، نفت، کناری کھانے کے لیے لونگ، الائچی، دھنیا، مرچ، بال دھونے کا مسالا، محرم کا مسالا، مسالے کا تیل، دقی والے اصل کی طرف جاتے ہیں مگر چونکہ زبانوں پر مصالحہ نہیں ہے یعنی کوئی یہ نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا، گرم مصالح ہو گیا، کرتی میں مصالح کم پڑا اب کے محرم کا مصالح ہمکو نہیں دیا، اس لیے میری رائے ہے کہ اردو میں جو بولیں وہی لکھیں، جس طرح مسالا بولتے ہیں اسی طرح لکھا ہی جائے، اور یہی مشرب متوسطین متاخرین شعراے لکھنؤ کا ہے، جیسا رشک نے لغت میں لکھا ہے "مسالا میم مفتوح، سین

مہملہ ولام بالف کشیدہ ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات رونق ولذت آں چیز شود ظاہرا
ایں لغت از مصالح باشد اور ہی کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت گلشن فیض میں کی ہے میسر
مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے ؎

کلک چیرکنے کو مانگے جراحت دل پر ۔۔۔ جو دیکھے آپ کے موباف کا مسالا سانپ

کالا سانپ اور پالا سانپ زمین ہے ؎

کسی کے سینۂ سوزاں سے کیا نشہ میں نہیں ہے ۔۔۔ کباب دل کی کچھ کچھ آبگوکرتی کے مسلے ہیں

لالے میں پیالے میں زمین ہے اور جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے
کہ محلات لکھنو میں بھی یہی بول چال تھی ؎

لے جان ایسا چاٹی سے نپٹا پیچ کر ۔۔۔ اگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا

حضرت صفیر بلگرامی نے مذکورۂ جلد ہذا میں امیر مرحوم کا حال اور عظیم آباد میں
حضرت شاداب کے دولتکدے پر ان سے ہوئی ملاقات کا ذکر درج کرکے ایک خط بھی نقل کیا
ہے ہم اس مکتوب کو بھی اس مضمون میں شامل کئے دیتے ہیں ابو ہذا۔

حضرت صفیر بلگرامی کے نام

بابل شیراز و طوطی ہند کے ہمصفیر سلامت۔

سلام مسنون انتالیس پیاس منحوس سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی
پرستاری نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات احباب
سے سفر میں پائیں تیسرے دن گزشتہ لکھوں تو مظر مثبہ ہو جائے کتنے ہی عزیز چل بسے
خدا مغفرت فرمائے اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فقیر نام کے امیر کو یہ نہ
سمجھیں کہ وطن پہنچکر آپ کی مہربانیوں اور قدردانیوں کی لذت بھول گیا نہیں نہیں اسے یاد ہیں
امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیجکر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب
کی آرزو ہی زیادہ حاجت تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ ۔ ۹ دسمبر ۱۸۸۸ء

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک	تنقید رسائل و کتب Islamic Fraternity	دو شلنگ یا ۸ر فی پرچہ ۰۲

اخبار اسلامک فریٹرنٹی - ٹوکیو

ہمارے قدیم کرم فرما مولوی محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی خدمت اسلام میں ہر وقت اور ہر حال میں سرگرم رہتے ہیں۔ نیویارک میں آپ جب تک رہے برابر امریکن اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے آجکل آپ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو زبان کے پروفیسر ہیں یہاں سے بھی اپنے تمام مشاغل سے وقت بچا کر آپ نے ایک ماہوار اخبار اسلامک فریٹرنٹی نکالنا شروع کیا ہے جس کی پہلی جلد مارچ ۱۹۱۰ء میں ختم ہو گئی ہے اور اب اپریل ۱۹۱۱ء سے دوسری جلد شروع ہو گی۔ حامیان اسلام کے لیے اس اخبار کی خریداری کا یہ موقع بہت اچھا ہے اس کے اجرا سے مولوی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ وابستگان ملت بیضا میں پیوند اخوت مستحکم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانان عالم اور دیگر مذاہب کے درمیان سلسلہ اتحاد و آشتی کی صورت پیدا ہو" مولوی صاحب کا پتہ یہ ہے:-

مولوی محمد برکت اللہ ۴۰ ڈائی ماچی اکا کا کو ٹوکیو (جاپان)

فروری ۱۹۱۰ء کے پرچے میں زیر عنوان "خلیفہ اسلام سلطان محمد خامس" ایک قابل غور مضمون شائع ہوا ہے جس کے ضمن میں مولوی صاحب نے تمام اسلامی ممالک کو یورپین خطرے کے مقابلے میں متحد ہو جانے کی جو قابل قدر صلاح دی ہے اس پر کاربند ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ حریت، مساوات اور برداری کو اسلام کا اصل اصول سمجھنا چاہیے جب سے مسلمانوں نے اس اصول کی پابندی ترک کر دی اسی وقت سے انکا تنزل اور یورپین طاقتوں کا عروج شروع ہوا۔ خدا کا شکر کہ ایک عرصہ دراز کے بعد مسلمانوں نے اپنے سوشلزم کے قدیمی اور صحیح اصول کو از سر نو اختیار کرنا شروع کر دیا ہے چنانچہ ٹرکی و ایران میں جمہوری حکومت قائم ہی ہو گئی ہے۔ لیکن اہل مغرب کو جو ہمیشہ مشرقی اور اسلامی سلطنتوں کو باہم تقسیم کر لینے کے درپے رہا کرتے ہیں ان ممالک کی یہ آزادی اور جمہوری استحکام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ البانیا کی بغاوت یمن کی شورش ایران

Translator Mr. Barkatullah No 40 Dai machi 1 Akasaka Ku Tokyo (Japan).

کی بدنظمی غرضکہ تمام خرابیوں کا سب سے قوی سبب یہی ہے کہ باغیوں کو خفیہ امداد اور آلات حرب بہم پہنچا کر یورپین طاقتیں اسلامی ممالک کو ہمیشہ اندرونی جھگڑوں میں مبتلا رکھنا چاہتی ہیں تاکہ انہیں اپنی بری و بحری فوج کی ترتیب نیز وسائل ترقی کی اختیار کرنیکا کسی طرح سے کوئی موقع ہی نہ مل سکے لارڈ کرزن نے اپنے رکٹورل ایڈریس گلاسگو میں صاف صاف اشارہ کر دیا ہے کہ اہل مغرب کو ٹرکی ایران افغانستان اور عرب وہی کچھ کرنا ہے جو وہ وسط ایشیا ہندوستان اور انڈوچائنا میں کر چکے ہیں۔ ایسی حالت مسلمانان عالم کا فرض ہے کہ حفاظت اسلام کا ایک خاص فنڈ قائم کر کے ٹرکی و ایران کو مالی اعانت پہنچائیں اور فرانس انگلستان و روس کے مقابلے میں تمام اسلامی ممالک کو لازم ہے کہ متحد ہو کر اپنے قیام و بقا کی فکر کریں اور مذہبی اختلافات کو فراموش کر دیں جسکی ایک قابل قبول صورت نادر شاہ درانی نے یہ تجویز کی تھی کہ حنفی شافعی مالکی اور حنبلی مصلوں کے مانند مسجد مکہ میں اہل تشیع کا ایک پانچواں جعفری مصلی قائم کر دیا جائے تاکہ شیعہ سنی کا اختلاف اس سے زیادہ باقی نہ رہے جتنا مثلاً حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مولوی برکت اللہ صاحب کو امید ہے کہ انکے پرانے اور عزیز دوست عبداللہ آفندی ترکی پارلیمنٹ میں اس مسئلے کو ضرور پیش کرینگے اور جب تک وہ منظور نہ ہوگا برابر اس پر زور دیتے رہیں گے۔

حجم ۱۲ صفحے ہفتے میں دو بار	**اخبار وکیل امرتسر** اور مسلم یونیورسٹی	قیمت سالانہ مع محصول ۲ روپے صرف للعہ

زبان کی صحت اور لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے زمیندار کی طرح وکیل بھی ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے جس کے اڈیٹوریل مضامین کی آزادی کا مقابلہ نسبتاً کوئی دوسرا اسلامی اخبار نہیں کر سکتا مثلاً ۲۰ اپریل کے پرچے میں مسلم یونیورسٹی اور عام رائے کے مطالبے پر ایک قابل قدر مضمون نکلا ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ قائم ہونیوالی مسلم یونیورسٹی کو بہر حیثیت حکومت کی ماتحتی سے آزاد رہنا چاہئے۔ اس کا چانسلر مسلمان ہو اور اس کی عنان انتظام بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کی تعلیمی زبان اردو رکھی جائے

یہ سچ ہے کہ اردو زبان کا علمی ذخیرہ ابھی بالکل ہی ناقابل اطمینان حالت میں ہے مگر مدعا یہ نہیں ہے کہ اس تحریک پر ابھی سے عملدرآمد شروع ہو جائے بلکہ عرض یہ ہے کہ اصولاً یہ مسئلہ طے ہو جانا چاہئے اور اسکو عملی صورت میں لانے کے لیے یونیورسٹی کے ماتحت مغربی علوم و فنون کے ترجمہ و تالیف کا ایک محکمہ کھول دینا چاہئے۔ حکومت سے آزادی کے متعلق ہم کچھ لکھنا نہیں چاہتے اس لیے کہ متوسلین علی گڑھ کے دلوں میں محکومی اختیار کی محبت اسدرجہ راسخ ہو گئی ہے کہ ان سے کسی قسم کی آزاد خیالی کی توقع رکھنا خیال است و محال است و جنون است البتہ مسئلہ زبان کی نسبت ہم یہی کہیں گے کہ جب تک تحصیل علوم سے قبل ایک غیر زبان کے سیکھنے میں زمانہ طالبعلمی کے بہترین دس بارہ سال ضائع ہوا کریں گے اسوقت تک مسلم یونیورسٹی سے کسی حقیقی فائدے کی امید کرنا عبث ہے[1] کہ انگریزی میں ہر ہفتے علوم و فنون کا اتنا ذخیرہ مہیا ہو جاتا ہے جسکا اردو ترجمہ سال بھر میں بھی نہیں ہو سکتا محض فضول ہے اس لیے کہ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی[2] کی تعلیم بدستور لازمی رہیگی جس کی مدد سے طالبعلم حسب استعداد اپنی معلومات وسیع کر سکیں گے تاریخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی سائنس۔ پولیٹیکل اکانومی منطق۔ فلسفہ وغیرہ کی جو کتابیں ابتدا اردو میں ہوں گی۔ جنکے پڑھنے سمجھنے۔ یاد کرنے اور پڑھنے کے بعد اسی قسم کی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے میں بے انتہا آسانی ہو جانے کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طالبعلموں کو ابتدا ہی سے تحصیل علوم کا موقع مل سکیگا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے اردو کو تعلیمی زبان قرار نہ دیا تو ہندو یونیورسٹی ترجمہ علوم و فنون سے مالا مال ہو کر ہندی اسے ایسی شکست دیگی کہ پھر اسکا کہیں ٹھکانا نہ رہیگا اور مسلمان لیڈروں کی بانی ہماری چھ کا نام آئیگا

اڈیٹر ظفر علیخان صاحب بی اے علیگ | **اخبار زمیندار لاہور** | قیمت سالانہ مع محصولڈاک ۱۰

نقل مکان کر کے یکم مئی سنہ ۱۹۱۶ء سے اخبار زمیندار کرم آباد کے بجائے لاہور سے شائع ہونیلگا ہے یہ اخبار بڑی تقطیع کے ۱۲ صفحوں پر جو پیسہ اخبار اور ہندوستان کے ۲۴ صفحوں کے برابر ہوتے ہیں مہینے میں چار بار شائع ہوتا ہے اسکے اڈیٹر اردو زبان کے ایک مشہور انشاپرداز ہیں یہی وجہ ہے کہ لٹریچر کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی اخبار اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اخبار حیثیت سے بھی اسکی خوبی میں کلام نہیں۔ ہم ناظرین اردو سے معلی سے اس کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں۔

[1] موجودہ صورت میں علوم کی تعلیم کا آغاز ایف۔ اے بی اے سے قبل نہیں ہو سکتا۔

غزل جناب مولوی عبدالاحد صاحب شمشاد لکھنوی مدظلہ العالی

روز غم کیوں روشنی سے تیرگی ہمدوش ہے
دود دل کیا ساغر خورشید کا سرپوش ہے

بدزبانی کج بیانی کا سراسر جوش ہے
اور جو فصح ہے انکم سے سو خاموش ہے

بیخودی کی جس کے دل میں کچھ لذت نہیں
ہوش کا پتلا سہی لیکن بڑا بیہوش ہے

جو رہا قدرت نے ہیں نے بے تکلف لے لیا
یہ نہ پوچھا میرے حق میں نیش ہے یا نوش ہے

یہ مری تقدیر کی خوبی ہے میں محو ہوں
میکدے میں ہر طرف آواز نوشا نوش ہے

بستی نے یہ کمر میری یاری نالہ ہی
ایک ساغر اسکو کیا دوں یہ تو دریا نوش ہے

آسمانوں کو لیے پھرتا ہے جو شکل حباب
میری دریا بار آنکھوں کا یہ ادنے جوش ہے

وائے غفلت رفتے والوں کو نہیں اس کی خبر
ہر طفل اشک حلقہ آنکھ کا آغوش ہے

ضبط سے ہونے لگا مینائے دل کیوں پاش پاش
عشق چشم مست ہے یا بادہ پر جوش ہے

درد ہجراں کی شب جھل آگئی کیا دل کو یا
شام ہی سے شمع صبح کیوں خاموش ہے

نقد دل تو لے چکا ایمان کی اب فکر کیا
اے بت کافر ترا دل سخت ناحق کوش ہے

میکدے پر جھوم کر بادل نہیں آئے ہیں یہ
دامن رحمت کسی کا ذیل عصیاں پوش ہے

اے شمشاد پڑھ دو تم ہی اپنے شعر تر
ایک گل اندام سننے کو سراپا گوش ہے

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

جو تجھ سے ہو سکے تو کاوش اتنا جسم تر کر دے
کہ درد دل کی اسکو پردے پردے میں خبر کر دے

اک آہ ناتواں کافی ہے شرح قصہ غم کو
حکایت یہ نہ طولانی ہے اے دل مختصر کر دے

مری امید ہے امید گویا نا امیدی کی
اثر کی آرزو شاید دعا کو بے اثر کر دے

تجھی کو مضطرب رکھتی ہے تو سے دلکی بیتابی
میں جب جانوں کہ اس کافر کے دلکو بھی جگر کر دے

حکایت میں کروں کیا خود ہی سکتا ہوں نہ کا
مجھے بیتاب اگر خود خواہش زخم جگر کر دے

نہ ہو امید صبح عشرت میں شب غم کو بسر کر دے
امید صبح عشرت میں شب غم کو بسر کر دے

ہے اک مختصر سی زندگی کا فکر نہیں مرنے
کہ اپنی عمر کو تو جسطرح چاہے بسر کر دے

[illegible] مرجاتا ہوں اب کیا ہے
تری شکیں دلی میرا ہی پتھر کا جگر کر دے

سیہ ہے تیرے گیسو کی طرح غمخانۂ عاشق
رخ روشن کو اکدن آفتاب بام و در کر دے

گراں ہوتا ہی طبع شعر کو طول سخن وحشت
اگر یہ لطف رکھنا ہے غزل کو مختصر کر دے

غزل جناب مولانا شفق عماد پوری شاگرد امیر مینائی مرحوم

آنسو ہوئے کیوں جاری کیوں دل ہوا گرویدہ
کیا دیکھ لیا تو نے اے دیدۂ نم دیدہ

زاہد کی گلی آئے رندوں کے تصدق میں
بے مانگے جو مل جائے دردِ تہ نوشیدہ

شمشاد کی کیا ہستی طوبیٰ کو بھی ہے پستی
بالا ہے صنوبر سے سروِ قد بالیدہ

در ہے نہ کوئی روزن دیوانے کدھر جائیں
دیواریں ہیں زنداں کی وقفِ سر شوریدہ

گلچیں کا بھی کٹتا ہی صرصر کا بھی دہڑکا ہے
گل رنگ پریدہ ہیں سبزہ بھی ہی کاہیدہ

زاہد تری طاعت ہو یا میری ندامت ہو
رحمت کو پسند آئے جو کار پسندیدہ

سنتے تھے شفق دیکھا تل اوٹ پہاڑ اوجھل
ہے مردم دیدہ میں اک جلوۂ نادیدہ

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اجنکڑہ

میہمان ہو مرے گھر میں مجھے باوری نہیں
وہ صنم وعدہ شکن ہی ہے ستمگر ہی نہیں

کوہ و صحرا میں بگولوں کی طرح پھرتے ہیں
آپ کے خانہ بدوشوں کا کہیں گھر ہی نہیں

خلد میں بھی نظر آتے ہیں مئے عشق کے مست
جگمتا بادہ کشو کا لبِ کوثر ہی نہیں

جان ہی طائر بسمل کی طرح ہے بیتاب
میرے پہلو میں تپاں اک دلِ مضطر ہی نہیں

دل میں ہی سوز محبت نہ کوئی گرمی عشق
دیکھنے آئے ہو کیا اب کہ وہ اخگر ہی نہیں

غزل جناب سید اعجاز حسین صاحب اعجاز لکھنوی تلمیذ مشتاق مرحوم

سر آئے اشک دل میں بڑھ گیا جب سوز غم میرا
عرق کی طرح بکھر آگیا آنکھوں میں دم میرا

عجب سلطان شاہانہ ہے ہنگام رقم میرا
نشانِ آمد فوج مصاعب میں ہے قلم میرا

میرے اشعار بے اصلاح ہیں پھولوں کے گلدستے
برنگ شاخ گل ہی نا تراشیدہ قلم میرا

ہوا نے خاک اڑائی رہروؤں نے ٹھوکریں دیں
رہا میری طرح ثابت قدم نقش قدم میرا

بظاہر اسکے اظہار مسرت جیسے کیا میں نے
پشیماں ہو کے قاتل نے کہا ہے ہے ستم میرا

میرے دل میں تصور اسکا قاتل کو انا الحق کا
خلاف حق نہیں ہے نعرۂ منصور دم میرا

مری رفتار سے شکل قلم مطلب ٹپکتا ہے
ارادہ دل کا کرتا ہے عیاں نقش قدم میرا

غزل مولوی سید امین الحسن صاحب بسمل موہانی

زمانہ نے چھوڑا یا کیا تعلق میگساری سے
ہے میخانہ میں سناٹا میری پرہیزگاری سے

بظاہر ترک الفت سے تڑپ دبی ہوئی دل کی
میں سمجھا تا کہ فرصت ملگئی اب بیقراری سے

جنون فتنہ زا کیا جانے کیا آفت اٹھائیگا
ذرہ دامن بچائے اوستمگر ہوشیاری سے

جو دل پر ہاتھ رکھا آپ نے غم تھا نہ حسرتی
مریض آدھا تو اچھا ہو گیا تیمارداری سے

حیا مانع نہیں مجھسے وہ ملتا ہے مگر بسمل
نظر اٹھتی نہیں اس بیوفا کی شرمساری سے

غزل حسرت موہانی

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکون کی صورت
جب سے اس ساعد رنگیں کو کھلا دیکھا ہے

پھر اسی لطف ستم کوش کا مشتاق ہے دل
ہمنے جس لطف کو ہمرنگ جفا دیکھا ہے

تجھ میں کچھ بات ہے جو کسی میں نہ ملی
یوں تو اوروں سے بھی دل ہمنے لگا دیکھا ہے

دل بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت
نگہ شوق نے کیا جانیئے کیا دیکھا ہے

ولہ

ماخوذ از رسالہ ادیب الہ آباد

محبوبی و رنگینی ہیں جسم و بدن تیری
سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

مجبور وفا کرکے محروم کرم کرنا
بھولینگی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

باطن میں وہ ہمیری ظاہر میں یہ دلجوئی
ہم خوب سمجھتے ہیں ترکیب سخن تیری

خارنگر تکیں ہے۔ آشوب دل و دیں ہی
یہ طرز نکو تیرا یہ وضع حسن تیری

جو ہم سے چھپائی تھیں ہمکو نہ بتائی تھیں
روشن ہیں وہ سب ہم پر باتیں من و تن تیری

اب رونے سے کیا ہوگا یہ وہی بے پروا
برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری

اس شاہد رعنا کے اکرام اقامت سے
تقدیر چمک اٹھی اے ملک دکن تیری

تنہائی غربت سے مغموم ہو حسرت
کب تک نہ خبر لینگے یاران وطن تیری

نوید مقدم شاہی [1]

از افکار تازہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سابق مدرس فارسی گورنمنٹ نارمل اسکول آگرہ

نوبہار بوستاں آنے کو ہے — خسرو گل ہم عنان آنے کو ہے
بہر استقبال رایات بہار — لشکر سرو رواں آنے کو ہے
ابر گوہر بار بحر مغربی — سوئے مشرق در فشاں آنے کو ہے
راہ دریائے سفینوں کی قطار — صورت سیارگاں آنیکو ہے
نوجواں بنگرگاہ خلق میں — استخوان استاں آنیکو ہے
جام صحت بنکے بزم عیش میں — گردش رطل گراں آنے کو ہے
طاقہ طاقہ محمل روم و فرنگ — فرش راہ دوستاں آنیکو ہے
طبلہ طبلہ منگ تاتار و ختن — حسب حکم نیسرباں آنے کو ہے
سیکے جنس نادرات روزگار — مجمع بازارگاں آنے کو ہے
مرہم آفاق کا جمع غفیر — کاروان در کاروان آنے کو ہے
ہر طرف سے لشکر آراستہ — مثل دریائے رواں آنے کو ہے
جانب چین و ختن و گنج ستاں — جانب ہندوستاں آنے کو ہے
مژدہ رسانے والی کی نوبت ہر سمت میں — مرحبا من دامان آنے کو ہے
صرف و نفعت کی گراں مایہ متاع — بر سبیل ارمغان آنے کو ہے
مقدمہ شہ میں زبان خلق پر — شاہنشاہ دیوان آنے کو ہے
[illegible] — آخر سال رواں آنے کو ہے

صرف مقدم [illegible] کے بعد [illegible] ۱۹۰۱ء [illegible] کو استاد [illegible] فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون [illegible] کا تذکرہ [illegible] اردو [illegible] دیوان [illegible] مولوی سید [illegible] آغا طباطبائی نظم لکھنوی نے بکمال لطف و [illegible] فرمائی [illegible] دیوان کا انتخاب بطور [illegible] اردو معلی میں [illegible]

[1] رسالہ ادیب الہ آباد سے [illegible] سے حوالہ لکھنؤ نقل کیا گیا۔

ضمیمہ اردوے معلیٰ بابت ماہ مئی ۱۹۱۱ء

مجموعہ غزلیات

مشاعرہ علی گڑھ

منعقدہ ۱۲ فروری ۱۹۱۱ء

جسکو

سید فضل الحسن حسرت موہانی نے بفرمایش منشی منگل سین صاحب بیدل جہنجانوی اپنے

اردو پریس علی گڑھ میں چھاپا اور شائع کیا

تمہید

علیگڈھ میں ہر سال ماہ فروری کے شروع میں ایک پسندیدہ میلہ ہوا کرتا ہے جس میں ضلع کی پیداوار اور دوسری صنعتی چیزوں کی نمائش کے علاوہ گھوڑوں اور متفرق تجارتی سامان کی بھی اچھی بکری ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر ضلع کے تمام رؤسا اپنے اپنے خیمے مقام نمائش سے متصل قائم کر کے سات آٹھ روز تک مصروف سیر و تماشا رہتے ہیں۔ گھوڑوں اور دنگلوں میں بھی اچھا مجمع ہو جاتا ہے۔

اس سال منشی منگل سین[1] صاحب بیدل جہنجانوی نے ان دلچسپیوں پر ایک اور جدید اضافہ کیا یعنی ایک سالانہ مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اشتہار قبل سے چھاپ کر ضلع و نواح ضلع کے شعرا کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۲۔ فروری کو یہ مشاعرہ منشی رام دیال صاحب نظر رئیس علی گڑھ کے خیمے میں منعقد ہوا۔ اور دیر تک شعر و شاعری کے چرچے سے حاضرین محظوظ ہوتے رہے۔

طرحیں دو قرار پائی تھیں (۱) تیرا گناہگار ہوں تیرے سوا ہے کیا
(۲) آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہو گا

بعض شعرا نے دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کی تھی اور بعض نے صرف ایک میں بہرحال ان غزلوں میں سے جسقدر دستیاب ہوئیں انکا مجموعہ تفریح طبع ناظرین کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

---

[1] نمائش کے انتظام میں منشی صاحب بھی شریک تھے۔ چنانچہ حسن کارگزاری کے صلے میں آپ کو حاکم ضلع نے انعام سے بھی سرفراز کیا ہے۔

بسم اللہ

جناب سید مخدوم عالم صاحب اثر مارہروی

یہ تو بتا اثر کہ تجھے ہو گیا ہے کیا
تو ہی اس انجمن کا نکالا ہوا ہے کیا

آتا نہیں سمجھ میں کہ خط میں لکھا ہے کیا
یہ بھی کوئی نوشتۂ کلک قضا ہے کیا

ساقی پناہِ خلق ترا آستانہ ہے
پھر جاؤں ترے در سے مرا سر پھرا ہے کیا

ہر ذرہ آفتاب سے کرتا ہے روشناس
آئینہ مجاز حقیقت نما ہے کیا؟

بدمست کر دیا ہے ہوائے بہار نے
سنا کہ عندلیب کی دلکش صدا ہے کیا

تیرا امیدوار کس امید پر رہوں
تو آپ آ کے دیکھ تو مجھ میں رہا ہے کیا

میں اور نا امید ہوں درگاہ سے تری
آمرزگار تو ہے تو میری خطا ہے کیا

ان کا ہی میں شکار ہوں اور میری سادگی
ان سے ہی پوچھتا ہوں کہ مجھکو ہوا ہے کیا

اے شوق بڑھ کے یار کے قدموں پہ لوٹ جا
دیوانہ ہو گیا ہے کڑا سوچتا ہے کیا

آخر کسی کا ہو کے رہے ہی غریب دل
میرا اگر نہیں ہے تو پھر آپ کا ہے کیا

کیوں ہم کلام مجھ سے ہوں خلوت میں اے اثر
وہ خوب جانتے ہیں ترا مدعا ہے کیا

جناب سید علی احسن صاحب احسن مارہروی

خوش بہت عشق سے اول دل ناداں ہوگا
مگر انجام یہ ہوگا کہ پشیماں ہوگا

سب سے بیگانہ جو مجھسا کوئی انساں ہوگا
آپ کے سر کی قسم آپ کا خواہاں ہوگا

عیش ہے منحصر اے وقت مساعد تجھپر
تو نہ ہوگا تو نہ پورا کوئی ارماں ہوگا

خواب میں دل کو جدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے
اس کی تعبیر یہ ہے عشق حسیناں ہوگا

اپنے مہجور کو تیروں کا نشانہ نہ بنا
تیر کیا تیرا تصور سے پیکاں ہوگا

کیوں نہ اغیار ہیں اُس چمن حسن کے ساتھ
کیا کہیں کانٹوں سے خالی ہی گلستاں ہوگا

خاک دیکھے یہ تو مجھ سا پشیماں خاطر
وہ بھی میری ہی طرح سر بگریباں ہوگا

کوئی غم عشق میں ایسا نہ بچے گا جو نہو
کل ہوا صدمۂ دل آج غم جاں ہوگا

قتل کچھ بات نہیں وصل محالات نہیں
تم جو چاہو گے تو دشوار بھی آساں ہوگا

کس بھروسے پہ شب غم کوئی مرنا چاہے
قبر میں بھی وہی رنگ شب ہجراں ہوگا

اے دل حسن طلب ناز بجا ہے تیرا
کیا خبر تھی کہ وہ خود بھی ترا خواہاں ہوگا

ایک دیدار کی حسرت ہی نہیں مایۂ عشق
دل سلامت ہی تو سب کچھ مجھے ارماں ہوگا

پھانس چبھ کر جو نکل جائے تو کیا اُس خلش
ہی وہی درد جو ناقابل درماں ہوگا

فصل ہوگی تو حواسوں میں نہ آئے گا خلل
عشق ہوگا تو یہ مجموعہ پریشاں ہوگا

ہے شہیدوں کی جو ان کے ہی کثرت حسن
ایک دن سارا جہاں گنج شہیداں ہوگا

دیگر

اے دل نہ آئے وہ تو کہوں کیا ہوا ہی کیا
تقدیر کا بگاڑ ہے تدبیر کا ہی کیا

غفلت شعاریوں نے غضب یہ کیا ہی کیا
مجکو خبر نہیں مرے دل کو ہوا ہے کیا

سودا نہیں ہی مجکو تو پھر یہ بلا ہے کیا
دل دے کے کہہ رہا ہوں کہ میرا گیا ہی کیا

کس کا نیا سا نام یہ تو لے رہا ہی آج
میرے سوا بھی کوئی ترا مبتلا ہے کیا

پہلو میں جب سے دل نہیں خانہ بدوش ہیں
ہم کیا بتائیں ہائے ہمارا پتا ہے کیا

رہنے دے اے صبا نہ نگہ نکہت چمن
ہاں یہ پتا بتا کہ وہاں کی ہوا ہے کیا

اے برق ہمتو دل کے لیے بے قرار ہیں
تیری نعل سے بھی کوئی ظالم جدا ہے کیا

خاک آستاں کی تیرے نہیں ہی اگر مفید
پھر میرے درد دل کی مگر دوا ہے کیا

فخر اور دکھتے ہیں مجھے خودکشی سے کیوں
مرنے میں درد دل سے اذیت سوا ہی کیا

لیتا ہی بزم غیر میں نام اس کا بار بار
وہ بدحواس دل ہے تجھے ہو گیا ہے کیا

حاضر ہیں امتحاں کو جاں باز ہر طرح
تلوار کیا ہی زہر ہی کیا شے قضا ہے کیا

آتے ہی شام وعدہ یہاں ہو رہی دھوم
لیکن خبر نہیں کہ وہاں ہو رہا ہے کیا

تم آؤ گے تو ہم شبِ وعدہ بتائیں گے
تاثیر کیا ہی اور ہمارا دعا ہے کیا

اپنے نیازمند سے رہتا ہے بے نیاز
اے حسن دلفریب یہ تیری ادا ہی کیا

احسن کے نام سے انہیں نفرت ہی کیلئے
پوچھو تو کوئی نام یہ اس کا برا ہے کیا

حضرت بیخود اترولوی

دور آنکھوں سے جو وہ ماہِ درخشاں ہوگا
صورت صبح مرا چاک گریباں ہوگا

سنبل یار سے سنبل ہی پریشاں ہوگا
آئینہ آئینۂ حسن سے حیراں ہوگا

زلف گر سورۂ واللیل ہے سر رشتہ دیں
آپ کا مصحفِ رخ بھی مرا ایماں ہوگا

آگیا چہرۂ دلبر کا تصور دل میں
جلوہ پرداز اسی میں مہ تاباں ہوگا

درد دل سوز جگر چھوڑ نہ جانا اس کو
بیخود خستہ جگر بے سر و سامان ہوگا

جناب منگل سین صاحب بیدل جہنجھانوی مہتمم مشاعرہ

یارب بصیبتِ دل درد آشنا ہے کیا
کہتی ہے موت ہائے اسے ہو گیا ہی کیا

حرماں نصیب کس سے کہے ماجرا ہی کیا
ترا گناہگار ہوں تیرے سوا ہے کیا

تا لطف پیتے خضر اگر ساغر فنا
تھوڑی سی عمر اس پہ یہ آب بقا ہی کیا

در پردہ ہیں رقیب سے میری شکایتیں
بے پردہ مجھ سے کج پہ ان کا گلا ہی کیا

پہلے تو خود ہو مثل عدو منکر وفا
پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ تو بیوفا ہی کیا

بیدل چلے ہو وادی ایمن کو دیکھنے
مثل کلیم تم کو یہ سودا ہوا ہے کیا

تم جو آجاؤ گے سرسبز گلستاں ہوگا
غنچے کھل جائیں گے گل دیکھکے خنداں ہوگا

خضر کے واسطے وہ چشمۂ حیواں ہوگا
سبزۂ خط جو ترے رخ پہ نمایاں ہوگا

کعبہ و دیر میں جلوا ترا یکساں ہوگا
بندۂ عشق ہر ایک گبر و مسلماں ہوگا

تم پریشاں نہ ہو سنکے مرا نالۂ دل
اور ہوگا کوئی کمبخت جو نالاں ہوگا

شرط انصاف ہی گر چرخ سے پتھر برسیں
یہ بھی میرے سر شوریدہ پہ احساں ہوگا

بے سبب پاؤں میں مہدی نہ لگائی تم نے
کج پامال کوئی کنج شہیداں ہوگا

کشتۂ زیست نہیں کشتۂ دیدار ہیں ہم
ڈوب مرنے کو ترا چاہ زنخداں ہوگا

دیکھ لے گا جو ترا جلوۂ حسن یکتا
گبر پھر گبر مسلماں نہ مسلماں ہوگا

ظلمت قبر سے مجھکو نہ ڈرا اے واعظ
خانۂ دل میں مرے وہ مہ تاباں ہوگا

آج کیا بات ہے اغیار سے وہ کہتے ہیں
کہئے اس بزم میں بیدل بھی غزلخواں ہوگا

جناب قاضی سید تہور علی صاحب تہور

بعد مرنے کے نہ کم شوق میری جاں ہوگا
روز محشر بھی تری دید کا ارماں ہوگا

کچھ بھی باقی نہ رہا چھیڑ کا ساماں دل میں
اب ہی کیا شکوہ کوتاہیٔ مژگاں ہوگا

گریہ ناکامی امید رہے گی قائم
جلد آباد تو اے شہر خموشاں ہوگا

جادۂ عیش تو سب برق نگہ نے پھونکا
کس کے آنکھوں میں ترا خواب پریشاں ہوگا

کس کو دے آئیں تہور دل ناشاد اپنا
کوئی اس جنس سبک قدر کا خواہاں ہوگا

جناب مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب
مدیر قند پارسی علی گڑھ

جز عشق اور شمع حریم بقا ہی کیا
اے عقل تو بتا کہ ترا مدعا ہے کیا

منزل ہے ایک راہ کا کچھ پھیر ہے تو ہو
ہنگامہ آفرینیِ عشق و ہوا ہے کیا

دل ہے کہ اک بہشت تصور زہی نصیب
تسخیر تیری یاد ہی راحت فزا ہی کیا

اللہ رے جانفزائیِ انوار عشق یار
حیراں ہے چشم شوق کہ یہ ماجرا ہی کیا

اک آگ ہی جہان میں گویا لگی ہوئی
نیرنگیِ جمالِ حقیقت نما ہے کیا

غفلت محیط عیش مہیا زمانہ رام
ان ظلمتوں میں نور کہاں ڈھونڈتا ہی کیا

جاتا ہوں ارجعی کی صدا پر بڑھا ہوا
میں بندۂ رضا ہوں مرا پوچھنا ہی کیا

رحمت وسیع دوست کی سرکار عذر جو
یہ ابتلا یہ شورشیں روز جزا ہے کیا

بدعت سے پاک شرک کا کھٹکا ذرا نہیں
ثاقب طریق سنت خیر الوریٰ ہے کیا

جناب سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے
اڈیٹر اردوئے معلی علیگڈھ

سرگرم ناز آپ کی شان جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کاریِ رنگ حیا ہے کیا

گرجوش آرزو کی ہیں کیفیتیں سی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار
عشق خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

ایک برق مضطرب ہی کہ اک سحر بے قرار
کچھ پوچھئے نہ دیکھ فتنہ زا ہے کیا

چل بھی دئے وہ چھین کے صبر و قرار دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بام یار سے ہے نردبان عشق
اے دل یہ جائے حوصلہ ہی دیکھتا ہی کیا

اس درجہ دلپذیر ہے آہنگ نغمہ کیوں
پنہاں لباس درد میں تیری صدا ہی کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہی کیا

مجھکو خبر نہیں کہ مرا مرتبا ہے کیا
یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا

ملتی کہاں گداز طبیعت کی لذتیں
رنج فراقِ یار بھی راحت فزا ہے کیا

حاضر ہی جانِ زار جو چاہو مجھے ہلاک
معلوم ہی تو ہو کہ تمہاری رضا ہے کیا

ہوں دردِ لادوا سے محبت کا مبتلا
مجھکو نہیں خبر کہ دوا کیا دعا ہے کیا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر
یہ دیکھئے مناسب شانِ عطا ہے کیا

ہیں بہترین صلح یہ ظاہر کی رنجشیں
ناحق ہوں میں ملول وہ مجھسے خفا ہے کیا

گر دیدہ جس سے تو ہی خبر بھی نہیں اُسے
پھر تیرے اضطراب کی حسرت نبا ہی کیا

ولہ

کیا کہئے آرزوے دل مبتلا ہے کیا
جب یہ بھی ہو خبر کہ وہ رنگیں ادا ہی کیا

کافی ہیں میرے بعد پشیمانیاں تری
میں کشتہ وفا ہوں مرا خونبہا ہے کیا

وقت کرم نہ پوچھے گا لطف عمیم یار
رند خراب حال ہے کیا پارسا ہے کیا

دیکھو جسے ہی راہ فنا کی طرف رواں
تیری محلسرا کا یہی راستا ہے کیا

ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

یوں شکر جور کرتے ہیں تیرے ادا شناس
گویا وہ جانتے ہی نہیں مدعا ہے کیا

رونے لگے ابھی سے کہ ہی ابتدائے حال
تمنے ابھی فسانۂ حسرت سنا ہے کیا

ولہ

ہم بندگاں درد پہ مشق جفا ہے کیا
دلجوئی وفا کا یہی مقتضا ہے کیا

مجھ رو میوں نے گھیر لیا ہے خیال کو
اے عشق یار تیری یہی انتہا ہے کیا

شوق لقائے یار کہاں میں حزیں کہاں
اے جان بے بقرار تجھے یہ ہوا ہی کیا

ہو جائے گی کبھی نہ کبھی جان نذر یار
بیمار عشق ہم ہیں ہماری شفا ہے کیا

لاکھوں کو جس نے صبر سے بیگانہ کر دیا
کیا کہئے آہ وہ نگہ آشنا ہے کیا

گرویدہ اسقدر ہی جو محرومیوں سے دل
اے دردیار تیری اسی میں بقا ہے کیا

سودائے عشق یار ملامت کی جا نہیں
حسرت کو پیر عقل یہ سمجھا رہا ہے کیا

جناب ابوالبیان محمد سید عالم صاحب خنجر مودودی مارہروی تلمیذ حضرت احسن مارہروی

گل اپنے رنگ و روپ پہ پھولا ہوا ہی کیا
دو دن کی بہار ہمیشہ رہا ہے کیا

بے چین ہی جو دل تو کسی کی خطا ہی کیا
قسمت کا ہی نگار خدا سے گلا ہی کیا

اسکو جلا کے خاک کر دوں تو بات کیا
یہ چرخ میری آہ کو سمجھا ہوا ہے کیا

ناصح جو بک رہا ہی تو پوچھے کوئی ذرا
مجکو تو ہے جنوں اسے ہو گیا ہی کیا

ناراض کیوں ہوے جو کہا تمکو بیمثال
تعریف حسن کی ہی کوئی بددعا ہی کیا

کیا خاک تجھسے حال زبوں ہمنشیں کہوں
مجکو ہی کب خبر ہی مجھے ہو گیا ہے کیا

یہ کیا کہا کہ وصل کی قیمت نہیں ہی دل
حاضر ہی جان بھی دل بے مدعا ہی کیا

کیوں بار بار دیکھ رہے ہو تم آئینہ
میری طرح تمہارا بھی دل آگیا ہی کیا

ہم ٹھان کر گئے تھے کہ سب کچھ کہیں گے دل
پوچھا نہ اس نے یہ بھی ترا مدعا ہی کیا

قاصد سمجھکے یار کا میں ساتھ ہو لیا
پیک قضا کا مجھ پہ یہ چکما چلا ہے کیا

بے پردہ ہوے تو بنی پردہ دار تو
اے بیخودی شوق تجھے ہو گیا ہی کیا

ارماں ہیں باغ باغ تو ہی آرزو نہال
داغوں سے صحن دل میں چمن سا کھلا ہی کیا

ضبط فغاں کی داد جو چاہی تو کہدیا
دنیا میں اک تو ہی فقط باوفا ہی کیا

غمخوار ہی کوئی تو کرے وہ دوا دل
یہ پوچھتا ہے کیا کہ تجھے ہو گیا ہی کیا

کعبے میں جس کو ڈھونڈتے ہو وہ تو دل میں ہے
خنجر تمہاری عقل پہ پردا پڑا ہے کیا

ولہ

دل نہ کانپے نہ اگر دیدۂ حیراں ہوگا
خاک حاصل تجھے نظارۂ جاناں ہوگا

کیا عجب عقدۂ دشوار جو آساں ہوگا
درد جب حد سے گزر جائے گا درماں ہوگا

بخت سیدھا جو مرا گردش دوراں ہوگا
خود بخود غیب سے تفریح کا ساماں ہوگا

غیر سے ربط تجھے مجھ سے قضا کو نفرت
کون حال دل بیمار کا پرساں ہوگا

قیس کی طرح مجھے دشت نوردی سے غرض
جوش وحشت سے مرا گھر ہی بیاباں ہوگا

ناوک ناز کو ترکش میں نہ ڈھونڈا او قاتل
کہ رگ جاں کی طرح وہ کہیں پنہاں ہوگا

مجھ سا خود رفتہ و حیراں تو نہ ہوگا کوئی
اک نظر جو مجھے دیکھے گا وہ حیراں ہوگا

اُن کو آنا ہی تو لوح آئیں عیادت کو مری
ورنہ کل کنج لحد میں تن بے جاں ہوگا

بزم جاناں ہی قیامت کا نمونہ ہوگی
کوئی خنداں کوئی گریاں کوئی حیراں ہوگا

یاد آئیں گی وفائیں مری تجھکو ظالم
قتل کر کے مجھے تو خود ہی پشیماں ہوگا

وعدۂ وصل سے کیا خوش ہوں کہ کٹنا ہی ہے
حسرتیں نکلیں جو دل سے تو یہ ویراں ہوگا

جیتے جی جس نے لیا ہو نہ کسی کا احساں
طالب گور و کفن خاک وہ انساں ہوگا

وہ دم نزع ہی آئے تو یہ فرما کے گئے
حشر کے دن ہی نہ پورا ترا ارماں ہوگا

وہ ہی دن ہوگا خدایا کہ بر آئے گی امید
وہ ہی دن ہوگا کہ کوئی مرا مہماں ہوگا

یہ تو ممکن نہیں خنجر ہو کسی پر شیدا
ہاں مگر ناز و ادا پر ترے قرباں ہوگا

جناب سید امیر حسن صاحب دلیر مارہروی

کوئی تو اس دل بیتاب کا خواہاں ہوگا
شکن زلف نہ گوشۂ داماں ہوگا

عقل سے عشق جہاں دست و گریباں ہوگا
کچھ وہاں شعبدۂ حسن بھی پنہاں ہوگا

ضد سے کیا فائدہ دل میں کوئی پنہاں ہوگا
مرا ارماں نہ سہی آپ کا پیکاں ہوگا

یاں تو ہی اور بھی ہنگامۂ شور و شیون
ہم بیاباں کو سمجھتے تھے کہ ویراں ہوگا

ذکر اس گیسوے برہم کا نہ کر باد صبا
اس حکایت سے تو دل اور پریشاں ہوگا

حسرت اغیار سے ملنے کی اگر ہے تم کو
میرے دل میں بھی کسی بات کا ارماں ہوگا

مجمع اہل شکایت سے تمہیں کیا مطلب
کوئی دل سے کوئی تقدیر سے نالاں ہوگا

اسکو دی جائے گی کیوں اور گناہوں کی سزا
جس کے حصہ میں عذاب شب ہجراں ہوگا

لاکھ تو عشق سے بچنے کی سکھائے گھاتیں
شدنی امر تو اے ناصح ناداں ہوگا

خوب وحشت میں تری دشت بیاباں چھانے
خاک مجکو غم پابندی زنداں ہوگا

جس کے غم میں تری آنکھوں سے نہ ٹپکے آنسو
وہ کوئی کشتۂ بے مہری پنہاں ہوگا

ایکدن تو مری گردن پہ چھری پھیر تو دیکھ
میں تو میں غیر بھی شرمندۂ احساں ہوگا

حشر میں تم نہ سہی غیر سہی میں ہی سہی
اپنے کردار پہ کوئی تو پشیماں ہوگا

غم فرقت کا نتیجہ یہ نہیں ہے نہ سہی
اور ہی کچھ سبب سوزش پنہاں ہوگا

پھاڑ کر دست جنوں جس کو بہت پچھتایا
ہو نہ وہ ترے وحشی کا گریباں ہوگا

اس طبیعت کا یہ صدقا ہی کہ وہ پوچھتے ہیں
کیا دلیر آج علی گڑھ میں غزلخواں ہوگا

ولہ

اب اے جنوں عشق ترا پوچھنا ہے کیا
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تجکو ہوا ہے کیا

ہل چل مچی ہے خلق میں یہ ماجرا ہے کیا
ناشاد نامراد کوئی مر گیا ہے کیا

اس وقت جبکہ میری زباں بند ہوگئی
وہ کیوں نہ پوچھتے کہ تری التجا ہے کیا

کیوں میرے خط کو دیکھکے آنسو نکل پڑے
پوچھو تو نامہ بر سے کہ حرف آشنا ہے کیا

ہٹ جاؤں سامنے سے تو میرا قصور ہے
ناوک اگر خطا ہو تو میری خطا ہے کیا

دل کا ہے ان کو پاس نہ کچھ جان کا خیال
کیا جانئے طریقۂ اہل وفا ہے کیا

شوقِ ستم ہے تیرے بہروپ سے اے وفا
میں چیز کیا ہوں اور مرا حوصلا ہے کیا

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہو گیا ہے کیا

صورت نمائے حسن ہی شیفتگی مری
جو مجکو دیکھتا ہے تجھے دیکھتا ہے کیا

ہم خار چننے والوں سے صحرا کے دشت
گلچیں سے پوچھئے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

جس کو دبی زبان سے بھی تم نہ کہہ سکو
ایسا وہ مدعی کا مرے مدعا ہے کیا

ہم جانتے ہیں تیری طبیعت کا مقتضا
ظالم تجھے ضرورت عذر جفا ہے کیا

ہیں پائے شوق اپنے سلامت تو ایکدن
ہم آپ ڈھونڈھ لیں گے تجھے رہنما ہے کیا

شاید پیامبر کی زباں اس نے کاٹ لی
کچھ منہ سے بولتا نہیں یہ ماجرا ہے کیا

اندیشۂ فراق سے کرتا ہے ترک عشق
ہمت کو اے دلیر تری ہو گیا ہے کیا

جناب تلسی رام صاحب شوخ ساکن ضلع علیگڑھ

پھر میرے جوشِ جنوں کیلئے ساماں ہوگا
پھر وہی طوق و سلاسل وہی زنداں ہوگا

آئینہ رو ہو تم آئینہ کو دیکھا نہ کرو
آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا

مجکو تنہائی میں رہنے کی تو عادت ہی نہیں
قبر میں ساتھ مرے وصل کا ارماں ہوگا

مجھسے وعدہ ہی میرے گھر پہ وہ آئیں گے ضرور
کالا منہ دیکھ ترا اب شبِ ہجراں ہوگا

آہ کے ساتھ جو یہ لختِ جگر آتے ہیں
دل کی جا پہلو میں شاید کوئی پیکاں ہوگا

چھوڑ دے عشق بتاں کر تو عبادت اسکی
آخری وقت میں اے شوخ پشیماں ہوگا

جناب سید کاظم علی صاحب شوکت بلگرامی تلمیذ امیر مینائی مرحوم

میں سن تو لوں اگرچہ مرا حوصلا ہی کیا
اے ابتدائے عشق تری انتہا ہے کیا

جز مرگ اور ہستیِ اہلِ فنا ہی کیا
میں بھولنے کی چیز ہوں میرا پتا ہے کیا

اے جذب شوق سب ہیں تری فتنہ سامیاں
منصور سے نہ پوچھ کہ سازا ہی کیا

دنیا خلاف چرخ عدو بخت نارسا
یہ زندگی تو ہے۔ مگر اس میں مزا ہے کیا

کرتا ہے چیر چیر کے کیوں ذکر آرزو
اس بدنصیب دل سے کوئی پوچھتا ہی کیا

رہتا ہے دل پہ کس کے خیالات کا ہجوم
یہ کون ہے؟ یہ کثرت وحدت نما ہی کیا

آتی ہے نالۂ دل صد چاک پر ہنسی
گل کیا ہی اور دامن گل کی ہوا ہے کیا

آنکھیں ہوئیں جو بند تو عقدہ یہ وا ہوا
اب ہم سمجھ گئے دل بے مدعا ہی کیا

اے کاش میرے بعد کوئی ان سے پوچھتا
اسکو تو تھا جنوں یہ تم کو ہوا ہے کیا

مثل حباب چشم براہ فنا ہوں میں
اب اے نگاہ ناز مرا دیکھنا ہے کیا

دعوی تو یہ کہ دعوی مہر و وفا غلط
پھر میرے پوچھنے سے ترا مدعا ہے کیا

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
اس کی خبر نہیں کہ ابھی دیکھنا ہے کیا

سن سن کے میرے نغمۂ دلکش وہ بول اٹھے
سنا ذرا یہ شوکت شیریں نوا ہے کیا

جناب حکیم فدا حسین صاحب فدا مارہروی

عشق کا راز نہ دل میں کبھی پنہاں ہوگا
رنگ بنکر مرے چہرہ سے نمایاں ہوگا

زندہ در گور تو تو نے مجھے کر رکھا ہے
اور کیا حال مرا اے شب ہجراں ہوگا

تو مرے قتل سے پہلے یہ سمجھ لے ظالم
حشر میں ہاتھ مرا اور ترا داماں ہوگا

مجکو دو تیغ کہ کاٹوں میں گلا خود اپنا
تم کو یہ کام ہے مشکل مجھے آساں ہوگا

میرے پہلو میں جو رہ رہ کے خلش ہوتی ہے
ہو نہ ہو ناوک دل دوز کا پیکاں ہوگا

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
آنکھ سے اشک جو ٹپکے گا وہ طوفاں ہوگا

ہاتھ میں تیر کمر میں ترے تلوار بھی ہے
اور کیا قتل کا عشاق کے ساماں ہوگا

اثر ہجر سے گھر ہی میرا ہوگا ظالم
بڑھکے اب اس سے بھی کیا خاک بیاباں ہوگا

اس کو امید رفاقت ہو جہاں کس کے
تیرے وحشی سے تو سایہ بھی گریزاں ہوگا

ہجر کی رات سے میں تنگ رہا کرتا ہوں
مجھکو تم قتل جو کردو گے تو احساں ہوگا

دم سے دو لمحہ ہی کی ہوتی ہے فدا ساری برات
دل نہ ہوگا تو مجھے خاک کچھ ارماں ہوگا

ولہ

اے دل کسی کے وعدے پہ بھولا ہوا ہے کیا
ان بے وفا حسینوں کو پاس وفا ہے کیا

شکوہ تمہارے عشق کا کس منہ سے میں کروں
مجرم ہے میرا دل ہی تمہاری خطا ہے کیا

پوچھے تو کوئی دل سے کہ ہے شاد شاد کیوں
محفل میں ان کی جا کے تجھے ملگیا ہے کیا

عاشق تو ہوں ضرور گداگر مگر نہیں
جز خواہش وصال مرا مدعا ہے کیا

ہم جس کو دیکھتے ہیں وہ مشتاق ہے ترا
دنیا ہماری طرح تری مبتلا ہے کیا

تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ سب جانتا ہوں میں
اچھا بتاؤ دل میں مرے مدعا ہے کیا

مجھ سا نحیف و زار کرے کیا بیان حال
صورت ہی دیکھ حال مرا پوچھتا ہے کیا

تم دیکھتے ہی بزم میں مجھ پر برس پڑے
کہا قسم کہ میں نے زباں سے کہا ہے کیا

جس دل کو چاہتے ہیں نہیں چھوڑتے
اللہ ان بتوں کو یہ تو بولا ہے کیا

رحم اے بیاہر دل پر اضطراب پر
اتنا بتلا دے جلد کہ اس نے کہا ہے کیا

اے جان حسن تو نہیں بیوجہ بے نیاز
عاشق ہزار ہا ہیں ترے اک فدا ہے کیا

جناب منشی رام دیال صاحب فکر رئیس علی گڑھ

وصل میں اور میرا حال پریشاں ہوگا
آئینہ رو کے مقابل دل حیراں ہوگا

ہائے یہ خستہ تنی ہائے میری تنہائی
میری حالت کو جو دیکھے گا وہ گریاں ہوگا

شکوۂ جور عبث ذکر وفا ہونے دو
آپ ہی اپنے کیے پر وہ پشیماں ہوگا

دیکھ پائے گا جو وہ چہرہ پر نور ترا
طاق میں زاہد صد سالہ کا ایماں ہوگا

اے فکر حشر میں ہم بیٹھ چکے خالی ہاتھ
دیکھنا ہاتھ میں اس شوخ کا داماں ہوگا

جناب سرفراز حسین صاحب نوشاہ ماہروی

دل کا میرے عیب و ہنر دیکھتا ہے کیا
جب مفت ہاتھ آئے تو اچھا برا ہے کیا

کر متاع ہوش دل اب سوچتا ہے کیا
انجام عاشقی کا ضرر کے سوا ہے کیا

رے خلاف شان کے میں نے کہا ہی کیا
تو بت نہیں تو کون ہے کافر خدا ہی کیا

ں نے کہا کہ مست ازل بانٹتا ہی کیا
دل نے کہا کہ رنج و الم کے سوا ہی کیا

کچھ تھی کائنات وہ نذر جنوں ہوئی
اب میرے پیرہن میں سلامت رہا ہی کیا

ٹھکرا کے اک غریب کی میت کو چل دئے
پوچھے تو ان سے کوئی یہ طرز جفا ہی کیا

ونی سے بھی چین ملا جب کسی طرح
پھر اور التہاب جگر کی دوا ہے کیا

آئے کبھی تو اور کٹے ہو کے بات کی
تم یوں ملو تو لطف ملاقات کا ہے کیا

کیا آج کل مزاج گرامی کا حال ہے
یہ پوچھنا ہے اور مجھے پوچھنا ہے کیا

اب دل تو مانتا ہے برا بات بات پر
ایسے اکل کرے سے ہمیں آسرا ہے کیا

چھوڑو خیال قیس سنو میری داستاں
افسانہ ہائے عہد کہن میں دھرا ہے کیا

دل لے کے تم یہ کہتے ہو کیا اب لینگے کچھ
اک جان میرے پاس ہی رہا ہے کیا

کیا دل کو چین آئے گا بے ہم بغل ہوئے
خالی تسلیوں سے شمگر ہوا ہے کیا

تم اک جھلک دکھا کے ہمیں چل دئے کدھر
دیکھو تو زیر بام قیامت بپا ہے کیا

خط بھیجنے کا قصد کریں کس امید پر
یہ بھی خبر نہیں کہ تمہارا پتا ہے کیا

پرسان حال جب کوئی عشاق کا نہیں
پوچھے کوئی نتیجہ روز جزا ہے کیا

اس پوچھنے پہ حشر میں دیکھیں وہ کیا کہیں
فتنہ یہ آپ ہی کا اٹھایا ہوا ہے کیا

دیکھا ہے فاقہ مستیوں میں ہی تجھے مگن
نوشاہ تیرے پاس کوئی کیمیا ہے کیا

ولہ

ایک ہنگامہ وہاں اے دل نالاں ہوگا
حشر میں کون تیرے حال کا پرساں ہوگا

خاک جینے کا مجھے ہجر میں ارماں ہوگا
قتل کر دیں گے اگر آپ تو احساں ہوگا

تیری فرقت میں گوارا نہ مری جان ہوگا
کوئی مردود ہی فردوس کا خواہاں ہوگا

اسکو تسکیں کہاں اس کو تسلی کیسی
جس کے پہلو میں کھٹکتا ہوا ارماں ہوگا

میری فریاد سلامت ہی تو ان کے در پر
نہ ہوا ہے نہ مقرر کبھی دربان ہوگا

ہائے کب تک کوئی بے آس ہی او ظالم
کبھی سچا بھی ترا وعدہ و پیماں ہوگا

اتنی تکلیف اٹھاتا ہے عبث دست جنوں
اب تو شاید ہی کوئی تار گریباں ہوگا

مذہب عشق میں تقلید کا پابند نہیں
جو کسی کو نہ ہوا وہ مجھے ارماں ہوگا

رحم کر اہل وفا قابل بیداد نہیں
ہم کہے دیتے ہیں بیدرد پشیماں ہوگا

دم نکل جائے کسی روز تڑپ کر میرا
کیسا کچھ نہیں اس بات کا ارماں ہوگا

تو ہی قاتل نہیں قاتل ہے ادا بھی تیری
زخم تو دے گا تبسم نمک افشاں ہوگا

تیرے جانباز ہیں اوقات کے پابند کہاں
موت ہو وقت جو آئے گی تو احساں ہوگا

کون پوچھے گا مریضوں کو تیرے دنیا میں
تو نے بیمار کیا جب سے ہی درماں ہوگا

ہے وصیت کہ میری قبر پہ لکھدیں یہ عزیز
جو محبت نکرے گا وہ پشیماں ہوگا

زن زمیں زر یہی جھگڑے کی ہیں چیزیں تو فقط
یہ نہوں پاس تو بے فکر بھرا انساں ہوگا

انڈین نیشنل کانگرس

اور

مسلمانان ہند

از

جناب مولانا ملا عبد القیوم مرحوم حیدر آبادی بانی حجاز ریلوے فنڈ

مشتمل

۱- دلائل عقلی بنسبت ضرورت کانگرس
۲- بحث شریعت درباب اتحاد اقوام ہند
۳- ازالہ اوہام جواب اعتراضات مخالفین کانگرس

ماخوذ از رسالہ اردوی معلی علی گڈھ بابت ماہ ستمبر و اکتوبر و نومبر ۱۹۰۶ء

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انڈین نیشنل کانگریس اور اہل اسلام

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہزار دشمن اگر بر سر ند ملا را
بآب دیدۂ خونین نوشتہ صورت حال

بدوستی کہ بگوید بجز حکایت دوست
نظر بصفحۂ اول مکن کہ تو بر توست

میرا ایک مدت سے خیال تھا کہ کانگریس کے نسبت جو غلط اور لاصل اوہام اہل اسلام میں پھیل گئے ہیں اُن کو رفع کرکے واقعات پر تلبیس کا جو پردہ ڈالا گیا ہے وہ اُٹھا دیا جائے تاکہ کانگریس کا رہ سے زیبا اپنے اصلی خط و حال میں نظر آجائے اور اپنے دلفریب نظارہ سے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرے۔ اسکے متعلق بہت سے مضامین لکھے جا چکے ہیں اور کئی لائق حضرات نے سابقاً و لاحقاً اظہار حقیقت و تائید کانگریس میں زور قلم دکھایا ہے مگر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں استیعاب اور تنقیح نہیں کیا گیا اسلئے ایک خاص حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

گذشتہ سال جب میں بغرض شرکت کانگریس بنارس گیا ہوا تھا تو مولینا فضل الحسن حسرت موہانی مدیر اردوی معلی نے تحریک کی کہ میں ایک مبسوط مضمون اردو میں لکھوں۔ اس سے میرے خیالات کی تجدید ہوئی۔ خوش قسمتی سے میری شرکت کانگریس اور تائید تحریک موقوفی قرنطینہ بھی پر بعض اردو اخبارات نے بہت کچھ ناشایستہ حملات کئے۔ لہذا مجھے ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی شرکت کانگریس کے ضروری و مفید و ناجائز ہونے پر میرے نزدیک جو دلائل عقلی و نقلی موجود ہیں وہ ظاہر کردوں اور اپنے فریضۂ قومی سے عہدہ برآ ہو جاؤں وما علینا الا البلاغ المبین۔

کانگریس کے مخالف مسلمانوں میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو سرے سے کانگریس کو اپنے لئے غیر مفید و مضر بتلاتا ہے اور گورنمنٹ کو عالم الغیب اور ارحم الراحمین سمجھکر اظہار و استحقاق حقوق کو گناہ جانتا ہے اور اپنے آپ کو گورنمنٹ کے محض رحم و کرم پر چھوڑتا ہے۔

طبقہ قدیم سلطان کو صرف ظل اللہ ہی سمجھتا تھا مگر آجکل کی نئی روشنی میں یہ گروہ اُن سے بھی بڑھ چڑھکر تاریک خیال نکلا۔ چونکہ موجودہ ترقی تمدن و ماہیت کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ اور اوسکی رعایا کے حقوق اور طریقہ استحصال حقوق سے یہ گروہ محض نابلد ہے اسلئے ایسی تنگ خیالی و گرداب جہالت میں مبتلا ہی مگر الحمد للہ کہ یہ فرقہ روز بروز ضعیف ہوتا جارہا ہے۔

دوسرا وہ گروہ ہے جو اصول کانگرس کو تو مفید خیال کرتا ہی مگر موجودہ کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کو بعض سیاسی پہلوؤں سے مضر و نقصان دہ بتلاتا ہی۔ اسکے افراد سرسید مرحوم کے خیالات کی کورانہ تقلید کرنیوالے ہیں اور چونکہ مصلحت وقت و ضروریات زمانہ کو نہیں سمجھتے نہ کبھی اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لاتے ہیں، نہ واقعات و حالات کی تحقیق و تفحص کرتے ہیں؛ اسلئے جو کچھ انکے اذہان میں جما دیا گیا ہی اُسی پر اذعان کئے ہوئے ہیں اور شرکت کانگرس سے جو فرضی نقصانات اُن پر ظاہر کئے گئے اُنسے خائف و ترساں ہیں۔

اسی گروہ میں ایک فرقہ ایسا بھی ہی جو مسلمان اور ہندوؤں میں تغایر مذہبی کی وجہ سے اتحاد سیاسی کو ناممکن سمجھتا ہے۔

اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان تمام شکوک و شبہات کو رفع کرنیکے لئے مسلمانوں کی شرکت کانگرس پر بروئے سیاست و شریعت مفصل بحث کریں اور آخر میں یہ دکھلائیں کہ سرسید مرحوم کے اعتراضات کہانتک درست اور بجا ہیں اور انکے اس اختلاف کے کیا وجوہ تھے اور پھر اسکا تصفیہ کریں کہ آیا مسلمانوں کو اس زمانہ میں اُسی کورانہ تقلید پر قائم رہنا چاہیے یا زمانہ کا ساتھ دینا اور اپنے ضروریات و حوائج کا خیال کرنا اور کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ کی نعمتوں سے مستفیض ہونا؟۔ مگر اسکے قبل یہ ضروری ہے کہ کانگرس کی ماہیت اور اسکی غرض و غایۃ بتلا دیجائے لہذا سب سے اول ہم یہ بتلاتے ہیں کہ کانگرس کیا ہی۔

کانگرس ایک سیاسی مجلس ہی جسکی غرض گورنمنٹ و رعایا کی خیر خواہی، حفاظت حقوق جانبین و رفع کدورت طرفین، استحکام اساس وفاداری رعایا، اور استقامت حکومت برطانیہ ہے اُس کا یہ کام ہے کہ رعایا کی تکالیف و شکایات کو گورنمنٹ تک پہنچاوے، مضر طرق حکومت اور مناقص و مفاسد قوانین سے حکومت کو مطلع اور متنبہ کرتی رہے، اور سلطنت اور رعایا کو ان

برے نتائج سے بچاے جو حریت، مساوات اور عدالت کے قائم نہ رہنے سے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

چونکہ عامۂ رعایا و برایا اس بھاری ذمہ داری کو فرادیٰ فرادیٰ انجام نہیں دے سکتے لہذا چند سربرآوردگان قوم کا وکیل رعایا ہونا اور کسی ایک جگہ مجتمع ہو کر تمام امور پر بحث مباحثہ کرنا اور ردوقدح کے بعد جو امر منقح ہو جاے اُسکو گورنمنٹ میں پیش کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ اس جماعت کی آواز ملک و قوم کی آواز اور رعایا کے مختلف طبقات کی متحدہ آواز سمجھی جائے اور گورنمنٹ کو اپنے طرز حکومت اور قوانین و آئین دولت کی اصلاح کا پورا موقع ملے اور اسکی وجہ سے رعایا کے دلوں میں اوسکی محبت متمکن ہو جاے اور اُن کی اطاعت و وفاداری روز افزوں ترقی کرتی جاے اور حکومت کی بنیاد نہایت مضبوط و مستحکم ہوتی جاے کیونکہ اگر گورنمنٹ اور رعایا میں شکایات باہمی کی وجہ سے ناراضی پھیلتی جاے تو ایسی حالت رعایا سے جو نظام متحدہ یا انتظام سے مخالف و ناراض ہے وفاداری کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اور جب رعایا سے وفاداری کا مادہ جاتا رہے تو دولت اندرونی و بیرونی خطروں سے ہرگز محفوظ و مصون نہیں رہ سکتی۔ اسلئے کہ سلطنت اُس اجتماع و اتحاد تالیفی کا نام ہے جو رعایا میں کسیکی انبت پیدا ہو جاتا ہے خواہ بجبر و قہر ہو یا بارادت حکیم شیرازی کا یہ مقولہ نہایت سچا اور بجا ہے کہ "خلقے بر دگرد آمدند و سلطنت بروے مسلم شد"۔

پس وہ جماعت جو سلطنت و رعیت دونوں کو اس آفت و مصیبت سے بچانا چاہتی ہے آیا وہ خیر خواہ دولت و خیر خواہ قوم و ملک کہلا سکتی ہے یا وہ لوگ جو دونوں کو خطرہ میں پڑنے دیں مگر اُن کی رہائی کی کوئی فکر و تدبیر نہ کریں بہرحال اسکا فیصلہ انصاف پسند حضرات پر موقوف رکھا جاتا ہے۔

بہرحال یہ اغراض ایسے صاف اور بدیہی النفع ہیں جن سے کوئی عاقل مخالفت نہیں کر سکتا دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملیگا جو اُن کو برا سمجھے یا مضر بتلاے البتہ چند ایسے خود غرض خسرو عہدہ دار اسکے مخالف ہو سکتے ہیں جو شخصی اور ذاتی اغراض اپنے مدنظر رکھتے ہیں، انسانی خواہشات کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور حکومت میں مساوات و عدل و حریت کے

وخود رائی کے غیر متمدنہ اور وحشیانہ قواعد پر عمل پیرا ہونا حکومت وسلطنت کا اصلی مقصد قرار دے لیا ہے۔

سرسید مرحوم نے انہیں قومی اور ملکی ضروریات کو مدنظر رکھکر ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی تھی جسمیں ہندو مسلمان عیسائی سب شریک تھے تاکہ ہندوستانی اپنے حقوق، اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لئے براہ راست گورنمنٹ ہند، سکرٹری آف اسٹیٹ، اور پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ وہ اسکو قائم نہ رکھ سکے اور باقاعدہ چلا نہ سکے مگر پھر بھی بہت سی تحریکیں مثل مسافران ریل کی شکایات، تخفیف محاصل کتب، ورنیکولر یونیورسٹی کی اقامت وغیرہ وغیرہ امور میں کامیابی ہوئی۔ سرسید نے دوبارہ خاص قانون کے لئے کانگرس کی تجویز کی۔ ایک ایسی مجلس بنام پیٹریاٹک ایسوسی ایشن یا انڈین کانگرس قائم کرنا چاہی تھی مگر بوجہ چند در چند اسکو بھی پورا نکر سکے اور یہ دوسری تجویز بھی کمن خفا سے منصہ ظہور پر جلوہ گر نہ ہونے پائی۔

کانگرس کی ضرورت کیوں ہے

بیان صدر سے یہ امر پوری طرح ثابت ہو گیا ہے کہ ان اغراض سے سرسید کو بھی اختلاف نہ تھا۔ بلکہ اقامت کانگرس سے بہت پہلے انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور یورپین باشندگان ہند کی نظر سے جنہوں نے اپنے لئے ایک ایسی اسوسی ایشن قائم کی تھی سرسید نے فائدہ اٹھا کر اپنے ہموطنوں کے لئے بھی ایک ایسی ہی اسوسی ایشن قائم کی تھی۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کمپنی کا تعلق اٹھ جانے سے ہندوستان کے معاملات کا تعلق بجائے کورٹ آف ڈایریکٹرز کے خاص پارلیمنٹ سے ہو چکا تھا۔ اور سکرٹری آف اسٹیٹ اور ممبران پارلیمنٹ کو رعایا کے اصلی حالات اور خواہشات کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ حکام مقامی کا توسط اسکے لئے ایک بڑا سد راہ تھا جسکا ارتفاع بجز ایسی تدبیر کے ممکن نہ تھا۔ جب خود یورپین باشندگان ہند نے جن کی وجاہت اور جنکا رسوخ بہ نسبت نیٹو انڈین رعایا کے بہت زیادہ تھا ایک ایسی مجلس کی اقامت کی ضرورت سمجھی تھی تو بے رسوخ اور ضعیف دیسی فرقہ کو جس کے حکام نہ ہم مذہب ہیں نہ ہم ملک نہ ہم قوم ہیں نہ ہم زبان اور جن کا مرکز حکومت سات سمندر پار ہے

زیادہ تر اسکی ضرورت ہے اور ہونی چاہیے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ اغراض کانگرس گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے لئے ہر طرح مفید اور ضروری ہیں اور اُنکے حاصل کرنیکا صرف یہی ایک شائستہ، مجرب اور عمدہ طریقہ ہے جسکو مخالفین کانگرس بھی تسلیم کرتے ہیں تو آیا ایسی مجالس ہر صوبہ، ہر قوم، اور ہر مذہب کے لئے علیحدہ علیحدہ ہونی چاہئیں یا سبکے اتفاق و اجماع سے ایک ہی مجلس کا ہونا زیادہ تر مفید ہے۔

جہانتک غور کیا جاتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جُدا جُدا مجالس قائم ہونیکے عوض مختلف اقوام کے اتفاق و اجتماع سے ایک ہی مجلس کا قائم ہونا نہایت مناسب اور مفید بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ جُدا جدا اور متفرق مجلسوں سے قومی و ملکی مجتمع قوت متفرق اور ضعیف ہو جائیگی اور وہ استحکام اور وقعت و اعتبار جو متحدہ مجلس کا ہوگا اُس صورت میں ہرگز حاصل نہو سکیگا اور نہ متفرق مجالس کی کارروائی تمام رعایا کا متحدہ خیال اور اُن کی متفقہ خواہش متصور ہو سکیگی۔ کیونکہ ہندوستان کی مختلف قومیں اگرچہ مراسم قومی۔ عقائد مذہبی اور زبان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف و متمایز ہیں مگر انقلاب زمانہ نے ان تمام مختلف قوموں، مختلف مذہبوں اور مختلف زبان والوں کو ایک ہی دولت و حکومت اور ایک ہی قانون کے تابع و زیر فرمان کر دیا ہے اور ایسی گورنمنٹ کے تابع کیا ہے جو کانسٹی ٹیوشنل قواعد کے رو سے ہمپر حکمرانی کرتی ہے اور جسنے ہم سبکو مراسم قومی و عقائد مذہبی میں پوری پوری آزادی دے رکھی ہے اور جو اسکا خیال رکھتی ہے کہ مختلف اقوام اس آزادی میں ایک دوسرے کے حارج نہوں جس کی وجہ سے وجوہات اختلاف زائل ہو چلے ہیں۔ پس ان وجوہات کے نظر کرتے مختلف اقوام ہند معاملات سیاسیہ میں متحد ہیں اور ہو سکتے ہیں اور اسلئے اُن کو ان معاملات سیاسی میں متحد مساعی کام میں لانا چاہیے۔

مگر ہم اس امر پر کہ آیا اقوام باوجود اختلاف قومی و لسانی و عقائد مذہبی امور سیاسیہ میں متحد و متفق ہو سکتے ہیں یا نہیں تفصیل سے بحث کرنا چاہتے اور پوری روشنی ڈالتے ہیں جسکے بعد اس کا فیصلہ خود بخود ہو رہیگا کہ آیا مسلمانوں کو بروے قواعد سیاست اصولاً کانگرس سے علیحدہ رہنا ضروری ہے یا شریک ہونا اور کونسی حالت اُنکے ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے

اُن کے مناسب ہے۔

جہاں تک ہم خیال کرتے ہیں اور تاریخ عالم پر نظر ڈالتے ہیں اور اصول سیاست مدن کو دیکھتے ہیں ہمکو یہی ثابت ہوتا ہے کہ جوں جوں مدنیت ترقی کرتی ہے قومیت، زبان اور مذہب کا اختلاف مانع اتحاد سیاسی نہیں ہوتا۔

انگلستان میں کلٹک سیکسن۔ اور نارمن نسلیں خلط ملط ہیں اور سب کے سب انگلش کہلاتے ہیں اسیطرح اسکاٹلنڈ والے انگلنڈ کے باشندوں سے مختلف ہیں مگر دونوں باایں ہمہ اختلاف سیاسۃً متحد ہیں اور انگلش کہلاتے ہیں۔ اسیطرح کناڈا کا حال ہے کہ مختلف قومیں مثلاً فرانسیسی، انگریزی وغیرہ وہاں جا بسے ہیں اور سب کے سب ایک ہی نیشن سمجھے جاتے ہیں آسٹریا میں تین مختلف قومیں آسٹرین۔ بوہیمین۔ ہنگیرین مشتمل ہیں۔ سوئٹزرلنڈ اور جرمنی کے اقوام کا اختلاف لسان اُنکے ایک نیشن ہونے سے مانع نہیں۔ پنیل آئلنڈ اور انگلنڈ کے باشندے مختلف الالسنہ ہیں مگر سیاسۃً میں متحد ہیں۔ امریکہ اور انگلنڈ کے باشندے ہمزبان ہیں مگر سیاسۃً میں ایک دوسرے کو کوئی ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ مختلف و مخالف ہیں۔ قدیم ہندوؤں کے زمانۂ سلطنت میں بھی السنہ و اقوام ہند مختلف تھے مگر ایک ہی نیشن یعنی ہندو کہلاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں بھی سب ہندو ہی کہلاتے ہیں جس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ مرہٹہ مراد ہیں یا تلنگے۔ بنگالی مراد ہیں یا پنجابی۔

اسیطرح اختلاف مذہب بھی مانع اتحاد سیاسی نہیں ہے۔ موجودہ یورپ اسکی بین نظیر ہے جہاں سیاسی حیثیت کے لئے مذہب کوئی چیز نہیں۔ مسلمانوں میں ذمیین کے حقوق مسلمانوں کے مانند تسلیم کئے جاتے ہیں اور اُن کے اتحاد سیاسی میں مذہب کی وجہ سے کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا[1]۔

افریقہ کے حبشی باشندے اُسیطرح کے حقوق رکھتے ہیں جو فرانسیسی اور جرمنی جنکے وہ زیر سیاست و حکومت ہیں۔ لنکا کے باشندے بھی حقوق میں انگریزوں سے مساوات رکھتے ہیں یہ ہندوستانیوں ہی کی بدقسمتی ہے جو یورپین انگریزوں کے مقابلہ میں ایک نظر سے

[1] ملاحظہ ہو بحث شریعت۔ حدیث انما بذلوا الجزیۃ لتکون دماؤھم الخ

میں دیکھے جاتے۔ پھر لوگوں کا یہ خیال کہ اختلاف قومی و مذہبی و لسانی مانع اتحاد و سیاست ہے غلط اور محض غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ قوم کا اطلاق مختلف اعتبارات سے بنی نوع انسان میں ہوا ہے، کبھی نسل اور خون کے لحاظ سے کبھی مذہب کے اعتبار سے کبھی ایک ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے جیسا کہ عرب میں مسلمان باشندگان ہند کو بھی ہندو ہی کہتے ہیں۔

مذکورۂ بالا دلائل کے علاوہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اصول علم سیاست مدن کے لحاظ سے اختلافات مذکورہ کے باوجود یہ اتحاد ممکن ہے یا نہیں۔ تاکہ واضح طور پر حقیقت حال منکشف ہو جائے اور کوئی خلجان اسکے اذعان و ایقان میں باقی نہ رہے۔ چنانچہ سیاست مدن میں حسب ذیل قواعد ممہد ہو چکے ہیں:-

(۱) ہر کثرت کا مقتضا اور منتہا وحدت کی طرف ہوا کرتا ہے؛ بلکہ ہر صفت کا کمال اسی میں ہے کہ وہ اپنی ضد سے متقارب ہو جائے اور اُس سے جا ملے۔

(۲) ہر موجود اشتمال کثرت کے باوجود، جو اوسکی ترکیب ماہیت کا لازمہ ہے، جس قدر وحدت کے احکام و آثار اُسمیں زیادہ تر ظاہر ہونگے اُتنا ہی وہ اشرف و اعلیٰ ہوگا؛ اور جسقدر کثرت کا ظہور و غلبہ اُس میں زیادہ ہوگا اُسیقدر اسکا اساس انتظام درہم و برہم ہوگا چنانچہ نغمات متناسبہ، اشعار موزونہ، اور صور حسنہ، وغیرہا کی تاثیریں صرف وحدت تناسبی کی وجہ سے حاصل ہوتی اور نفوس پر اثر کرتی ہیں۔

(۳) علم حکمت میں یہ امر بھی مسلم اور منفصل ہو چکا ہے کہ جسقدر مزاج اعدل ہوگا اُسقدر وحدت حقیقی بھی اقرب و اسہل اور جو صورت و نقش اُسپر مترتب ہوگا۔ وہ افضل و اکمل ہوگا یہی سبب ہے کہ نسبت شریفہ جہاں نہیں پائی جاتی ہے موجب انجذاب و اہتزاز نفس ہوا کرتی ہے۔ بنا برین حسن، اعضا کے ایک خاص تناسب کیوجہ سے پیدا ہوتا ہے؛ بلاغت و فصاحت، الفاظ و کلام اور مقتضائے مقام کی ایک خاص مناسبت کا نام ہے الحاصل ایک ہی معنی ہے جو اگر اجزائے ممتزجہ عنصری میں ظاہر ہو تو اعتدال مزاج سے موسوم ہوتا ہے؛ اگر اصوات میں ہو تو ابعاد لذیذہ کہلاتا ہے، اگر حرکات میں ہو تو غنج و دلال اور ناز و کرشمہ اُسکا نام ہے، اگر کلام میں ہو تو فصاحت و بلاغت، اگر اعضا میں ہو تو

حسن ہے اور اگر ملکات نفسانی میں ہو تو عدالت نفس ناطقہ ہر ایک جگہ اور ہر ایک مقام پر اُس معنی حقیقی کا طالب و عاشق ہوا کرتا ہے خواہ جس لباس اور جس صورت میں اور جہاں کہیں وہ جلوہ گر ہو۔

وانی احب الحسن حیث وجدته
وللحسن فی وجه الملاح مواقع

جُز یا بقبا ہر چہ ہست بیروں آے
کہ من حریف توانم بہر لباس شناخت

(۴) جس طرح اعضاء بدن انسانی اپنی بقا میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں مثلاً جگر محتاج ہے دل کا۔ روح حیوانی اور قوت وحیات میں، اور دل محتاج ہے جگر کا۔ روح طبعی اور تغذیہ میں، اور یہ دونوں محتاج ہیں دماغ کے۔ روح نفسانی اور قوت حس میں، اور دماغ محتاج ہے دل و جگر کا حیات و تغذیہ میں، اسیطرح افراد انسانی بھی مدنی الطبع ہونے کیوجہ سے اپنی معیشت و زندگی میں ہمدیگر کی مشارکت و معاونت کے محتاج ہیں اور اس مشارکت میں باہم عوض و مبادلہ ضروری اور لازمی ہے۔ مثلاً نجار کسان کے لئے روٹی پکائیگا اور کسان اسکے لئے کھیتی کریگا، درزی جولاہے کیلئے کپڑا سئیگا اور جولاہا اسکے لئے کپڑا بنیگا۔ لہٰذا قیاس مختلف حوائج اور ضروریات معیشت کے لئے مختلف پیشہ ور ہونے چاہئیں تاکہ وہ اپنی اپنی مصنوعات کا تبادلہ ایک دوسرے سے کیا کریں اور اسطرح سے ہر ایک کے حوائج تمدنی پورے ہوں۔ غرض یہ کہ انسان اپنی بقائے شخصی و نوعی دونوں میں بنی نوع کی معاونت و خدمت کا محتاج ہے۔ کیونکہ اگر ہر ایک شخص بنفسہ ترتیب غذا و مسکن و لباس میں مصروف ہو جائیگا تو سب سے پہلے اسکو ان کے اسباب کا فراہم کرنا ضروری ہوگا اور پھر خود ہی ان اشغال میں یعنی بونے، کاٹنے، پیسنے، پکانے میں مشغول ہونا پڑیگا۔ تب کہیں جا کر غذا اور مسکن وغیرہ اشیاء جنکا وہ اپنی زندگی میں محتاج ہے، حاصل ہو سکیں گی۔ لیکن اس مدت تک کہ وہ ان اسباب کی فراہمی میں مشغول رہے بدوں غذا اور مسکن و لباس کے بسر کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ اوسکی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی تمام عمر بھی ان صنائع میں بجز ایک صنعت پر بھی صرف کر دے تب بھی وہ اسکو اچھی طرح حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن جب بنی آدم افراد مجتمع ہو کر ایکدوسرے کی معاونت کرینگے اور ہر ایک دوسرے کا کام انجام دیگا اور اس معاونت و معاوضہ میں جادۂ اعتدال

کو مرعی رکھیگا تو احوال معیشت منتظم اور بقاے نوع محفوظ رہیگی۔

چونکہ انسان کے امور معیشت کا انتظام، اُنکی باہمی معاونت پر موقوف رکھا گیا ہے اسلئے حکمت بالغۂ الٰہی کا یہ مقتضیٰ ہوا کہ افراد انسانی اپنی ہمتوں، طبیعتوں، ارادوں اور خواہشوں میں مختلف ہوں تاکہ ہر ایک اپنی اپنی طبیعت و ہمت کے مطابق ایک ایک صنعت کی طرف متوجہ ہو جاے اور اسکی تکمیل میں کوشش کرے۔ کیونکہ اگر تمام افراد اپنی طبیعتوں اور ارادوں میں متحد و متفق ہو جاتے تو سب کے سب ایک ہی صنعت کی طرف مائل ہوتے جس کی وجہ سے دوسری صنعتیں معطل رہجاتیں اور نظام انتظام بگڑ جاتا۔ اسی طرح اگر سب کے سب حالت فقر و غنا میں یکساں رہتے تو ایکدوسرے کی معاونت نکرتے کیونکہ اگر سب فقیر ہوتے تو کسی کو اپنی خدمت کے مقابلہ میں دوسرے سے نفع کی توقع نہ ہوتی اور اگر سب غنی ہو جاتے تو ایک دوسرے کی خدمت ہی نکرتے لیکن جب اختلاف ہم و طبائع کی وجہ سے ہر ایک کو ایک صنعت پسند آئی اور بھلی معلوم ہوئی اور بمقتضاے اختلاف احوال ہر ایک کو من وجہ دوسرے کی احتیاج ہوئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی معاونت و خدمت سے تمام کام انجام پاے اور سب کی معیشت منتظم ہوئی پس کمال ہر شخص کا ایک دوسرے کی معاونت پر موقوف اور اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے ہر فرد کو اپنے بنی نوع کے ساتھ مخالطت بمعاونت و معاشرت بمعاوضت کرنی واجب و لازم ہے ورنہ وہ قاعدہ عدالت سے متجاوز اور جادۂ اعتدال مدنیت سے منحرف سمجھا جاے گا اور جور و ظلم سے متصف ہوگا۔

بیان مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ رہبانیت خلاف مقتضاے طبیعت انسانی ہے اور شریعت نے اسی لئے اسکو منع کیا ہے کہ خلاف مدنیت و انسانیت ہے۔ پس جو لوگ عزلت و وحشت اختیار کرتے ہیں اور معاونت بنی نوع سے دور اور نفور رہتے ہیں اور اپنی معیشت و زندگی کا بوجھ دوسروں کے سر ڈالتے ہیں اور اسکا نام فقر و زہد اور تفرید و تجرید رکھتے اور اسکو فضیلت جانتے ہیں۔ وہ محض ظالم و جابر اور غاصب اموال ہیں۔ کیونکہ غذا و لباس اور دیگر مایحتاج معیشت اپنے بنی نوع سے لیتے ہیں اور اسکے عوض میں اُن کو کوئی نفع نہیں پہنچاتے اور اُسکی قیمت و اُجرت تک نہیں دیتے جو عفت و عدالت انسانی سے نہایت بعید ہے۔ یہ لوگ صرف اسی پر اکتفا نہ کرتے [illegible] کہ [illegible] منفعت کے اُنکے بجاے نقصان کے ضرر پہنچاتے ہیں

اور قسم قسم کے فسانہ و افسوں ابلہ فریب سے افراد بنی نوع کو مدنیت سے دور اور ترقی و استحصال قابلیت سے باز و مہجور رکھتے ہیں اور بجائے اجتماع و اتفاق و اتحاد کے انہیں مخالفت و منافرت و مبغضت پھیلاتے ہیں۔

ہمارے اس بیان سے یہ اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ انسان خاص خاص اختلافات کے باوجود بنی نوع کے اجتماع کا محتاج ہے اور اسی اجتماع کا نام تمدن ہے یعنی ایسا عام اجتماع جو مختلف الطبائع اور متباین الآراء افراد کے امور معیشت میں بوجہ لائق موجب انتظام ہو۔

افراد بنی نوع کی طبعی خواہشیں مختلف ہوا کرتی ہیں اور ہر ایک کا نفس اپنے نفع کے استحصال پر مجبول ہے۔ اگر ان کو اپنی اپنی طبیعت پر چھوڑ دیجئے تو باہمی معاونت میں خلل پڑیگا اور انتظام باقی نہ رہیگا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے نفع کیلئے دوسرے کا ضرر چاہیگا جس کی وجہ سے مخالفت و منازعت پیدا ہو جائے گی اور ہر ایک دوسرے کو فنا کرنے اور صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کرے گا۔ اسلئے کسی ایسی تدبیر کی ضرورت ہوئی جس سے ہر ایک اپنے حق پر قانع رہے اور دوسرے پر جور و تعدی نہ کرنے پائے اسی ضرورت سے حاکم و قانون کا ہونا لازمی ہے اور جو چیز اس ضرورت کو انجام دیتی اور پورا کرتی ہے اسکا نام سیاست عظمیٰ ہے۔

حکما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس طرح معاونت و مساعدت اور سرانجام ہونے کے باہمی کے لئے بنی نوع انسان کا اجتماع ایک ضروری اور فطری امر ہے۔ اسی طرح اس اجتماع کے اعتدال کو باقی رکھنے اور اسکی محافظت کرنے کے لیے ایک حاکم کا ہونا بھی بنی نوع انسان کے لئے لازمی اور طبعی امر ہے۔

چونکہ اجتماع تمدن انسانی خیر و شر کے مختلف حالات پر مبنی ہے اور طرز معیشت تمدن سلطنت اور افراد بنی نوع کے اوصاف خیر و شر کے لحاظ سے یہ علاقات مختلف ہوا کرتے ہیں اسلئے حکما نے حالات اجتماعی اور اغراض تمدنی کے اختلافات کی مناسبت سے مدینہ کے کئی [illegible] بغرض امتیاز انکے جدا جدا نام رکھے ہیں۔ مثلاً

مدینہ جاہلہ [illegible] فاسقہ، مدینہ ضالہ۔ مدینہ فاضلہ

اگر اجزاء مدینہ، قوت ناطقہ[1] سے بے بہرہ ہوں اور انکا اجتماع کسی اور قوت کی وجہ سے ہوا ہو تو اسکو "مدینہ جاہلہ" کہتے ہیں ؛ اگر افراد مدینہ، قوت ناطقہ کو استعمال کر سکتے ہوں مگر دوسری قوتیں بھی اسکے ساتھ شریک کر لی گئی ہوں اور انکا مجموعہ موجب تمدن ہوا ہو تو اسکو "مدینہ فاسقہ" کہتے ہیں ؛ اگر کوئی ایسا قانون۔ جو قوت فکر کے نقصان کا نتیجہ ہو۔ تجویز کر لیا گیا اور بجائے خود وہی فضیلت قرار دے لیا گیا اور اسی پر تمدن کا دار و مدار رکھا گیا ہو تو اسکو "مدینہ ضالہ" کہتے ہیں اگر بنی نوع انسان کا اجتماع قواعد کسب سعادت، و دفع شرور پر مبنی ہو تو اسکو مدینہ[2] فاضلہ کہتے ہیں اگرچہ عقائد و اعمال کے اعتبار سے مختلف اور شخصی حالات اور ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے متباین ہی کیوں نہوں چونکہ سب کے سب اغراض و مقاصد میں ایک دوسرے کے ہم و شریک ہیں اور ان سب کی غرض ایک ہی ہے اسلئے یہ شخصی اور ذاتی اختلافات تمدن کے منافی و مضر نہیں ہو سکتے اور جسطرح ہر ایک کی صورت اور طبیعت کا اختلاف اس اجتماع کے مخالف نہیں ہے اسی طرح مختلف فرقوں کے صور اعتقادی و اعمالی کا اختلاف بھی اس اجتماع کا مانع نہیں، چونکہ سب کی غرض و غایت ایک ہی ہے اور ایک ہی امر اجمالی میں سب شریک ہیں اور ایک ہی مدبر فاضل اور حاکم عادل کے تابع اور رعیت ہیں، لہذا انمیں تعصب و تعاند نہ رہنا چاہیے اور جس کمال کے جو مستعد اور لائق ہے اس میں مصروف ہونا اور ایک دوسرے کے معاون و معاضد بنے رہنا نہایت ضروری ہے۔

ہمارے مذکورۃ الصدر دلائل کا ماحصل و نتیجہ یہ نکلا کہ ہر کثرت کا قوام و نظام وحدت پر موقوف رکھا گیا ہے اسلئے مختلف فرقے رعایا اور متفرق افراد ملک کے باہمی انتظام کے لئے فطرتاً انکا سیاستہً متحد رہنا اور ایک حاکم، ایک سیاست اور ایک قانون کے تابع ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ جسطرح سے جسم انسانی کا التیام مختلف الطبائع عناصر کے اختلاف اور کسی انکسار سے ہوتا ہے اسی طرح جسم سلطنت کی ساخت اور ترکیب بھی ایسے فرقوں سے ہوتی ہے

---

[1] قوت ناطقہ۔ اس انسانی قوت کا نام ہے جو بیدار فکر و تیز ہوا کرتی ہے یعنی جزئیات سے کلیات کیطرف منتقل ہونا اور احکام کلیہ نکالنا اور مقدمات سے نتائج پیدا کرنا اسکا کام ہے۔

[2] ان چاروں کی ترکیب سے بہت اقسام پیدا ہوتے ہیں جنکو حکمائے "ذاہبت" کے نام سے موسوم

جنکی عصبیات یا مذاہب یا عقائد و رسوم مختلف ہوا کرتے ہیں اور یہ اختلافات اتحاد سیاسی کی ان اور سلطنت کی وحدت قہری میں مجتمع ہونے سے مزاحم نہیں ہوتے۔ بلکہ اسکے قیام کے لئے یا اختلاف ایک لازمی اور طبعی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسقدر زیادہ مختلف عصبیات کسی سلطنت کی وحدت قہری میں مجتمع اور متحد ہونگے اتنی ہی اُس حکومت کی عظمت و شوکت و قوت زیادہ ہوگی۔ کیونکہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ہر کثرت اُسی وقت اعلیٰ و اشرف ہوگی جب کہ وہ اپنی ضد سے متقارب ہو جائے اور اُسمیں وحدت کے آثار زیادہ ظاہر ہوں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

کیا ہے لیکن یہ بات ہوگی ہم کو مدینہ فاضلہ سے بحث ہے لہذا مزید وضاحت کی غرض سے ہم اسکے ارکان کو بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ارکان مدینہ فاضلہ پانچ ہیں

اوّل وہ لوگ جن پر تدبیر مدینہ موقوف ہو یعنی گروہ اپنے فضائل اور تحصیل قوت مدرکہ کی وجہ سے سب سے ممتاز ہوا کرتا ہے۔ جیسے فلاسفہ حکیم طبع۔

دوسرے۔ وہ لوگ جو عوام کو کمال انسانی پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ اور مدینہ کے افراد مجتمعہ کو مواعظ و نصائح کے ذریعہ سے اہل اخلاق و شفاق سے باز رکھتے ہیں۔

تیسرے۔ وہ افسر و عہدہ دار جو افراد مدینہ کی نوع میں قانون حکومت نافذ کرتے ہیں۔

چوتھے۔ وہ جو مدینہ کو تعرض و تغلب اعدا سے بچاتے ہیں۔ یعنی لشکری۔

پانچویں۔ وہ جو ان چاروں کے ماکولات، ملبوسات اور مسکونات وغیرہ اشیا کے متکفل ہوتے ہیں یعنی پیشہ ور اور اہل حرفہ۔

ان پانچوں کے مواد سے اور اشخاص ارکان مدینہ فاضلہ سے خارج ہیں اور ان فرقوں کے ادوات و آلات کے مانند ہیں۔ اگر یہ قابل فضیلت ہوں تو جس کمال کے وہ لائق ہوں بترتیب فضلا اندرجہ فضیلت و کمال پر پہنچائے جائیں ورنہ اُن اعمال میں جو بسبب مصالح قوم ہوں مشغول و مصروف رہیں۔ بعضے اُس گھاس پات کے مشابہ ہوتے ہیں جو اکثر باغوں اور کھیتوں میں اُگ آتا ہے اسلئے علماے اخلاق نے اُنکا نام نوابت رکھا ہے اور اُن کی بھی پانچ قسمیں کی ہیں۔

(۱) مراتی وہ لوگ جو اپنے آپ کو افعال فضلا اور شعار علما میں ظاہر کرتے ہیں اور بزرگوں کے لباس

جب یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ کمال افراد انسانی و استکمال ہیئت مدنی و سیاسی اجتماع باہمی سے منوط و مربوط ہے اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اُن صفات و اخلاق کو جن پر اجتماع بنی نوع انسان موقوف ہے اور جن سے ہیئت مدنیت قائم ہے بیان کریں۔ بہترین ملک و مصلحین قوم کا فرض ہے کہ وہ سلطنت کی اس ہیئت اجتماعی کے قائم رکھنے میں کوشش کریں اور اُن اسباب کو جن پر انکا قیام موقوف ہے کام میں لائیں۔

میں جلوہ گر ہو کر بہ تلبیس و تلبیس دنیوی اغراض فاسدہ حاصل کرتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ گذشتہ)

(۲) محرف۔ جو خواہشات نفسانی کے تسلط اور میلان رذائل کے غلبہ کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ قواعد مدنیت کو بحیلہ و تاویل اپنی طبیعت و خواہش کے موافق کریں۔

(۳) باغی۔ جو احکام بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے جنکا دفع کرنا عقلاً و شرعاً تمام پر واجب ہے۔

(۴) جاہل۔ جو اپنے قصور فہم و ادراک کے سبب سے [illegible] واقف و آگاہ نہیں ہوتے اور دوسرے معانی پر اُن کو محمول کر کے جادۂ استقامت سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

(۵) مغالطہ۔ جو حقائق کو نہ سمجھ کر طلب جاہ و مال کے لئے دعاوی کاذبہ پر اقدام کرتے ہیں اور غلط سلط دہوکہ کی باتوں سے بے شرمانہ خود فروشی کا بازار گرم کرنے لگتے ہیں اور عوام کی نظروں میں اپنے تئیں دانا اور عقلمند ثابت کرتے ہیں حالانکہ خود متحیر رہتے ہیں اور کبھی مسئلہ کا بھی اذعان و ایقان نہیں رکھتے۔

علم اخلاق میں یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ بمقابلہ فضائل بعض ایسے رذائل ہوا کرتے ہیں جو شبیہ بفضائل ہوتے ہیں اور جو لوگ علم اخلاق سے ممارست نہیں رکھتے اُنکے دہوکہ اور فریب کا موجب ہوتے ہیں۔ پس کسیقدر اُنکا بھی یہاں بیان کر دینا مناسب ہے تاکہ "خوابت" کا انکشاف اچھی طرح ہو جائے اور طالبان کمالات انسانی اور راغبان ملکات نفسانی مغالطہ میں نہ پڑیں اور ان دغابازوں اور فریبیوں کے دہوکہ میں آکر خرمہرہ کو بہ نرخ جواہر نہ خریدیں۔ مثلاً فضیلت حکمت میں بعض لوگ مسائل علوم حکمت کو حفظ اور انکے نکات و دلائل کو یاد کر کے اسطرح تقریر کرتے ہیں کہ وہ لوگ جنکو فراست و کیاست سے کچھ تعلق نہیں ہے عش عش اور تعجب کرنے لگتے ہیں اور اُنکے وفور دانش و بینش کی گواہی دیتے ہیں حالانکہ اُن کو کسی مسئلہ حکمیہ کا یقین اور اُسپر اطمینان نہیں ہوتا اور اُنکے نفس ناطقہ میں کوئی نقش راسخ و متمکن نہیں ہوا کرتا علماء حکمائی مناسبت میں ان لوگوں کا حال مثل اُن جمادات کے ہے جو افعال و اقوال انسانی کی محاکات کرتے ہیں جیسے بندریا طوطی یا اُس لڑکے کے مانند جو بانوں

منجملہ انکے ایک محبت ہے - یہ ایک ایسی فضیلت ہے جسکے ہوتے ہوئے نظام تمدن میں عدالت کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ یہ اُس سے افضل ہے کیونکہ یہ ایک ایسی وحدت ہے جو شبیہ بطبعی

بقیہ صفحہ گذشتہ

سے مشابہ ہوا کرتا ہے ؎

گیرم کہ مار چوبہ کند تن بشکل مار　　کو نہ ہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ کسی مطلب مسئلہ میں حق صریح کا اذعان نہیں رکھتے ہیں اور ہر مطلب میں - اگرچہ صریح وصاف ہی کیوں نہو - باوجود عدم فطانت تصرف کرنا چاہتے ہیں اور غلط سلط دہوکہ کی باتوں سے ہندیوں کو وہم وشک میں ڈالتے ہیں حالانکہ مسائل یقینیہ میں وہم وگمان کی گنجایش اور شک کا خانہ ہی کہاں - یہ لوگ مطالب عالیہ میں بڑے بڑے دعوے کرتے اور باطل کو لباس حق پہناتے اور ظن وتخمین کو بصورت علم و یقین ظاہر کرتے اور بزعم خود اسکا نام تحقیق وتدقیق رکھتے ہیں - چونکہ حکمت، کمالات انسانی کے اعلیٰ مدارج سے ہے اسلئے اوسکی جانب یہ حال بجز حکیم کے حاصل نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ حکما میں اور اس گروہ میں فرق وامتیاز نہیں کرسکتے -

اسیطرح فضیلت عفت میں ایک گروہ لذات دنیاوی سے اعراض واحتراز کرتا ہے تاکہ اُسی جنس کی اُس سے زیادہ تر لذت والی چیز حاصل کرے - جیسے کہ وہ زاہد جو تزویر عوام اور صید انام کے لئے زہد اختیار کرتے ہیں تاکہ اسکے وسیلے سے اپنے خواہشات کو پورا کریں - یا وہ لوگ جو کثرت استعمال لذات کی بنا پر ملال وکلال حاصل ہونے سے - یا اصل فطرت یا کسی مرض کی وجہ سے نقصان شہوت آجانے سے عفت برتتے ہیں ؎

گر بعصیاں در نمی آویزم از ناطاقتی است　　ورنہ بعینہ چون حریص شہوت است وضعفناہ

یا وہ لوگ جو بوجہ خوف آلام وامراض یا اس خوف سے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائیگا تو موجب سرزنش وملامت ہوگا - اس سے محترز رہتے ہیں یہ لوگ درحقیقت عفیف نہیں ہیں -

اور اسیطرح فضیلت شجاعت کا حال ہے کہ کبھی غیر شجیع سے بھی شجاعت کا فعل صادر ہوتا ہے - مثلاً بعض لوگ مال وجاہ کے لئے یا حرص کی وجہ سے ضرب شدید وحبس مدید وقتل وقتال وجنگ وجدال کے متحمل ہوتے ہیں - جیسے قیار وقطاع الطریق - مگر یہ لوگ شجیع نہیں کہلا سکتے اسلئے کہ شجیع وہی شخص ہے جو سوائے اس ملکہ فاضلہ کے دوسری غرض ومنظور نہ رکھتا ہو - یہاں اسقدر رذائل شبیہ بفضائل کا بیان

ہے اور عدالت شبیہ بصناعی اور یہ امر مسلم ہے کہ طبعی صناعی پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ نسبت دو کو ایک اور عدالت و انصاف ایک کو دو کرنے والی صفت ہے کیونکہ انصاف کے معنی ہی نصف نصف

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

جو طرداً للباب وتبصرۃً لاولی الالباب کر دیا گیا ہے کافی و وافی ہے زیادہ تطویل کی ضرورت نہیں

چونکہ اعتدال تمدنی موقوف بدرستی اخلاق انسانی ہے اور بدون اسکے مصالح دین و دنیا۔ خواہ شخصی ہوں یا نوعی پورے نہیں ہو سکتے اس لئے شریعت کی ضرورت و حاجت کیلئے بھی کچھ اشارہ کر دینا ضروری ہے کیونکہ اصلاح تمدن و اصلاح اخلاق تمدن و اعضائے مدینہ کا ممکن ہے اسلئے حکماء قدیم طالب فضیلت کو پہلے تہذیب اخلاق کی تعلیم [illegible] بعد علم اخلاق ریاضی بعد منطق، بعد علم طبعی پڑھانے کا بہت اہتمام کرتے تھے اور [illegible] پڑھایا کرتے تھے کیونکہ ریاضیات کی ممارست سے نفس میں یقین کی عادت اور ملکہ مستفاد ہوتا ہے [illegible] تحقیق و تدقیق اسکا شعار ہو جاتا ہے اکثر لوگ جو بغیر ریاضی کے منطق پڑھتے ہیں ان صفات سے برعکس موصوف و متصف ہوتے ہیں انکے نزدیک کمال نفس ناطقہ شغب و جدال کا نام ہے اور ایراد مغالطہ یا شک پیدا کرنا نہایت تحقیق ہے اسلئے افلاطون نے اپنے گھر پر یہ نوٹس لگا دیا تھا کہ جو حساب و ہندسہ نہ جانتا ہو وہ مجھ سے نہ ملے۔ [illegible] جمیع علوم حکمیہ پر تہذیب اخلاق مقدم ہے۔ بقراط کا یہ مقولہ ہے کہ جب تک بدن اخلاط خالص [illegible] نہ ہو غذا سے بجز فساد کے کچھ فائدہ نہ ہوگا اور مرض کی زیادتی کے سوا اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلیگا۔ یہی نکتہ در مراس میں بھی ہے کہ جب تک کہ نفس اخلاق ذمیمہ سے پاک نہ ہو تعلیم علوم حکمیہ اسکے ازدیاد فساد کا سبب ہوتی ہے۔ کیونکہ اسکی وجہ سے مواد کبر و نخوت پیدا اور اسباب انواع رذائل مہیا ہوتے ہیں [illegible] چونکہ اکثر طلبہ در آتوا البیوت من ابوابہا پر عمل نہیں کرتے اور تہذیب اخلاق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں اسی لئے فسق و فجور اور ضلالت و گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علمت قید تقلید سے آزاد کر کے اور درجہ تحقیق پر پہنچاتی ہے اور نہیں سمجھتے کہ اسکے کیا معنی ہیں؟ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ حکمت موجب اخلال قیود شریعت اور سبب اطلاق تعاطی ملت ہے اور سبب رد [illegible] ہوا و ہوس اور خوشامد نفس قید شریعت سے آزاد ہو جاتے ہیں جو زیور [illegible] راہ طلب [illegible]

خلاص ما ہمہ زاں زلف تابدار مباد ۔۔۔ کہ بستگان کنند و بستگار مست

رنگ کے ہیں جو وحدت سے کثرت کی طرف جاتی ہے۔ اگر غور دیکھا جائے اور خیال کو ذرا وسعت دیجائے تو معلوم ہوگا کہ تمام عالم ہی کشش انجذابی و تالیفی اور ہی حب ذاتی پر موقوف و منحصر ہے اگر یہ جاتی رہے تو ابھی تمام عالم درہم برہم ہو جائے اور اذا النجوم انکدرت کا مفاد پورا ہو جائے

سر حب ازلی در ہمہ اشیا سارست ورنہ بر گل نہ زدے بلبل بیدل فریاد

جو محبت بادشاہ و رعیت اور حاکم و محکوم کے درمیان ہوتی ہے وہ بوجہ اختلاف اسباب طرفین کے لئے موجب شکایت ہوا کرتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے وہ چیز طلب

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

اور بہائم کے مانند ہو جاتے ہیں [illegible] پہنچ جاتے ہیں اور درندوں کی طرح ہتک عرض اقران و [illegible] بہائم کے مانند [illegible] جانے کے مسائل پر ایمان رکھنا طالبان [illegible] جو فرزندان [illegible] ہیں۔ واجب ہے یہ ان اعتقادی مجازی سے ہوا کئے گذرے ہیں جو ایک قسم کی نجات [illegible] موجب ہے۔

البلاء [illegible] الخاص من فتنة بنزاع [illegible] حقیقت کو سمجھکر اور کنہ کو نہ پہنچکر حیران و پریشان [illegible] [illegible] استهوته الشياطين في الارض [illegible] بين ذلك لا الى [illegible] ہو لا [illegible] کا تقریر [illegible] سنت میں متعدد جگہ وارد ہوا ہے [illegible] قاصروں کی [illegible] ہو [illegible] غرض [illegible] ہو [illegible] تعلیم قدیم و جدید میں جو نقص [illegible] ہو [illegible] کا مرض دونوں میں ہو سکتا خواہ کسی دینی یا دنیوی [illegible] تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں کالج کے پڑھے ہوئے ہوں یا یونیورسٹی کے [illegible] اس مرض [illegible] تعلیم قدیم و جدید کو اسکا خیال زیادہ تر ہونا چاہئے ورنہ بجز تخریب اخلاق کے تعلیم سے اور کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔

چونکہ اتحاد و اتفاق مدنی میں محبت کا ذکر آگیا ہے اسلئے ہم بیان [illegible] اقسام کو بیان کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ نوع انسانی میں دو قسم کی نسبت ہوا کرتی ہے ایک طبعی جیسے والد اور اولاد کی محبت۔ دوسرے ارادی جیسے استاد و شاگرد اور مرید و مرشد کی محبت۔ محبت ارادی کی باعتبار ارادہ کی غایت کے چار قسمیں کی گئی ہیں۔

پہلی۔ وہ جسکی غایت صرف لذت ہو یہ محبت جلد حاصل اور جلد زائل ہو جاتی ہے کیونکہ لذت سہل الحصول و سریع الزوال ہے

کیا کرتا ہے جو اسکو اکثر اوقات میسر نہیں ہوتی اور فقدان مطلوب سبب ملامت و مادۂ شکایت ہوتا ہے
اسکا ارتفاع بغیر عدالت کے جو مستلزم رضا بقدر استحقاق ہے، نہایت مشکل ہے۔ سلاطین کو رعایا سے
تنعم و تفضل اور تربیت کیوجہ سے محبت ہوا کرتی ہے۔ لہذا بادشاہ کی محبت رعایا کے ساتھ پدرانہ
اور رعایا کی بادشاہ کے ساتھ پسرانہ ہونی چاہئے اور رعایا کو باہم برادران مشفق کی مانند رہنا
اور بقدر استحقاق اپنے حقوق طلب کرنا چاہئے نہ کہ زائد از استحقاق۔ چونکہ برادر حقوق میں
باہم شریک ہیں اور شرکت ایک قسم کی منازعت کی مقتضی ہے۔ لہذا انہیں جادۂ عدالت کو مرعی

دوسرے وہ جو لذت و نفع و نسبت مرکب ہو یہ دیر سے حاصل ہوتی اور دیر تک رہتی ہے۔ کیونکہ اجتماع نفع و خیر دونوں
حالتوں کو مقتضی ہے۔

تیسرے وہ جس سے صرف نفع مقصود ہو، یہ جلد سے پیدا ہوتی اور جلد زائل ہو جاتی ہے کیونکہ حصول نفع پر مبنی ہوتا
ہے اور جب حصول اسباب باقی نہیں رہتا، لہذا جلد زائل ہو جاتی ہے۔

چوتھی۔ وہ جس سے صرف ضرر و شر مقصود ہو، یہ جلد حاصل ہوتی اور دیر سے زائل ہوتی ہے کیونکہ مناسبت ریعانی اور
انسیت جانی کی وجہ سے جلد میسر ہوتی ہے اور اتحاد طبیعتوں کے سبب سے دیر پا رہتی ہے۔

حکماء نے کہا ہے کہ محبت صداقت سے اعم ہے کیونکہ محبت جماعت کثیر سے ہو سکتی ہے، بخلاف صداقت کے
اور اسی طرح اس سے بھی۔ ظاہر ہے کہ ایک دل میں دو کا جمع نہیں ہو سکتا۔ چونکہ محبت اہل خیر کی غایت خیر ہے اس لئے
یہ کبھی حاصل واقع نہیں ہوتا، بر خلاف دوسری محبتوں کے کہ وہ ادنیٰ عوارض سے ہی خلل پذیر اور زائل ہو جاتی ہیں جیسا
کہ اس آیت میں ہے کہ اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ

لیکن تو یہ ہے کہ صرف نفع، اتفاق کے لئے بمنزلہ ہے، درمیان اسرار و اخیار اور اشرار و اشرار دونوں کے ہو سکتی
ہے۔ کبھی یہ محبت اصلح عزت اور مصائب و شدائد اور اجتماع ہو جانے سے بھی ہوا کرتی ہے۔ جیسے اسفار دریا بعیدہ
یا کشتی میں ایک ہو جانے کے سبب سے یا مصائب و حوادث وغیرہ کی وجہ سے۔ اس قسم کی محبت کا ہونا ہے کہ انسان
طبیعی طور کی طرف مائل ہے اسلئے اسکو انسان کہتے ہیں۔ اور محبت کسی فرقہ یا قوم وغیرہ میں یہ مادہ کم ہوتا ہے
اور انسانیت سے بعید اور دوستی سے قریب ہو جاتا ہے۔ یہی ماہیت انسانی مبدا و مقتضا سے تالف و تمدن ہے۔
شارع علیہ السلام نے بھی تالف و تمدن کا اہتمام اپنے تمام احکام میں مرعی رکھا ہے۔ جیسے کہ جمع و جماعت اور جمعہ و زکوٰۃ
وغیرہ اس کے اسرار یہی ہیں اور ان تکالیف سے مقصود شارع یہی ہے کہ تحقق رابطۂ وحدت اور رفع فائدہ عزت
ہو اور اسی طرح۔ ہے کہ اسلام اپنے مقصود توحید کا تمام سب اسی طرح پر دے عمل میں لاتا ہے تو جیسا کہ اسکا
عقیدہ وحدت ہے عمل میں موحد ہے۔ جب کہ سبب محبت ایک طرف سے لذت اور دوسری طرف سے منفعت ہو
تو یہ اختلاف اسباب اکثر شکایات واقع ہوتی ہے جیسے محبت، محب و مستحق اور عاشق و معشوق کی کہ مستحق و
عاشق کی محبت کا سبب لذت ہے اور محب و معشوق کی وجہ محبت منفعت۔ اس قسم کی محبت میں حوادث شکایات
کا ہونا ہوتی ہے۔ غالب لذت استیفاء لذت میں مجاہدت کرتا ہے اور طالب منفعت اسکو حصول منفعت پر
موقوف رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے دونوں میں موافقت کمتر میسر و متصور ہوتی ہے اور اسی وجہ سے عشاق بیشتر شاکی
اور متظلم رہتے ہیں حالانکہ درحقیقت خود ہی ظالم ہوتے ہیں کیونکہ استیفاء لذت میں تو جلدی کرتے ہیں اور
اسکے بدلے تادیہ منفعت میں تاخیر کرتے ہیں۔ اس قسم کی محبت کو "لوامہ" کہتے ہیں یعنی یہ محبت مقرون
بملامت ہوا کرتی ہے۔

نہ رکھنے اور اپنے حقوق سے بھی متجاوز ہونے کو ہے۔ بعض اوقات نزاع بھی ضروری ہے چنانچہ اگر دیکھا گیا ہے کہ بھائی بھائی میراث پر لڑا کرتے ہیں مگر یہ نزاع اُنکے رشتہ برادری کو منقطع نہیں بلکہ قانون یا حکم عادل اُن کو اپنے حقوق پر قانع اور راضی رکھ سکتا ہے اسی طرح اگر افراد رعایا میں بعض خصوصیات اور اتصال منافع و حقوق پر لڑائی جھگڑا ہوتے ہوں تو اُس سے ان کی محبت و اُلفت میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیئے بلکہ اُسکو اُسی حد تک محدود رکھنا چاہیئے۔

دوسری۔ صداقت ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ شریعت و عقل جہاں تک ہو سکے حکم اشتبیت کو مرتفع اور رابطہ اتحاد کو اسطرح مستحکم کریں کہ جو بات اپنے لئے پسند نہ کریں اپنے دوست کے لئے بھی نہ پسند کریں اور جو منافع اپنے لئے چاہیں اُسکے لئے بھی چاہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ:

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ — تم میں سے کوئی بھی کامل مومن اسوقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تیسری۔ الفت ہے یعنی مختلف فرقے اور گروہ ایک دوسرے کی معاونت کریں اس فضیلت کو آنحضرت صلعم نے اوصاف ایمان سے قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:۔

المومن مألف لا خیر فیمن لا یألف ولا یولف۔ — مومن الفت رکھتا ہے۔ اُس شخص میں کچھ بھلائی نہیں جو نہ دوسروں کو مالوف کرتا ہے اور نہ خود مالوف ہوتا ہے۔

چوتھے۔ وفا ہے یعنی مواسات جسکے معنی مال و تن سے یاری و مدد کرنے کے ہیں یا مواعید و حقوق کا ایفا کرنا حدیث میں آیا ہے۔

انصر اخاک ظالماً و مظلوماً — یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم

صحابہ نے عرض کیا یا رسول مظلوم کی نصرت تو خیر لیکن ظالم کی نصرت کیونکر ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ظالم کی نصرت یہی کہ وہ ظلم سے باز رکھا جائے۔ قرآن میں دوسری تاکید کی بابت وارد ہے کہ:

اوفوا بالعہود ان العہد کان مسؤلا۔ — مواعید کو پورا کرو کیونکہ وعدے جانچے جائیں گے

پانچویں۔ شفقت یہ ایک قسم کے انفعالی اثر کا نام ہے جو بنی نوع پر کسی نامالایم حادثہ کے واقع ہونے سے طبیعت انسانی میں پیدا ہوتا ہے جس سے بالطبع انسان کو اُس حادثہ کے زائل اور دفع کرنے کی تحریک ہوتی ہے کیونکہ بنی نوع انسان ایک ہی تن کی شاخیں ہیں اور ایک ہی جسم کے اعضا۔ جب کہ خدا فرماتا ہے

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء

اے لوگو ڈرو اس پروردگار سے جس نے تم تمام کو ایک نفس (آدم) سے پیدا کیا اور اس سے اسکا جوڑا بنایا اور ذکور و اناث کی ایک تعداد کثیر پیدا کی

آنحضرت نے فرمایا ہے۔

ترى المؤمنين في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد اذا اشتكى عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى۔

مومنین اپنے ترحم، دوستی اور مہربانی میں مثل ایک جسد کے ہیں جب ایک عضو میں تکلیف ہو تو تمام جسم بخار اور بیخوابی سے بے چین رہتا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگراند	که در آفرینش ز یک جوهراند	
چو عضوے بدرد آورد روزگار	دگر عضوہا را نماند قرار	
تو کز محنت دیگران بے غمی	نشاید که نامت نهند آدمی	

پہلا۔ رفق یعنی خوش خلقی اور نرمی [illegible] کی اس علامتیں ہیں۔

(۱) نیک کاموں [illegible] (۲) اگر کسی سے کوئی خطا ہو [illegible] تو اسکو قبول کرنا۔ (۳) [illegible] (۴) [illegible] پر نظر رکھنا۔ (۵) خلق [illegible] خوش کلامی سے پیش آنا۔ [illegible] میں داخل ہوا۔

ما کان الرفق فی شیء الا زانه ولا کان العنف فی شیء الا شانه۔

[illegible] ہوا یا صوم و تاب اور [illegible] فی شیء الا شانه۔

خدا سے تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کے [illegible] جو [illegible] پر احسان کیا اور یہ فرمایا ہے

فبما رحمة من الله لنت لهم [illegible]

الحاصل رفق خلق سے [illegible]

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است	[illegible]	
درشت کاری سبب تفسیت [illegible]	[illegible]	
آبشیرین زبانی [illegible]	[illegible]	

باتوں - حسن شرکت و معاشرت ہے - یعنی بمراعات قانون عدالت معاملات کو اسطرح
سے کہ شرکا کے لئے موجب الخرات ہو - رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ :-

الاصحاب عند اللہ خیرھم لصاحبہ
والجیران عند اللہ خیرھم لجارہ
برکہ من یرجی خیرہ ویومن شرہ
والناس من ینفع الناس

خدا کے نزدیک بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے رفیق کے حق میں
بہتر ہوں - اللہ کے نزدیک وہ ہمسایہ اچھا ہے جو اپنے ہمسایہ کے
لئے اچھا ہو - تم میں اچھا شخص وہ ہے جسکے خیر کی امید کیجاوے اور اسکے
شر سے امن میں رہا جاوے - اچھا انسان وہ ہے جو دوسرونکو نفع پہنچاوے -

آٹھویں - تودد یعنی اکفار و افاضل کی دوستی بطیب کلام و انعام و اکرام طلب کرنا اور اسی قسم کے اسباب
جو موجب جلب محبت ہو سکیں -

بہرحال ان صفات حسنہ اور اخلاق حمیدہ کے بغیر نہ عدالت کا تحقق ہو سکتا ہے نہ مختلف فرق
آپس میں نسبت تالیفی پیدا ہو سکتی ہے نہ تمدن و مذہب کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اسلئے جو لوگ ارکان
بنی فاضلہ ہیں یعنی علماء و فضلا و حکما اور حکام عادل انکو پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ صفات
افراد و اجزائے مدینہ میں پیدا ہوں اور جو لوگ اسکے برخلاف اتفاق اور عداوت و اختلاف
پھیلاتے ہیں وہ درحقیقت مخرب دولت و ملت اور مفرق اجزائے مدنیت ہیں -

ہم یہاں بمناسبت مقام بادشاہ و حاکم مدینہ کے ان فرائض کو بھی مختصراً بیان کر دینا مناسب
خیال کرتے ہیں - جو اس اجتماع تمدنی کے قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں -

بادشاہ کی مثال طبیب عالم کی مانند ہے جسطرح طبیب کو اسباب مرض کا دریافت کرنا اور
اسکے مناسب علاج کی فکر کرنا ضروری ہے اسیطرح بادشاہ کو بھی مرض مملکت کا جاننا اور اسکے
دفعیہ کی کوشش کرنا واجب ہے - ہم مکرر بیان کر آئے ہیں کہ تمدن مختلف فرق انام کے اجتماع
عام کا نام ہے جب تک ہر ایک گروہ اپنی اپنی حد پر رہیگا اور جو اشغال کہ اسکے مناسب حال
ہیں انہیں مصروف رہیگا اور جو عہدے اور مراتب اسکے لائق ہوں اسکو ملتے رہینگے تو اس صورت میں
مزاج مدینہ حد اعتدال پر اور تمام کام منتظم رہتے ہیں - اگر اس قانون کی پابندی نہ کیجائیگی تو اسکا لازمی نتیجہ
یہ ہوگا کہ افراد مدینہ کا شیرازہ الفت منحل اور تمام انتظام خراب و مختل ہو جائیگا کیونکہ ہر ایک دولت کا مبدا ایسی
جماعت کے افراد کا اتفاق ہے جو باہمی معاونت میں اعضا شخص واحد کے مانند ہوتے ہیں اور اس جماعت

کی تمام قوتوں کا جامع ایک شخص ہوجاتا ہے اسی وجہ سے کوئی شخص تنہا اُسکا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ ایسے بہت سے اشخاص بھی جو باہم مختلف آرا رکھتے ہوں اُسپر غالب آسکتے ہیں، لیکن ان لوگوں میں بھی اتفاق و ائتلاف ہوجائے اور سب کے سب ایک شخص کی ماتحت متحد ہوجائیں تب ان کا مقابلہ اور غلبہ ممکن ہے۔

ہمنے متعدد بار بیان کیا ہے کہ کوئی کثرت، وحدت تالیفی کے بغیر منتظم نہیں ہوسکتی اور وہ وحدت عدالت ہے۔ اسلئے جب تک بادشاہ قانون عدالت پر چلتا رہیگا، تمام طبقات رعایا کو اپنے اپنے حدود پر برقرار رکھیگا۔ اُن کو دوسروں پر جور و تعدی کرنے دیگا، تو ضرور نظام مملکت باقی رہیگا۔ اگر اسکے برخلاف ہر ایک گروہ اور ہر ایک فرقہ اپنے نفع کی خواہش میں دوسروں کو ضرر پہنچانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا تو اس افراط و تفریط کی وجہ سے ضرور رابطہ انتظام درہم برہم ہوجائیگا۔ تجربے سے ثابت ہے کہ جس دولت کے مختلف فرق رعایا میں موافقت رہتی ہے اور قانون عدالت کی پابندی کیجاتی ہے وہ دولت ترقی کرتی رہتی ہے اور جہاں ظلم و عدوان کا غلبہ ہوا وہاں ہمیشہ سلطنت کو زوال ہوا۔ کیونکہ اہل زمانہ اپنے سلاطین کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اُسی روش چلتے ہیں۔ الناس علی دین ملوکھم۔

چونکہ ہر ایک شخص کی طبیعت میں دوسروں پر ظلم و تعدی اور تسلط و غلبہ حاصل کرنیکا مادہ ہے اسلئے جب بادشاہ اور اُسکے اتباع ظلم کرتے ہوئے دیکھے جائینگے تو خواہ مخواہ قوی کو ضعیف پر مسلط ہونے اور اُسکے حقوق میں دست اندازی کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ ہمنے اوپر بیان کیا ہے کہ وحدت سیاسی غلبہ و عدوان کے ساتھ مجتمع نہیں ہوا کرتی ہے کیونکہ اسکی وجہ سے ملک میں انتظام نہیں رہیگا اور فتنہ و فساد برپا ہوجائیگا اسی لئے کہا گیا ہے کہ:۔

الملك يبقى بالكفر ولا يبقى مع الظلم — ملک کفر کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے ساتھ نہیں رہتا
والظلم مؤذن للخراب — ظلم اُجڑنے اور خراب ہونے کی خبر دیتا ہے۔

پس بادشاہ کو چاہئے کہ اصنافِ خلق کو بایکدگر برابر رکھے تاکہ اسکی وجہ سے اعتدال تمدنی حاصل ہوسکے۔ جسطرح اعتدال مزاج عناصر اربعہ کے معتدل رہنے سے پیدا ہوتا ہے اسیطرح مزاج تمدنی کا اعتدال بھی ان چار گروہوں کے اعتدال سے ظہور میں آتا ہے۔

(۱) اہل قلم۔ جیسے علما، فقہا، قضاۃ، کتاب، شعرا، منجم، اطبا، شعرا وغیرہ وغیرہ جنکے قلم سے دین و دنیا کا قوام ہے۔ یہ لوگ بمنزلہ آب ہیں اور جو مناسبت علم و آب میں ہے وہ

روشن تر از آفتاب ہے۔

(۲) اہل شمشیر۔ یہ گروہ رعایا کے انتظام مصالح کے لیے ہے۔ اسکا یہ کام ہے کہ سلطنت کو دشمنوں اور باغیوں کے خطروں سے محفوظ رکھے۔ یہ بمنزلہ آتش ہے اور ان دونوں کی وجہ شبہ ظاہر ہے۔

(۳) اہل معاملہ۔ جیسے تجار اور دیگر اہل حرفت جنکے ذریعہ سے مایحتاج زندگی اور اسباب معیشت فراہم ہوتے ہیں۔ یہ گروہ مثل ہوا کے ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ جسطرح ہوا نباتات کے نشو نما میں مدد و معاون ہے اور اپنے تموج و حرکت سے بطرح قسم قسم کے دلکشا اور مفرح اشیا سے حیوانات اور انسان کی روح کو تر و تازگی پہونچاتی ہے، اسیطرح اہل حرفہ اور تجار انسان کی ضروریات زندگی پورا کرتے اور دور دراز مقامات سے طرح طرح کے دلفریب امتعہ اور مرغوب و خفیف اشیاء سے مستفید و منتفع کرتے ہیں۔

(۴) اہل زراعت۔ یہ فرقہ مدبر نباتات ہے اور اہل مدینہ کے اشیاء خورد و نوش کو پیدا کرتا ہے بغیر اسکی کوششوں کے افراد انسان کا زندہ رہنا محال ہے، درحقیقت یہ گروہ معدوم شی کو موجود کرتا ہے، کیونکہ دوسرے جتنے فرقے ہیں وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں نہیں لاتے بلکہ موجودہ اشیا کو ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک حالت سے دوسری حالت کیطرف منتقل کرتے ہیں۔ چونکہ اس گروہ کو خاک سے قرب و اتصال ہے اسی لئے بمنزلہ خاک ہے[1]۔

مرکبات عنصری میں جسطرح ایک عنصر کا غلبہ اور حد اعتدال سے متجاوز ہو جانا فساد کا موجب اور نظام جسمی کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے اسی طرح اجتماع مدنی میں ان اصناف اربعہ میں سے کسی ایک صنف کا غلبہ بھی انتظام میں خلل ڈالتا ہے۔

---

[1] اہل مدینہ کی تقسیم ایک دوسری وجہ سے یعنی انکے خصائل طبعی و فطری کے لحاظ سے پانچ قسم پر ہو سکتی ہے۔

(۱) وہ جو بالطبع نیک ہوں اور انکا خیر متعدی بغیر ہو جیسے علمائے شریعت مشائخ طریقت اور علمائے حقیقت۔

(۲) وہ جو بالطبع نیک تو ہیں مگر ان کی نیکی دوسروں تک متعدی نہیں ہوتی یعنی اہل میں نکمل نہیں۔ بادشاہ کو چاہیے کہ اس طبقہ کو بھی محترم رکھے اور انکی معونت کرے۔ (۳) وہ جو بالطبع نیک ہیں نہ بادشاہ کو اس گروہ کی حمایت و نگہبانی کرنی چاہیے تاکہ فساد اسکے تعدی سے محفوظ و مصئون رہے اور بقدر امکان کمال لائق تک ترقی کرے۔

چہارم۔ جو بالطبع شریر ہوں مگر انکا شر دوسروں تک سرایت نکرے۔ بادشاہ کو چاہیے کہ اس جماعت کی تحقیر و اہانت کرے

بادشاہ کو چاہیئے کہ اہل تمدن کے مراتب کی تعین کے بعد انکو قسمت خیرات میں بھی حد اعتدال پر رکھے خیرات کی تین قسمیں ہیں۔ سلامتی نفوس، سلامتی اموال، اور تعدیل کرامات۔

تعدیل کرامات کے یہ معنی ہیں کہ ہر شخص کے رتبہ اور استحقاق کا لحاظ رکھا جائے اور بقدر اوسکی لیاقت وحیثیت کے رتبہ اور راتبہ مقرر کیا جائے اسلئے کہ اگر اُسکے حقوق کا خیال نہیں کیا جائیگا تو اُسپر جور ہوگا اور اگر اُسکو استحقاق سے زیادہ رتبہ دیا جائیگا اور مستحقین ولائق لوگ محروم رکھے جائینگے تو گویا یہ اہل مدینہ پر ایک قسم کا ظلم ہوگا۔ کبھی کسی خاص شخص کی تنقیص بھی اہل مدینہ کے لئے جور وظلم ہوا کرتی ہے اسلئے کہ کسی مستحق کو اُسکے رتبہ سے گھٹانا، اُسکے اور دوسرے مستحقین کی خاطر شکنی کا موجب اور انتظام مدینہ کے خلل کا باعث ہوتا ہے۔

پس جو لوگ لیاقت واستحقاق کے بغیر ملکی خدمات میں حصہ لینا چاہتے ہیں اور مستحقین کو محروم کرنا پسند کرتے ہیں وہ قواعد عدالت سے دور اور ضوابط وآئین ریاست سے نامعمور ہیں۔

اور موعظت ونصیحت سے انکو شر سے حتی الامکان باز رکھو۔ پنجم۔ وہ جو کہ بالفعل شریر ہیں اور انکا شر دوسروں تک سرایت کرے یہ طائفہ اخیر دو اقسام پر مشتمل ہے۔ اس گروہ میں جنکی اصلاح کی امید ہو اُنکی تادیب کرنی چاہیئے اور جنکی شرارت شمول عمومیت نہ رکھتی ہو اُنکی تنبیہ بقدر مصلحت وقت کا رہنما ہونا چاہیئے اور جنکی شرارت عمومیت وشمولیت رکھتی ہو اُنکے شر کا ازالہ واجب ہے اور اُنکے دفع کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

حبس یعنی اہل المدینہ سے علیحدہ کر دینا۔

قتل یعنی بند کرنا اور بیڑیاں ڈالنا اور تصرفات بدنی سے باز رکھنا۔

نفی یعنی خارج البلد کرنا اور دخول مدینہ سے باز رکھنا۔

اگر ان طریقوں سے بھی اُن کا شر منتفی نہ ہو تو اُن کو معدوم اور قتل کر دینا چاہیئے جسطرح کہ اعضاء کے بقا اور حفاظت جسم کے لئے طبیب کو کسی فاسد وموذی عضو کا قطع کر دینا واجب ہے اسیطرح طبیب عالم یعنی بادشاہ کو بھی سلامتی نفوس اور مصلحت عامہ بنی نوع کے لئے جو اعضائے تمدن میں سے ہے ایسے مضر شخص کا قتل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

دیکھئے ہم کیا کہتے ہیں

العزیز نام کا ایک ماہوار رسالہ بڑی تقطیع کے پچاس صفحوں پر نہایت آب و تاب سے جاری ہوا ہے جو بالکل ولایتی رسالہ جات کے ڈھنگ پر ہے۔ ہندوستان کے نامی اور مشہور اہل قلم اصحاب کے سلسلہ مضامین کے علاوہ العزیز کی ایڈیٹری کا چارج۔

ایک تجربہ کار اخبار نویس کے ہاتھ میں ہے

ہر مہینہ خصوصاً ملکی۔ اصلاحی۔ ترقی جیسے ضروری معاملات پر آزادی مگر کمال متانت کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ کم از کم ایک درجن تصاویر اور کئی دلچسپ کارٹون ماہوار درج ہوتے ہیں۔ علاوہ اسکے انگریزی رسالہ جات اور صحائف کے ترجمے جنہوں نے اپنی جدت سے۔

یورپ بھر میں دھوم مچا رکھی ہے۔

ہر مہینہ درج ہوتے ہیں۔ ایک بالقطع تاریخ کا سلسلہ جاری ہے دنیا کے مشہور لوگوں کی باتصویر سوانح عمریاں بھی درج ہوتی ہیں غرضیکہ بلحاظ لکھائی چھپائی وغیرہ کے رسالہ قابل دید ہے۔

ایک ہزار صفحہ کی انعامی کتابوں کے ساتھ

رسالہ کی سالانہ قیمت ۴ صرف رسالہ کی قیمت عا (نمونہ ۱ر) کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے درخواست بنام منیجر العزیز مطبع عزیزی آگرہ ہونا چاہئے۔

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بھاگلپور کے چند زمیندار رؤسا نے مندرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکا ہرگز یہ منشا نہیں کہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ منشا اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے بادار نفیس دیسی طرز کے کپڑے از قسم لنگی چادر دھوتی و صافہ و رومال دستی و سوتی لنگا و ساڑیاں ہر قسم ہر رنگ کے تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دھوپ چھاں ساہ و چک و دوڑیا و بافتہ وغیرہ لایق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ بآسانی پہونچائے جاتے ہیں نفاست و پائداری میں خاص بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ ڈھاکہ کی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرات پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں فرمائش و بل کے بھیجنے سے آنی چاہیں المشتہر ڈاکٹر مزاف حسین سکرٹری رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور محلہ تاتارپور۔

ید بیضا

زبان اردو کا ایک ماہوار علمی رسالہ جس میں ہر قسم کے ادبی تنقیدی تمدنی اخلاقی تاریخی اور فلسفیانہ مضامین اور تازہ خبریات اور دلچسپ نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ حجم ۴۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶۔

مقاصد ضروری۔ اردو علم ادب کی تزئین و توسیع قیمت سالانہ مع محصول ڈاک

والیان ریاست سے ..... عطیہ مرضیہ

رؤسا عظام سے ..... سے ر

عام خالقین سے (قسم اول عمدہ کاغذ پر) ..... ہے

(قسم دوم معمولی کاغذ پر) ..... عا

خریداران ممالک غیر سے ..... ہے

درخواست خریداری بنام حکیم محمد سعید منیجر سکندرآباد ضلع بلند شہر آنی چاہئے

الرفیق

یہ اردو کا ماہوار رسالہ ملک کے مشہور مضمون نگار مولوی عبدالسلام صاحب سلیقی کے زیر ایڈیٹری رنگوں سے شائع ہوتا ہے۔ بڑی تقطیع کے چار سو صفحے سالانہ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجہ کی۔ عموماً مضامین نگاروں کو ایک اشرفی سے لیکر سو روپیہ تک انعام دیا جاتا ہے۔ قیمت سالانہ صرف عا ۱ روپیہ مع محصول ڈاک جو لاگت سے بھی کم ہے نمونہ کے لئے ۴ر کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ اشتہارات کا تعلق بذریعہ خط ہو سکتا ہے۔

تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام منیجر ہونی چاہئے

سید

شاہد حسن ہاشم۔ منیجر

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور تیس روپیہ میں مفت

ناظرین کو خوب خیال ہوگا کہ یہی ریلوی فیشن کی چینی گھڑی
کسی وقت میں روپے سوداگر سات روپیہ کو بیچا کرتے تھے
جب ہمنے وساوت چالان خود منگایا اور قیمت ہمنے کشادی
تب اور سوداگر ہمسے کرنے لگے مگر کیونکہ ہمارے اب اسٹاک
ہمارا [illegible] مفت دینا کر [illegible] کو کر
اصلی ڈائل [illegible] ریلوی اور تار گھر کے لئے
موزوں ہے۔

[illegible] ڈائل کی یادگار [illegible] روپیہ [illegible]
[illegible] ڈبل کیس [illegible] سال [illegible] گھڑی [illegible]
[illegible] فیشن [illegible] کلاک [illegible]

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ جوتے

[illegible] بوٹ [illegible]
[illegible] بوٹ [illegible]
کانپور [illegible]
[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے زین

[illegible] زین [illegible]
[illegible] سواروں کے [illegible]
[illegible] سامان [illegible]
[illegible] گھوڑوں [illegible]
[illegible] کرنے والوں کے لئے [illegible]

کانپور کے ہر قسم کے ساز

[illegible] ساز [illegible] پرزہ [illegible]
عمدہ قیمت [illegible] نہایت عمدہ خوبصورت [illegible]
[illegible] ساز [illegible] پرزہ [illegible]
[illegible] پرزہ [illegible]
[illegible] سوا [illegible] ہر قسم کی اشیاء دیسی و ولایتی
[illegible] ہو سکتی ہے

[illegible] 15

ممیرے کا سرمہ

[illegible] جناب سہٹ ٹکیسٹل [illegible] صاحب بہادر گورنمنٹ [illegible]

[illegible] ڈاکٹر [illegible] ریاست اور ولایت [illegible] یونیورسٹی کے سند یافتہ [illegible] ڈاکٹر
[illegible] سرمہ کی [illegible] نام [illegible]
[illegible] بیماری [illegible] پانی [illegible]
[illegible] ہے اور [illegible] کی حاجت نہیں رہتی [illegible]
لیکن بوتل تک [illegible] ہے قیمت فی بوتل [illegible] سال
کے لئے کافی [illegible] روپیہ میرے کا [illegible] اعلیٰ قسم فی بوتل [illegible]
ہے خالص [illegible] روپیہ [illegible] سرمہ فی بوتل [illegible]
[illegible] خریدار۔

[illegible]

[illegible] سنگھ [illegible] مقام [illegible] ضلع گورداسپور [illegible]

[illegible] ڈاڑھ کا درد کیا شہادت ہو سکتی ہے

[illegible] کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible] کا [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible] کا [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible] کا

رجسٹرڈ نمبر ۲۵۱

اردوی معلّٰی

نمبر ۶ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۶ء | جلد ۷

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی - بی - اے

فہرست مضامین

(۱) عیشی ..... صفحہ ۳۹
(۲) بلجیم کی سیر - از مانی ۳۱
(۳) حقوق مسلمانان ہند از قاضی تلمذ حسین صاحب جبالی - ای - ۳۳
(۴) بیاض حسرت ۴۸
(۵) مکتوبات امیر مینائی ۴۹
(۶) مکتوبات داغ ۵۱
(۷) شعرائے عہد اکبری از عبدالعزیز بہمنی
(۸) مثنوی سوز و ساز عیشی ۵۳
(۹) غزلیات عزیز مصنفی - شرف ۶۸
(۱۰) تنقید (دیوان ناکی سوانح مولانا روم - نیرنگ افغان وغیرہ)
(۱۱) ضمیمہ اردوی معلّٰی - رپورٹ ناس کانگریس

مقام اشاعت دفتر اردوی معلّٰی علیگڈھ

احسن المطابع واقع علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت { قسم اول (مع دواوین) للعہ رسالانہ مع محصول
قسم دوم (مع دواوین) سفید کاغذ عجاالضمن } سالانہ

اسمیں ایک ہزار نسخے آزمودہ تمام امراض کے درج ہیں

علاج مفتی تمام امراض کے واسطے ادویات قدرتی جن میں کوری جمع نہ ہو اور ہر جگہ میسر بنگل میں صرف روکھڑیوں جڑی بوٹیوں سے باغ میں صرف چمالی پتے اور بیل پھول سے گھر کے اندر صرف گھر کی موجودہ چیزوں گڑ نمک تیل وغیرہ سے دیہات میں اصلی چیزوں سے جو ہر ایک کو مفت ملسکیں۔ غریبوں و عیالداروں کے لئے نعمت فقیری نسخے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت عہ مجلد

جوہر قانون تعزیرات ہند۔ تمام ضروری قوانین کا خلاصہ مع تعزیرات ضابطہ دیوانی و فوجداری قانون شہادت میعاد سماعت رجسٹری اسٹامپ کورٹ فیس۔ آبکاری۔ انکم ٹیکس مفیدہ وغیرہ جسکو سبکو کام پڑتا ہے عام فہم عبارت میں۔ ہر وکیل سے کچھ پوچھنا نہ پڑیگا زمیندار کارندے تاجر عرائض نویس سب کے کام کی چیز ہے۔ قیمت عہ

اردوی معلے

یعنی صحیح فصیح اردو کا ایک ماہوار اور قابل دید رسالہ جسکے ساتھ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان بلاقیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ حجم ۵۲ صفحے لکھائی چھپائی کاغذ نہایت پسندیدہ نمونہ کا پرچہ ۲ر کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ دواوین۔ للعہ رسالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ ہے سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) عہ سالانہ (برائے طلبا وغیرہ) مقاصد ضروری نمونہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالیٹکس۔

درخواست خریداری بنام مینجر اردوی معلے علیگڈھ کے آنا چاہئے

لہ پنا پرشد ۱۹۰۱ء میں (۱) رپورٹ آگرہ بھی کانگریس (۸) دیوان میر سوز مہر اور دیوان قائم چاند پوری شاگرد سودا (۳) شائع ہوئے۔ اور ۱۹۰۲ء میں رپورٹ بنارس کانگریس اور دیوان شیفتہ نذر کئے گئے

شرح اجرت اشتہار اردوی معلے

	صفحہ یا ۲ کالم	نصف صفحہ یا ۱ کالم	نصف کالم
سالانہ	للعہ	عہ	سے ر
ششماہی	عہ	سے ر	ے ر
سہ ماہی	سے ر	ے ر	۲ر
فی ...	عہ ر	عہ	فی سطر ۲ر

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بھاگلپور کے چند زمیندار و رؤسا نے مندرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہرگز یہ نیت نہیں کہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ منشا اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی دولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس دیسی لٹری کپڑے از قسم لنگی چادر دھوتی دھاندہ رومال کھتی و سوتی لنگا و ساڑیاں ہر قسم ہر رنگ کے تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دوپٹہ چھاپ و سادہ و چمک دوڑ یا دبانتہ وغیرہ لائق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون و ہندوستان ہر جگہ بآسانی پہونچائے جاتے ہیں نفاست و پائداری میں یہ خاص بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کئے جاتے ہیں۔

حضرات پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں۔

فرمائشیں ذیل کے پتے سے آنی چاہئیں۔ **المشتہر**۔ ڈاکٹر شرف حسین سکرٹری رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور محلہ تاتارپور

شعرا کو مژدہ

رسالہ معیار جنوری ۱۹۰۲ء کو پھر جاری ہوگا جو صاحب اس رسالہ کو دیکھ چکے ہیں وہ تو دیکھ ہی چکے اور جنہوں نے نہیں دیکھا اُن کی اطلاع کے واسطے یہ عرض ہے کہ اب کی مرتبہ نہایت انتظام کے واسطے یہ رسالہ بالکل اچھوتے ڈھنگ سے شاعری دنیا میں اصلاح کرنے والا ہوگا۔

ایک حصہ میں غزلیات شعرا بمقابل قوافی منتخب اشعار درج ہونگے اور دوسرے حصہ میں اساتذہ سابق و حال کے ہم قوافی اشعار بمقابل قوافی تنقید ہوگی اور نیز مفید شاعری مضامین ہونگے چونکہ پرچہ ایک ہی مرتبہ کا ہوگا لہذا قیمت بھی ایک ہی روپیہ ہے۔ عہ

درخواست خریداری کمینہ نحاس کہنہ مکان مرزا محمد ہادی صاحب عزیز کے پتہ سے اڈیٹر معیار حکیم سید محسن خانصاحب کے نام آنا چاہئے

بسم اللہ

طالب علیخاں عیشی

(۱۱۹۷ھ تا ۱۲۵۰ھ غالباً)

سلسلہ شاعری | طالب علیخاں نام عیشی تخلص اردو میں مصحفی کے شاگرد رشید تھے اور فارسی میں مرزا قتیل کے تلمذ تھا چنانچہ کلیات اردو کے سادہ ان سے ایک کلیات نظم و نثر فارسی بھی یادگار ہے۔

تصانیف | اردو میں ایک دیوان اور ایک مثنوی سوز و ساز قابل دید ہے۔ نظم فارسی میں تین ہیں زیادہ تر قصائد حمد و نعت و منقبت اور کچھ قصیدے نواب سفیر الدولہ کی شان میں ہیں آخر میں رباعیات و مقطعات اور ۴۰ کے قریب چھوٹی بڑی مثنویاں ہیں مثلاً شکارنامہ نواب سعادت علیخاں۔ مثنوی حقیقت و مجاز۔ مثنوی نعمت دنیا۔ مثنوی در مدح آغا تقی بہادر اور مثنوی وصل و ہجر جو سب سے بڑی ہے۔ نثر فارسی معروف بہ خزاں و بہار میں اکثر حکایتیں اور رقعے ہیں۔

سرقہ و توارد | اسمیں ایک موقعہ پر سرقہ و توارد کے باب میں انہوں نے نہایت معقول رائے ظاہر کی ہے کہ جو شخص خود معنی یا باطبیعت رکھتا ہوگا وہ ایک بیت یا مصرعے کے لیے کبھی سرقہ نہ کریگا اگر بظاہر کہیں ایسا معلوم بھی ہو تو اسکو توارد سمجھنا چاہیے۔ یا بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذہن شاعر میں کسی دوسرے شخص کا شعر یا مضمون شعر محفوظ ہوتا ہے اور کمال نادانستگی وہ اس مضمون کو اپنی غزل میں ادا کر جاتا ہے۔ اسکو بھی سرقہ کہنا ظلم ہے۔ البتہ معلوم ہو جانے پر ایسے شعر کو اپنے کلام سے خارج کر دینا چاہیے۔ عیشی کی عبارت یہ ہے:۔

"در مثنوی وصل و ہجر بیتے در حمد الٰہی گفتم۔ بتحقیق رسید تمامش از ہاتفی ست۔ و ما استفادہ گویاں از سلک نتائج فکرش بیروں کردم۔ و در غزلے مصرعے از نتائج طبع استادی و فخر المتاخرین مرزا محمد حسن قتیل توارد گردید۔ چوں آگاہ شدم گفتم انا للہ و انا الیہ راجعون و خط نسخ بر کشیدم و علی ہذا القیاس بر ذمہ ہمت خود لازم داشتہ ام کہ نقشے را کہ ثانیاً از قلم ہمچو ان صورت بندد بنقاش ادلش واگزارم۔ اگر صورت تحقیق نپذیرد معذورم ..... و از نگاہ ذوی الابصار حقیقت نگر مخفی نیست کہ این معذرت بجانب مختصر و بہ من ملکہ بر کر انکہ معنی یاب دادہ اند کے

برائے یک مصرعہ یا یک بیت دامن ہمت را بلوث سرقہ بیالاید"

عیشی کی شاعری | عیشی میاں مصحفی کے درمیانی عہد شاعری کے شاگردوں میں سے تھے یہی وجہ ہے کہ انکا کلام عہد آخر کے شاگردوں مثل اسیر و منور و فرد کی شاعری کے خلاف بلائے خشک، کلامی و بے رنگی سے پاک ہے بلکہ جابجا باعتبار سادگی و درد مثنوی میں کلام میر اور غزل میں کلام مصحفی کے ہم پہلو نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

خوے وزدی زبس اس طبع ہوسکار کی تھی
آنکھ ہر ہوں سدا روزن دیوار کی تھی

حشر تک لطف صبر کے طمانچے کھائے
خاک یہ کہکے محبت کے گنہگار کی تھی

سر مژگاں پہ لگے تخت سبز دیکھ چکے
یہ بھی ہم نخل محبت کا ثمر دیکھ چکے

کبھی صیاد چھیڑے ہاتھ گاہے باغباں ڈالے
چمن میں کیا سمجھکر کوئی طرح آشیاں ڈالے

کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہتا
اس برس تنگ جوانی نہتا جو زنداں میں نہتا

نے کبھی روئے نہ ٹیکا سر کو گاہے سنگ پر
مفت اپنا خون ہوا جرم شکست رنگ پر

ہستی کا جو اپنے مجھے مختار بناتے
سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

تنہا میں اس جہان کی محفل میں رہگیا
اور داغ ہمرہان سفر دل میں رہگیا

اٹھتے ہی تیری بزم سے اٹھا یہ غلغلہ
بہتوں کا دل کشاکش محفل میں رہگیا

رویا میں یاد کرکے بہت ماجرائے دل
پروانہ جلکے رات جو محفل میں رہگیا

عیشی مشابہت رخ جاناں سے تھی اسی
پر داغ عارض مہ کامل میں رہگیا

چشم کس ترک کی شمشیر لئے پھرتی ہے
کہ قضا حسرت تکبیر لئے پھرتی ہے

کوئی اس فصل میں دیوانہ ہوا ہے شاید
کہ ہوا ہاتھ میں زنجیر لئے پھرتی ہے

قیس برگشتہ خدا جانے کہاں ہے کہ صبا
خبر لیلئے دلگیر لئے پھرتی ہے

پھول یوں ہوگئے برباد کہ اب بلبل زار
آرزوئے گل تصویر لئے پھرتی ہے

بادہ نوشان خرابات مغاں مژدہ کہ آج
مغفرت دفتر تقصیر لئے پھرتی ہے

گل نے کیا بے ادبی کی تجھے [illegible]
تازیانہ پئے تعذیر لئے پھرتی ہے

ضعف ہر چند کہ زنجیر قدم ہے عیشی
گردش خامۂ تقدیر لئے پھرتی ہے

بلجیم کے دلفریب نظارے

دوسرے دن جب میں اپنے کمرے سے نیچے اُتر کر آیا تو خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہانکے ہوٹلونکا دستور ہے کہ ہر اک کے متعلق ایک ایک قہوہ خانہ ہوتا ہے جہاں لوگ کھانے پینے کے لئے جاتے ہیں۔ علی ہذا اس ہوٹل کے متعلق بھی ایک قہوہ خانہ تھا جہاں سب سے پہلے میری نظر انہیں پرانے دوست "گارسان" پر پڑی پیرس کے اثنائے قیام میں ان حضرات سے اسقدر سابقہ پڑا تھا کہ اتنی جلدی بھول جانا ناممکن تھا۔ پیچھے سے کٹا ہوا کوٹ اور سامنے کمر سے نیچے اک سفید رومال بندھا ہوا ان لوگوں کی مخصوصیات لباس میں سے ہے۔

میں نے "دی رینے" یعنی ناشتے کے لئے حکم دیا اور ایک گز بھر کی لمبی کرکری روٹی۔ پتھر کی میز پر میرے سامنے لاکر رکھدی گئی۔ اور ایک قدح گرم دودھ اور ایک پیالہ قہوہ اور ایک پلیٹ مکھن کی بھی روٹی کے پاس رکھدی گئی۔ بس یہ اسیقدر یہانکے لوگوں کا ناشتہ ہوتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ بالکل فرانسیسی فیشن کے مطابق ہے۔ ہم انگلستان کے ٹوسٹ۔ مکھن پارج اور انڈے یا یا مچھلی کھانے کے عادی تھے۔ اتنے ذرا سے ناشتہ میں کیا ہوتا تھا۔ مگر دو تین دن میں عادت پڑ گئی۔

ہوٹل کے سامنے ایک بڑا چوک تھا جسکے شمال پر اسٹیشن کی خوبصورت عمارت واقع تھی۔ سامنے بہت سی شاہراہیں تھیں اور چوک کے بیچ میں ایک بہت وسیع چبوترا سا تھا جسپر اخبار بیچنے والوں کے اڈے تھے۔ جہاں ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ہر چہار طرف بگھی اور اسپی ٹریم گاڑیاں منٹ منٹ پر چھوٹتی تھیں۔ بازار کے اس شور و شغب میں سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ چھوٹی چھوٹی لکڑی کی گاڑیاں تھیں جنکو کتے کھینچتے پھرتے تھے۔ مثلاً ایک دودھ والا جو ظاہرا غریب معلوم ہوتا ہے اور شاید ابھی دیہات سے آیا ہے۔ اپنے برتن ایک گاڑی میں رکھے اور اک بڑے قد کا تندرست ساز و یراق سے آراستہ کتا جوتے گاڑی ہانکتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں ایک دھوبی کی گاڑی میں اسی طرح ایک کتا ہانکا جا رہا ہے اور کہیں ایک چاقو پر سان رکھنے والا اسیطرح کتے کے ذریعہ سے اپنے اوزار اور تیار روغیرہ ایک گاڑی پر لادے کھینچتا جا رہا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ تمام بلجیم اور خصوصاً دیہاتوں میں

اکثر اسکا رواج ہے۔ جہاں لوگ عموماً غریب ہوتے ہیں وہاں کتوں کے ذریعہ سے بہت سے کام نکالتے ہیں۔

برسلس میں پہلے ہی دن کے چکر میں مجھے بہت سی ایسی نئی چیزیں معلوم ہوئیں جنکو میں نے پیرس میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ شہر جو بلجیم کا دارالسلطنت ہے خوبصورتی میں چھوٹا پیرس کہا جاتا ہے اسمیں شک نہیں کہ جو قدامت اور علو شان پیرس میں پائی جاتی ہے یہاں اُسکا عشر عشیر بھی نہیں اور نہ پیرس کے مانند اسکی آرائش پر کروروں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے نہ یہاں کوئی عالیشان پل مثل "پان اسکندر سوم" ( ) کی ہے اور نہ یہاں "گرانڈ پلے لے" ( ) کی طرح کوئی خوبصورت عمارت ہے نہ یہاں دریائے سین ہے اور نہ اوسکی دلفریبیاں تاہم اپنی حیثیت کے لحاظ سے جو ایک جداگانہ شے ہے اُسے دیکھئے تو اسمیں بہت سی خوبیاں نظر آئینگی۔ یہاں پیرس کی طرح آرام و راحت زندگی کے لئے کچھ کم سامان مہیا نہ نظر آئینگے۔ اسمیں ایک ایسی خوبی پائی جاتی ہے جو پیرس کو نصیب بھی نہیں۔ یہ خوبی یعنی سادگی ہی اسکا زیور ہے اور پیرس کی سی بناوٹ نام کو نہیں یہاں اسقدر مکروہات بھی نہیں پائے جاتے جتنے کہ وہاں ہیں اور نہ یہاں ضروریات زندگی اسقدر گراں ہیں کہ رہنا دشوار ہو جائے۔ یہانکے لوگ بھی اسقدر سرکش نہیں کہ ہر وقت بغاوت کا خوف لگا رہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نے اسپر کیا کیا ستم توڑے ہیں اور تاریخ یورپ نے یہاں کیا کیا پلٹے کھائے ہیں، اسپر بھی یہ ایک بے حیثیت شہر تھوڑے زمانہ میں ایک خوبصورت پائے تخت بن گیا ہے تو درحقیقت حیرت ہوتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور دریائے رائن پر آباد تھا۔ مگر اب اس دریا کا اندرون شہر کہیں پتہ نہیں لگتا۔ شہر میں جا بجا اس دریا کی شاخیں اور نہریں پھیلی ہوئی ہیں مگر بالکل پٹی ہوئی ہیں۔ دہلی کی چاندنی چوک کی طرح اس شہر کی ایک شارع عام کے نیچے ایک خوب چوڑی نہر ہے اور اوپر دورویہ مکانات بنے ہیں جو دو تین منزل سے زیادہ اونچے نہیں۔ شاہراہوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ پتھر سے پاٹی گئی ہیں۔ جنپر گاڑیوں کے چلنے سے سخت ناگوار آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہانکے مکانات زیادہ اونچے نہیں ہیں اور انمیں رہنے والوں کی خوش طبعی کا اس سے خوب پتہ لگتا ہے کہ ہر کھڑکی کے سامنے باہر کی جانب کھلی ہوئی [illegible]

تحفظ حقوق مسلمانان

جسوقت سے مسٹر مارلی نے اپنی گرانقدر اور بیش بہا تقریر میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی اور توجہ کا اظہار کیا ہے اور صاف الفاظ میں کہدیا ہے کہ نئے خیالات جو ملک میں پھیل رہے ہیں انمیں کوئی بات خلاف عقل اور نامناسب نہیں معلوم ہوتی اور نہ کانگریس کوئی خوف کی چیز ہے، اسیوقت سے اس گروہ میں جو گورنمنٹ کے کسی فعل پر رائے زنی کرنے اور اپنے حقوق طلب کرنے کو گناہ کبیرہ سمجھتا تھا، ایک سنسنا ہٹ پیدا ہوگئی ہے اور وہ دم بخود دیکھ رہا ہے کہ ع۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ اور حیران ہے کہ جب ہندوستان کے اصلی حکمران کے یہ خیالات ہیں تو معمولی عہدہ داران گورنمنٹ ہماری پولیٹیکل "دلکشی" اور "جی حضوری" کا ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ (اگرچہ اسوقت تک بھی سوائے نقصان کے فائدہ نہیں ہوا ہے)۔ اس نے پس از خرابی بصرہ اب سمجھا ہے کہ بیسویں صدی کا اقتضا کیا ہے اور اس زمانے میں اگرچہ نفع ہوسکتا ہے تو پولیٹیکل جد وجہد میں غرق ہوکر نہ کہ انسے علیحدہ ہوکر۔ وہی وسوسہ شیطانی جو لاحول پڑھکر دلوں سے نکالا جاتا تھا اب دلوں میں پیدا کیا جارہا ہے۔ ہم مسلمانوں میں کہ ایک عرصہ سے باعتبار پالیٹکس اپنے کو مردہ بنا چکے تھے، ایک خفیف حرکت کا پیدا ہونا بھی بہت بڑی خوشی کا باعث ہے۔ اور یہ خوشی اسوقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نواب محسن الملک بہادر کے سے بھی خواہ و برگزیدہ قوم اور تجربہ کار شخص نے اسکی ابتدا کی ہے۔ معلوم نہیں اب نواب صاحب بہادر ہملوگوں کے لئے کیا فتویٰ دینگے۔ میں اس حیرانی میں ہوں کہ۔

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما

چیست یاراں طریقت بعد ازیں تدبیر ما

لیکن جہاں اس تحریک کے پیدا ہونے سے خوشی اور مسرت ہے وہاں ایک اندیشہ بھی دامنگیر ہے وہ یہ کہ نواب صاحب اس تحریک کی روح رواں ہیں اور وہی کالج کی بھی جان ہیں اگر کہیں یہ تحریک مثل مرحوم ڈیفنس ایسوسی ایشن کے کالج میں مدغم ہوگئی تو پھر اسکا ہونا نہ ہونا دونوں

برابر ہو جائیگا۔ ہمیں نواب صاحب بہادر کی دانشمندی سے پوری توقع ہے کہ وہ اس تحریک کو کالج سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھینگے۔

یہ خفیف تموج جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اسکی پہلی عملی شکل دوسرے کو اپنے حفظ حقوق کے متعلق ایڈریس دینا ہے چونکہ یہ ایڈریس عام مسلمانان ہند کی طرف سے دیا گیا ہے اسلئے میں بہ حیثیت ایک مسلمان کے اپنے کچھ خیالات اسکے متعلق ظاہر کروں تو امید ہے کہ اسکا مستحق سمجھا جاویگا۔

مسٹر مارلی نے اپنی بجٹ اسپیچ میں لیجسلیٹو کونسل کی توسیع اور اصلاح کا وعدہ کیا اور فوراً ایک کمیٹی بھی مقرر ہو گئی۔ مسلمانوں کی ایک گروہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بعض دیگر اسباب نے جو اسوقت اتفاقاً جمع ہو گئے ہیں۔ انہیں کامیابی کا یقین دلایا۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے غلط سمجھا۔ جس نشان پر وہ چلے ہیں وہ رہبری نہیں بلکہ گمراہی کا نشان ہے

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

سول سروس ہندوستان کی ترقی میں ہمیشہ سد راہ رہی ہے اور رہیگی۔ انگلو انڈین (سوائے بعض مستثنیات کے) الشاذ کالمعدوم ہیں نہیں چاہتے کہ کسیطرح بھی ہندوستانیوں کو واقعی اختیارات انتظام ملک میں حاصل ہوں۔ چنانچہ مسٹر گوٹ (ماسٹر بلیل کالج) نے جو خطوط لارڈ لینسڈاؤن کو انکے زمانہ حکومت ہند میں لکھے ہیں۔ اسمیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہند کے سربرآوردہ لوگوں سے اخلاق بلکہ ادب کا برتاؤ کرنا چاہیے مگر اسیوقت تک کہ انکے گلے میں رسی بندھی رہے" پس کیونکر یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا گروہ ایک منٹ کے لئے دلمیں یہ خیال گزرنے دیگا کہ مسٹر مارلی کی خواہش پوری ہو سکے۔ تمام انگلو انڈین اخبارات نے جو کچھ ان سے ہو سکا ہے مسٹر مارلی کے خلاف لکھنے اور شائع کرنے میں دریغ نہیں کیا ہے اور انکے [illegible] بنا ہی کرنیوالے یہی ممبران سول سروس ہیں، ان لوگوں کی خوش قسمتی سے ہندوستان کی ہر ایک اصلاح اور رفاہ کے کام میں روڑا اٹکانے کیلئے انکے ہاتھ میں مختلف اقوام کا ایک ایسا آلہ آگیا ہے کہ موقع بے موقع وہ اسے استعمال کرنے سے باز نہیں رہتے۔ اور

ہماری بدقسمتی سے کچھ ہندوستانی بھی انہیں ایسے ملجاتے ہیں جو انکے اس خیال کی تائید کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ معاملہ زیر بحث میں بھی ایسا ہی ہوا۔ تمام اینگلو انڈین اخبارات گویا خاص مسلمانوں کے آرگن بن گئے ہیں اور اینگلو انڈین اصحاب کا برتاؤ مسلمانوں سے ایسا ہے گویا وہ ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے فلاح اور بہبود کے لئے آئے ہیں۔ یہ سب کیوں؟ اسلئے کہ مسلمانوں کی طفل تسلی سے فائدہ اٹھا کر مسٹر مارلی کے نیک ارادوں میں خلل ڈالیں۔

اچھی طرح جاننا چاہئے کہ اقوام اور علی الخصوص مفتوح اقوام کے تاریخ میں ایسے اتفاقات بہت کم آتے ہیں کہ انہیں واقعی اور حقیقی ترقی کیطرف قدم بڑھانیکا موقع ملے۔ لبرل فریق ہندوستان کے حق میں کنسرویٹو سے نسبتاً بہتر ثابت ہوا ہے مگر ہمیشہ لبرل کی وزارت نہیں رہتی اور لبرل کی وزارت میں بھی ہمیشہ مسٹر مارلی سکرٹری ہند نہیں ہوتے۔ ہندوستان کی بیدار بختی کہنی چاہئے کہ اسوقت اسکی زمام حکومت ایک نیک نفس، خیر خواہ بنی انسان، دور اندیش، معاملہ فہم اور مدبر وزیر کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں اس مغتنم وقت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا چاہئے۔ اور کفران نعمت کرکے آئندہ کے لئے رحمت الٰہی کا دروازہ نہ بند کرنا چاہئے۔ اگر ہم اپنی بدبختی کے سبب اس فرشتہ بصورت انسان کے عہد سے متمتع نہ ہوسکے تو پھر کیا امید کیجا سکتی ہے کہ کبھی ترقی کی شکل خواب میں بھی دیکھنی میسر آویگی۔ ایسے وقت میں کہ کامیابی بہت قریب تھی مسلمانوں نے ابلہ فریبی میں آکر اگر اسے بالکل نیست کرنے کی نوبت نہیں پہنچادی ہے تو بہت کچھ کمی ضرور ہوجائیگی۔ مسلمانوں کے ایڈریس کا جو کچھ فائدہ انہیں پہنچے وہ تو ابھی موہوم ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ اسکی بنا پر مسٹر مارلی پر بہت بڑا دباؤ پڑیگا۔

ہماری قومی سیاہ بختی کا سب سے تاریک دن وہ تھا جب ہمنے پہلی بار کانگرس کے خلاف آواز بلند کی۔ بیس برس ہم اس روش پر قائم رہے اور اسکا نتیجہ سوائے اسکے کچھ نہ پایا کہ پولیٹیکل میدان میں دوسری قوموں سے بدرجہا پیچھے رہگئے۔ اب کچھ احساس ہوا تو اپنی غفلت کی تلافی اسطرح کررہے ہیں کہ کوئیں سے نکلکر کھائی میں گریں یعنی ایک دوسری غلطی میں ایک ربع صدی اور ضائع کردیں اور پھر مرثیہ خوانی

شروع کریں۔ پہلے ہم سرے سے ریپریزنٹیشن کے خلاف رہے اور ہر طرح اسکے مٹانے کی کوشش کی مگر جب یہ ظاہر ہوگیا کہ زمانے پر کسیکا زور نہیں چلسکتا تو بجاے اسکے کہ فراخ دلی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرکے ترقی قوم میں ساعی ہوتے یہ کہنا شروع کیا کہ ریپریزنٹیشن مفید ہی، ہونا چاہیے مگر مسلمانوں کا ایک حصہ خاص مقرر ہوجائے۔ یہ خیال بوجوہ چند در چند قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا اور اسی پر اس آرٹکل میں بحث کرنا مقصود ہے بزرگانِ قوم نے اپنے ایڈریس میں بہ نظر بہی خواہی مسلمانان دو امور کی درخواست کی ہے اولاً۔ ملازمت سرکاری میں مسلمانوں کو نسبتاً جگہ دیجائے۔ دوم کونسل اور میونسپلٹی میں ایک خاص تعداد مسلمانوں کی مقرر ہوجائے اور بصورت انتخاب مسلمان آبادی مسلمانوں کا انتخاب کرے۔ برخلاف اسکے لیڈران کانگرس کی یہ خواہش ہے کہ (۱) تمام اعلی عہدہ ہاے سرکاری پر امتحان مقابلہ کے ذریعہ تقرر ہو اور (۲) طریق انتخاب کو بلا لحاظ قوم وملت ترقی دیجائے یہانتک کہ مثل برٹش پارلیمنٹ کے ایک کونسل ہندوستانیں قائم ہوجائے۔

انہیں دونوں صورتوں میں محاکمہ کرنا چاہیے کہ کونسی ملک کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص مفید ہے۔

۱۔ مقابلہ

کانگرس کا یہ مقصد مسلمانوں میں بہت بری طرح سے شائع کیا گیا ہے اور یہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سے غرض سواے اسکے اور کچھ نہیں ہی کہ مسلمان ملازمت سرکاری سے بالکل خارج کردیے جائیں۔ شاید ہندوستان میں کسی مسئلہ پر اتنی غلط فہمی نہ ہوئی ہوگی جتنی اس مسئلہ پر ہوئی ہے۔ کانگرس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہی جو مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے۔ کانگرس کا اس تجویز پر اصرار کرنا وجوہات ذیل پر مبنی ہی۔

(الف) جو شخص ذرا بھی غور کرے گا اسے معلوم ہوجائے گا کہ ہندوستانیوں کا بکثرت ملازمت سرکاری کے اعلی عہدوں پر لیا جانا موجودہ ملازمین کی حسن کارگزاری پر بہت کچھ منحصر ہے۔ اور سفارشی طریقہ تقرر کا اسکے منافی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نالائق لوگ

حضور رسی" کے سبب مقرر ہو جاتے ہیں اور ان کی عدم قابلیت کے سبب تمام ہندوستانیوں کی بدنامی ہوتی ہے۔ اگر مقابلہ کا قاعدہ رائج ہو تو لائق اور قابل لوگ مقرر ہوا کریں اور اسطرح عام ہندوستانیوں کی عزت بڑھے۔

(ب) بڑا فائدہ اس مقابلہ سے یہ حاصل ہوگا کہ قوم کی ایک کثیر التعداد نوجوانوں کی زندگی تلف ہونے سے بچ جائیگی۔ بہت سے قابل تعلیم یافتہ جو ملک کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں نوکری کی امید میں برسوں دفتروں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ اور جب کامیابی نہیں ہوتی تو ناامید ہو کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور پھر وہ دنیا کے کسی کام کے نہیں رہتے۔ اسکی مثالیں ایک نہیں سینکڑوں ہو سکتی ہیں۔ تعداد ملازمین تو ہر حال میں ایک ہی رہیگی۔ مقابلہ ہو یا نامزدگی لیکن اول الذکر حالت میں جو امیدوار کامیاب ہوتے وہ مقرر ہو جاتے۔ دوسروں کو کچھ نہ پہنچتا۔ صورت آخر الذکر میں ہی کامیاب تو صرف اسیقدر ہوتے ہیں، مگر سینکڑوں برباد ہو جاتے۔ ہمیں ان ہمدردان قوم پر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ باوجود قوم کے بہی خواہ اور تعلیم کے پیشوا ہونے کے۔ اپنے ہم مذہب تعلیمیافتہ گروہ کی یہ پریشانی دیکھکر انہیں کچھ رحم نہیں آتا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نوجوان تعلیم یافتہ اس امتحان کو بجائے زحمت کے اپنے لئے رحمت سمجھتے ہیں۔ میں نے متعدد گریجویٹوں کو اس صوبہ سے امتحان مقابلہ کے ٹوٹ جانے پر افسوس کرتے دیکھا ہے۔ ہاں جو لوگ ذاتی قابلیت سے معرا صرف آباواجداد کی استاد کو وسیلہ بنانے یا کسی حاکم کا سہارا پکڑنے والے ہیں وہ ضرور خوش ہیں۔

(ج) اکثر انگریز صاحبان بہی طریق نامزدگی کے دلدادہ معلوم ہوتے اور لارڈ کرزن بہی اسکے موید تھے اس سے ان کی غرض سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ملک میں نئی اسپرٹ ایک حد تک روکی جائے، اور انکے اس خیال میں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے جو جوش اور اُمنگ کہ طلباء کالج سے لیکر نکلتے ہیں انہیں نوکری کی امید انکے اظہار سے مانع ہوتی ہے، اور ایک زمانہ کی خوشامد اور حاضر باشی کے بعد جب وہ ناکام رہتے ہیں تو پھر پژمردگی اور دلشکستگی انہیں کسی کام کا نہیں رکھتی۔ اگر ہم ہندوستانی بہی اس امر میں انگریزوں

امید ہوں تو سوائے بداندیش ملک کے اور کیا کہے جا سکتے ہیں

نفس الامر یہ ہے کہ امتحان مقابلہ سے مسلمانوں کی مخالفت وقتی مخالفت تھی۔ اور اب وہ وقت نہیں رہا ہے کہ ہم ہر حاکم کے پاس یہ درخواست لیکر پہنچیں کہ ہم نالائق ہیں اسلئے ہمیں نوکری ملنی چاہیے جس وقت اول اول مسلمانوں نے امتحان مقابلہ کی مخالفت کی تھی اسوقت وہ کسیقدر حق بجانب بھی تھی کیونکہ تعلیم انمیں بہت ہی کم تھی لیکن اب بفضل خدا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی کمی قریب قریب پوری کر لی ہے اور اب امتحان مقابلہ کو خوفناک سمجھنا سوائے اسکے کہ ہماری پست ہمتی پر دلالت کرے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ زمانہ کی رفتار نے مسلمانوں میں اکثروں کو امتحان مقابلہ کا مخالف بنا دیا ہے لیکن اب دوسرے خیال نے گھیرا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک خدا داد خاص تمغہ ہے اس سے زیادہ مہلک اظہار مسلمانوں کو نہیں دیا سکتے ہیں بلحاظ ذہنی قابلیت کے کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں صرف اتنا ہی کہ انہیں اپنی اس جودت کے اظہار کا موقع نہ ملا ہے اور اس قلیل زمانے ہی میں انہوں نے بہت کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ پس ہمیشہ کے لئے انہیں چہارم یا پنجم حصہ ملازمت سرکاری چند محدود کر دینا کسیطرح انکے حق میں مفید نہیں معلوم ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ تھوڑے زمانہ کے بعد وہ نسبتاً اس سے زیادہ کامیابی حاصل کریں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ تقسیم تعداد نسبتی قابل عمل آمد بھی یا نہیں۔ متعدد وجوہ اسکے خلاف ہیں۔

(الف) انتظامی۔ اور عدالتی صیغوں کے تمام بڑے عہدے صرف سویلین کو ملتے ہیں اور اسکے لئے امتحان مقابلہ شرط ہے۔ مدبران انگلستان نے بہت غور اور تامل کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے قاعدہ کیڈٹ کو توڑ کر یہ طریقہ جاری کیا ہے اور اسکا تعلق ہندوستانیوں کے بہ نسبت انگریزوں سے زیادہ ہے۔ انگریزوں کے مفاد کے مقابلے میں ہندو ہوں یا مسلمان کسیکی نہیں سنی جا سکتی۔ اور غالباً ول سروس کے متعلق ایسا خیال بھی نہیں ہے ہندوستانی اسبارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی کہ ملکی طلبا کی راہ میں جہانتک ہو سکے آسانیاں پیدا کریں (جیسا کہ عمر کی قید

بڑھانے سے ہوا ہے) اسطرح کی جو سہولتیں حاصل ہونگی انسے ہندو مسلمان برابر کا فائدہ اٹھائینگے

(ب) ملازمین گورنمنٹ کا ایک بڑا حصہ پروفیشنل لوگوں سے لیا جاتا ہے جیسے انجینیری ڈاکٹری تحکیمی محکمات وغیرہ اس معاملہ میں گورنمنٹ کو یہ صلاح دینا کہ ایک زیادہ قابلیت کے شخص کے ہوتے ہوئے ایک کم قابل شخص (محض تعداد مقررہ پوری کرنیکے لئے) لیا جائے ملک کیساتھ سخت بدخواہی کرنا ہے۔ فرض کیجئے کہ گورنمنٹ ایک تعداد نسبتی منظور کرے تو اسوقت کیا کیا جائیگا جب ایک مسلمان یا ہندو کی جگہ خالی ہوگی اور اس مذہب کا کوئی شخص نہیں ملیگا تو کیا گورنمنٹ اپنے کام بند کردیگی۔ ہرگز نہیں۔ پس اس لائن میں تعداد نسبتی کا تقرر کسیطور ہی ممکن نہیں۔ (ج) جوڈیشنل لائن میں منصفی اور سب ججی تک اکزیکیٹو لائن میں ڈپٹی کلکٹری تک ایسی جگہیں ہیں جو زیادہ تر نامزدگی سے پوری کیجاتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ انہیں پر لوگوں کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ اسکا حال یہ ہے کہ جوڈیشنل لائن میں گورنمنٹ نے نہایت دانشمندانہ پالیسی اختیار کرکے قانون پیشہ لوگوں کا اسکا بیشتر رفع کردیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اپنی تعداد بار میں بڑھائیں۔ اکزیکیٹو لائن کو بھی اب گورنمنٹ نے قریب قریب پروفیشنل کے کردیا ہے۔ جا بجا امتحان درجہ دوم ہوتے ہیں، اور اب کچھ دنوں میں قانونگو سے لیکر ڈپٹی کلکٹری تک انہیں کا جو کہ لیا جائیگا۔ [illegible] ہے کہ ایسی حالت میں تعلیمی قابلیت کا لحاظ کیا جائے۔

(د) ان محکموں کو چھوڑکر [illegible] وغیرہ) میں اور زیادہ یورپین اور اور یورشین مقرر ہونے چاہئے [illegible] ہندوستانی بچے پڑھ رہے ہیں۔ انکے مرخص ہونیکا انتظار ہے کہ کوئی یورپین ان جگہوں پر مقرر کیا جائے۔ وہاں ہندو مسلمانوں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے [illegible] کا خیال کیا جائے۔

(ہ) ان جگہوں کو چھوڑکر اور [illegible] کا خیال [illegible] کا نہیں ہے۔

ایسی حالت میں کہ [illegible] ہے اور ہر جگہ میں گورنمنٹ [illegible] اختیار کرتی جاتی ہے (خواہ کمپٹیشن [illegible] لیا جائے) ہماری ہاویاں قوم کا اپنے طلباء کی ہمت پست کرنا اور مقابلہ سے انہیں ڈرانا کیا [illegible] نہیں ہوسکتا۔ ہم مسلمانوں کو اسی طرح

یاد رکھنا چاہئے کہ جو ہر ذاتی سے چشم پوشی کرکے محض سعی و سفارش کے زور سے ملازمت میں چند افراد کا داخل ہوجانا قوم کے حق میں سخت مضر ہوگا۔ اسوقت تک جو نالائق لوگ ملازمت سرکاری داخل ہیں وہ ہندو مسلمان سب ہی ہیں اور جو ذلت ہے وہ سب کے لئے ہے لیکن جسوقت کہ امتحان مقابلہ ہو اور ناکامیاب مسلمان محض تعداد پوری کرنے کو لئے جائیں اسوقت یہ ساری ذلت مسلمانوں کی قوم کے ساتھ مخصوص ہوجائیگی۔ علاوہ قوم کی بدنامی کے جو بے انصافی اور کام کی ابتری ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوگی وہ ہندو اور مسلمان رعایا کو یکساں برداشت کرنی پڑیگی چند افراد کے ذاتی فائدے کے لئے انسان کی ایک بڑی گروہ کو مصیبت میں ڈالدینا کسی دانشمند کا کام نہیں۔ کوئی شخص اس امر کا خاطر خواہ جواب نہیں دیسکتا کہ ایک مسلمان ایم۔ ڈی۔ کے ہوتے ہوئے ایک ہندو ایم۔ بی کیوں رکھا جائیگا۔ اور کیوں اول الذکر کو اعلیٰ قابلیت سے سیکڑوں کو مستفید ہونیکا موقع نہ دیا جائے۔

رہبران قوم کو عامہ خلائق کا نفع سب سے مقدم رکھنا چاہئے۔ ان وجوہ سے میرا یہ خیال ہے کہ تعداد نسبتی مقرر کرنا خود مسلمانوں کے حق میں مضر ہوگا۔

۲۔ ریپریزنٹیشن

دوسرا مسئلہ یعنی ریپریزنٹیشن بہت خوف اور بے چینی کا سبب ہو رہا ہے جن مسلمانوں نے کسی نہ کسی غرض سے اسکی مخالفت کرنیمیں مصلحت سمجھی ہے، انہوں نے صاف الفاظ میں اپنے ہم مذہبوں سے یہ کہا ہے کہ انمیں اور ہندوؤں میں ایک اور پانچ کی نسبت ہے، وہ الکشن میں ایک جگہ بھی نہیں حاصل کرسکتے اگر کسی طور سے انہوں نے کوئی جگہ حاصل بھی کرلی تو کونسل میں ان کی کوئی ہستی نہ ہوگی اور انکے مفاد کا کچھ خیال نہ کیا جائیگا اسلئے کہ ہندو پھر بھی زیادہ ہونگے۔ میرا یہ مستحکم عقیدہ ہے کہ مذہب کی بنا پر کوئی پولٹیکل پارٹی نہیں قائم ہوسکتی۔ اصلیت جو مذہب ہندو اور مسلمانوں میں مابہ الامتیاز ہے وہ صرف اسوجہ سے کہ انمیں کسیطرح کی پالیٹکس ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ پالیٹکس پیدا ہوتی ہے اختیار اور ذمہ داری سے اور یہی چیزیں ہم میں ابھی نہیں ہیں۔ لیکن جو مسلمان سچے دل سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ پولٹیکل حقوق حاصل ہونیکے بعد بھی ہندو مسلمانوں کا تفرقہ قائم رہیگا یا وہ اگر یہ کوشش کریں کہ جب تک مسلمانوں کی

حفاظت اغراض کی کوئی اطمینان بخش شکل نہ پیدا ہو جائے ریپریزنٹیشن سے علیحدہ رہنا چاہیئے تو وہ بالکل بجا ہیں۔ الا میں بہت ادب سے ایسے بزرگان قوم سے گزارش کرونگا کہ جو علاج آپنے تجویز کیا ہے وہ نہ صرف بے اثر بلکہ مضر ہے۔ ترقی کی راہ میں سد باب ہونا۔ ملک کی حالت سے غفلت کرنا۔ قوم میں پولیٹیکل بے توجہی اور غیر ضروری سکوت پیدا کرنا۔ اس مرض کی دوا نہیں ہو سکتی۔ اب وقت نہیں ہے کہ **ترقی کن جماعت** کی شرکت اور عدم شرکت پر بحث کیجائے۔ کانگریس کی ابتدا کے وقت اسکے مخالفین نے عتاب گورنمنٹ کا جو خوف ظاہر کیا تھا وہ اب زیر غور نہیں ہے بلکہ شد و مد کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ گورنمنٹ نے بھی ایکشنری کارروائیوں کا ملک ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ لارڈ کرزن نے جتنے قوانین جاری کئے انہیں اُن لوگوں کے لئے جو پولیٹیکل معاملات سے بالکل وستکش ہیں کوئی استثنا نہیں قائم کی گئی۔ اب اگر ہم اس طریق کو چھوڑنا چاہیں تب بھی ہمیں کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ گورنمنٹ اپنی روش نہیں بدلیگی۔ مسلمانوں کو اختیار ہے کہ ہندوں کے ساتھ شریک ہو کر عام مقاصد اور اغراض کے حصول میں کوشش کریں یا ان سے اختلاف کر کے ملک کی تباہی و بربادی کو اور ترقی دیں۔ اگر ہماری لیڈروں سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ مستقل فائدہ حاصل ہو تو انہیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ترقی کن جماعت کی مخالفت کر کے اور گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملا کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ بلکہ انہیں مردانہ وار میدان میں آنا چاہیئے۔ اور جو موانع حصول اتحاد میں حائل ہیں انہیں صدق نیت کے ساتھ رفع کرنا چاہیئے۔

ریپریزنٹیشن کے بارے میں مسلمانوں کی وہی روش رہی ہے جو امتحان مقابلہ کے بارے میں۔ پہلے تو انہوں نے یک قلم ریپریزنٹیشن سے انکار کیا اسکے بعد اسکے فوائد کا اقرار کیا اور اپنے ایڈریس میں یہ الفاظ لکھے۔ کہ جن لوگوں کو اب تک گورنمنٹ نے مسلمانوں کا قائم مقام بنایا ہے وہ ہمیشہ مسلمانوں میں اس نظر سے نہیں دیکھے گئے ہیں اور آخر میں الکشن کی تائید کی ہے۔ بشرطیکہ ایک تعداد

خاص مسلمانوں کے لئے مخصوص کردی جائے۔ جب اس مسئلہ پر غور کیا جائیگا تو معلوم ہو جائیگا کہ

(۱) مسلمان بغیر اسکے کہ قانوناً ایک تعداد مقرر کرائیں اپنی تعداد پوری کر سکتے ہیں۔

(۲) اگر تعداد نسبتی قانوناً مقرر کیجائے تو اس سے (الف) مسلمانوں کے اور (ب) ملک کے اغراض کو سخت صدمہ پہنچیگا۔

(۳) یہ مشکل اور صورتوں سے بھی حل ہو سکتی ہے۔

۱۔ (الف) سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے برٹش انڈیا میں ہندو پندرہ کروڑ اسی لاکھ (۱۵۸ ملین) اور مسلمان پانچ کروڑ تیس لاکھ (۵۳ ملین) ہیں۔ اس تعداد کے دیکھنے سے ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان بھی منتخب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ خیال ایک بہت بڑی غلطی پر مبنی ہے۔ یعنی یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کے ہر گوشے میں ایک ہی نسبت سے آباد ہیں۔ واقعاً ایسا نہیں ہے۔ ملک کی آبادی ایسے ہے کہ اگر انتخاب کا ذریعہ صرف مذہب قرار دیا جائے تو مسلمان اپنی تعداد کی نسبت سے کم نہ منتخب ہونگے۔ فرض کیجئے کہ ایک ملین کی طرف سے ایک ممبر منتخب ہو، مقابلہ صرف ہندو مسلمانوں میں ہوگا۔ کیونکہ دوسرے مذاہب کے لوگ (جنکی تعداد بیس ملین ہے) اسقدر متفرق ہیں وہ کہیں بھی (سوائے پنجاب اور برہما کے بعض مقامات کے) ہندوؤں اور مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ انتخاب کی بنا صرف مذہب ہوگا اسلئے صوبجات ذیل میں صرف مسلمان منتخب ہونگے۔

صوبہ سرحدی	۲
سندھ	۴
پنجاب	۲۱
مشرقی بنگال و آسام	۲۶
	۵۳

مسلمان اپنی پوری تعداد مذہب کے زور سے حاصل کر سکتے ہیں نسبتی حلقہ انتخاب

کی تقسیم اسطرح سے ہوسکتی ہی کہ مسلمان ہندوؤں کی مدد سے آزاد ہو جائیں - میں یہ نہیں کہتا کہ صورت ابھی ہے مگر مسلمانوں کے اطمینان کے لئے ایک صورت یہ بھی ہے -

(ب) جسوقت ہندوستانیوں کو حقوق ملکی حاصل ہونگے ہر فریق کو دوسرے کا لحاظ مجبوراً کرنا پڑے گا - حقوق ملکی کا پہلا اثر لوکل گورنمنٹ میں ظاہر ہوگا - اور اسکا آخری نتیجہ ہندوستان میں فڈریشن کا قائم ہونا ہوگا (یہ صوبے اپنے اندرونی معاملات میں سنٹرل گورنمنٹ سے اسقدر آزاد ہوں جیسے کہ امریکہ کے صوبے ہیں یا اسقدر پابند جیسے کناڈا کے صوبے اسکا فیصلہ کرے گا) لیکن اتنا یقین ہے کہ ایک طرح کی لوکل حب الوطنی پیدا ہو جائیگی - اور یہ حب الوطنی ہندو اور مسلمانوں کو اس امر پر مجبور کرے گی کہ ایک دوسرے کے اغراض اور مقاصد کا پاس کریں ورنہ ایک سخت اضطرابی کیفیت پیدا ہو جائیگی - بعض صوبوں میں صرف ہندو حاوی ہو جاوینگے اور بعض میں مسلمان - مجبوراً ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا پاس کرنا پڑیگا اور اس طرح ایک پائدار صورت اتحاد کی پیدا ہو جائیگی - اب بھی ان مقامات میں ایسا ہی ہی جہاں "خیالی اختلاف اغراض" کی زہریلی ہوا نے اثر نہیں کیا ہے - بمبئی کی کونسل میں ہندو - مسلمان اور پارسی بلا خیال مذہب کے منتخب ہوتے ہیں - مدراس میں (جہاں مسلمان ۵ فیصدی بھی نہیں ہیں) دوبارہ نواب سید محمد کو کونسل وائسرے کا ممبر منتخب کیا ہے - یہی آسانیاں اور جگہ بھی ممکن ہیں اگر ہندو مسلمان ان اختلافات کو بھول جائیں جنکا وجود سوائے انکے ذہنوں کے اور کہیں نہیں پایا جاتا -

"تکثیر ووٹ"

تیسری صورت اس مسئلہ کی حل کرنے کی "تکثیر ووٹ" کا قاعدہ جاری کرنا ہے انگلستان میں اگرچہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص ایک ہی ووٹ کا مجاز ہے مگر ہر ملک و ہر قوم - بلجیم اسکی نظیر موجود ہے وہاں پر ۲۵ برس کے شخص کو بحیثیت باشندہ

ملک کے ایک ووٹ کا اختیار ہے۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو اسے ایک اور ووٹ کا اختیار ہے، اگر اسکی جائداد ایک خاص مقدار کی ہے تو وہ ایک تیسرے ووٹ کا مجاز ہے، غرضکہ وہاں ایک شخص پانچ ووٹ کا مالک ہو سکتا ہے۔ انگلستان میں بھی اسطریق کو رائج کرنے کی نسبت بہت بحث ہو رہی ہے۔ پس ہندوستان میں اگر یہاں کی ضروریات کے اعتبار سے تکثیر ووٹ کا طریقہ اختیار کیا جائے اور اس ذریعہ سے قلیل التعداد مذاہب کے ووٹ جہاں مقابلہ مذہبی بنا پر ہو بڑھا دیئے جائیں تو ہر ایک چھوٹے بڑے مذہب کی شکایت رفع ہو جائے اور انصاف میں بھی کسیطرح کا خلل نہ پڑے۔

(د) لیکن سب سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ یہ ہوگا کہ جائے اسکے کہ ایک حلقہ میں صرف ایک ممبر ہو ہر حلقہ کے لئے متعدد ممبر رکھے جائیں۔ انگلستان میں بہت سی اصلاحات کے بعد ایک حلقہ ایک ممبر کا قاعدہ جاری ہو گیا ہے مگر "انگلستان کا قابل احترام اوک جبکہ ہندوستان کو منتقل نہیں کیا جا سکتا" (مسٹر مارلی) ہندوستان میں انگلستان کے صرف وہی اصول اور قواعد رائج کئے جا سکتے ہیں جو یہاں کے حالات کے مناسب ہوں۔ مسلمہ اصول کی اس ترمیم سے ہندوستان کے مختلف مذاہب کو ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے، ایک دوسری کی ضروریات کے سمجھنے اور آپس میں اتفاق پیدا کرنے کے عمدہ موقع ملینگے

۲۔ (الف) جو تجویزیں اسوقت بیان کی گئی ہیں۔ وہ صرف اس غرض سے ہیں کہ مسلمانوں کو ریپریزنٹیشن میں انکا حق واجبی ملجائے لیکن اگر کسی طور سے انہوں نے اپنی تعداد کونسل میں پوری بھی کر لی تو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے اگر دونوں قوموں کے معاملات صاف نہیں ہیں۔ ممکن ہر حال میں تعداد میں کم ہونگے۔ تعداد نسبتی کے لئے مسلمانوں کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انکے اور ہندوؤں کے اغراض ایک نہیں ہیں اور وہ اپنے اغراض کو دوسروں کے ہاتھوں میں چھوڑنا چاہتے۔ اسوقت اس بحث نے کچھ کشیدگی پیدا کر دی ہے اور اگر مسلمانوں

نے اپنی اس رائے میں ترمیم نہ کی تو اس معاملہ میں اُنکی تمام کوشش بیکار جائیگی اور اُن کی حالت کچھ بھی بہتر نہ ہو سکیگی۔ ہر معاملہ میں ہندو انسے مخالفت کریں گے کیونکہ وہ کونسل میں ہندوؤں کے فریق مخالف بنکر داخل ہونگے۔ اور ہندوؤں کے ووٹ انسے ہر حال میں زیادہ ہونگے بلکہ کوشش کرنے کا ہر آوردن کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اور **مسلمان ہر طرح خسارہ میں رہینگے۔**

(ب) جو بحث اوپر لکھی گئی ہے وہ اس بنا پر ہے کہ ہندوستانیوں کو کونسل میں واقعی کچھ اختیارات ہونگے (اور خدا نے چاہا تو وہ دن دور نہیں) مگر مسلمان اپنی حالت کی وجہ سے مجبور ہونگے کہ اس طرح کے اختیار ملنے سے مخالفت کریں وہ ہمیشہ اس امر کی کوشش کرینگے کہ کونسل صرف مشورت کے لئے ہو۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی کمیٹیوں میں مگر ان کی رائے کا کوئی اثر فیصلہ معاملات پر نہ پڑے مسلمانوں کو اسمیں کامیابی ہو۔ یا نہ ہو مگر موجودہ کوشش جو انہوں نے اختیار کی ہے۔ اس سے سوائے اسکے اور کچھ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ انگلو انڈین بہت خوشی سے مسلمانوں کی اس خواہش کی تائید کرینگے۔ اور ملک کی پولیٹکل ترقی کو روکنے کے لئے مسلمانوں کو ذریعہ بناوینگے جیسا کہ اب تک کیا ہے۔ ہندوستان کے لئے وہ بدبختی کا دن ہوگا جس روز ان حرکات سے **ترقی کی رفتار رک جائیگی۔** اور چند مسلمانوں کے ذاتی فائدے کے لئے قوم اور ملک کے مفاد قربان کر دئے جائینگے اور ہمیشہ کا طوق غلامی ہماری قسمت میں لکھدیا جائیگا۔

۲۔ سب سے احسن صورت اس مشکل کو حل کرنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے تو ہندو اور مسلمان سب ملکر اس امر کی کوشش کریں کہ کونسل میں ہندوستانیوں کا ایک جزو غالب شریک کیا جائے اور اختیارات واقعی اسے ملیں اسکے بعد وضع قانون کے کام میں حصہ نہیں تقسیم کریں۔

(ا) وہ قوانین جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسے قوانین صرف مسلمان ممبروں کے ہاتھ میں ہوں۔

(۲) وہ قوانین جو صرف ہندوں سے تعلق رکھتے ہیں - یہ صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوں
(۳) وہ قوانین جو مشترک ہیں - یہ کل ممبروں کے ہاتھ میں ہوں اور اسمیں بھی کسی فریق کی حق تلفی نہ ہونیکے لئے مصالحت کے ساتھ قرار واقعی انتظام کیا جائے - یہ کوئی جدت نہیں ہے - فرانس کی "مجلس نائبان" مختلف حصص میں منقسم ہے اور ہر حصہ کے متعلق ایک صیغہ گورنمنٹ کا ہے اور اسکے فیصلے میں بہت کم تبدیلی کیجاتی ہے - انگلستان میں بھی اسی اصول پر گرینڈ کمیٹی قائم کرنیکا چرچا بعض اخبارات میں ہو رہا ہے - اسلئے ہندوستان میں یہ انوکھی بات نہ ہوگی اور اس سے ہر ایک فریق کی حفاظت بھی پوری پوری طرح ہو جائیگی - لیکن یہ سب باتیں اُسیوقت ہوسکتی ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے دل صاف ہوں اور دونوں نیک نیتی کے ساتھ متحدہ کوشش کرنا چاہیں

جو صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ قطعی نہیں ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ اگر بہی خواہان ملک چاہیں تو بغیر گورنمنٹ میں داد فریاد کئے ہوئے آپس کے مشورت سے کوئی صورت قرار دیسکتے ہیں اور غالباً ہندوؤں کو اسمیں کسیطرح کا تامل نہوگا کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ انکے حقوق ہر طرح محفوظ رہینگے -

اب میں چند الفاظ مسلمانوں کی موجودہ کوشش پر بھی لکھنا چاہتا ہوں کہ اس خیال کی کہ مسلمانوں کے لئے ایک خاص تعداد کونسل میں مقرر کردی جائے تا کہانتک تائید ہوسکتی ہے -

یہ امید نہیں کیجاتی کہ موجودہ نظام میں بہت زیادہ تغیر کیا جائیگا اور جب تک کونسلوں میں ہندوستانیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑہا دی جائے - گورنمنٹ اس خواہش کو پورا کرنے سے مجبور رہیگی - مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انکے اغراض دوسری قوموں سے مختلف ہیں اسلئے وہ انکے ہاتھ میں نہ چھوڑنے چاہئیں - بالفاظ دیگر دوسرے بھی اپنے اغراض مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑینگے - اب موجودہ کانسٹیٹیوشن کو دیکھیے ہر جگہ ایوان تجارت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انگریز ہی

انکی طرف سے ممبر ہوتا ہے۔ یونیورسٹیونکا بھی یہی حال ہے۔ باقی رہگئے لوکل کونسلوں میں میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے نامزد کردہ ممبر اور امپریل کونسل میں دوسری کونسلونکے غیر سرکاری ممبرونکی طرف سے ایک ایک ممبر۔ پس جبتک ہندوستانی ممبروں کی تعداد اسقدر نہ بڑھا دی جائے کہ ہر جگہ ہندو اور مسلمانونکو انتخاب کا موقع ملے یہ غرض پوری نہیں ہوسکتی۔ اسکی زیادہ صراحت یوں ہوسکتی ہے کہ وائسرائے کی کونسل میں ہر صوبہ کے غیر سرکاری ممبرونکی طرف سے ایک ایک ممبر نامزد ہوتا ہے اب فرض کیجئے کہ پانچ ممبروں میں یہ قرار دیا جائے کہ دو مسلمان ہونگے تو جہاں سے مسلمان منتخب ہونگے اُن صوبوں کے ہندو کب اس امر پر راضی ہونگے کہ انکے اغراض کا کوئی قائمقام نہو اور یہی حال بقیہ تین صوبے کے مسلمانونکا ہوگا۔

اس سے بھی بڑھکر دشواری اسوقت پیدا ہوگی جبکہ دوسرے اقوام بھی اسیطرح کا مطالبہ کرینگے۔ اسوقت برٹش انڈیا میں ۹۵ لاکھ بدھ مذہب کے پیرو اور ۸ لاکھ اینمسٹک اور ۳۰ لاکھ عیسائی ۲۱ لاکھ سکھ موجود ہیں۔

یہ بھی کوئی چھوٹے اعداد نہیں ہیں۔ امریکہ کے بعض اسٹیٹ کی آبادی اس سے زیادہ نہوگی۔ پس جب ایکبار گورنمنٹ نے تعداد نسبتی کا اصول قرار دیدیا تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اسکی تخصیص ہندو تک کیوں ہو اور دوسرے بھی ایسی ہی خواہش کیوں نہ کریں۔ چنانچہ جس اثر نے مسلمانوں کو حرکت دی ہے اس نے عیسائیوں میں بھی اپنا کام شروع کردیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی گذشتہ حکومت کی بنا پر جب اپنی اہمیت ثابت کی تو عیسائی حکمران قوم۔ ہم مذہبی پر کسقدر رہبر نہ کرینگے اور پارسیوں کا غیر معمولی رسوخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ وقت تھا کہ بجائے تفرقہ اندازی کے تمام اقوام ہند متفق ہوکر سرکار کی عنایات سے مستفیض ہونیکی کوشش کرتے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے وقت بہت ملتے رہینگے۔ آخر میں مجھے ہندو اور مسلمان بزرگان قوم سے اسقدر عرض کرنا ہے کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آویگا کہ تمام اختلافات مٹ جائیں اور دونوں قومیں ایک ہوجائیں

بلکہ اختلافات روز نئے نئے پیدا ہوتے رہینگے۔ پس بجائے اسکے کہ آج ہم اور کل آپ ہر معاملے میں گورنمنٹ کا سہارا پکڑیں آپس کی منافرت کو بڑھائیں اور انگریزونکو اپنے اوپر ہنسی کا موقع دیں، اپنے جھگڑے آپس میں چکا دیں اور اختلافی امور کو سر برآوردگان ملک کی ایک کانفرنس قرار دیکر آپس میں طے کریں اور اتفاق کی برکت سے ملک کی عظمت اور دولت بڑھائیں اور اسی قعر تذلت سے نکالیں۔ خداوند ان کرے۔ فقط

(تلمذ حسین)

بیاض حسرت موہانی

حضرت میرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ

"از بدو حیات الی یومنا ہذا کہ عمر شریفش ۔ بیاضش خطوہ ستین است ..... از دالا ہمتی مراستغنا بپادشاہ و وزیر فرزانہ متکی مسند فراغت و مربع نشین چار بالش عزت است" (از تذکرہ فتح علی شاہ تالیف ۱۱۶۶ھ)

ابھی مت کسو کے پیش ۔ بخ انتظار آوے	بمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے
انھی زحمت دو کہ ہولیں فصت اسیر صیاد ہم	۔ توں اس باغ سے سا کر میں ہی آزاد ہم
نہیں کچھ غم کہ ملتا کیوں نہ ہو پیمان گل میرا	کہ یں ۔ دتا ہوں دل کی بیکسی پر ہی دل میرا

میر شرف الدین مضمون شاگرد میرزا مظہر و خان آرزو

از شعرای قرار دادہ ریختہ است ... ہرگاہ کہ دندانش از نزار ریختند خان آرزو از مزاح شاعر بے دانہ میگفت (از تذکرہ فتح علی شاہ)

چلا آگے سے کشتی میں جو وہ محبوب جاتا ہے	کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو دل ڈوبتا ہے
مرا یہ اشک تا صدر کی طرح اکدم نہیں تھمتا	کسی بیتاب کا گویا لئے مکتوب جاتا ہے

مرزا رضا قلی آشفتہ (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

لڑے تو اس سے رات میں غصے میں لڑ لیا	پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجا پکڑ لیا
چرا نچہ اندنوں غم پنہاں سے زرد ہے	ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے
وہ رشک مہ جو عاطر ہوا ہے نقاب پھرے	پھر اس چمک سے نہ گردوں پہ آفتاب پھرے

مکتوبات امیر مینائی

مرتبہ حضرت ثاقب

قاضی عبدالجمیل صاحب مرحوم رئیس بریلی کے نام

(رامپور - ۲۵ ستمبر ۱۸۹۳ء)

مکرم و محترم جناب قاضی صاحب زادت مکارمکم -

سلام مسنون اخلاص و نیاز مشحون - مکرمت نامہ میرے نامہ ہائے نیاز کے جواب میں صادر ہوا تھا
جب اطلاع رہتا کہ جن عزیزوں کے اُتارنے کا بریلی میں بندوبست کرنا ہے اُنکا تاریخ تعین وقت کیا
آجائے تو آپ کی خدمت میں اطلاع کروں - اسوقت راہ سے تار آیا کہ منگل کا دن گزر کر شب کو
بریلی میں پہنچینگے - میں احتیاطاً میاں ناصر علی اپنے ایک معتمد کو کہ مثل میرے عزیزوں کے ہے
یہ نامہ نیاز دیکر آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں جس جس قسم کی ضرورت مرکبوں اور کہاروں اور مکانا
فرودگاہ کے درپیش ہو اُن سب کا تکفل آپکی توجہ سے ہونا چاہیے اور مستعدی سے اسٹیشن
پر مع سواریوں کے حاضر باشی اور دو تین وقت تک ریل گاڑیوں کی نگرانی میاں ناصر علی کے
ذمے ہے - مزید احتیاط کے واسطے ایک کارڈ ڈاک پر بھی آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں - آخر
میں آپ کی مزاج پرسی اور آپکی عنایتوں کی شکرگزاری کرتا ہوں - صاحبزادہ بلند اقبال کو دعائیں
بندہ زادگان عقیدت نشان تسلیم رساں ہیں فقط - امیر احمد عفی عنہ

حکیم برہم صاحب اڈیٹر ریاض الاخبار کے نام

(۲) پیاری برہم - ؎ غصے میں ترے ہمنے عجب لطف اُٹھایا + اب تو عمداً اور بھی تقصیر کرینگے
تمہاری تحریر آئی اسیوقت غزل دیکھی بہت اچھے اچھے شعر ہیں - دو ایک جگہ
تصرف کیا - اس زمانے میں حبس بول کا دورہ پڑا تھا میں اور بھی ناتواں ہوں اور عسر بول کی
تکلیف تو روز ہی رہتی ہے - اشعار قصیدے کے آئینگے تو بشرط امکان دیکھکر بھیجونگا - آپ کی بابت
میں تحریک باطنی اور ظاہری چلی جاتی ہے - خاطر جمع رکھئے - انشاء اللہ آپ بہت جلد کامیاب ہونگے

	زعمر خویش برخوردار باشی		بشرط آنکہ با ما یار باشی

حافظ غلام احمد صاحب فروغی مدرس مدرسہ فارسی جہانگیری بپولی کے نام

دلنواز، دوستاں، زادت اخلاقکم بسلام مسنون اخلاص و نیاز مشحون۔ عنایت صحیفہ آیا اور اپنے ساتھ عمدہ ہدیہ لایا۔ نصاب کا نسخہ جو تحفۃً آپنے مرحمت کیا۔ میں نے خوش ہو کر اسکو قبول کیا۔ مینے دو چار ورق الٹکر دیکھے۔ کتاب آپنے بہت اچھی اور مفید لکھی ہے۔ مرزا غالب مرحوم کا قادر نامہ بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ آپکے یہاں بہت سی باتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ حسن انجام کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ و ربط بہت ہی کم آئے ہیں انشاء اللہ یہ کتاب مقبول خاص و عام ہوگی۔ میری رنجوری و معذوری کی وہی حالت ہے جو لکھ چکا ہوں۔ مجھے ذرا بھی صحت اور اطمینان ہوتا تو آپ کی فرمائش کی شرح سے تعمیل کرتا۔ آپ کے اصرار اور اپنی حالت سے نہایت محجوب ہوں۔ اخلاق سامی سے امید ہے کہ میرا عذر قبول کرکے میری خجالت مرتفع فرمائینگے۔ فرزندان و احباب فقیر کا واجب گزار ہیں۔ منت پذیر۔ امیر فقیر

(۴) منشی ولایت علیخاں صاحب عزیز حسنی پوری کے نام

گرامی گوہر معانی پرور سلمہ اللہ الاکبر۔ سلام مسنون۔ اخلاص و دعا مشحون۔ مختصر سا کلام جو آپنے اپنے دیوان سے نقل کرکے بالا نخانے پہنچا۔ رمضان کی وجہ سے میں ابھی اسکو پورا تو نہیں دیکھ سکا مگر جہاں جہاں دیکھا تو میری نظر میں سب منتخب قرار پایا۔ الحق آپ جوہر قابل ہیں اور ہر رنگ میں مذاق آپکا بہت اچھا ہے۔ کوئی کوئی زمینوں میں آپنے نعت کی غزلیں کہی ہیں کہ ان زمینوں میں شاعر سے عاشقانہ شعر بھی نکل سکتے ہیں۔ بارک اللہ فی عمرکم۔ فہرست آپکی تالیفات کی بھی معلوم ہوئی خداوند تعالیٰ ایسا سامان کرے کہ یہ سب نتائج افکار باحسن عنوان نظر افروز چشم مشتاقان ہوں۔ آپکے چھوٹے بھائی محمد عبد الرحمان مرحوم کی جوانمرگی سے جو صدمہ میرے دل نے اٹھایا اسکے بیان کو الفاظ نہیں ملتے۔ آپ ایسا خلق جسقدر رکھتے ہیں بجا ہے۔ حق تعالیٰ اس مغفور کو غرق دریای رحمت فرمائے اور آپکو صبر و جزائے صبر عطا کرے۔ ایسی حالت ضعف قلب و ضعف بصر میں آپنے میری واسطے اس کلام کی اپنے دست و قلم سے لکھنے میں تکلیف اٹھائی اس تکلیف نے مجھے راحت تو پہنچائی مگر شرمندہ بھی کیا۔ بیوقت تصدیع دہی سے شرمسار ہوں۔ اور اس عنایت و محبت کا شکر گزار۔ کیفیت صوری زیادہ لکھنے نہیں دیتے۔ یہ چند سطریں بطور رسید لکھدی ہیں تاکہ آپکو نگرانی نہ رہے۔ اطفال عقیدت خصال واجب سال ہیں۔ اشعار الاشعار دیکھنے کی نوبت ابھی نہیں

مکتوبات داغ دہلوی مرحوم

میرزا محمد شرفیار خانصاحب شرف سنج ریاست جاورہ کے نام

جناب صاحبزادہ محمد شرفیار خانصاحب - الہی شکر - کہ برسوں کے بعد میں یاد آیا برس دن تک بیمار رہا کہ خبر مرگ اخبار میں چھپی - مرثیہ تاریخیں لوگوں نے کہیں - تسنے بات بھی نہ پوچھی - ہلکو دیوان دیکھنے کی فرصت کہاں - جو میرے سلک سے خلاف ہو اوسکو خود نکال ڈالو البتہ ایک بات ہے کہ کوئی محاورہ خلاف نہ بندھا ہو -

منشی نظام کا قصد حضور خواجہ غریب نواز میں حاضر ہونے کا تھا بالفعل تو ملتوی ہوا مگر ضرور وہاں حاضر ہونگے - میں بھی بشرط زندگی ہمرکاب ہونگا - انشاء اللہ تعالی وہاں ملاقات ممکن ہے -

سب کچھ خدا نے دیا کسی پردیسی کی ایسی عزت اس دربار میں نہیں روٹی بھی پاس کو کھلا کر کھاتا ہوں مگر ہائے ہندوستان تیرا ارمان -

چھ مہینے سے سفر میں ہوں - یہاں بھی خدمت احباب حتی الوسع دریغ نہیں کرتا - تقدیر اللہ تعالی بلدہ میں جا کر بھیجونگا بشرطیکہ تم پھر یاد دلاؤ - ۲۱ ذی الحجہ [illegible] بخشیں [illegible] ہوں - فصیح الملک - داغ دہلوی -

[illegible] دیوان - تمہارے [illegible] میں رمضان نہیں آتا - [illegible] کر یہاں [illegible] [illegible] ہوں - [illegible] کی فرصت کہاں - بطور خود دیوان کو دیکھ لو [illegible] یہاں اگر ہو اور [illegible] کر لیجاؤ - مجھکو مہلت اگر ایک بار چھپنے میں غزل [illegible] تو آپ کو [illegible] آپکے نزدیک میرا ہی قصور رہا - فصیح الملک داغ دہلوی -

شعرائے عہد اکبری حصہ ۲

خواجہ مروی - شیخ رکن الدین بہاؤ الدولہ کی اولاد میں [illegible] میں شیخ ابن حجر ثانی سے تلمذ تھا - انشا - صنائع - بدائع - حسن تقریر - فصاحت - بلاغت - ظرافت - لطافت میں بے نظیر تھے - اشعار انکے متوسط درجے کے [illegible] دیوان [illegible]

یہ اشعار کتاب ناتمام سنگاسن بتیسی میں موجود ہیں جسکے لکھنے کا اکبر نے حکم دیا تھا۔ ؎

خوش الحان عندلیب باغ ابلاغ		مکحل نرگسش از کحلِ مازاغ	
کشیدہ در زبورِ نسخ بے قیل		قلم بر نسخہ توریت و انجیل	
نبوت را بدرگاہش حوالہ		امام الانبیا اختم الرسالہ	

ہندوستان کی آب و ہوا نے اسکو کچھ ایسا اپنا گرویدہ بنالیا تھا کہ اُسنے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ یہیں صرف کیا۔ سنہ ۹۸۹ھ میں بمقام کابل اسکا انتقال ہوا۔

تدوری ابجری

یہ مولانا بزرگی کے بہانے میں بڑے ذہین تھے بیرام خاں کے زمانہ میں روم سے ہندوستان آئے اور پہاڑوں کی لڑائیوں میں اتکہ خاں نے انہیں قید کرلیا۔ رسالہ سن یوسفی اسنے یوسف محمد خاں اتکہ کے نام پر لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے۔ ؎ بنام آنکہ روئے دشمن و دوست ٭ بہر جانب کہ باشد جانب اوست۔

سر بزانو چوں نہم در ہجر آں پیمان گسل	ولہ	تو دہ خاکستری گردو تنم از سوز دل
تیر داز بہر قتلم چوں نہم تیغ جفائے او	ولہ	تظلم را بہانہ سازم و افتم بپائے او
[illegible] غالے بر خود پسندیدم ندانستم		کہ چنداں اعتمادے نیست بر مہر و وفائے او
[illegible] تو اندر بیخودی آمد بناز	ولہ	چوں بخود باز آمدم صد رخنہ در جاں داشتم

سنہ ۹۷۰ھ میں انکو چوروں نے قتل کرڈالا اور آگرہ میں دفن کئے گئے۔

جعفر بیگ

یہ آصف خاں قزوینی کے نام سے مشہور تھا بخشیوں کے زمرے میں داخل تھا طبیعت اسکی شعر سے نہایت مناسب تھی کسیقدر علم سے بھی ذوق رکھتا تھا۔ ؎

[illegible] امروز بہ بیداد گرے افتادہ است		کہ بہر جا کہ نہد پائے سرے افتادہ است
ایں بچہ صحرا بود ایں صیاد صید افگن کبود	ولہ	ہیچ نخچیرے نشد پیدا کز و تیری نداشت
نالہ دردی سوے دلدار می باید نوشت	ولہ	در دل بسیار شد با یار می باید نوشت
میا در خاطرش ای رحم رنجم را کہ ضایع	ولہ	کہ خونہائے خورم تا بر سر بیدادے آ
[illegible]		[illegible]